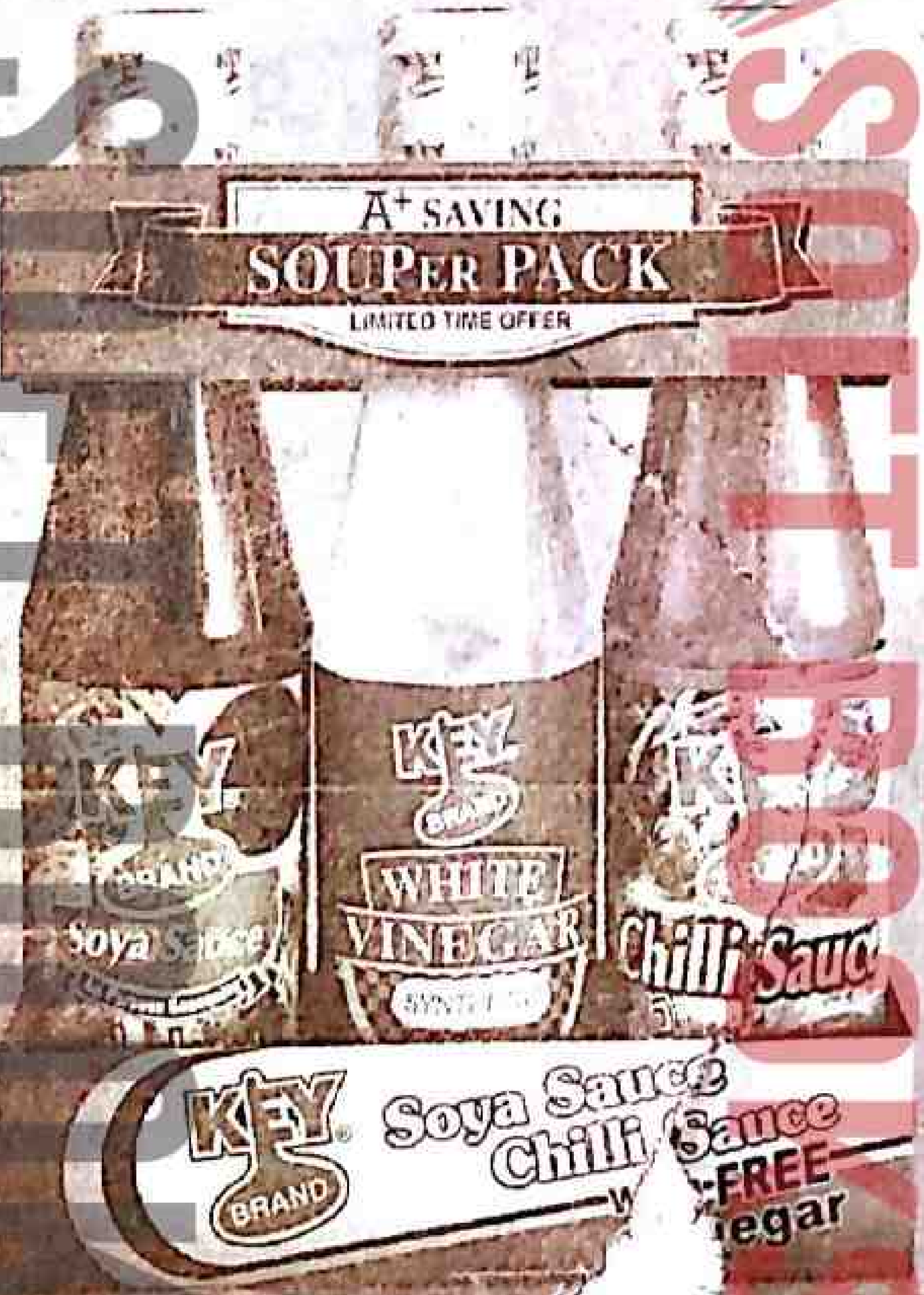
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

نومبر 2016

NOVEMBER 2016


KEY® BRAND
SAUCES
Rs. 160/- Only
WINTER WARMER OFFER
Perfect for any type of soup
A+ SAVING
SOUPER PACK
LIMITED TIME OFFER
WHITE VINEGAR
Chilli Sauce
Soya Sauce
Soya Sauce
Chilli Sauce
FREE
rossmoor@cy

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

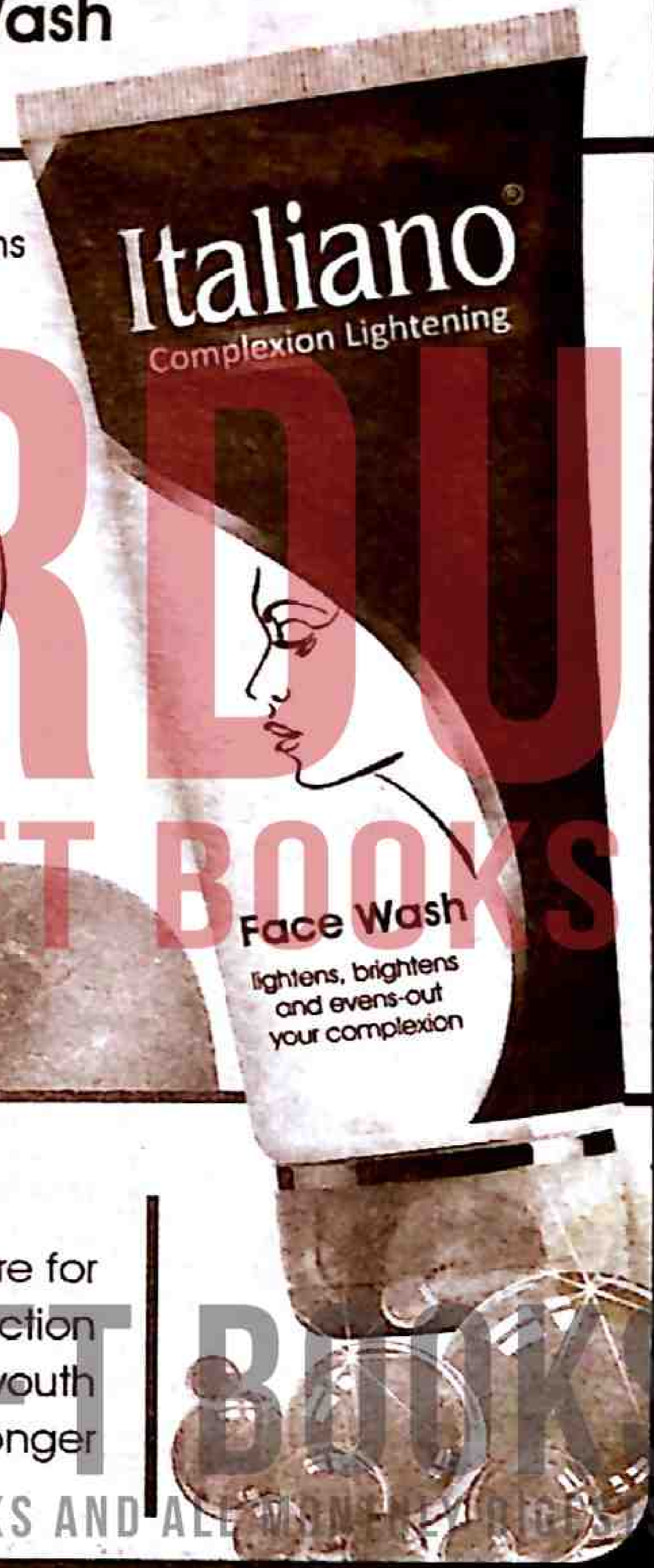


Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books






Lightens, brightens
and evens-out
your complexion


Italiano®
Complexion Lightening
Face Wash
lightens, brightens
and evens-out
your complexion









Pakistan's 1st

Anti-Bacterial Toothpaste



Round-the-clock
Cavity protection

Herbal
Dental Care

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیر کتب ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37-اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے

















نومبر 2016

جلد 44 شمارہ 7

قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



مدیر



خواتین ڈائجسٹ کا نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

جنگ ہمیشہ دو محاذوں پر لڑی جاتی ہے۔ ایک میدان جنگ میں اور ایک مکروفریب اور عیاری سے۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے دشمن بھی کم ظرف اور کم حوصلہ ملا ہے۔ ہمیشہ چھپ کر وار کرتا ہے اور ہماری صفوں میں ہی گھس کر ہم پر حملہ کرتا ہے۔

حالیہ المناک واقعہ کوئٹہ میں پولیس ٹریننگ کالج پر حملہ ہے جہاں دہشت گردوں نے حملہ کرکے پولیس اہلکاروں کو نشانہ بنایا۔ وہ نوجوان جو روشن مستقبل کا خواب آنکھوں میں سجائے اپنے گھروں کی غربت، تنگ دستی، بدحالی دور کرنے نکلے تھے۔ ہمیشہ کی نیند سلا دیے گئے۔ سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے اور نہ جانے کتنے افراد معذوری کی زندگی گزاریں گے۔ اس سے بڑا المیہ کیا ہوسکتا ہے کہ دہشت گردی کی جنگ میں سب سے زیادہ قربانیاں پاکستان نے دی ہیں اور سب سے زیادہ نقصان بھی اسی نے اٹھایا ہے۔ ہمارے بے گناہ معصوم شہری شہید ہورہے ہیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ دشمن کا مذموم کردار دنیا کے سامنے لانے میں ہم ناکام رہے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سانحے کے مجرمان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ کی جائے۔ انہیں سخت سزائیں دی جائیں اور متحد و متفق ہوکر ایک لائحہ عمل تیار کیا جائے تاکہ آئندہ ایسے سانحات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اس شمارے میں،

- عنیزہ سید کا مکمل ناول ۔ محبت خواب جزیرہ،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ نمل،
- راشدہ رفعت کا مکمل ناول ۔ تھینک یو سلجوق،
- سمیرا حمید، میمونہ صدف، صائمہ نور، عاصمہ فرحین اور راؤ سمیرا ایاز کے افسانے،
- سمیرا عثمان گل کا ناولٹ ۔ اچھی بہو،
- آمنہ ریاض اور عمیرہ احمد کے ناول،
- باصلاحیت فنکار جاوید شیخ سے ملاقات،
- معروف فنکارہ علیزے طاہر سے باتیں،
- حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ ۔ مصنفین سے سروے،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے، اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کے خطوط نہ صرف آپ کی رائے جاننے کا ذریعہ ہیں بلکہ ہماری رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ ہم آپ کی آرا کی روشنی میں پرچا ترتیب دیتے ہیں۔ ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

خواب اور ان کی تعبیر

لغوی معنی: تعبیر کے لغوی معنی اظہار، بیان اور ترجمانی کے ہیں جبکہ خواب سے مراد وہ مناظر یا وہ چیزیں ہیں جو کوئی شخص نیند میں دیکھتا ہے لہٰذا تعبیر الرویا کا مطلب ہوگا: حالت نیند میں دیکھے جانے والے مناظر کی تفسیر اور ان کی ترجمانی کرنا۔

خوابوں کی اقسام

خواب مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں۔ اگر اچھا خواب نظر آئے تو مومن کو دلی مسرت اور روحانی سرور حاصل ہوتا ہے اور اگر برا خواب نظر آئے تو مومن اپنے رب کی طرف رجوع کرکے احتیاطی تدابیر اختیار کرتا اور اپنے رب کی پناہ حاصل کرلیتا ہے۔ اس طرح خواب مومن کے لیے ہر حال میں خیر و برکت کا باعث بنتے ہیں۔ خوابوں کی اقسام درج ذیل ہیں۔

1۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کے لیے خوش خبری پر مشتمل خواب۔

2۔ مومن کو پریشان کرنے کے لیے شیطانی اور ڈراؤنے خواب۔

3۔ دن بھر کی مصروفیات، منصوبوں اور خیالات کا خواب میں نظر آنا۔

خواب سچے بھی ہوتے ہیں اور انسان کو پریشان کرنے کے لیے محض شیطانی وسوسے بھی۔ حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ نے خواب دیکھنے والوں کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

انبیائے کرام علیہ اسلام: ان کے خواب سچے اور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔

نیک لوگوں کے خواب: ان کے اکثر و بیشتر خواب سچے ہوتے ہیں جبکہ کبھی کبھار اس کے برعکس صورت حال بھی ہوسکتی ہے۔

فاسق و فاجر اور کفار کے خواب: ان کے اکثر خواب جھوٹے اور شیطانی وسوسے ہوتے ہیں، البتہ کبھی کبھار ان کے خواب بھی سچ ہوسکتے ہیں، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے دو قیدی ساتھیوں کے خواب یا فرعون کا

خواب وغیرہ۔

خواب کی تعبیر کے آداب: نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر شعبے میں امت کی رہنمائی فرمائی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خواب آتے تھے جن کی تعبیر خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔

اچھا یا برا خواب دیکھنے پر کیا آداب اختیار کرنے چاہئیں اس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی بھرپور رہنمائی فرمائی ہے' چنانچہ امت کو حکم دیا ہے کہ خواب کی تعبیر کرتے وقت اسے اچھی اور بہتر صورت پر محمول کریں کیونکہ تعبیر کردینے کے بعد خواب ویسے ہی واقع ہو جاتا ہے۔

خواب کی تعبیر کے سلسلے میں آپ کا ارشاد گرامی ہے کہ "تعبیر ہمیشہ اپنے خیر خواہ اور عالم شخص سے دریافت کرو۔" اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ عالم شخص اور خیر خواہ آدمی ہمیشہ اچھی تعبیر کریں گے جبکہ حاسد یا جاہل شخص بری تعبیر دے کر نقصان کا باعث بنیں گے۔ جس شخص کو خواب آئے اسے درج ذیل آداب نبوی اپنانے چاہئیں۔

1۔ اچھا خواب نظر آئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے' اپنے پسندیدہ' محبوب اور خیر خواہ لوگوں کو سنائے اور خوشی کا اظہار کرے۔

2۔ اگر ڈراؤنا یا برا خواب دیکھے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے' یعنی اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے۔ نیند سے بیدار ہونے پر بائیں طرف تین بار تھتکار دے۔ کسی بھی شخص سے اس کا اظہار نہ کرے۔

3۔ جس کروٹ لیٹا ہوا سے تبدیل کر کے دوسری کروٹ پر لیٹ جائے۔ نفل نماز ادا کرے۔

4۔ آیتہ الکرسی پڑھے۔

درج بالا آداب اختیار کرنے سے ان شاء اللہ آدمی برے خواب کے اثرات سے محفوظ ہو جائے گا۔

خوابوں کی تعبیر سے متعلق آداب واحکام

مسلمان کا خود یا کسی اور کا اس کے لیے اچھا

خواب دیکھنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نیک آدمی کا اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل

1۔ نبی کا خواب ہمیشہ سچا ہوتا ہے کیونکہ اس پر شیطان کا اثر نہیں ہوتا' البتہ بعض اوقات وہ خواب ایسا ہوتا ہے جس کی تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیک آدمی کو کبھی غلط خواب بھی آتے ہیں کیونکہ وہ معصوم نہیں ہوتا' تاہم جتنا زیادہ نیک ہو اتنا زیادہ اس کے خواب کے سچا ہونے کی امید ہوتی ہے۔

2۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی آدمی نبی نہیں ہو سکتا' اس لیے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ خواب دیکھنے والا شرف نبوت میں شریک ہو جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ نبوت کے چھیالیس یا ستر حصے ہیں اور ان میں سے ایک حصہ اچھے خواب بھی ہیں۔ اگرچہ نبوت اب باقی نہیں رہی مگر اس کا یہ حصہ قیامت تک باقی ہے۔

3۔ اس کی ایک توجیہہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دور نبوت تیئس سال کا ہے اور ان میں پہلے چھ ماہ تک آپ کو محض خواب آیا کرتے تھے جو اس قدر سچے اور حقیقت پر مبنی ہوتے تھے' جیسے رات کے اندھیرے کے بعد صبح صادق کا طلوع ہونا۔ چونکہ یہ چھ ماہ تیئس سال کا چھیالیسواں حصہ ہے' اس نسبت سے مومن کے خواب کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مومن کا خواب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ ممکن ہے اس حدیث سے ادنیٰ درجے کے مومن کا خواب مراد ہو اور پہلی حدیث میں اعلیٰ درجے کے مومن کا خواب۔ ادنیٰ درجے کے خواب میں اس کے اپنے خیالات کا دخل زیادہ ہوتا ہے' اس لیے اس کے بعینہ پورا ہونے کا امکان نسبتاً کم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

سچے خواب

حضرت ام کرز کعبیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نبوت ختم ہو گئی اور خوش خبری دینے والی چیزیں رہ گئیں' یعنی سچے خواب باقی ہیں۔" (مسند احمد)

فوائد و مسائل :

1۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں' اس لیے نبوت سے براہ راست مستفید ہونا اب ممکن نہیں۔

2۔ سچے خوابوں کو مبشرات کہا گیا ہے کیونکہ ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ مومن کو کسی ملنے والی نعمت کی خبر دیتا ہے یا کسی آنے والی مصیبت سے متنبہ کر دیتا ہے تاکہ انسان اس سے بچنے کی دعا اور تدبیر کر لے۔

3۔ اکثر خواب ایسے ہوتے ہیں جن کی تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے' البتہ بعض خواب جیسے نظر آتے ہیں بعد میں ویسا ہی واقعہ پیش آجاتا ہے' جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو صحابہ کے ساتھ عمرہ کرتے دیکھا تو اگلے سال اسی طرح عمرہ ادا کیا گیا۔

اچھا خواب

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اچھا خواب نبوت کا سترواں حصہ ہے۔" (مسلم)

خوش خبری

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق دریافت کیا۔

"ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی۔" (سورہ یونس۔64)

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس سے مراد اچھا خواب ہے' جو مسلمان دیکھتا ہے یا اس کے لیے دیکھا جاتا ہے۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ اچھا خواب اپنے بارے میں بھی ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے مسلمان کے بارے میں بھی۔ دونوں صورتوں میں یہ خوش خبری ہے' مثلاً: ایک آدمی دیکھتا ہے کہ وہ کعبہ کا طواف کر رہا ہے یہ اس کا اپنے بارے میں خواب ہے۔ یا دیکھتا ہے کہ اس کا والد طواف کر رہا ہے۔ تو یہ اس کے والد کے بارے میں خوش خبری ہے۔

2۔ آخرت میں مومن کو جنت میں داخلے کی خوش خبری ملے گی۔ یہ روح قبض ہوتے وقت بھی ملتی ہے اور قبر کے سوالات کے بعد بھی ملتی ہے۔

3۔ دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملنا بھی خوش خبری ہو گی۔ اعمال کا وزن ہوتے وقت نیکیوں کے پلڑے کا بھاری ہو جانا بھی خوش خبری ہے۔

نیک خواب

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے (آخری) مرض کے ایام میں (ایک دن) پردہ ہٹایا جبکہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے صفیں باندھے ہوئے (نماز پڑھ رہے) تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لوگو! نبوت کی خوش خبری دینے والی چیزوں میں سے صرف نیک خواب باقی ہیں جسے کوئی مسلمان دیکھتا ہے یا اس کے لیے دیکھا جاتا ہے۔" (مسلم)

خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے (گویا) مجھے بیداری میں دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا۔" (ترمذی)

حضرت ابوجحیفہ وہب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس نے مجھے خواب میں دیکھا گویا اس نے مجھے بیداری میں دیکھا۔ شیطان یہ طاقت نہیں رکھتا کہ میری صورت اختیار کرے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ بعض خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ یہ خواب سچے ہوتے ہیں۔ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی اسی قسم میں شامل ہے۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اس حلیے کے مطابق ہو تو خواب سچا ہے، تعبیر کی ضرورت نہیں۔ اگر خواب میں حلیہ مبارک مختلف نظر آئے تو اس کی تعبیر کی جائے گی اور یہ دیکھنے والے کے دین و خلق میں نقص اور کوتاہی کا اظہار ہے۔ (فتح الباری ۱۲/۳۸۴)

3۔ شرعی مسائل خواب سے ثابت نہیں ہوتے، ان کے لیے قرآن و حدیث کے دلائل کی ضرورت ہے۔

4۔ بعض لوگ جھوٹ موٹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا دعوا کردیتے ہیں، حالانکہ انہیں ایسا کوئی خواب نہیں آیا ہوتا۔ یہ بہت بڑا گناہ اور نہایت سنگین جرم ہے۔

تین قسمیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"خواب تین قسم کے ہوتے ہیں: (ایک) اللہ کی طرف سے خوش خبری، (دوسرے) دل کے خیالات اور (تیسرے) شیطان کی طرف سے خوف زدہ کرنے کے لیے (برے اور ڈراؤنے خواب) جب کسی کو ایسا خواب آئے جو اسے اچھا لگے تو اگر وہ چاہے تو اسے (کسی کے سامنے) بیان کردے۔ اور اگر کوئی ناپسندیدہ چیز نظر آئے تو کسی کو خواب نہ سنائے اور اٹھ کر نماز پڑھے۔" (بخاری)

خواب کی قسمیں

حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"خواب تین قسم کے ہوتے ہیں: بعض خواب ڈراؤنے ہوتے ہیں، (وہ) شیطان کی طرف سے انسان کو پریشان کرنے کے لیے (ہوتے ہیں۔) بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انسان بیداری کی حالت میں جو کچھ سوچتا رہتا ہے، وہی کچھ خواب میں اسے نظر آجاتا ہے۔ اور بعض (خواب) وہ ہیں جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔" حضرت مسلم بن مشکم رحمتہ اللہ نے کہا:
"کیا آپ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (براہ راست) سنی ہے؟"
حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
"ہاں، میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی ہے۔ ہاں، میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی ہے۔" (طبرانی)

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ کی طرف سے فرشتے کے ذریعے سے دکھائے جانے والے خواب سچے ہوتے ہیں، خواہ واضح ہوں یا ان کی تعبیر کی ضرورت ہو۔

2۔ شیطان جس طرح بیداری میں انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے، اسی طرح نیند کی حالت میں پریشان کن خیالات کو خوابوں کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

3۔ انسان دن میں جو کام کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے لیکن کسی وجہ سے کر نہیں سکتا، نیند میں اس قسم کے

خیالات خوابوں کی صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔ ان کی تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

4۔ جدید علم نفسیات صرف تیسری قسم کے خوابوں کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ یہ لوگ فرشتوں اور شیطانوں پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے پہلی اور دوسری قسم پر یقین نہیں رکھتے لیکن وہ ایک حقیقت ہیں جن کی مثالیں اکثر سامنے آتی رہتی ہیں۔

5۔ انبیائے کرام علیہ السلام کے خواب وحی میں شامل ہیں لہٰذا یقینی امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔

برا خواب

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب کسی کو ایسا خواب آئے جو اسے برا لگے تو اسے چاہیے کہ بائیں طرف تین بار تھوک دے اور تین بار شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے اور جس پہلو پر لیٹا ہوا ہو اسے بدل دے (دوسرے پہلو پر لیٹ کر سو جائے۔") (مسلم)

اللہ کی طرف

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے، لہٰذا اگر کسی کو (خواب میں) ایسی چیز نظر آئے جو اسے ناگوار ہو تو اسے چاہیے کہ تین بار بائیں طرف تھوک دے اور شیطان مردود سے تین بار اللہ کی پناہ مانگے اور جس پہلو پر لیٹا ہوا ہو اسے بدل دے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ برا خواب شیطان کے شر سے ہوتا ہے، اس لیے اس سے حاصل ہونے والی پریشانی کا علاج اعوذ باللہ پڑھنا ہے۔

2۔ بائیں طرف تھتکارنے میں یہی حکمت ہے کہ بائیں طرف شیطان سے مناسبت رکھتی ہے، وہ اس طرف سے آکر دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔

3۔ کروٹ بدلنا جسمانی حالت میں ظاہری تبدیلی ہے جس میں اللہ سے اس کی رحمت کی امید اور درخواست کا اظہار ہے کہ اللہ پریشانی کی حالت تبدیل فرما کر اطمینان عطا فرما دے۔

شیطان شرارت کرے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

"میں نے (خواب میں) دیکھا کہ میرا سر اڑا دیا گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ لڑھکتا جا رہا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شیطان (بعض اوقات) کسی انسان کی طرف متوجہ ہو کر اسے (خواب میں) خوف زدہ کرتا ہے، پھر وہ (شخص) صبح لوگوں کو بتانے لگتا ہے (یہ مناسب نہیں۔") (مسند احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ پریشان کن خواب کسی کو سنانا مناسب نہیں۔

2۔ انسان کو چاہیے کہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے ایسے خواب کو اہمیت نہ دے بلکہ گزشتہ باب کی احادیث کے مطابق عمل کرے۔ اللہ کی رحمت سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک آدمی آیا اور اس نے کہا:

"اے اللہ کے رسول! آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا گلا کاٹ دیا گیا اور میرا سر (جسم سے الگ ہو کر) گر گیا ہے۔ میں نے اس (لڑھکتے ہوئے سر) کا تعاقب کر کے اسے پکڑ لیا اور دوبارہ (جسم پر) لگا لیا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب کسی کے ساتھ شیطان خواب میں شرارت کرے تو وہ (یہ خواب) لوگوں کو ہرگز نہ بتائے۔" (مسلم)

مرنے والوں کو سہولتیں

انشا جی

اخبار میں آیا ہے کہ گزشتہ بدھ کو گزمی شاہو میں "انجمن معین الاموات" کا جلسہ ہوا جس میں نئے سال کے لیے عہدیدار منتخب کیے گئے۔

معین کا مطلب ہے مددگار' اعانت کرنے والا۔ اموات جمع ہے موت کی۔ ہم نے یہ نام پہلی بار سنا تھا لہٰذا اس کے معنی کچھ غور کرنے سے سمجھ میں آئے لیکن جب سمجھ میں آ گئے تو ہم نے فوراً" اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے کہا کہ۔

"دیکھو' لاہور والے تم کراچی والوں سے بازی لے گئے۔ اپنی انجمن بنالی۔ جو کام تم لوگ یہاں فرداً" فرداً" کرتے ہو' اب وہاں اجتماعی طور پر ہوا کرے گا۔ اب یہ لوگ آبادکاری والوں پر زور دے کر قبرستانوں کے لیے مزید زمین بھی منظور کرالیں گے۔ یہاں تم لوگوں سے یہ بھی نہ ہوسکا۔"

آج کل نیکی کا زمانہ نہیں' بجائے اس کے کہ اس امر ضروری کی طرف توجہ دلانے پر وہ ہمارا شکریہ ادا کرتے بپھر گئے اور کہنے لگے۔

"دیکھو جی۔۔۔ تم گھوم پھر کر بات ہم پر لاتے ہو' یہ ٹھیک نہیں۔ خود تمہارے پڑوس میں تابوت الحکما حکیم عزرائیل علی خاں مالک ہلاہل دواخانہ بھی تو موجود ہیں اور اب تو ہومیو پیتھیوں کو بھی خلق خدا کے مارنے جلانے کا اختیار مل گیا ہے۔ طب چین وجاپان والے تو مریض پروار کرنے کے لیے لائسنس تک نہیں لیتے۔ ان نیولوں اور سانڈوں اور درویش کی چٹکی والوں کو بھی تم بھول گئے' جن کی ایک پڑیا زکام' آشوب چشم' بواسیر' ہیضہ' کھٹی ڈکاروں' گٹھیا اور گنج کا شرطیہ علاج ہوتی ہے بلکہ چہرے کی رنگت سفید اور سفید بالوں کو کالا کرنے کے لیے بھی مزید کسی دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

✡ ✡ ✡

ادھر سے ہماری توجہ ہٹی تو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ ملاوٹ کا کام کرنے والوں کی انجمن ہے جنہوں نے لکڑی کے برادے' بھٹے کی لال اینٹوں کے سفوف اور کیکر کی چھال وغیرہ کی چھوٹی صنعتوں کو ترقی دے کر اتنا بڑا بنا دیا ہے۔ اب تک یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ تعمیر مکانات یا ایندھن کے کام کی سمجھی جاتی تھیں' ہلدی' مرچ مسالوں اور چائے کے طور پر ان کا استعمال کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ موبل آئل بھی فقط بسوں اور ٹرکوں وغیرہ میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ کسی نے نہ سوچا تھا کہ یہ گھی کا نعم البدل ہے اور اس سے انسانی جسم کی گاڑی بھی خوش اسلوبی بلکہ زیادہ' تیزی اور تیز رفتاری سے چلائی جاسکتی ہے۔ زندگی کی راہ جو پہلے ساٹھ ستر' اسی سال میں طے ہوتی تھی' موبل آئل باقاعدگی سے استعمال کرنے والے اسے دو تین ہی سال میں طے کر لیتے ہیں۔

✡ ✡ ✡

اس پر ہم اپنے پرانے کرم فرما سیٹھ ہلدی بھائی' چونا بھائی' نوٹوں والے پرانے کوٹوں والے کے پاس گئے اور اس انجمن کے بنانے پر مبارک باد دی۔ انہوں نے فوراً" موبل آئل میں تڑتڑاتی جلیبیوں کی پلیٹ ہماری طرف بڑھائی' جوہڑ کا پانی ملے دودھ کی چائے کے ڈبل کپ کا آرڈر دیا جس میں کیکر کی چھال کے علاوہ چنوں کا چھلکا بھی استعمال کیا گیا تھا' جو اعصاب کے لیے خصوصاً" گھوڑوں کے اعصاب کے لیے مفید مانا گیا ہے۔ اس کے بعد بھس ملے تمباکو کی بیڑی ہمیں پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بابا۔ یہ انجمن ہماری نہیں ہے۔ ہم تو درویش'



گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شہرت سے ہمیں نفرت ہے۔ نام و نمود کا شوق نہیں اسی لیے خفیہ تہہ خانوں میں اپنا کام کرتے ہیں اور پبلک کی خدمت بجالاتے ہیں۔ اگر کوئی منصفی کرے تو دیکھے کہ فیملی پلاننگ والوں سے زیادہ مفید کام تو ہم کرتے ہیں۔ آخر آبادی کو کم ہی تو کرنا ہے' پریذیڈنٹ صاحب نے بھی تو کہا ہے۔"

اس کے بعد بھٹے کی اینٹوں سے بنے ہوئے کتھے اور پیپل کی لکڑی کی سپاری کا پان پیش کرتے ہوئے کہا۔

"حکومت کہتی ہے اناج بچاؤ۔ جب ہم نے اناج بچایا اور اپنے گوداموں میں بھر لیا۔ خود میرے تہہ خانے میں کئی سو بوریاں ہوں گی۔۔۔ تو اب حکم نکالا ہے کہ یہ بری بات ہے' اسے باہر نکالو' سستا بیچو۔ بابا ہم اخبار والا ہے' حکومت کو سمجھاتا کیوں نہیں۔ رزق جیسی انمول چیز کو سستا کیسے بیچ دیں۔"



اب ہم نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ انجمن بسوں' ٹرکوں اور رکشا والوں نے بنائی ہے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ہمارا دھیان سب سے پہلے اس طرف کیوں نہ گیا' جو پبلک کی خدمت کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور فٹ پاتھ پر ٹرک چلا کر اور نالے میں بس گرا کر ثابت کرتے ہیں کہ انسان ہمت کرے تو بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانا بھی کچھ مشکل کام نہیں۔ ہم پتا پوچھتے پوچھتے ٹرک ٹرانسپورٹ یونین کے دفتر پہنچے تو اس کے سیکریٹری جنرل نے فوراً" ٹرانسسٹر کی آواز دھیمی کر کے نسوار کی چٹکی سے ہماری تواضع کی اور کہا " ابھی حقہ تازہ کر کے لاتا ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت نہیں ہے' صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی انجمن معین الاموات کی اس ماہ میں کیا کارگزاری ہے اور آیا بس والوں کا پلہ بھاری رہا ہے یا ٹرک اسے ہارن دیئے بغیر پاس کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔"

ہماری بات ان کی سمجھ میں آئی تو فوراً" تھرڈ گیئر میں گفتگو کرنے لگے اور پھر فورتھ گیئر میں آنے کو تھے کہ ہم نے وہاں سے بھاگنے میں سلامتی دیکھی۔ اس اثناء میں سامنے "انجمن معین الاموات شاخ کراچی" کا بورڈ نظر آگیا۔ ہم نے ہانپتے کانپتے اندر داخل ہو کر کہا۔

"صاحبو! ہماری مدد کرو۔۔۔" اس پر ایک صاحب جو مٹکوں کے درمیان بیٹھے لٹھا ناپ رہے تھے' بولے۔

" جناب ہمارا کام تو مردے کو اس کی ابدی آرام گاہ تک پہنچانا ہے۔ زندوں کے امور میں ہم دخل نہیں دیتے۔ وہ سامنے ٹرک آرہا ہے' پہلے اس کے سامنے لیٹ جائیے پھر ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے۔"



حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

راؤ سمیرا ایاز

اگر میں یہ کہوں کہ میرے لیے تو ہر وہ دن خوشی کا ہوتا ہے جب میرے ہاتھ میں خواتین' شعاع یا کرن آجاتا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ سو ہر وہ دن سالگرہ کا۔۔۔ جسے میں نہایت دل سے شوق سے مناتی ہوں سارے کام نمٹا کر۔۔۔

یہ ممکن ہی نہیں کہ بے جان ہو تم
جیسے چمکے آسمان پہ تارے وہی جان دار مثال ہو تم

1 ۔اس سوال کا جواب اب تک کی نسل میں کہیں نہیں۔۔۔ البتہ پڑھنے کا شوق ضرور وراثت میں منتقل ہوا۔۔۔ لیکن مجھے زیادہ انسپائر میری آپی نے کیا۔۔۔ شگفتہ آپی۔۔۔ یہ ان ہی کا ہمارے گھر میں شوق تھا جو مجھ میں اور شازیہ (بہن) میں منتقل ہوا لیکن لکھنے کا سلسلہ میں نے ہی شروع کیا۔

شگفتہ آپی نے بھی لکھا تھا ان کے مطابق۔۔۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جب پڑھنے پر بھی حد بندی تھی تو لکھنے کا مطلب بالکل ہی بائیکاٹ۔۔۔ سو کبھی بھیجنے کا اتفاق انہوں نے نہیں کیا۔۔۔ یہ جرات و ہمت ہم دونوں نے ہی کی۔ دونوں مطلب میں اور میری بہن شازیہ' لیکن ایک بات سے میں ضرور اتفاق کرتی ہوں کہ یہ صلاحیت پوشیدہ ہوتی ہے' صرف یہی نہیں اور بھی بہت سی لیکن قدرت نے میرے اندر شاید اس چیز کو چن کر بھیجا تھا' جسے میں نے جبرا" باہر نکالا۔ یوں ہی شوق شوق میں۔ سوچا تھا بس ایک یا دو سین لکھ کر بند یہ سلسلہ۔۔۔ (کہ کون بھیجنے دے گا) لیکن لفظوں نے ایسی دوستی باندھی کہ آج تک قائم و دائم ہے۔

کسی زمانے میں پنسل بہت پیاری تھی اور آج قلم۔۔۔ یہ قلم ہی در حقیقت قدرت کا حسین تحفہ ہے ورنہ ہماری قوم کہاں آباد ہو پاتی (کیوں متفق ہیں ناں سب) اب حد بندی پڑھنے کی ٹوٹ گئی ہے تو لکھنے کی بھی ٹوٹ ہی جائے گی۔ ابھی تک تو کوئی ایسا نہیں دور دور تک کہ لکھنے کا شوق رکھے' ہاں شاید کسی کو یہ شوق بھا جائے۔۔۔ سو پڑھنے پر بھی ہم تینوں بہنیں قائم ہیں اور دائم ہی رہیں گی (ان شاء اللہ)۔۔۔

2 ۔کیا یاد دلا دیا آپ کے اس سوال نے۔۔۔

پہلی تحریر جب "کرن" میں شائع ہوئی تو جنوری میں شائع تحریر کا مئی کی دوسری تاریخ کو پتا چلا۔۔۔

یہ وہ وقت تھا جب عباد اور رہنیہ (متاع جاں ہے) کے کردار Carmel کی سیر کو نکلے تھے۔۔۔ اور جنوری کے اس شمارے کو مئی کے گرم دن کی شام کو ہاتھ میں لیے بیٹھے ان ہی میں کھوئے ہوئے تھے جب خواتین کے شمارے میں جنوری کے کرن کا پمفلٹ دیکھا اور اس میں اپنا نام۔۔۔ تو بھاگم بھاگ بھائی کو بھگایا اور جنوری کا کرن ہاتھ میں آتے ہی تصدیق ہو گئی۔۔۔ اور اس تصدیق کے بعد سب بے یقین۔۔۔ جوائنٹ فیملی کے سارے کردار تحیر میں غرق۔۔۔

پھر سب سے پہلے ابو نے کہا کہ "میں پڑھوں گا ناول۔" اور صبح ان کی رائے۔

"بھئی کافی بڑا تھا۔ شروع کے ہی صفحے پڑھے ہیں لیکن اچھا ہی ہے ناول تب ہی تو شائع ہو گیا۔"

اب یہ رائے کیسی رہی آپ خود اندازہ لگائیں۔۔۔

دوسری رائے شگفتہ آپی کی جب وہ سسرال سے آئیں تو فورا" بے تاب پڑھنے کو۔۔۔

پہلے چند صفحے پڑھ کر آئیں۔

"بہت اچھے لفظ لکھے ہیں سمیرا۔"

اس کے بعد کے صفحے پڑھے۔۔۔

"تحریر میں روانی ہے۔۔۔ عمدہ لگ رہی ہے۔"

آدھی سے زیادہ پڑھنے کے بعد۔۔۔

"کچھ زیادہ ہی مشکل لفظ نہیں ہیں تمہارے۔۔۔"

اور پوری پڑھنے کے بعد۔۔۔

"کہاں ہے یہ سمیرا۔۔۔ اتنے خوب صورت ناول میں جملے کیوں اتنے مشکل ڈالے ہیں۔ اتنا فلسفہ کیوں ہے بھئی مکالموں میں۔۔۔"

اس کو تو کہتے ہیں غبارے میں سے ہوا نکلنا۔۔۔ نہیں نکال دینا۔۔۔

رہیں امی حضور۔ تو وہ میرا نام دیکھ کر ہی خوش ہو جاتی ہیں۔۔۔ کیونکہ انہوں نے کبھی ناول نہیں پڑھے۔۔۔ پہلے کبھی کبھار کسی اخبار یا میگزین سے بچی کہانیاں پڑھتی تھیں پھر گھر گرہستی کے چکر میں چھوڑ دیا۔

صرف یہی نہیں۔۔۔ بھائی نے پڑھی "یہ نہ تھی ہماری قسمت" تو مجھ سے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔۔۔ جو تم نے لکھا ہے لیکن پھر بھی ایسا ہونا چاہیے کم از کم والد صاحب تو ایسے اور کچھ نہیں تو پسند کی شادی تو ہو ہی جاتی۔۔۔"

بہنوئی (اصغر بھائی) نے کہا۔ قسطوں میں پڑھ کر "بھئی یہ تو میری کہانی ہے۔"

میں نہیں سمجھی تو شازیہ نے کہا کہ وہ بھی تو اکلوتے ہیں ناں۔۔۔ صرف "اسی" مماثلت سے انہیں لگا۔۔۔ میں حیران۔

شازیہ نے کہا کہ زیادہ اوور نہیں کرو۔ ورنہ۔۔۔

شگفتہ آپی نے کہا فجر ویلے پڑھ کر "ہاں یہ بہترین اسٹوری تھی یوں ہی لکھا کرو۔"

اور کاشف بھائی خواتین لا دیا، پڑھ لی؟ میں نے پوچھا تو کہا۔

"پتا نہیں کیا لکھا تھا سمجھ میں نہیں آیا۔" اس پر میں نے دل برا نہیں کیا کیونکہ ان سے کوئی اچھی رائے لینا "ناممکن" یہ ہی کہوں تو یہ ہی ٹھیک ہے۔

مجموعی طور پر یہی تاثر بنا ہے۔۔۔ اندازہ آپ لگا لیں۔

اس جمع، تفریق سے پرے ایک بات، جس پر میں آج بھی حیران ہوں وہ ہے میرا لکھنے کا سلسلہ۔۔۔

ایک ایسا امکان، جس کا میں نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ شکریہ کرم اللہ کا، جو وہاں سے نوازتا ہے، جس کی خبر تک نہیں ہوتی۔۔۔ اور اس نے نوازا بھی ایسا کہ اب زندگی لفظوں کے روگ میں لگ گئی ہے۔۔۔

"تو ہی بڑا۔۔۔ اور تیری شان بھی بس میں بندہ عاجز، اپنی عاجزی نہ بھولوں۔"

3۔ "اطمینان" کا لفظ پانا بہت مشکل ہے۔ میری دوسری شکل۔۔۔ مطمئن ہونا۔۔۔ اور مجھے بھی یہ لفظ بہت مشکل سے حاصل ہوا جب میں نے "مظہر الوہیت" کو لکھا۔۔۔

بہت سالوں پہلے لکھا یہ "ناول" میرے پورے دو سال کی کاوش ہے۔ جسے میں نے ابھی تک شائع نہیں کروایا۔ جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ ہلکا پھلکا اور افسانوی و رومانوی کاوش سے بھرپور تحریر لکھنا یا ایک سنجیدہ شکل کی، مضبوط پیرائے میں باوزن الفاظ تحریر کرنا۔۔۔ دونوں ہی مشکل ہیں۔ لیکن لکھنے والے کو اطمینان بھی تب ہی حاصل ہوتا ہے جب اس کے اندر کردار شور مچانے لگیں، ذہن الفاظ و واقعات کے پیراہن میں الجھا رہے اور تب تک جب تک وہ سفید کاغذ پر مجسم نہ ہو جائیں۔ سو مجھے یہ ناول دل سے پسند ہے بلکہ دل سے قریب ہے۔ کیونکہ ادھر یہ میں نے سوچا تھا اور ادھر دوسرے دن ہی سب فراموش کیے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ رات دن کی تمیز کیے بغیر۔

اس کے علاوہ کرن میں "بلا عنوان" کے نام سے شائع ہونے والا افسانہ، جسے قارئین نے بے حد پسند کیا اور "یہ نہ تھی ہماری قسمت" اور "لازوال محبت" جو اگر قابل اشاعت ہوا تو آپ ضرور پڑھ سکیں گے۔

اور وہ تمام خاموش تحریریں جنہیں اگر زندگی نے وفا کی تو آپ تک ضرور پہنچ جائیں گی۔

"کن مصنفین" نہیں، سب مصنفین کو میں نے شوق سے پڑھا ہے۔۔۔ وہ تمام جو ڈائجسٹ ادب میں نام ور رہی ہیں، اور وہ جو اب گمنام ہو گئی ہیں، جن میں سرفہرست "رفعت سراج" ہیں۔۔۔ پھر ہما کوکب بخاری اور موسٹ فیورٹ آسیہ مرزا۔۔۔ جن کی تحریریں مجھے

بہت یاد آتی ہیں۔۔۔ (پسندیدہ مصنفین کی فہرست بہت لمبی ہے لیکن پھر بھی اگر نام نہ لکھوں تو زیادتی ہے)

نگہت عبداللہ کا انداز تحریر دیکھ کر ہی میں ان کا نام جان جاتی ہوں۔ شازیہ چوہدری جو اپنے بے باک قلم سے مشہور تھیں ان کو میں سب سے پہلے پڑھتی تھی لیکن انہیں جب پڑھا چھپ چھپ کر پڑھنے والے دن تھے کیونکہ امی منع کرتی تھیں وجہ پہلے پڑھائی۔۔۔ اور چھٹیوں کے دنوں میں ڈائجسٹ کی ایک یا دو کہانی وہ بھی ان کی منتخب شدہ۔

اس معاملے میں سحر ساجد کی "پاگل سی" کی سی اسٹوری رہی میری۔۔۔ اور اس معاملے میں وہ وہ راز چھپے ہیں جنہیں نہ ہی بیان کروں تو اچھا ہے۔ ہاں لیکن کبھی کورس کی کتابوں میں رکھ کر ڈائجسٹ نہیں پڑھا۔۔۔ کیونکہ میں اپنی پڑھائی میں ہمیشہ سے سنجیدہ رہی تھی۔

عمیرہ احمد کا تعارف بھی ان ہی دنوں ہوا اور آپی نے ان کی پہلی کہانی بھائی کو پڑھنے کے لیے دی تو مجھے بھی تجسس سا ہوا کہ ایسی کون سی کہانی ہے۔ بہت مشکل سے پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ کہانی کا نام مجھے یاد نہیں، لیکن کہانی ضرور یاد ہے، جس میں ایک مسلمان کرسچن ہونا چاہتا ہے اور پارک میں لڑکی اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔

(اگر میں غلط نہیں تو یہی اسٹوری تھی عمیرہ احمد کی تحریر کی) اس کے بعد عمیرہ احمد کی ہر تحریر پڑھی "ایمان امید اور محبت" سے لے کر اب "آب حیات" تک (اور یہاں تک پڑھنے کی آزادی بہت مشکل سے ملی ہے کیونکہ شوق کا واقعی کوئی مول نہیں)

نمرہ احمد کا "قراقرم کا تاج محل" سے لے کر "نمل" تک بہترین اور خوب صورت تحریر "عہد الست" جس پر تنزیلہ ریاض کا شکریہ۔

"آمنہ ریاض" کا "تم آخری جزیرہ ہو" کمال انداز۔۔۔

اور کمال در کمال "ستارہ شام" جسے میں نے تین دفعہ پڑھا۔ وہ بھی اس طرح کہ میرے بستر پر ڈائجسٹ کا ایک انبار اور میں پہلی قسط، دوسری سے لے کر آخری قسط۔۔۔ جس پر امی سے ڈانٹ پڑی۔

ویسے "نمل" بھی میں دو دو دفعہ پڑھتی ہوں۔ یعنی ہر قسط۔ عمل رضا کے افسانوں نے چونکایا اور "تعویذ حب" نے باندھ لیا۔ عفت سحر طاہر کے لیے میرے پاس لفظ کم پڑ جائیں گے کیونکہ لفظوں کی پاکیزگی کا جس طرح سے وہ خیال رکھتی ہیں، کسی کے بس کی بات نہیں۔

سمیرا حمید کا "سودا" نے عصر سے مغرب تک حیران کردیا۔ اور "یارم" بس ختم۔۔۔ (عالیان اور امرحہ اب مل ہی جائیں کہیں) سائرہ رضا "سرسوں کا پھول" پہلی تحریر تھی نا۔ اس کے بعد سے "خالی آسمان" تک کا آپ کا سفر آخری سانس تک یاد رہے گا۔ "فرحانہ ناز ملک" ایک سنہری یاد۔

عنیزہ سید "جور کے تو کوہ گراں" بار بار، ہر بار پڑھنے والی تحریر۔ بالکل فرصت سے پڑھنے اور دل تک اتر جانے والی تحریر ہے جو بتاتی ہے کہ محبت ایسی بھی ہوتی ہے اور زندگی ایسے بھی رنگ دکھاتی ہے۔ سفر در سفر پہ ماخوذ

راحت جبین "سبز رتوں کا پہلا پھول" "زرد موسم" "تتلیاں پھول اور خوشبو" اور "اے وقت گواہی دے" اور۔۔۔ اور۔۔۔

فائزہ افتخار کا "کی جاناں میں کون" اور اب "شاید" فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" صائمہ بشیر کا "توبہ" میمونہ صدف کا "گرامی منش" بشریٰ سعید کا "سفال گر" اور "اماوس کا چاند" سمیرا طور شریف، عارفہ رباب، فرحت اشتیاق (میں انہیں کیسے فراموش کردوں) سعدیہ راجپوت (اب واپس آجائیں کہاں کھو گئی ہیں۔۔۔ "عشق آتش" مدتوں یاد رکھی جانے والی تحریر ہے ان مٹ) صبا سحر، نادیہ احمد، نادیہ جہانگیر اور ثوبیہ جہانگیر (یہ وہ کردار ہے جس کا بے شک دنیا میں حصہ کم رہا مگر انہیں میں نے ہمیشہ یاد رکھا) نادیہ جہانگیر کے ساتھ قلمی و تحریری ساتھ کے سبب راشدہ

رفعت، آسیہ رزاقی (میرا آپ سے ملنے اور دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے) عالیہ حرا، عالیہ بخاری، ماہا ملک۔۔۔ ف۔۔۔ اف۔۔۔ (دو دفعہ قلم روکنے کی کوشش ناکام)

یہ سوال پڑھ کر ہی میں سمجھ گئی تھی کہ مجھے کچھ نہیں سوچنا پڑے گا ورنہ جھجکتا اور رو ہی ہوتا۔

نبیلہ عزیز، نایاب جیلانی، نگہت سیما، فرحین اظفر (پلیز ردائے وفا میں سے دکھ کو ذرا کم کر دیں۔۔۔ فقط التجا) اور بہت سی مصنفین جنہیں میں لکھ نہیں پائی زندگی کی خوشنما اساس ہیں۔

یہ تو صرف مصنفین کی بات تھی اگر کرداروں پر ہوتی تو۔۔۔

خواتین ڈائجسٹ کے ادب سے ہٹ کر سب سے پہلے جسے پڑھا وہ ابن صفی ہیں ان کے "عمران سیریز" بے حد پڑھے۔ ابن صفی میرے ابو کے بھی پسندیدہ رہے اتنے کہ جاکر مل بھی آئے تھے۔ خوش قسمت۔۔۔

اور پھر نسیم مجازی کا "شاہین" اور اشفاق احمد۔۔۔ جن کا ٹیلی کاسٹ "زاویہ" میں شام میں شوق سے دیکھتی۔ ہلکی پھلکی باتوں میں چھپی ان کی مسحور کن گہرائی۔

ایک دن بھائی نے دو چٹیوں والی لڑکی کو حیرت سے اور کچھ مزاح سے سر پہ ہاتھ مارا۔

"یہ تمہیں سمجھ میں آئے گا۔" لڑکی شرمندہ

"اس میں مشکل کیا۔۔۔"

اب یہ وہی جانتی تھی کہ میتھس کا خشک مضمون ہو یا اکاؤنٹس کی مشکل تھیوری سب مشکل باتیں اور فلسفے۔۔۔ آسان، اور آسان باتیں جس کے سر پر سے گزر جاتی ہیں۔

آخر میں ایک خاص بات کہانیاں معاشرے کی عکاس ہوتی ہیں اور انسانی مزاج کے موسموں کی بھی۔۔۔ جیسے غربت، امیری، جیسے غصہ، نفرت، حسد، محبت، جذباتیت، کفریت، مایوسی، معاشرتی تقسیم انسانوں نے کر دی اور انسانی تقسیم۔۔۔ قدرت نے۔ جس طرح یہ سب بدل نہیں سکتا بالکل ویسے ہی کہانیوں کے رخ اور

اندازِ بیاں بھی بدل نہیں سکتے، ہاں مگر اندازِ بیاں سب کا منفرد۔

اس لیے "عہد الست اور نمل" اپنی جگہ اور "کہسار کی کا گھر، بن مانگی دعا" اور "بھرم" اپنی جگہ اور ویسے بھی لفظ لکھنے والے جانتے ہیں لفظ لکھنے میں جو قیامت ہے۔

5۔ پسندیدہ شعر۔۔۔ آہم۔۔۔ ایک زمانہ تھا کہ جب اکبر الہ آبادی سمیت بہت سے شاعروں کے شعر "ببر شیر" لگا کرتے تھے۔ آپی سے تشریح پوچھا کرتے تھے اور بعد میں فقط اک "سمجھ" نے سارا ماحول بدل دیا۔ اردو کی ٹیچر مس فوزیہ نے کہا تھا "سمیرا آپ کا شعری انداز اور استعمال بہت اچھا ہے۔" کہاں کی نوبت کہاں تک آگئی۔ بس وقت وقت کی بات ہے۔ سب سے پہلے

یہ آسمان محبت پہ کیسی رونق ہے
چمکتا عشق محمد میں ہر ستارا ہے

ابن انشاء پسندیدہ ترین شاعر۔۔۔۔

چاند کسی کا ہو نہیں سکتا، چاند کسی کا ہوتا ہے
چاند کی خاطر ضد نہیں کرتے، اے میرے اچھے انشاء چاند

ان کے علاوہ۔۔۔

ہجر کے ہاتھ میں لوح محفوظ تھی
عشق رکھتا رہا، وہ مٹاتا رہا

اور بصد اصرار شگفتہ اصغر علی (آپی) کے ہاتھ کا لکھا:

مجھے اطفار نار عشق میں جلنے دو
مجھے خاروں پر رقص کرنے دو
لگن کی اگن لگنے دو
ساگر کے آنسو سے موتی بننے دو
مجھے اطفار نار عشق میں جلنے دو

پسندیدہ اقتباس یعنی لفظوں کے مجموعے، جو بہترین و نایاب۔۔۔ نہ جانے کتنی تحریریں گزر گئیں، کتنے ہی لفظ موتی سے ہیرے بن گئے۔ زندگی کی راہیں سلجھا گئے اور نہ جانے کب تک ہم اس سحر کے غلام رہیں گے نئے تازہ میں۔۔۔

عہد الست کا لفظ لفظ چونکا دینے والا تھا۔ معاشی، معاشرتی، ذہنی، گھریلو، روحانوی اور دینی الفاظوں کے ذخیرے میں سے سب سے پہلے جس جملے نے اسیر کیا:

"انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔"

نمرہ احمد کے تحریر کردہ یہ الفاظ ذہن کی ہزاروں کھڑکیوں پہ دستک دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔

"تو بات یہ ہے ایشا کہ سب کے دائیں ہاتھ میں عصا نہیں ہوتا اس کا ٹیلنٹ ہوتا ہے کوئی ہنر یا قیمتی چیز۔" اور "یارم"

"محبت رتن دیپ سے بجی رتھ ہے جس کا سوار ابدیت کی طرف اڑان بھرتا ہے۔"

"محبت وہ کمال ہے جو عرش کو فرش کرتا ہے اور فرش کو عرش تک لے جاتا ہے۔"

اور سب سے بڑھ کر

"جسم سے جان اس وقت نہیں نکلتی جب اپنی جان نکلتی ہے۔ یہ جان اس وقت نکلتی ہے جب جان سے پیارے کی جان نکلتی ہے۔"

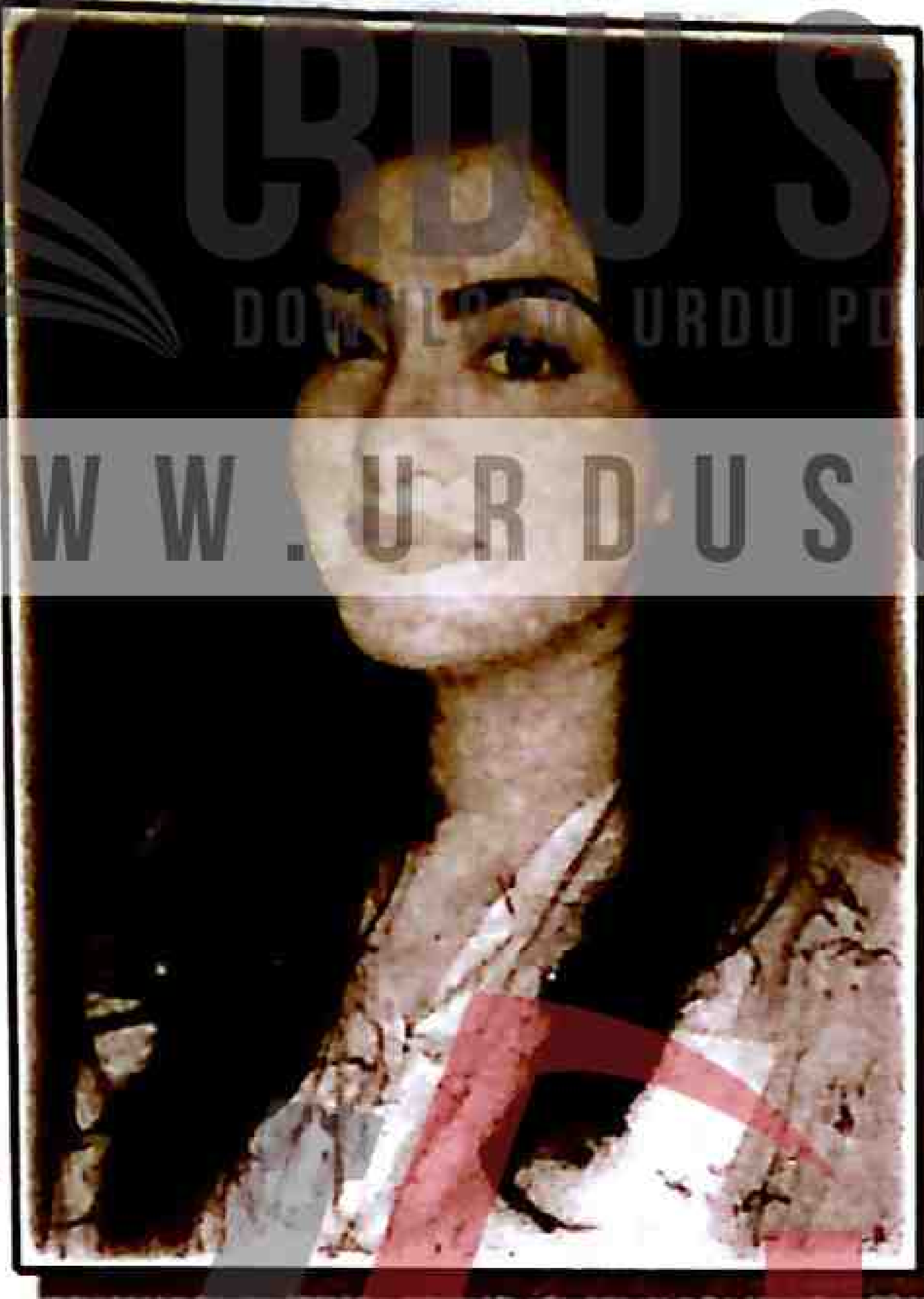
"سیاہ حاشیہ" سے۔۔۔

"کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ انسان کی قسمت میں ان مٹ سیاہی سے لکھ دیتا ہے وہاں پر تدبیر بھی بے بس ہو جاتی ہے ایسے میں اللہ کی رضا میں راضی ہونے میں ہی آسانی اور سکون ہوتا ہے۔" اور۔۔۔۔

"بعض فیصلے آپ سے صرف اللہ کرواتا ہے اور اللہ کے کیے گئے آسمانی فیصلوں کے جواز زمین پر نہیں ڈھونڈا کرتے۔" اپنی تحریر "مظہر الوہیت" سے:

"کیا سزا اور جزا پہ عمل انسان جیسے خطا کے پتلے کے پاس ہے! اگر وہ "جزا" کو مستحق سمجھے تو یہ اس کی خوش فہمی۔۔۔ اور اگر "سزا" کو مستحق سمجھے تو یہ اس کی غلط فہمی۔۔۔ کب، کہاں۔۔۔ کس وقت۔۔۔ سزا، جزا بن جائے اور جزا، سزا بن جائے۔۔۔ تو پھر انسان کو کیا اختیار۔۔۔"





1- "اصلی نام؟"

"علیزے طاہر۔"

2- "پیار کا نام؟"

"لیزا اور علیزو۔"

3- "تاریخ پیدائش/شہر؟"

"8 دسمبر/1993ء۔"

4- "قد/ستارہ؟"

"5 فٹ 4 انچ/Sagittarius(قوس)۔"

5- "مادری زبان؟"

"پنجابی۔"

6- "بہن بھائی؟"

"تین بہنیں ایک بھائی۔"

7- "تعلیمی قابلیت؟"

"ماسٹرز ان انٹرنیشنل ریلیشن۔"

ٹی وی فنکارہ

باتیں علیزے طاہر سے

شاہین رشید

8- "شادی؟"

"نہیں ہوئی.... لیکن شادی ضرور ہونی چاہیے۔"

9- "فیلڈ میں متعارف کرانے کا سہرا؟"

"اپنی محنت سے آئی ہوں۔"

10- "آپ کی فیملی میں کوئی اور اس فیلڈ میں ہے؟"

"نہیں جی، صرف میں ہی ہوں۔"

11- "گھر والے خوش ہیں؟"

"جی بہت، کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا میرے اس فیلڈ میں آنے پر۔"

12- "بڑی ہو کر کیا بننا چاہتی تھیں؟"

"اعلا تعلیم یافتہ اور اداکارہ ہی بننا چاہتی تھی۔"

13- "صبح سویرے اٹھ جاتی ہیں؟"

"جی.... جس دن شوٹ پہ جانا ہوتا ہے اس دن جلدی اٹھ جاتی ہوں۔"

14- "اٹھتے ہی دل چاہتا ہے کہ؟"

"نہیں کسی چیز کا دل نہیں چاہتا۔"

15- "آپ کے آن ایئر ڈرامے؟"

"جیو سے "میری سہیلی میری بھابھی۔" اور ایکسپریس سے "جب تک عشق نہیں ہوتا۔""

16- "گھر کے کاموں سے دلچسپی؟"

"بہت کم۔"

17- "کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"چائنیز۔"

18- "پسندیدہ تہوار؟"

"کوئی نہیں۔"

19- "تھکن میں کہاں جانا چاہتی ہیں؟"

"صرف اور صرف اپنے بیڈ پر۔"

20- "آپ اداس ہو جاتی ہیں؟"

"جی.... بالکل ہو جاتی ہوں اور میرے خیال میں سب ہی

اداس ہوتے ہوں گے۔"

21۔ "رونا آتا ہے؟"

"جب اداس ہوتی ہوں تو رونا آتا ہے اور ضرور آتا ہے۔"

22۔ "ضدی ہیں؟"

"جی... ہوں... مگر زیادہ نہیں۔"

23۔ "بچپن کی بری عادت جو اب بھی ہے؟"

"جی... نخرے دکھانا۔"

24۔ "غصہ کب آتا ہے؟"

"ہر غلط بات پر۔"

25۔ "غصے میں رد عمل؟"

"جس پر غصہ آتا ہے اس پہ غصہ اتار کر پھر نارمل ہو جاتی ہوں۔"

26۔ "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"کسی کے غصے سے نہیں... کیونکہ کسی کا غصہ تیز نہیں ہے۔"

27۔ "لڑکوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"کہ وہ کسی سے جیلس نہیں ہوتے... لڑکیوں کی طرح"

28۔ "فضول خرچ ہیں؟"

"ہاں جی... اور شاپنگ پہ بہت خرچ کرتی ہوں۔"

29۔ "شاپنگ میں پہلی ترجیح؟"

"کپڑے بنانا، شوز لینا اور ہینڈ بیگ میری پہلی ترجیح ہوتے ہیں۔"

30۔ "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"جس جھوٹ سے کسی کو نقصان نہ ہو اس وقت بولتی ہوں۔"

31۔ "آپ کی کوئی ایکسٹرا اصلاحیت؟"

"جی میں پینٹنگ بہت اچھی کر لیتی ہوں۔"

32۔ "ایک خواب جو بار بار دیکھتی ہیں؟"

"جی... ایک اچھی آرٹسٹ بننے کا خواب۔"

33۔ "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"جی واقعی اندھی ہوتی ہے۔"

34۔ "آپ کے بیگ کی تلاشی لی جائے تو؟"

"تو اس میں سے موبائل فون... چارجر، میک اپ اور پرفیوم نکلے گا۔"

35۔ "شادی کی پسندیدہ رسم؟"

"کوئی نہیں... سادگی پسند ہوں۔"

36۔ "بدلہ لیتی ہیں؟"

"نہیں اللہ پہ سب کچھ چھوڑ دیتی ہوں۔"

37۔ "گھر آکر پہلی خواہش؟"

"اچھا اور مزیدار کھانا مل جائے اور پھر میں سو جاؤں، یہ ہے میری پہلی خواہش۔"

38۔ "اپنے ڈراموں میں آپ کا پسندیدہ ڈراما؟"

"میرا درد نہ جانے کوئی۔"

39۔ "تحفہ دینا پسند ہے یا کیش؟"

"تحفہ دینا پسند ہے۔"

40۔ "کھانے کی ٹیبل پہ کیا ہونا ضروری ہے؟"

"سلاد۔"

41۔ "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ 'چٹائی' اپنا بیڈ یا ڈائننگ ٹیبل؟"

"اپنا بیڈ۔"

42۔ "لوگ مل کر کیا فرمائش کرتے ہیں آپ سے؟"

"تصاویر بنوانے کی۔"

43۔ "کس قسم کے کردار کرنا چاہتی ہیں؟"

"ہر وہ کردار جو کرنے میں مزہ آئے... جو مجھے ذاتی طور پر پسند آئے۔"

44۔ "کیا کیا چیزیں لے کر گھر سے نکلتی ہیں؟"

"موبائل اور پیسے... ان کے بغیر تو گزارا ہی نہیں ہے۔"

45۔ "گھر میں کوئی ناراض ہو تو؟"

"تو بے سکون ہو جاتی ہوں اور پھر منا لیتی ہوں۔"

46۔ "بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے؟"

"نہیں جی... اتنی آسانی سے نہیں آتی۔"

47۔ "فیوچر پلاننگ؟"

"شادی کروں گی مگر اپنا کیریئر بھی ضرور بناؤں گی۔"

48۔ "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"
"سو کر یا پھر ٹی وی پہ کوئی اچھا سا پروگرام دیکھ کر۔"
49۔ "گھر کا کون سا کمرہ پسند ہے؟"
"اپنا۔ سکون ملتا ہے۔"
50۔ "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"اپنی بیسٹ فرینڈ کے۔"
51۔ "موبائل نمبر جلدی جلدی بدلتی ہیں یا۔۔۔؟"
"نہیں بدلتی۔"
52۔ "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"
"کبھی کبھی۔"
53۔ "لڑکوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"
"فلرٹ کرنا۔"
54۔ "اپنی کمائی سے اپنے لیے کیا قیمتی چیز خریدی؟"
"گھڑی۔"
55۔ "پیسہ کس شکل میں محفوظ کرتی ہیں؟"
"بنک میں جمع کرا کے۔"
56۔ "دیسی کھانے پسند ہیں یا کانٹی نینٹل؟"
"دیسی تو پسند ہیں ہی۔ مگر چائنیز بہت پسند ہیں۔"
57۔ "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"بہت زیادہ۔"
58۔ "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"میری بات میں جب کوئی بولے تو برا لگتا ہے۔"
59۔ "پسندیدہ لباس؟"
"جینز۔"
60۔ "آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟"
"اچھی کہہ لیں یا بری۔ میں نخرے بہت کرتی ہوں۔"
61۔ "اچھی اور بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتی ہیں؟"
"اپنی امی کو۔"
62۔ "اپنے آپ میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟"
"میں اپنے آپ میں کوئی چینج نہیں لانا چاہتی، کسی کو مجھے

پسند کرنا ہے تو ایسے ہی کرے۔"

63۔ "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"

"یورپ۔"

64۔ "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"تو بہت غصہ آتا ہے۔"

65۔ "لڑکی ذہین ہونی چاہیے یا حسین؟"

"دونوں۔"

66۔ "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"

"میں... میں دونوں کی سنتی ہوں۔ پھر فیصلہ کسی ایک کا مانتی ہوں۔"

67۔ "اپنی جسمانی ساخت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں... اللہ نے جیسا بنایا ہے اس پر بہت خوش ہوں۔"

68۔ "کس سین کو کرنے میں مشکل ہوتی ہے؟"

"جس میں مشکل ہوتی ہے اس کے لیے بہت ریہرسل کرتی ہوں کسی خاص سین کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

69۔ "اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے؟"

"میں سینئرز سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔"

70۔ "شاپنگ کے لیے بہترین جگہ؟"

"جہاں سے اچھی چیزیں مل جائیں۔ کوئی خاص جگہ نہیں ہے۔"

71۔ "ماڈلنگ اور فلم کی؟"

"ابھی تو صرف ڈراما کر رہی ہوں۔"

72۔ "آپ اکثر سوچتی ہیں کہ؟"

"کہ کاش میں پوری دنیا گھوم سکتی۔"

73۔ "بات دل میں رکھتی ہیں یا بول دیتی ہیں؟"

"نہیں دل میں نہیں رکھتی، بول دیتی ہوں۔ فورا"۔"

74۔ "آئینہ دیکھ کر سوچتی ہیں؟"

"کچھ نہیں سوچتی۔"

75۔ "شوبز میں جگہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ؟"

"کہ آپ بہت محنت کریں۔ محنت ضروری ہے۔"

76۔ "شاپنگ کے لیے کتنی رقم لے کر نکلتی ہیں؟"

"اے ٹی ایم کارڈ لے کر جاتی ہوں۔"

77۔ "کب پراؤڈ فیل کرتی ہیں؟"

"جب کوئی تعریف کرے، کوئی حوصلہ افزائی کرے۔"

78۔ "اگر سیل فون کی سہولت لے لی جائے تو؟"

"نہیں... یہ میرے لیے بہت ضروری ہے۔"

79۔ "عام لوگ آپ سے مل کر کیا کہتے ہیں؟"

"یہی کہ آپ ہمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

80۔ "اگر ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ ملے تو کہاں جائیں گی؟"

"یورپ۔"

81۔ "دو تعلیمی دور کا سب سے اچھا سبجیکٹ؟"

"اسکول کا۔"

82۔ "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"صرف اور صرف امی کے ہاتھ کا۔"

83۔ "دو غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"جی... جی... فورا"۔"

84۔ "پیسہ محنت سے ملتا ہے یا قسمت سے؟"

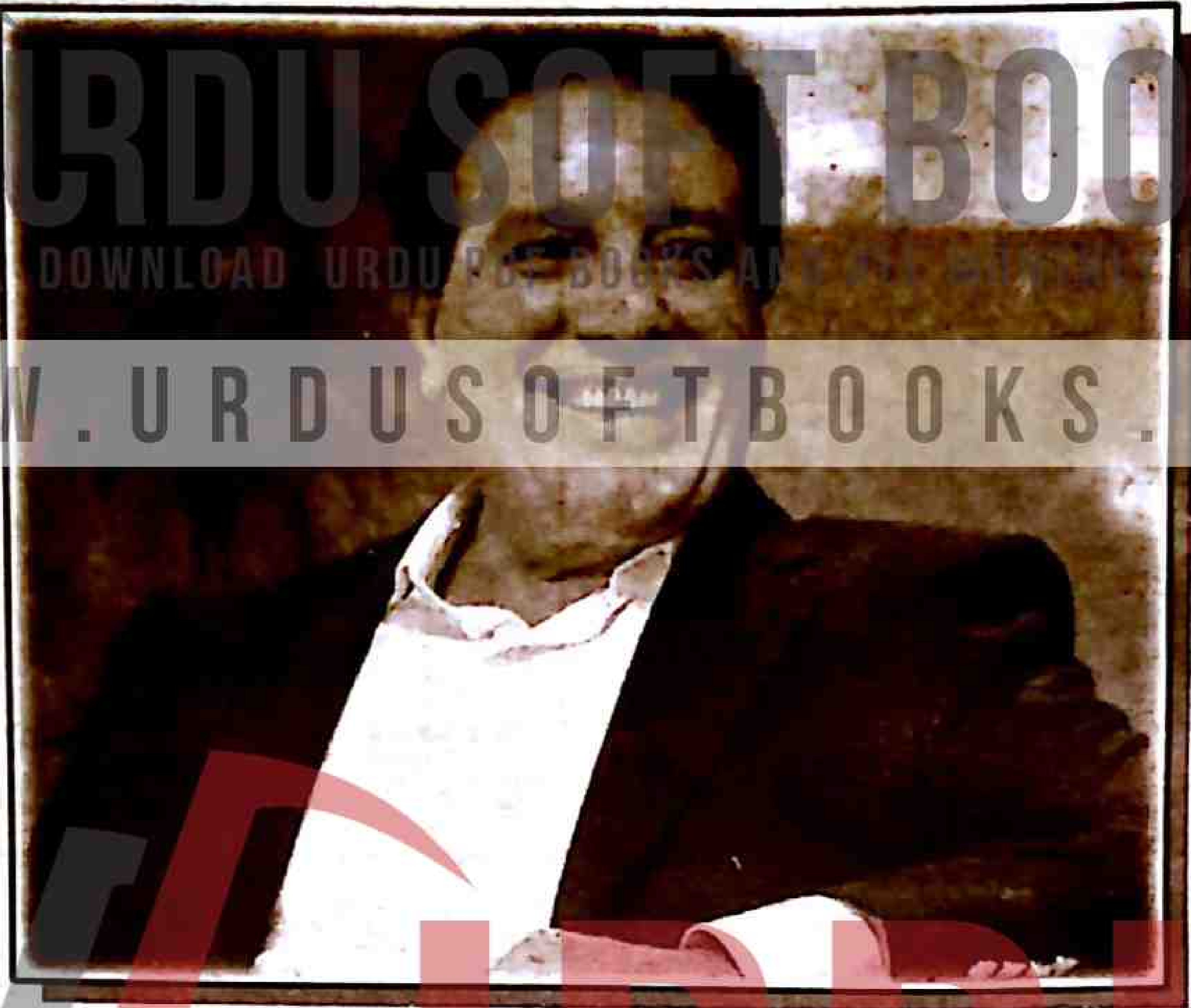
"محنت کے ساتھ ساتھ قسمت کا اچھا ہونا بھی ضروری ہے۔"

85۔ "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

"ہر اچھے دن کا۔"

86۔ "آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"اللہ جو میرے حق میں بہتر سمجھے گا کرے گا۔"



باصلاحیت فنکار

جاوید شیخ سے ملاقات

شاہین رشید

جاوید شیخ کا کیا تعارف کرائیں۔ ایک عالمگیر شہرت یافتہ فنکار' خوب صورت پرسنالٹی کے مالک جو خود تو مقبول ہیں ہی' ان کی پوری فیملی بھی شوبز کے حوالے سے مشہور ہے۔ وہ خواہ ان کی بیٹی مومل شیخ ہوں یا ان کے بیٹے شہزاد شیخ ... شہروز' بہروز سبزواری' سائرہ یوسف' سب ان ہی کی فیملی کا حصہ ہیں۔ اور ان سب کی پہچان (سوائے بہروز سبزواری کو چھوڑ کر) جاوید شیخ ہیں۔ "یہ جاوید شیخ کے بیٹے ہیں" ان کے والد جاوید شیخ ہیں۔ عموماً" لوگوں کا یہی انداز ہوتا ہے تعارف کا...

جب سے "فیس بک" کی دنیا آباد ہوئی ہے' لوگوں کو سرچ کرنا اور سرچ کرکے باتیں کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے... مگر ہماری تو ان سے جان پہچان اور بات چیت ہے۔ کچھ سالوں کا گیپ پڑا مگر ان کی فیملی سے ہیلو ہائے ہوتی رہی اور ہوتی ہے۔

"جی... جاوید شیخ صاحب کیسے ہیں؟"

"الحمد للہ۔"

"میں آپ کو یاد ہوں؟"

"ارے آپ کیسے نہیں یاد ہوں گی' کافی ملاقاتیں رہیں انٹرویوز کے حوالے سے... اور پھر بچوں سے تو آپ کی بات ہوتی ہی رہتی ہے۔"

"جی... جی بالکل... اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"بس ہم فنکاروں کی مصروفیات تو ٹی وی اور فلم سے متعلق ہوتی ہیں۔ ڈرامے بھی چل رہے ہیں اور فلمیں بھی... بس اللہ کا کرم ہے۔"

ڈیولپ ہو رہا ہے اس کو نہ صرف برقرار رکھنا ہے بلکہ اسے مزید بہتر بھی کرنا ہے۔ ہم کافی حد تک سینما کی رونقیں بحال کرنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ہم نے بہت بُرا وقت دیکھا ہے۔ انڈسٹری کا۔ اب ان شاء اللہ ہم آگے کی طرف بڑھیں گے۔"

"آپ کے بچوں نے بھی اس فیلڈ میں کافی نام کمایا ہے، فلموں کے لیے آپ کی ان سے کیا امیدیں ہیں؟"

"مومل شیخ نے انڈیا کی فلم میں میرے ساتھ کام کیا ہے۔ مزید میں وہ کرے گی یا نہیں یہ اس کے میاں پر منحصر ہے۔ اگر اس نے اجازت دی تو ضرور کرے گی۔ شہزاد آج کل ڈراموں میں مصروف ہے۔ اسے اچھی آفرز آئیں تو وہ بھی ضرور کرے گا۔ جس فلم کا میں ذکر کر رہا ہوں مومل کے ساتھ۔ اس میں میں نے مومل کے سسر کا رول کیا ہے۔"

"گزرے زمانے کی فلموں اور آج کے زمانے کی فلموں میں نمایاں فرق کیا دیکھتے ہیں آپ؟"

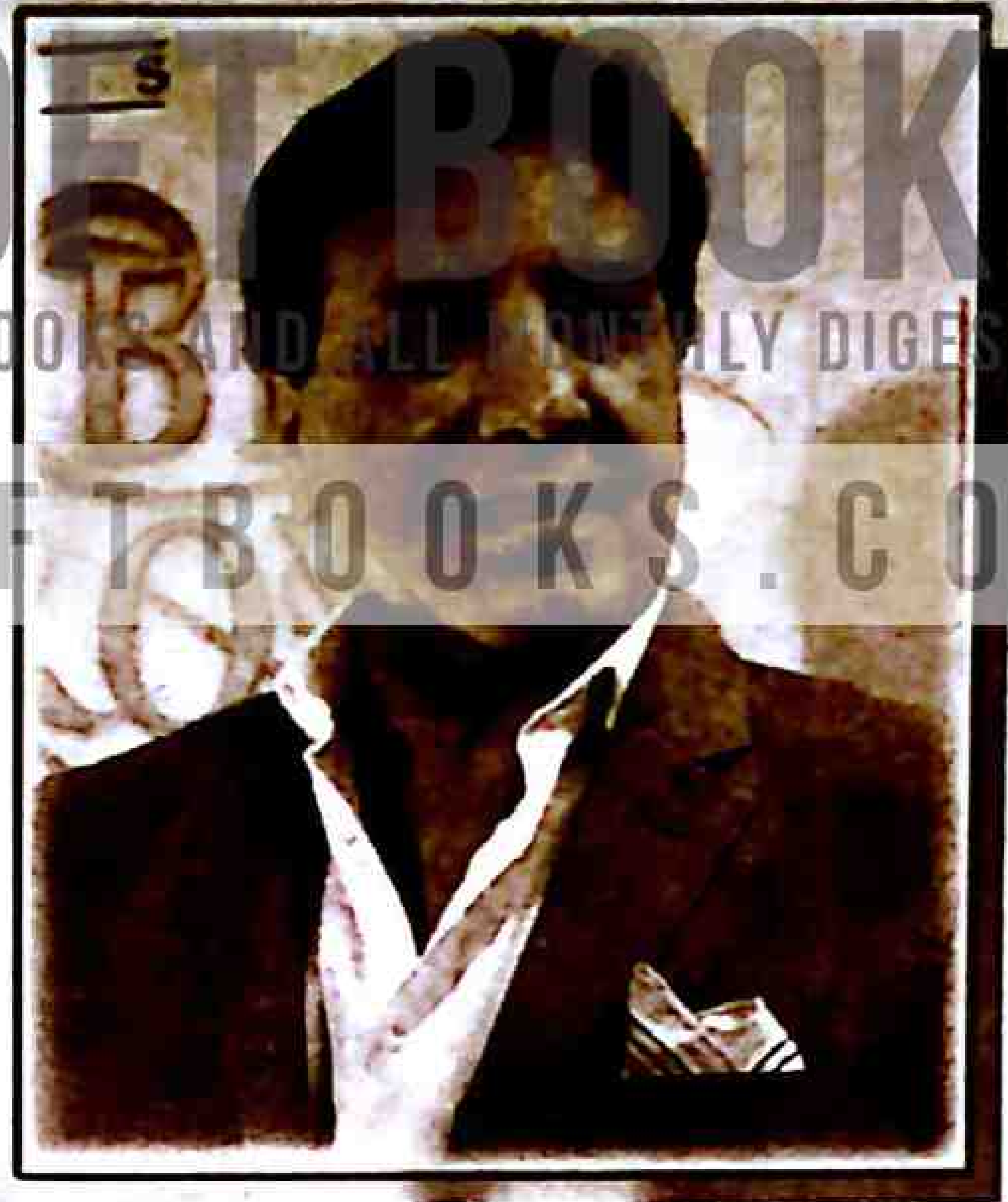
"کیا موازنہ کریں، فرق نمایاں ہے۔ ہر شعبہ بہترین تھا خواہ ڈائریکٹر کا ہو، پروڈیوسر ہو یا رائٹر۔ تب ہی تو اس کا عروج تھا اور ہماری موجودہ فلم انڈسٹری نے تو ابھی جنم لیا ہے۔ اس لیے ٹائم تو لگے گا۔"

"اپنی فلم انڈسٹری کی کامیابی کے بعد کیا ہمیں بھارتی فلموں کی نمائش پر پابندی لگا دینی چاہیے؟"

"ارے نہیں.... کیوں پابندی لگا دیں۔ بھارتی فلموں کی پابندی ہمارے مسائل کا حل تو نہیں ہے۔ ہمیں اپنی فلموں کے لیے بہت سنجیدگی سے کام کرنا ہے تاکہ لوگوں کا رجحان خود بخود ہماری فلم انڈسٹری کی طرف راغب ہو۔"

"کہتے ہیں کہ فلم فنکاروں کی ٹیم الگ ہو اور ٹی وی ڈراموں کی الگ۔ یہ ہمارے ایک ٹی وی کے ہیرو نے کہا.... آپ کیا کہتے ہیں؟"

"اچھا.... مگر میرے نزدیک مکمل فنکار وہ ہی ہوتا ہے جو اداکاری کے ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا



"اب تو خیر ہماری فلموں کا ریوائیول ہوا ہے اور ایک زمانے میں ہماری فلمیں بھی بہت عمدہ ہوا کرتی تھیں، پھر اچانک ہی زوال آیا۔ اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟"

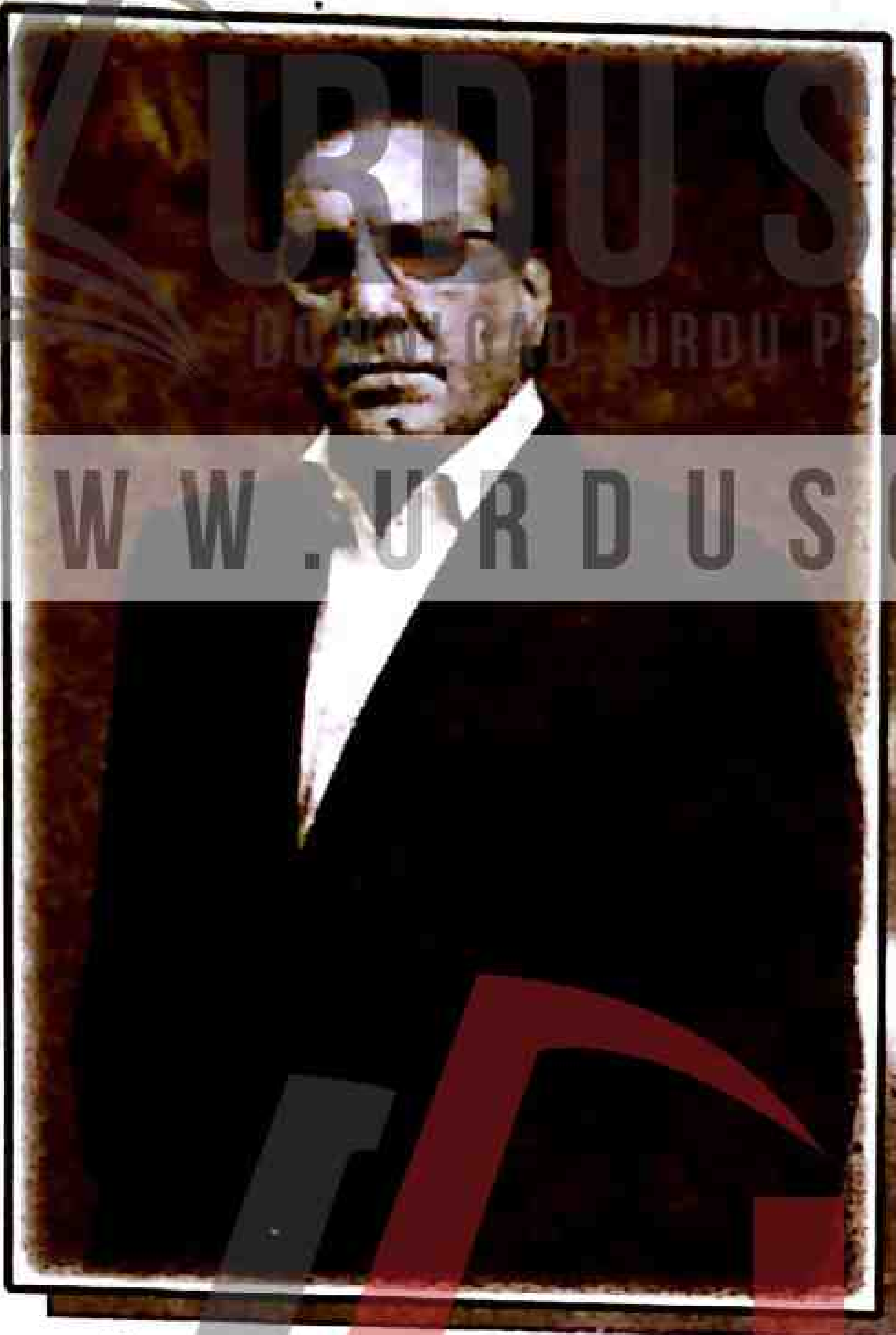
"دیکھیں جی.... چیزیں ہوں یا انسان.... اگر آپ اپنے آپ کو وقت کے ساتھ اپ ڈیٹ نہیں کریں گے تو پیچھے رہ جائیں گے۔ اور فلم انڈسٹری کے زوال کی وجہ بھی یہی تھی۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی مگر ہم نے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی اور اس پرانے نظام کے تحت چلتے رہے.... تو زوال تو آنا ہی تھا۔"

"زیادہ کس شعبے میں زوال آیا؟"

"کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ پوری فلم انڈسٹری زوال کا شکار ہوئی۔ جدید ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے ہم نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز بدل گئی ہے تو ہمیں بھی بدلنا چاہیے تھا۔ بہرحال اب اچھی فلمیں بن رہی ہیں تو امید ہے کہ مزید اچھی فلمیں بھی بنیں گی۔"

"اب کیا امیدیں ہیں آپ کو؟"

"اب تو خیر بہت امیدیں ہیں اور اب ہماری انڈسٹری کامیابی کی طرف بھی جا رہی ہے اور جو معیار



منوالیے۔ خواہ وہ تھیٹر ہو، فلم ہو یا ٹی وی کا میڈیا اور آپ نے دیکھا ہو گا کہ فلم میں زیادہ تر وہی فنکار کام کر رہے ہیں جو ٹی وی کے نامور آرٹسٹ کہلاتے ہیں اور انہیں فلم کے شائقین نے فلم میں بھی ویلکم کیا ہے۔"

"آپ نے فلم انڈسٹری میں اس وقت نام کمایا جب ہماری فلم انڈسٹری عروج پر تھی۔ کتنی مشکلات جھیلنے کے بعد مقام پایا؟"

"ہر نئے کام میں جگہ بنانے کے لیے بہت زیادہ محنت درکار ہوتی ہے اور جب میں فلم انڈسٹری میں آیا تو مجھے کسی ایک ہیرو کا مقابلہ نہیں کرنا تھا بلکہ ماشاء اللہ اس وقت جتنے بھی ہیرو کام کر رہے تھے' وہ سب ہی فلم کے شائقین کے پسندیدہ ترین ہیروز تھے۔ مگر پھر بھی مجھے ویلکم کیا گیا۔ ان ہیروز کی موجودگی میں کچھ فلمیں ہٹ نہ ہو سکیں میری مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور لگا رہا.... اور آخر کار رب نے میری سن لی اور مجھے عزت دی۔"

"سب آپ سے تعاون کرتے تھے؟"

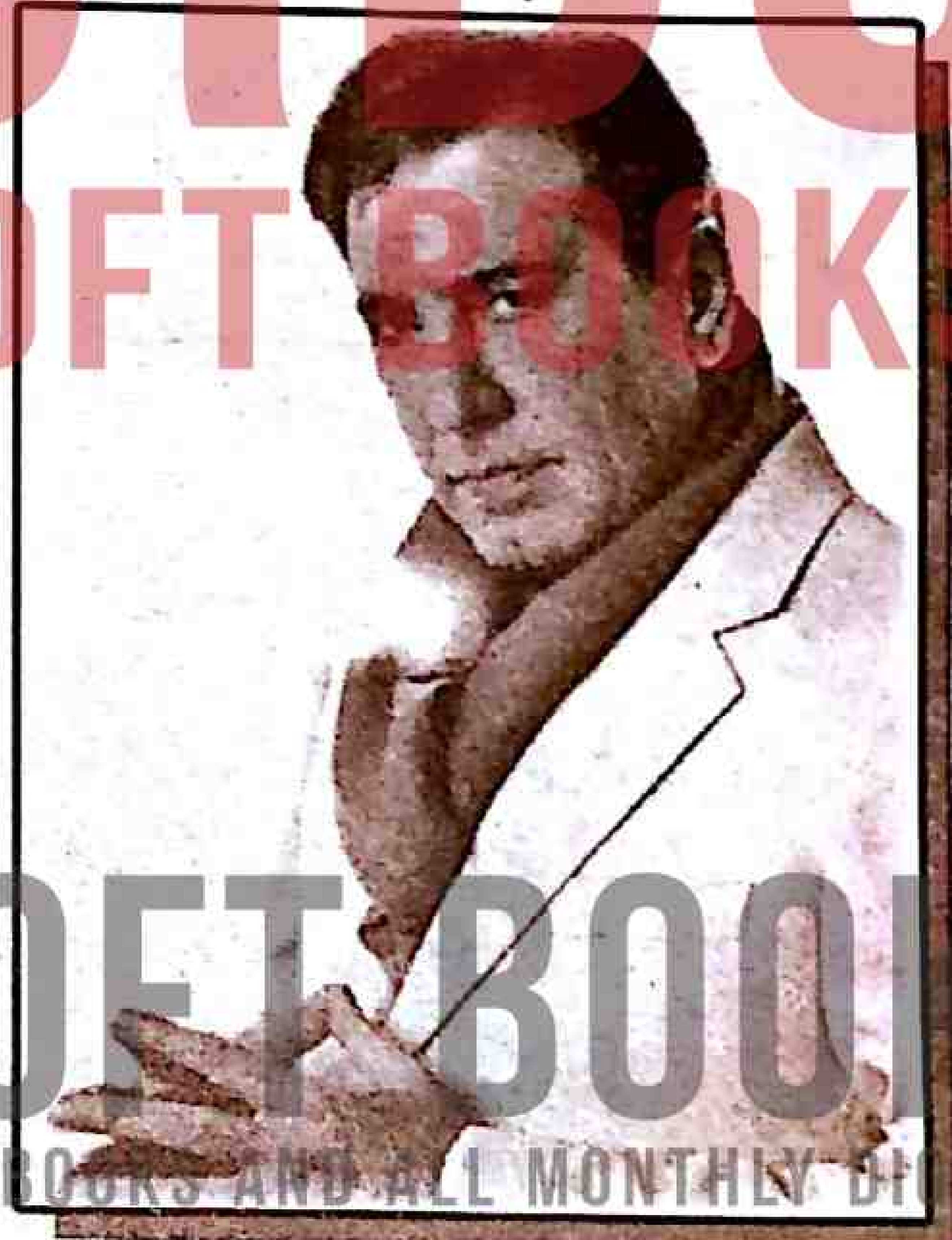
"بالکل کرتے تھے۔ اگر اس وقت کے سینئرز میری حوصلہ افزائی نہ کرتے تو بھلا میں اس انڈسٹری میں کیسے کامیاب ہوتا.... مگر سچ تو یہ ہے کہ سب کچھ "تھالی میں رکھ کر" نہیں ملا محنت بہت کرنا پڑی۔ میری پہلی فلم "شبنم" کے ساتھ تھی جس کا بڑا نام تھا اور یہ بات ہے 1983ء کی۔ فلم کا نام تھا "کبھی الوداع نہ کہنا۔"

"بچوں کے بچپن کے کچھ اور خواب ہوتے ہیں.... کیا آپ کا یہی خواب تھا؟"

"بالکل یہی خواب تھا.... کیونکہ فلمیں اور ڈرامے بچپن سے ہی دیکھ رہا تھا تو ان سب سے متاثر بھی بہت تھا.... بس پھر یہی سوچ لیا کہ آنا ہے تو اسی فیلڈ میں.... نام کمانا ہے تو اسی فیلڈ میں.... اور پھر اداکار بننے کا خواب لے کر کراچی آ گیا۔"

"آپ اپنی نوجوانی سے بہت گڈ لکنگ رہے ہیں شوبز میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے ہوں گے؟"

ہنستے ہوئے.... "اس فیلڈ میں صرف شکل نہیں دیکھی جاتی.... اللہ نے مجھے قد کاٹھ' شکل' آواز سب ہی کچھ نوازا تھا.... مگر آپ یقین کریں کہ ریڈیو' ٹی وی



اور فلم تینوں جگہوں پر جگہ بنانے کے لیے بہت محنت کی ٹھوکریں بھی کھائیں باتیں بھی سنیں۔۔۔ مگر امید کا دامن نہیں چھوڑا۔۔۔ اور نہ ہی ہمت چھوڑی۔

"متاثر کس سے ہوئے تھے؟"

"متاثر تو میں بہت سے لوگوں سے ہوا تھا۔ بہت سے فنکاروں سے ہوا تھا۔ مگر محمد علی صاحب کی شخصیت نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان کی اداکاری اور ان کی پرسنالٹی مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور ایک لحاظ سے وہ میرے آئیڈیل تھے۔۔۔ اتنا زمانہ گزر گیا آج بھی لوگ محمد علی صاحب اور وحید مراد کے گرویدہ ہیں۔"

"فلم پہ تو بہت باتیں ہو گئیں۔۔۔ اپنے ڈراموں کے لیے آپ کیا کہیں گے؟"

"اپنے ڈرامے بہترین ہوتے ہیں۔۔۔ آج سے نہیں شروع دن سے۔"

"بالکل۔۔۔ کیا وجہ ہے کہ ڈرامے بے حد کامیاب اور فلم۔۔۔؟"

"دیکھیں دونوں میڈیم میں بہت فرق ہے۔۔۔ اور ہمارے ڈراموں کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ بہترین کہانیاں اور عمدہ پروڈکشن اور ڈائریکشن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ڈرامے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔"

"پڑوسی ممالک میں خاص طور پر انڈیا میں تو ہمارے ڈرامے ہمیشہ سے ہی پسند کیے جاتے ہیں؟"



"جی ہاں۔۔۔ اس لیے کہ ہمارے ڈرامے انڈیا کے ڈراموں سے بہت مختلف اور بہت منفرد ہوتے ہیں۔۔۔ نہ صرف ہمارے ڈراموں کو پسند کیا جاتا ہے بلکہ ہمارے فنکاروں کو بھی۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ٹی وی کے فنکار ان کی فلموں کے ہیرو ہیروئن ہوتے ہیں۔"

"آج کے ڈراموں کے لیے کہا جاتا ہے کہ معیار میں کمی آ گئی ہے۔ آپ کیا کہیں گے؟"

"نہ کبھی کوئی چیز مسلسل کامیاب ہوتی ہے اور نہ ہی مسلسل ناکام۔ جب اتنے ڈرامے 'سیریلز اور ٹیلی فلمز بنیں گی تو سو فیصد نہ کامیاب ہوں گے نہ سو فیصد ناکام۔۔۔ تو اتار چڑھاؤ تو رہتا ہے۔"

"نئے ٹیلنٹ کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"ہمارا ملک باصلاحیت افراد سے بھرا پڑا ہے۔ ماشاء اللہ اور صرف شوبز میں نہیں بلکہ ہمارے ہر شعبے میں باصلاحیت افراد کی کمی نہیں ہے۔ اس میڈیا میں تو بہت اچھا' قابل اور پڑھا لکھا ٹیلنٹ آیا ہے۔ جنہوں نے اپنے آپ کو منوایا ہے۔"

"کچھ یاد ہے کہ آپ نے کتنی فلموں میں کام کیا ہو گا؟"

"یہی کوئی 130 یا 140 تو ہوں گی ہی۔۔۔"

"اور جو مقبول ہوئیں؟"

"ارے۔۔۔ جو نام آپ کو یاد ہوں لکھ لیں۔۔۔ میرے حساب سے تو مجھے ہر فلم میں کامیابی ملی ہے۔۔۔ اور ابھی کچھ ہی عرصہ قبل "رانگ نمبر" "میں ہوں شاہد آفریدی" "نا معلوم افراد" "دبن روئے" "کراچی سے لاہور تک" "جوانی پھر نہیں آنی" "ہلا گلا" سب ہی ہٹ گئی ہیں۔"

"آپ فلم اور ٹی وی دونوں میں ہی یکساں مقبول ہیں۔ کبھی اپنی کامیابیوں پر غرور ہوا؟"

"اگر غرور کرتا تو شاید آج اس مقام پر نہ ہوتا۔۔۔ مجھے تو اپنی کامیابیوں پر فخر ہوتا ہے۔"

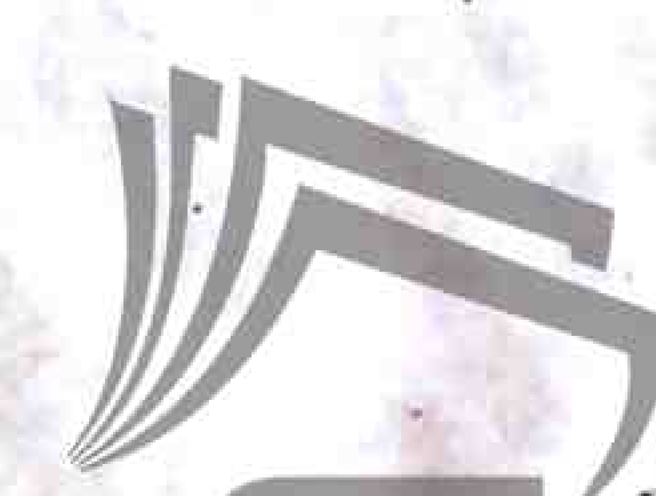
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔





مرحبا
SINCE 1979
قدرت کی حکمت
اصلی فارمولا
100% نیچرل
100% ہیلتھ
نزلہ، زکام، فلو، بخار، کھانسی اور گلے کی سوزش کے لیے مفید و مؤثر
مرحبا جوشاندہ







آمنہ ریاض



دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی۔۔۔ ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔

معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں تین بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہجہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں عرف مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن ای اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن ای خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

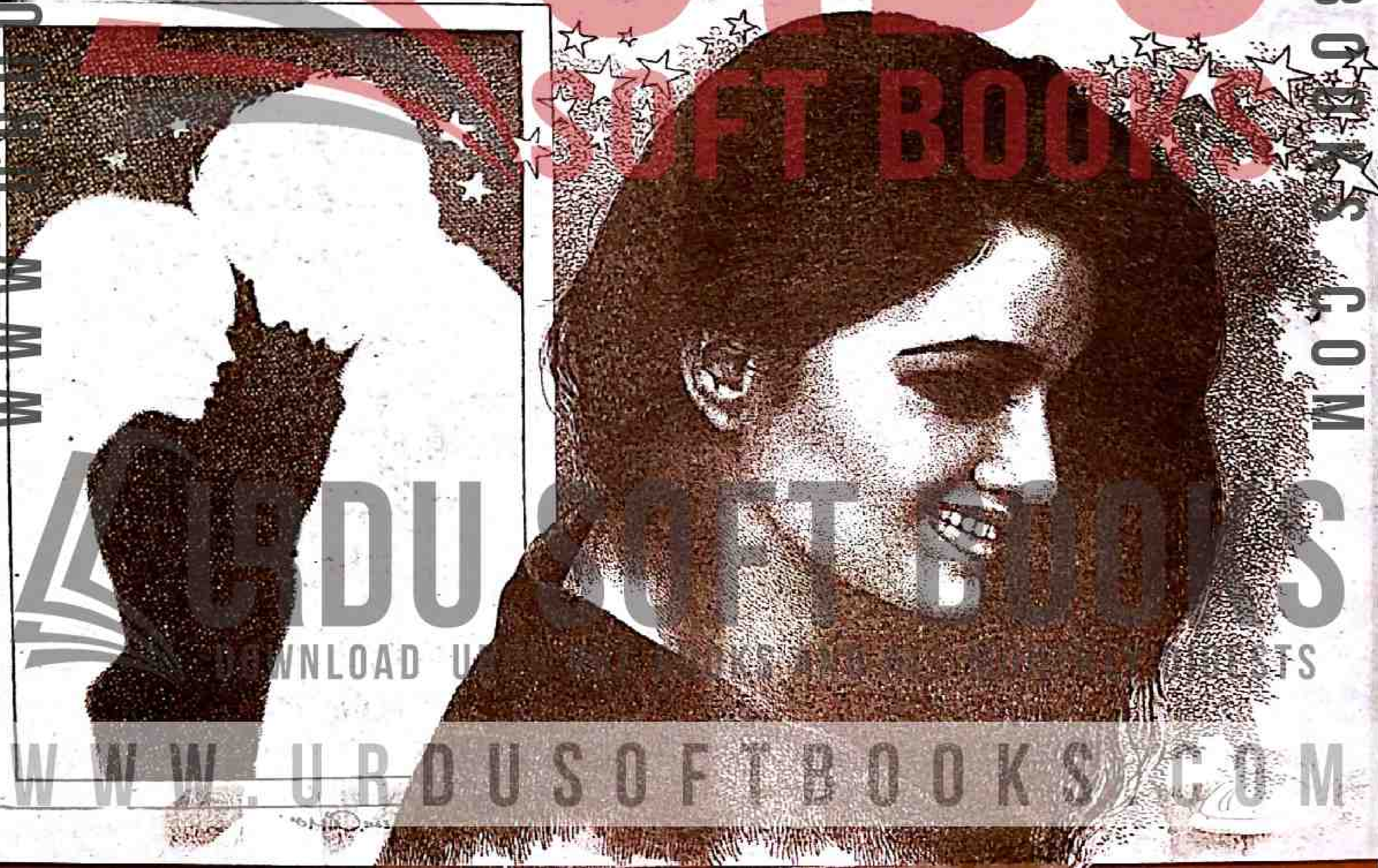
کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور فیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

دسویں قسط

سہ پہر کار کار کا سا وقت تھا۔

پوری فضل منزل جاتی گرمیوں کی خنکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پچھلے صحن کی سیڑھیوں میں بیٹھی خوش نصیب نے سر اٹھا کر دیکھا آسمان ابھی بھی سورج کی تپش سے سلگ رہا تھا اور شام کے پرندے شام سے پہلے پہلی پروازیں بھرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اس کے دل کو کچھ ہوا۔ جلدی سے اٹھی۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ٹوٹے ہوئے گھڑے کا پیندا اس قابل ملا کہ پانی بھر کر رکھا جا سکے۔ پولیتھن کی تھیلی میں ۔ چپکے سے وِطے بھائی کا باجرہ بھر لائی اور صحن کی منڈیر پر آزاد پرندوں کے لیے رکھ دیا۔ بے چارے معصوم پرندے۔ کھائی کر اور کچھ نہیں تو دعا ہی دے دیں گے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی اور منہ اٹھائے سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی کہ عقب سے آکر شامیر اس کے بالکل پیچھے رک گیا۔ اس کی نظریں خوش نصیب کے بے ترتیب بالوں پر تھیں، جو کمر تک آتے تھے۔ کالے سیاہ ریشمی اور چمکدار۔ اور



اتنے موٹے کہ لگتا نہیں تھا انہیں مٹھی میں جکڑا جا سکتا ہے۔

وہ بال کم ریشم کے تار زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ خود بخود دل الجھتا تھا ان میں اور ایسا الجھتا تھا کہ پھر سلجھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ وہ دلکش قد کاٹھ کی مالک تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بالکل سیاہ جن پر گھنی پلکوں کا سایہ تھا۔ رنگت گندمی لیکن چمک دار تھی۔ پتا نہیں اسے کسی نے جتایا تھا یا نہیں لیکن مجموعی طور پر وہ خوب صورت چہروں میں شمار ہوتی تھی بشرطیکہ ایسا اول جلول حلیہ بنا کر نہ پھرا کرتی۔ انگلش فلموں کا یہ ہیرو ہماری اس پنجابی مٹیار کا پورا ہی دیوانہ بن چکا ہوتا اگر جو وہ محترمہ تھوڑا سا دھیان اپنے حلیے پر بھی دے لیتیں۔

اس کی گردن کسی راج ہنس کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ جلد بالکل بے داغ اور شفاف۔ شامیر کا دل چاہا چھو کر دیکھے۔ لیکن خوش نصیب سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ جھانپڑ ہی رسید کر دیتی۔ وہ جتنی خوب صورت تھی اس سے چار گنا زیادہ بے وقوف تھی اور اس بے وقوفی کی سب سے بڑی میراث ہے حد سے زیادہ پراعتماد ہونا اور پراعتماد خوش نصیب بھی تھی۔ اور پراعتماد لوگوں کا اعتماد جیتنا مشکل ہوتا ہے سو وہ صبر کرے گا کم سے کم اس وقت تک جس وقت تک وہ اس لڑکی کو اپنا گرویدہ نہیں بنا لیتا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چپکے سے خوش نصیب کے کان کی لو کو چھوا۔ وہ اپنی جھونک میں تھی، تڑپ کر مڑی۔

شامیر خوب صورتی سے مسکرا رہا تھا۔ ”کیا میں نے تمہیں ڈرا دیا؟“

خوش نصیب اپنی سٹپٹاہٹ چھپا کر مسکرا دی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”آسمان پر کیا ڈھونڈا جا رہا ہے؟“ وہ دوسرے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ”کیا قسمت کے ستارے؟“ وہ بات سے بات نکالنے کا فن جانتا تھا۔

”دن میں کسے ستارے مل سکتے ہیں؟“

”مجھے تو مل گئے۔“ اس نے اپنی جادوئی مسکراہٹ سمیت خوش نصیب کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کبھی کسی نے تمہیں بتایا، تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں۔“

فضل منزل پر اترتی شام کے سائے میں وہ اس کے گرد حصار بنانے لگا۔ اپنی آنکھوں سے، اپنی مسکراہٹ سے اور اپنی گفتگو سے۔

”میری آنکھیں؟“ وہ سوچ میں مبتلا ہوئی پھر ایک دم سے بولی۔

”ہاں۔۔۔ کیف اکثر کہتا ہے کہ میری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔ بس مجھے اندھیرے میں نہیں جانا چاہیے۔ کیوں کہ اندھیرے میں میری آنکھیں بلی کی طرح چمکنے لگتی ہیں اور کسی بھی انسان کو ڈرانے کا باعث بن سکتی ہیں۔“ منہ بنا کر بولی۔

شامیر محظوظ ہو کر خوب ہنسا۔

”ویسے یہ کیف۔۔۔ دلچسپ انسان ہے۔“

”کہاں؟“ دوبارہ منہ کا زاویہ بگاڑ کر بولی تھی۔ ”ایک نمبر کا بے کار انسان ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں پتا نہیں اللہ نے اسے کیوں زمین پر بھیج دیا۔“

”تمہیں وہ پسند نہیں ہے؟“

”بالکل نہیں۔“

”اچھا تو۔۔۔ تمہیں کون پسند ہے؟“

وہ جھجک کر خاموش رہی۔

"کیا میں سمجھوں۔ وہ خوش نصیب انسان میں ہو سکتا ہوں؟"
وہ اب بھی خاموش رہی۔ بھلے ہی پھنے خان بنی پھرتی تھی لیکن تھی تو لڑکی ذات۔ ایسے سوال کا جواب دیتے تھوڑا سا لحاظ آہی رہا تھا۔
"تم چپ کیوں ہو۔ ؟کیا میں سمجھوں تم ٹھیک ٹھکل مشرقی لڑکیوں کی طرح شرما رہی ہو؟"
"اس میں کوئی برائی ہے کیا۔ ؟" اسے چڑا کر بات کرنے پر آمادہ کرنا سب سے آسان کام تھا۔ "میرا مطلب ہے مشرقی لڑکی ہونے میں؟"
"یہ میں نے کب کہا؟"
"تم نے ابھی کہا۔" وہ بضد ہوئی۔
"نہیں' میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" وہ سٹپٹا کر بولا۔
"اس سے اچھا تھا تم مجھے برتھ کے جنگلات میں گرمی کی شدت سے لگنے والی آگ کا قصہ سناتے۔" وہ دل ہی دل میں اس کے سٹپٹانے کا مزا لیتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر بولی تھی۔
"برتھ کے جنگلات میں تقریباً" ہر دوسرے سال گرمی کی شدت سے آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ یہ کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں ہے کہ اسے بار بار دہرایا جائے۔" اسے پتا نہیں کیوں خوش نصیب کا ردعمل برا لگا تھا۔
"خیر! تم انجوائے کرو۔ پھر بات کریں گے۔"
"ارے بات تو سنو....." جتنی دیر میں خوش نصیب سمجھ پائی' وہ جا چکا تھا۔
"یہ لو۔ یہ تو ایسے ناراض ہو گیا کہ کیا ہی نئی نویلی دلہنیں ناراض ہوتی ہوں گی۔" اس نے جھنجلا کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اس کے پیچھے دوڑی۔ مرکزی راہداری میں شیرو سے ٹکرا گئی۔ وہ بے چارہ اس حادثے کی تاب نہ لا سکا اور سر کے بل فرش پر گر گیا۔
"آ.... میرا سر!"
"تم کہاں سے آگئے بیچ میں۔" خوش نصیب ذرا جو شرمندہ ہوئی ہو۔ بازو سے کھینچ کر اسے اٹھا کر بٹھایا اور اپنی طرف سے یہ بھی بڑا احسان عظیم کیا تھا ورنہ اسے کوئی ڈر تھوڑی تھا کسی کا۔ آرام سے یونہی اسے گرا اور تڑپتا چھوڑ کر کھسک جاتی۔
"بیچ میں.... ؟" شیرو جو سر پکڑے بری طرح کراہ رہا تھا تڑپ ہی اٹھا۔ "میں کب آیا بیچ میں.... ؟میں تو اچھا بھلا ایک طرف چل رہا تھا آپ ہی آکر خودکش میزائل کی طرح ٹکرائیں۔" رونکھا ہو رہا تھا بے چارہ۔
"کیا مطلب.... ؟کیا مطلب.... ؟یعنی میری غلطی ہے۔" شیرو کے سر پر لگی ہوئی چوٹ کی پروا کیے بغیر اس کا کان اس زور سے مروڑا کہ وہ بے چارہ از سر نو بلبلا اٹھا۔

"آ.... میری غلطی ہے' میری غلطی ہے۔" وہ چلایا۔
"ہوں..... یہ ہوئی نا بات۔" اس نے کان چھوڑ دیا۔
"ایمان سے خوش نصیب باجی! آپ میں اور پاکستان کی پولیس میں رتی بھر بھی فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی بکری کے منہ سے ہاتھی ہونے کا اعتراف کروا سکتے ہیں۔" وہ سر کو بھول کر اب کان سہلا رہا تھا جو بری طرح سرخ ہو رہا تھا اور ایسا محسوس ہو تا تھا تیز آنچ پر دھرا ہو۔
"اچھا بکو مت..... تم تو عرفات ماموں کے ساتھ قصور گئے ہوئے تھے اچانک کہاں سے ٹپک پڑے؟" اس نے جھاڑ کر پوچھا۔

"یہ لو۔ ہم کوئی آم ہیں جو ٹپک پڑیں گے؟" نروٹھے پن سے ٹھنک کر بولا تھا۔ خوش نصیب نے آنکھیں دکھائیں تو جلدی سے بولا۔

"آج صبح ہی واپس آئے ہیں۔ آتے ہی سو گئے تھے۔ تھکن بہت ہو گئی تھی۔"

"ہاں۔ پرانے زمانے کی طرح عرفات ماموں کی گاڑی کے آگے تم جتے ہوئے ہو گے۔ اسی لیے اتنا تھک گئے۔"

شیرو برا ہی مان گیا۔ "آپ مجھے گھوڑا کہہ رہی ہیں یا بیل؟"

"میں کیا پاگل ہوں جو تمہیں ان دو جانوروں سے [illegible] گی۔ بیل تو اچھا خاصا کار آمد جانور ہے جب کہ گھوڑا ۔۔۔ اپنا یہ ساڑھے تین فٹ کا قد دیکھو اور اس کالی سیاہ رنگت پر غور کرو۔ پھر دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کیا تم گھوڑے جیسے عالی شان جانور کہلائے جانے کے قابل ہو؟"

وہ جو منہ کھولے بغور اس کا بیان سن رہا تھا اس بات پر اور بھی برا منا گیا۔ "نہ گھوڑا' نہ بیل۔ تو اس کا مطلب۔ اس کا مطلب آپ مجھے گدھا کہہ رہی ہیں۔ دیکھیں خوش نصیب باجی! میں اچھا خاصا برا مان سکتا ہوں اس بات کا۔"

"لو۔" وہ ٹھٹھا لگانے کے انداز میں ہنسی۔ "اور گدھا تو کب کا برا مان بھی چکا۔"

شیرو نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اپنا غصہ دبوچ دباچ کر دل میں کہیں دھکیلا۔ پاؤں پٹخا اور جاتے جاتے بولا۔ "آپ! آپ خوش نصیب باجی! اتنی بری ہیں۔ اتنی بری ہیں کہ دل دکھاتے ہوئے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سوچتیں۔ اللہ کرے۔" ایک منٹ کو سوچا پھر بولا۔ "اللہ کرے آپ کی شادی کیف بھائی سے ہی ہو جائے۔ لیکن نہیں۔ یہ تو کیف بھائی کے لیے بددعا ہو گئی۔" وہ بے چارہ اپنا غم بھول کر نئی پریشانی میں مبتلا ہوا۔

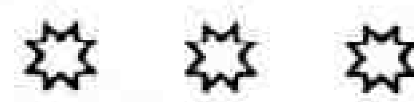
"آئے ہائے۔۔۔ تمہیں اتنی خوش گمانی کب سے ہو گئی کہ تمہاری دی ہوئی بددعا اگلے بندے کو لگ جائے گی؟" تمسخرانہ انداز جیسے کسی بڑی فخر والی بات کا حوالہ دے رہی ہو۔

"دو بھی جا کر منا لیتی اسے۔ تم نے بلی کی طرح راستہ کاٹ کر سارا کام بگاڑ دیا۔" وہ بری طرح جھنجلا رہی تھی۔ "دبھاگ جاؤ اب یہاں سے۔۔۔ ورنہ دعا کر کے تمہاری شادی چمارن کی کانی بیٹی سے کروا دوں گی۔"

شیرو اس بات پر صحیح کا سٹپٹایا اور سر پر پیر رکھ کر دوڑا۔

"عرفات ماموں سے مل لیں۔ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ ان ہی کا پیغام لے کر آیا تھا۔" وہ جاتے جاتے بھی پیغام پہنچا گیا۔

"دپہلے اس سے تو مل لوں جو میرے روشن مستقبل کی چابی ہے۔" وہ اس طرف چل دی جس طرف گیسٹ ہاؤس بنایا گیا تھا اور جو پہلے اس کا اپنا مسکن تھا۔



یار کے غم کو عجب نقش گری آتی ہے
پور پور آنکھ کی مانند بھری جاتی ہے
زندگی کیسے بسر ہو گی کہ ہم کو تابش!
صبر آتا ہے نہ آشفتہ سری آتی ہے

طالب نگر پر اس روز جو شام اتری وہ پچھلی کئی شاموں کے برعکس اداس معلوم ہوتی تھی۔ رکا رکا سا وقت اور ٹھہرا ہوا سا غم۔ آسمان پر بارش کے بعد والے بادلوں کا ملگجا سا اندھیرا اور شام کے پرندوں کی اڑتی ہوئی قطاریں۔ کچھ موسم کا اثر تھا کچھ دل کی دنیا اجڑی تھی۔ آئے گت کی نم ناک آنکھیں ہراں کہی بات کا جواب

تھیں۔ طالب ماموں اور صائقہ ممانی نے تو یوں بھی دل پر صبر کی بھاری سلیں رکھ لی تھیں لیکن ہر بار وسامہ کی یاد آنے پر یہ سلیں جیسے اپنی جگہ سے کھسک جاتی تھیں اور آنکھیں برسنے لگتی تھیں۔ باقی بچا معاویہ۔ وہ سب کو صبر کی تلقین کرتا اور خود کمرے میں چھپ کر رو تا تھا۔ وسامہ سے وابستہ ان تین افراد کو خوش کرنے اور زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے جیسے اس نے ہر ممکن کوشش کرلی تھی۔ وہ انہیں لطیفے سناسنا کر ہنساتا رہتا۔ سیرو تفریح کے نت نئے پلان بناتا۔ انہیں کھانے بنا بنا کر کھلاتا۔ وہ ان تین افراد کو ہنستا ہوا اور خوش دیکھنا چاہتا تھا اور بس۔

اس روز بھی آئے کت کو روتے ہوئے دیکھا تو اس کی کیفیت سمجھنے کے باوجود چڑ ہی گیا۔ "آخر تم رونا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟" اس نے اتنا چڑ کر اور بد تمیزی سے کہا تھا کہ آئے کت کے آنسو لحظہ بھر کو تھم سے گئے۔

"ان آنسوؤں پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔" پھر اس نے رخ موڑ کر کہا۔

"ٹھیک ویسے ہی جیسے وسامہ کی یاد پر میرا اختیار ختم ہو چکا ہے۔"

"ہم میں سے کسی کے دل سے وہ کبھی نہیں نکلے گا لیکن آنسو بہانا ہمیں چھوڑنا ہوگا۔" وہ منت سے بولا جیسے کہہ رہا ہو "اب بس کرو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے معاویہ۔ کم سے کم میرے لیے تو بالکل ممکن نہیں ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں جتنا اسے بھولنے کی کوشش کرتی ہوں وہ اتنا ہی مجھے یاد آتا ہے۔ میں کیا کروں کیسے اسے بھولوں۔"

"تم مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" وہ روہانسا ساہو کر اس کے قدموں میں گیا۔

"میں نے وسامہ سے وعدہ کیا تھا میں تمہارا خیال رکھوں گا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دوں گا۔ تم روتی ہو تو مجھے تکلیف ہوتی ہے آئے کت یا رونا چھوڑ دو یا میرے سامنے آنا چھوڑ دو۔"

آئے کت کی آنسو بہاتی آنکھوں میں جیسے تعجب سا ٹھہر گیا پھر وہاں ایک روشنی کا کوندا لپکا۔

"تم مجھے بشام لے کر جا سکتے ہو معاویہ؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"بشام؟" وہ حیران رہ گیا۔ "بشام جا کر کیا کرو گی۔"

"مجھے فلک جانا ہے۔ پلیز مجھے وہاں لے چلو۔" وہ روتے ہوئے منت سے کہہ رہی تھی۔

"میں تمہیں لے جاؤں گا۔ لیکن تم وہاں کیوں جانا چاہتی ہو؟" وہ الجھ کر پوچھ رہا تھا۔

"میں وہاں اس آسیب کو تلاش کروں گی۔" آئے کت نے ایک دم سے پھٹ پڑنے کے انداز میں کہا تھا۔ "مجھے اس سے پوچھنا ہے وسامہ کی کیا غلطی تھی جو اسے مار دیا۔ وسامہ کو ہم سے چھین کر کیا ملا اس آسیب کو۔" اب وہ پاگلوں کی طرح زور زور سے رونے لگی تھی۔

معاویہ بالکل خاموش ہو گیا۔ دکھ کا زہر بجھا خنجر سیدھا اس کے دل میں اترا تھا۔

"تمہیں یقین ہے فلک بوس میں واقعی کوئی آسیب ہے؟" اس نے الجھ کر پوچھا تھا۔ "تم نے مجھ سے کہا تھا وہ سب وسامہ کا وہم تھا۔ اور تم نے کسی آسیب کی موجودگی کو کبھی محسوس نہیں کیا۔"

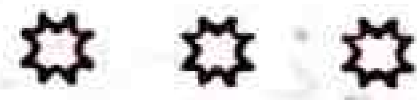
آئے کت بہت رو چکی تھی اس کی آنکھیں اب بوجھل ہو رہی تھیں۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"یہی سچ ہے' فلک بوس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں جذباتی ہو جاتی ہوں تو ایسی باتیں سوچنے لگتی ہوں جو ناممکنات میں سے ہیں۔"

"تو پھر تم وہاں کیوں جانا چاہتی ہو؟" معاویہ گہری سانس بھر کر بولا۔

"وہاں وسامہ کی آخری قیام گاہ ہے۔ میں اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتی ہوں۔ وہاں وسامہ کی یادیں ہیں معاویہ! میں نے وہاں جو وقت وسامہ کے ساتھ گزارا وہ میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ مجھے وہ سرمایا چاہیے۔" اس نے دکھی

لہجے میں کہا تھا۔
معاویہ نے ذرا دیر کے لیے سوچا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔“
بے یقینی آئے کت کی خوب صورت آنکھوں میں جیسے تھم سی گئی۔ ”کیا سچ؟“
”بالکل سچ۔“ وہ مسکراتے ہوئے زمین سے کھڑا ہو گیا۔ ”وسامہ کے لیے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“
اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔ آئے کت نے اس کا ہاتھ دیکھا اور شکر گزاری سے مسکراتی ہوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔
اداس شام آسمان کے کناروں پر چپکے سے ڈوب گئی تھی۔



دروازے کے باہر وہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی سوچتی رہی۔ عزتِ نفس نام کا کیڑا دل ہی دل میں کلبلانے لگا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل اس نے ایک چپت لگائی دل کو اور اس کیڑے کو کان سے پکڑ کر دل کی چار دیواری سے باہر پھینک دیا جو دل کو بھی بغاوت پر اکسا رہا تھا۔ اچھے مستقبل کے لیے بعض اوقات وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جنہیں نہ کرنے کے لیے انسان نے خود سے کئی عہد کیے ہوتے ہیں۔ سو اس نے دل ہی دل میں اپنا کندھا تھپتھپایا اور ہاتھ اٹھا کر دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک ایسے ہی ہوا میں تحلیل ہو گئی جیسے سرف کا بلبلا ہوا میں چند منٹ تیر کر غائب ہو جاتا ہے۔
دوسری مرتبہ دستک دینے سے لے کر ہاتھ باندھ کر انتظار میں کھڑے ہو جانے تک خوش نصیب کے دل کی دھڑکن اس خیال سے تیز ہو چکی تھی کہ اگر اس نے دروازہ کھولا ہی نہیں تو کس قدر سبکی ہو جائے گی۔ لیکن خیر جب وہ دروازہ کھولے گا ہی نہیں تو اسے کیا پتا کس نے کھٹکھٹایا تھا۔ مجھ سے کسی نے پوچھا تو صاف کہہ دوں گی۔ صیام یا طوطا بھائی ہوں گے۔ ان دونوں بہن بھائی کو ہی ایسے دروازوں پر دستک دے کر بھاگ جانے کی ”چھچھوری عادت“ ہے ہنہ۔ میں تو بچپن سے ہی اتنی ڈیسنٹ رہی ہوں مجال ہے جو کبھی کسی کے گھر کی گھنٹی بجا کر بھاگی ہوں۔ ہاں فضیلہ چچی کے دروازے پر پتھر مار کر منظر سے غائب ہو جانا اور صباحت تائی جان کے پیچھے جلتا ہوا پٹاخہ چھوڑ دینا الگ باتیں ہیں۔
ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ سامنے شامیر آرام دہ ٹراؤزر اور ہلکے رنگ کی ٹی شرٹ میں کھڑا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے تولیے سے منہ پونچھ رہا تھا۔
خوش نصیب کو دیکھ کر بس ایک پل کے لیے حیران ہوا تھا۔
”تم یہاں؟“ تولیے سے منہ تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔
”اُف...“ زبان بند کیے خوش نصیب اس ادا پر نثار ہی ہو گئی۔ کیسے اچھے طریقے سے منہ تھپتھپا کر پونچھ رہا تھا۔
ایک وہ زمانے بھر کا جاہل کیف ہے۔ ایسے رگڑ رگڑ کر منہ صاف کرتا ہے جیسے چہرے کے نقوش بھی تولیے سے کھرچ کھرچ کر صاف کر دے گا۔ کیف کی یاد آنے سے خوش نصیب بدمزہ ہی ہو گئی تب جلدی سے سر جھٹک کر اس کی نالائق یاد سے پیچھا چھڑایا اور جلدی سے بولی۔
”وہ میں سوری کہنے آئی تھی؟“ جلدی سے بولی۔
”سوری کس لیے؟“ وہ حیران ہوا۔
”پرتھ کے جنگلات میں لگنے والی آگ کا قصہ جو دہرایا دیا تھا۔“
”نہیں نے پرتھ کے محکمہ جنگلات میں کچھ عرصہ نوکری ضرور کی ہے۔ لیکن ان جنگلات سے ایسی کوئی محبت نہیں ہے مجھے کہ کوئی ان میں لگنے والی آگ کا ذکر کرے اور میں اتنا برا مان جاؤں کہ اسے مجھ سے ایکسکیوز کرنے

کے لیے آنا پڑے۔" وہ ذرا حیران ہو کر بول رہا تھا۔ "اور وہ بھی ایسے وقت میں جب میں کچھ دیر آرام کرنا چاہ رہا تھا۔"

کسکی سے خوش نصیب کی رنگت ماند پڑ گئی۔ بھاڑ میں گیا اچھا مستقبل۔ ایسے نک چڑھے لڑکے سے شادی کرنے کا خواب دیکھنے سے اچھا تھا کہ وہ ساری زندگی کیف کی بیوہ بن کر ہی گزار دیتی۔

"سوری۔۔۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔" بڑی سنجیدگی سے کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑ گئی۔

"لیکن میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ تمہارا اس طرح سے آنا مجھے برا لگا ہے۔" اس نے پیچھے سے آواز لگائی۔ خوش نصیب کے بڑھتے قدم تھم گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ شامیر آنکھوں میں شرارت سموئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"انفیکٹ مجھے اچھا لگا کہ تم کنسرنڈ ہو رہی ہو۔"

"کنسرنڈ تو ہونا ہے۔ مہمان ہو تم ہمارے۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

"مجھے لگا ہم دوست ہیں۔" شامیر نے فوراً" کہا۔

خوش نصیب کا دل چاہا انکار کا لفظ اس کے منہ پر دے مارے لیکن ایک دم سے مصلحت آمیزی نے اس کا دامن پکڑ لیا اور وہ خاموش رہی لیکن سنجیدگی کے ساتھ اور ایسی سنجیدگی جس سے ناراضی جھلکتی تھی۔ اس نے نظریں موڑ لیں۔

شامیر بھی کوئی بچہ نہیں تھا کہ اس کے انداز سمجھ نہ پاتا۔ مسکراہٹ چھپا کر بولا۔ "اچھا چلو۔۔۔ مہمان ہی سہی' چائے پر تو میرا ساتھ دو۔"

خوش نصیب نے سرعت سے اسے دیکھا۔ فوراً" انکار کر دینا چاہتی تھی لیکن اس سے بھی پہلے شامیر بولا۔

"دیکھو انکار مت کرنا' مجھے اکیلے چائے پینے کی عادت نہیں ہے اور اس وقت ایک بہترین چائے ہی میری تھکن اتار سکتی ہے۔" اس کا انداز ایسا منت بھرا اور ایسا دلکش تھا کہ خوش نصیب کا انکار دل کے اندر ہی دم توڑ گیا۔

"میں چائے لاتی ہوں۔" احسان کرنے والے انداز میں کہا لیکن اس سے قبل کہ مڑ کر کچن کا رخ کرتی شامیر نے کہا۔

"یہاں چائے بنائی جا سکتی ہے۔۔۔ سارا سامان موجود ہے۔"

خوش نصیب اس بات پر جتنا حیران ہوتی وہ کم تھا۔ شامیر نے اس کے چہرے پر آمادگی دیکھ کر جلدی سے دروازے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ جھجکی پھر اندر آ گئی۔ اور اندر پہنچ کر جو جھٹکا لگا اس کے بعد تو سنبھلنے میں اسے بہت ہی وقت لگا۔

یہ وہ پورشن تھا جسے ان سے چھین کر گیسٹ روم کی شکل دی گئی تھی۔ خوش نصیب ایک بار یہاں سے ہجرت کر کے گئی تو دوبارہ ناراضی کے اظہار کے طور پر پلٹ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی لیکن آج آ کر پتا چلا اندر کا تو پورا نقشہ ہی بدلا جا چکا تھا۔ ایک بڑے سے ہال نما کمرے کے درمیان میں دیوار اٹھا کر دو کمرے بنا دیے گئے تھے امریکن اسٹائل کا کچن جہاں ضرورت کی تقریباً" ہر چیز نظر آ رہی تھی۔ سٹنگ روم میں ایسے نرم صوفے رکھوائے تھے فضیلہ چچی نے کہ جنہیں دیکھتے ہی خوش نصیب کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔ دل چاہا دادی کے زمانے کا برف توڑنے کا سُوا لے کر آئے اور صوفے پر مار مار کر حشر نشر کر دے۔ دیواروں پر ایسے دیدہ زیب وال پیپرز لگائے گئے تھے کہ نظر پڑتے ہی دل خوش ہو جاتا بشرطیکہ وہ خوش نصیب کا دل نہ ہوتا۔

"آؤ بیٹھو۔" اس کے خیالات سے انجان شامیر نے کہا۔ "آج تم میری مہمان ہو۔۔۔ چائے میں بناتا ہوں۔" وہ

مسکرا کر بولا۔

خوش نصیب نے موتا" بھی اپنی خدمات پیش نہ کیں۔ دل ایسا ہی جل کر خاک ہوا تھا۔ وہ بیٹھ گئی اور جتنی دیر میں شامیر چائے بنا کر لے نہیں آیا وہ دل ہی دل میں تاؤ کھاتی ___ اور ارد گرد کا جائزہ لیتی رہی۔

"مجھے پتا ہوتا، آج چائے پر تم میرا ساتھ دینے والی ہو تو ضرور تمہارے لیے فریش چاکلیٹ چپ کوکیز بیک کرتا۔" شامیر نے خوش نصیب کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

خوش نصیب نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ چہرے پر سے غصہ ختم ہو گیا۔ "تم بیکنگ بھی کر لیتے ہو؟"

"دنیا کا وہ کون سا کام ہے، جو شامیر نہیں کر سکتا۔" اس کا انداز بہت عام تھا۔

"تمہاری پانی کی موٹر کا پمپ کافی دن سے خراب ہے... زحمت نہ ہو تو اسے ٹھیک کر دینا ہمارے پیسے بچ جائیں گے۔" اس نے اتنی سرعت اور سادگی سے کہا تھا کہ شامیر کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

خوش نصیب نے البتہ اپنی ہنسی کو قہقہے میں ڈھلنے نہ دیا۔ شامیر کے سامنے وہ یوں بھی ذرا امپریشن بنا رہی تھی اور منہ کھول کھول کر ہنسنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں... دھرم پورہ کی گلیوں میں کیوں بھٹکتے پھرتے تھے؟" اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"تم پیروں فقیروں کو مانتی ہو خوش نصیب؟" خوش نصیب کے سوال کے جواب میں شامیر نے سوال کیا تھا۔

خوش نصیب چائے کا گھونٹ بھر چکی تھی۔ سوال سن کر ایسا بر اجھٹکا لگا کہ حلق میں پھندا لگتے لگتے رہ گیا۔

"ہہ... ہرگز نہیں لیکن تت تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ اپنی گھبراہٹ چھپا نہیں پائی۔

"یہ جو بیری پیر کا مزار ہے، اسی کی وجہ سے میں بھٹکتا رہا ہوں ان گلیوں میں... تمہیں یاد ہے تم نے پوچھا بھی تھا میں گاڑی کیسے پھنسا لیتا ہوں ان تنگ گلیوں میں..." وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ "دراصل میری ماما بیری پیر کی بہت بڑی معتقد ہیں۔ میں پاکستان آیا تو انہوں نے وعدہ لیا تھا میں جب تک پاکستان میں رہوں گا ہر جمعرات کو مزار پر دیا جلانے جایا کروں گا اور جب تک میرا گھر نہیں بن جاتا، میں مزار کے سائے میں ہی رہوں گا تاکہ بری بلائیں مجھ سے دور رہیں۔" وہ صاف مذاق اڑانے والے انداز میں بتا رہا تھا ایسے جیسے اسے اپنی ماں سے ان تمام باتوں پر سخت اختلاف رہا ہو۔

"اور مزار کے سائے میں تو فضیلہ آنٹی کا گھر تھا ہی سو یہ طے ہوا کہ جب تک میرا گھر مکمل نہیں ہو جائے گا، میں یہیں رہوں گا میرا کوئی اعتقاد نہیں ہے ان پیروں فقیروں پر۔ لیکن اپنی ماما کو میں ناراض نہیں کر سکتا وہ بہت عزیز ہیں مجھے۔"

"اچھی بات ہے... اپنی ماں کسے عزیز نہیں ہوتی میرے بس میں ہوتا تو میں اس پورشن سے کبھی اپنی روشن امی کو نکلنے نہ دیتی یہاں کی ایک ایک چیز کو انہوں نے بڑی محبت سے رکھا ہوا تھا۔ چاہے وہ سیلن زدہ دیواریں ہوں یا بارش سے ٹپکتی ہوئی چھت۔"

وہ یک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں اپنے پورشن سے نکلنا پڑا... بٹ ڈونٹ وری، میں زیادہ دن نہیں رکوں گا۔ میرے گھر کا تھوڑا ہی کام باقی ہے، میں جلد ہی چلا جاؤں گا۔"

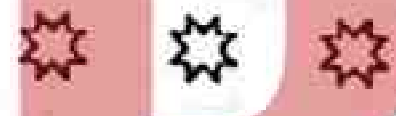
خوش نصیب اس دوران بالکل چپ ہی رہی۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا کہنے کے لیے۔ ایک دم سے دل بڑا بوجھل سا ہو گیا تھا۔ اس نے کپ رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی۔

"چائے کے لیے شکریہ... میں چلتی ہوں اب۔"

"کیا میں نے بہت بری چائے بنائی ہے تم نے آدھی چھوڑ دی۔" اس نے کپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس میرا جائے پینے کا دل نہیں چاہ رہا۔"
"تمہارا موڈ بہت جلد بدلتا ہے۔" وہ الجھ کر کہہ رہا تھا۔
خوش نصیب نے کندھے اچکائے۔ "میں ایسی ہی ہوں۔"
"اور مجھے تم ایسی ہی پسند ہو۔" وہ خوب صورتی سے مسکرانے لگا تھا۔
خوش نصیب کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ وہ جتنی محنت شامیر پر کر رہی تھی' جانتی ہی تھی کہ یہ وقت ضرور آئے گا جب وہ اس سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا ہو گا لیکن اتنی جلدی... اتنی جلدی...؟ اس نے ہرگز نہیں سوچا تھا۔

"تم بہت سادہ مزاج ہو خوش نصیب! بہت معصوم' مجھے ایسا لگتا ہے تمہاری تلاش میں اب تک میں پھرتا رہا ہوں۔ دنیا میں بھٹکتا رہا ہوں۔" وہ نرم اور اثر انگیز لہجے میں بولتا رہا یہاں تک کہ خاموشی ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ نیم وا دروازے کے پیچھے شام اتر آئی تھی اور محبت خاموشی سے ان دونوں کے درمیان اپنا جال بننے لگی تھی۔ تب ہی شامیر نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گال چھونا چاہا۔
باہر شاید آوارہ بلی نے منڈیر سے چھلانگ لگائی تھی۔ کہ دیوار کے ساتھ ساتھ رکھے گملے زوردار آواز سے آپس میں ٹکرائے اور ان دونوں کے مابین حائل سحر کا اثر توڑ کر خاموش ہو گئے۔ خوش نصیب کی ساری ہوشیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ چونک کر الٹے قدموں پیچھے ہٹی اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔
"خوش نصیب! خوش نصیب! میری بات سنو۔"
شامیر بے چین ہو کر اس کے پیچھے دوڑا لیکن خوش نصیب جا چکی تھی۔ دروازہ ابھی تک لرز رہا تھا۔



بشام جانے کا پلان سن کر صاعقہ ممانی نے فوراً "منع کر دیا۔ "کم سے کم بھی آٹھ گھنٹے کا سفر ہے بشام تک... اور آئے کت کے لیے اتنا طویل سفر بالکل بھی مناسب نہیں رہے گا۔" انہوں نے قطعیت سے کہا تھا۔
"آئے کت دودھ پیتی بچی نہیں ہے کہ احتیاط سے کام نہ لے۔" طالب ماموں نے کہا۔ "میرا خیال ہے اسے جانے دو اور کچھ نہیں تو اس کا اسٹریس ہی کسی حد تک کم ہو جائے گا۔"
"وہ دودھ پیتی بچی بے شک نہیں ہے لیکن ماں بننے کے مرحلے سے پہلی بار ہی گزر رہی ہے اور لڑکیوں کو بہت سی چیزیں نہیں پتا ہوتیں۔" صاعقہ ممانی نے کہا۔
"او بھلی عورت! اچھا نہیں ہو گا آئے کت کو۔ کچھ باتیں اللہ کے بھروسے بھی چھوڑ دینی چاہییں۔"
"اللہ پہ بھروسہ ہے مجھے۔ لیکن آئے کت کا ابھی چیک اپ تک نہیں ہوا اس ہفتے میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے والی تھی میرا خیال ہے اتنے لمبے سفر سے پہلے ڈاکٹر سے کنسلٹ لازمی کر لینا چاہیے۔"
ان کا خیال غلط نہیں تھا سو طالب ماموں نے خاموشی اختیار کر لی گو کہ وہ بھی بشام جانا چاہتے تھے اور وسامہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتے تھے۔ معاویہ کو... اس معاملہ میں زیادہ بولنا مناسب نہیں لگا' سو وہ چپ ہی رہا۔ لیکن آئے کت کی بے چینی ہر روز بڑھتی چلی گئی۔ اپنی حالت اور آنسوؤں پر جیسے اس کا اختیار نہیں رہا تھا۔ رونے لگتی تو گھنٹوں بیٹھ کر روتی رہتی۔ معاویہ کی فکرمندی بڑھتی چلی گئی اور ساتھ ہی صاعقہ ممانی کی بھی۔
"میں سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں لیکن آئے کت کا رونا ختم ہی نہیں ہو رہا اس حالت میں اتنا اسٹریس ٹھیک نہیں ہے اس کے لیے۔" انہوں نے معاویہ کے سامنے فکرمندی سے کہا تھا۔
"آپ اسے ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں لے جاتیں؟" معاویہ نے فکرمندی سے پوچھا۔
"جس گائناکالوجسٹ کے پاس میں لے جانے کا سوچ رہی تھی وہ چند دن کے لیے کوئی کانفرنس اٹینڈ کرنے


روح افزا
سردی میں
SHARBAT ROOH AFZA
گرم دودھ اور روح افزا
اور کیا چاہیئے!
Roohafzapk

ملک سے باہر گئی ہوئی ہے۔ جیسے ہی وہ واپس آئے گی میں اسے لے جاؤں گی۔"

"مجھے لگتا ہے شاید فلک بوس جا کر آئے کت بہتر محسوس کرے۔" اس نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"بشام بہت دور ہے معاویہ!"

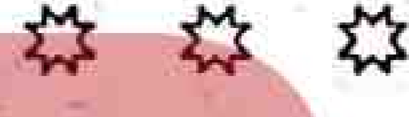
"چاند سے تو قریب ہے ممانی! لوگ تو وہاں بھی چلے جاتے ہیں۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا پھر دونوں ہی ایک ساتھ ہنس دیے۔

"میری مانیں۔ آئے کت کو بشام جانے دیں۔۔۔ وہ جا کر تھوڑا فریش ہی ہو جائے گی اور تب تک آپ کی ڈاکٹر بھی واپس آجائے گی۔" صاعقہ ممانی سوچ میں پڑ گئیں۔

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ آپ اور طالب ماموں بھی ساتھ ہی چلیں۔ اسی بہانے آیو فہمتی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" وہ صرف ان کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے ایسی باتیں بول رہا تھا۔

صاعقہ ممانی نے گردن موڑ کر مضمحل نظروں سے اسے دیکھا۔ "اسی لیے تو میں وہاں جانا نہیں چاہتی۔ میرے بیٹے کو اس آسیب کا خوف کھا گیا۔" ان کی آنکھوں میں نمی دکھائی دینے لگی تھی۔

معاویہ نے ان کے کندھوں کے گرد بازو حمائل کر کے انہیں اپنے قریب کر لیا۔ کسی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا روتے ہوئے انسان کو کیسے دلاسا دیا جاتا ہے۔ وہ گردن موڑ کر بے بسی سے دور کھڑی آئے کت کو دیکھنے لگا تھا۔



خوش نصیب عجلت میں اوپر آئی اور سر تک چادر اوڑھ کر دیر تک لیٹی رہی۔ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ لیکن کہیں دماغ کے کونے میں ایک آواز تھی جو اسے مسلسل لتاڑ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر ایسے ہی لیٹی رہی پھر کروٹ بدل کر سو گئی۔ جب آنکھ کھلی تو شام رات میں بدل چکی تھی اور شیرو عرفات ماموں کا پیغام لے کر دوبارہ سر پر موجود تھا۔

"سر جی کہہ رہے ہیں۔۔۔ آپ نہیں آسکتیں تو کیف بھائی کا فون نمبر کسی کاغذ پر لکھ دیں۔۔۔ ان کے موبائل سے ڈیلیٹ ہو گیا ہے۔"

"میں کیوں نہیں آسکتی؟ ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں کیا میری؟" وہ اسی پر الٹ پڑی۔

"میں نے یہ کب کہا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"ہو نا تم کیف کے چیلے۔۔۔ وہ بھی جو زبان سے نہیں کہتا اس کی آنکھیں کہہ دیتی ہیں۔" پتا نہیں کیوں اتنا غصہ آ رہا تھا۔

"خوش نصیب باجی! آپ کیف بھائی کی آنکھوں میں دیکھتی ہی کیوں ہیں؟ آنکھوں میں جھانکنا تو سنا ہے، محبت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔" وہ جھجک کر بولنا شروع ہوا تو پھر فراٹے سے بولتا چلا گیا۔

"بکو مت۔" وہ تڑخ کر بولی۔ شیرو دبک کر کھڑا ہو گیا۔

"عرفات ماموں سے کہنا میں آ رہی ہوں اور تم بات سنو۔"

وہ جو مؤدب بن کر سر ہلاتا ہوا جا رہا تھا رک کر اسے دیکھنے لگا مبادا کوئی اگلا اعتراض جڑ دے۔

"انڈین فلمیں ذرا کم دیکھا کرو۔ بھاگ جاؤ اب۔۔۔ ہونہہ محبت کی نشانی۔"

شیرو جلدی سے بھاگ گیا اور خوش نصیب جھنجلاتی ہوئی اٹھ کر چپل میں پیر پھنسانے لگی۔



اور یوں آئے کت کی خواہش پوری کرنے وہ سب ایک بار پھر بشام آ گئے۔

بشام کرۂ ارض پر خوب صورتی کا دھڑکتا ہوا دل۔
وہ ویسا ہی تھا۔ دنیا میں جنت کے نظارے جیسا۔
بشام پر جھکے آسمان پر جو بادل گھر کر آتے تھے ویسے بادل کہیں اور نہ جاتے ہوں گے۔ جیسی بارشیں بشام میں برستی تھیں کہیں اور نہ برستی ہوں گی۔ جیسی خوش رنگ گھاس اس سرزمین پر لہلہاتی تھی ممکن ہی نہیں کہ ویسی نرمی کہیں اور پیروں کے تلووں کو گدگدائے۔ جیسی خوشبو وہاں اڑتی پھرتی تھی کہیں اور نہ مہکتی ہوگی۔
اونچے اونچے سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، بل در بل بچھی ہوئی سڑکیں، منہ زور جھرنے، شفاف ٹھنڈے میٹھے پانی کی خاموش ندی، پرندوں کی دلکش بولیوں سے گونجتا ہوا جنگل اور..... اور عالی شان فلک بوس۔ جب دھند کے مرغولے چمنیوں سے لپٹتے اور دھواں سا ہر طرف پھیل جاتا تو فلک بوس کی خوب صورت بڑھ جاتی۔ وہ آسیب زدہ تھا لیکن دل سے قریب لگتا۔ اسرار کے پنجے دل کو دہلاتے لیکن کشش ایسی جو انسان کو ہلنے نہ دیتی تھی۔ وہ سب وہاں آ گئے۔ جہاں قدرتی خوب صورتی کی بہتات تھی اور اسرار کا لہراتا ہوا سایہ اور روسامہ کی یادیں۔
بشام کے پہاڑ پر بچھی بل دار سڑکوں پر جوں جوں ان کی جیپ فلک بوس کی طرف بڑھ رہی تھی ان کے دل مٹھی میں جکڑے جاتے تھے۔ وہ سب ایسے خاموش تھے اور ایسے باہر کھڑکیوں کے شیشوں سے دیکھتے تھے جیسے ایک دوسرے کی موجودگی سے ناواقف ہوں۔ اسی راستے پر آگے بڑھتے ہوئے جب فلک بوس کے کنگرے دکھائی دینے لگے تو خون کے ساتھ ایک حرارت کی تیز لہر رگوں میں دوڑ گئی۔ جیپ فلک بوس کے مرکزی پھاٹک پر رکی۔ بابا کبیر پہلے ہی ان کا منتظر تھا۔ اس نے معاویہ کو دیکھتے ہی بڑی خوش دلی سے ہاتھ سر تک لے جا کر سلام کیا اور جھٹ سے پھاٹک کھول دیا۔
جیپ رینگتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور ایک فراٹے سے روش کو روندتی فلک بوس کے مرکزی داخلی دروازے سے کچھ دور ہی جا کر ٹھہر گئی۔ معاویہ نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا تو اسے احساس ہوا اس کے ہاتھ میں واضح کپکپاہٹ تھی۔ آخری بار جب وہ فلک بوس سے نکلا تو اس کے کندھوں پر روسامہ کی موت کا دکھ اس کی میت کی طرح دھرا ہوا تھا۔ اس نے عہد کیا تھا واپس مڑ کر اس جگہ کا رخ نہیں کرے گا اور اب آ گیا تھا' صرف اور صرف آئے کت کی خوشی کے لیے۔
"سلام صاحب!" فلک بوس کے ملازم ان کے استقبال کے لیے مرکزی دروازے پر موجود تھے۔ خاتون بی بی اور بابا کبیر سے تو معاویہ واقف ہی تھا باقی چہرے نئے تھے۔ سب بڑھ کر مالکان کو سلام کرنے لگے۔
"سلام صاحب!" بابا کبیر بھی دوڑا آیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی لیکن معاویہ کی آمد کی خوشی اس کے چہرے اور آنکھوں سے صاف جھلکتی تھی۔
"وعلیکم السلام..... کیسے ہیں بابا!" وہ مسکرایا ضرور لیکن یہ مسکراہٹ اتنی مصنوعی اور بے رنگ تھی کہ ایک پل میں اپنا راز کھول گئی۔
"میں ٹھیک ہوں صاحب! آپ نے آ کر بہت اچھا کیا۔ فلک بوس میں پھر سے رونق ہو جائے گی۔" بابا کبیر کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔
معاویہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دور جاتی آئے کت کو دیکھنے لگا۔ وہ گاڑی سے اتر کے جیسے بے دھیانی میں گھاس کے قطعے پر چلنے لگی تھی اور اس طرف بڑھ رہی تھی جس طرف تالاب اور سفید پری نصب تھے۔ وہ بے بس سی دکھائی دیتی تھی۔ کرب اس کی آنکھوں سے جھلکتا تھا اور زندگی کا عظیم سرمایہ کھو دینے کا دکھ اس کے ماتھے پر تحریر تھا۔

"آیئے صاحب! آپ لوگوں کے لیے کمرے تیار کروا دیے ہیں۔"

"ماموں! ممانی! آپ لوگ اندر چل کر آرام کریں۔" معاویہ نے بابا کبیر کو ان دونوں کا سامان اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔ بابا نے فوراً دیگر ملازمین کو ساتھ لگا کر سامان اٹھانا شروع کر دیا۔

"میں... میں فلک بوس کا ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔" دکھ ماموں طالب کی آنکھوں میں بھی کم نہیں تھا۔ ان کی بات پر معاویہ فوراً سمجھ گیا۔ وہ بھی اس آسیب کا پتا لگانا چاہتے تھے جس کی دہشت ان کے بیٹے کے حواس مفلوج کر گئی تھی۔

"آپ دونوں کچھ دیر آرام کرلیں۔ دو دن تک ہم یہیں ہیں میں خود آپ کے ساتھ فلک بوس کا چکر لگاؤں گا۔" معاویہ نے کہا۔ ساتھ ہی بابا کو اشارہ کیا۔

"کبیر بابا! ماموں اور ممانی کو ان کا کمرہ دکھائیں۔" کہہ کر وہ آئے کت کی طرف بڑھ گیا۔

وہ گھاس کے قطع پر چہل قدمی کرنے کے انداز سے قدم دھرتی یہاں وہاں دیکھ رہی تھی۔ یہاں اتنی خوب صورتی تھی جو نظر کو باندھتی تھی لیکن آئے کت کے لیے یہ خوب صورتی اپنا اثر کھو چکی تھی۔ اسے وسامہ کی یادیں چاہیے تھیں۔ وہ وسامہ کو نہیں بچا سکی تو اس کی یادوں کو ہی ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ معاویہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا اس کے پاس آگیا اور برآمدے کے قریب لیکن تالاب سے دور اور بالکل اس کی سیدھ میں آئے کت کے ساتھ کھڑا ہو کر اسی سمت میں دیکھنے لگا۔ جس طرف آئے کت دیکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔

"ہم... اکثر وہاں، تالاب کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ میں اور وسامہ۔" معاویہ کے قریب جا کر کھڑے ہوتے ہی آئے کت نے کہا۔ اس نے نہ گردن موڑ کر معاویہ کو دیکھا، نہ آواز سنی۔

"خاص کر رات میں... تم نے کبھی رات کو شام کا آسمان دیکھا ہے معاویہ؟ وہ آسمان جو فلک بوس پر جھکتا ہے؟ نہیں دیکھا؟ کبھی دیکھنا، یہ کوئی الگ آسمان ہوتا ہے اتنا خوب صورت اتنا دلکش، ستارے نہیں ہوتے اس وقت آسمان پر موتی ہوتے ہیں، ہیرے ہوتے ہیں جو چمکتے ہیں تو آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ پتا نہیں وسامہ کے بغیر یہ آسمان اتنا خوب صورت لگے گا یا نہیں۔"

بولتے بولتے وہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہاں شام کے ابتدائی رنگوں میں ڈوبے آسمان پر پہاڑی پرندے اونچی اونچی اڑانیں بھر رہے تھے۔ آئے کت نے مایوسی سے سر جھکا کر معاویہ کو دیکھا۔ آئے کت کی آنکھوں کے کنارے نمی کی لکیر ابھر آئی تھی۔

"وسامہ کیوں چلا گیا معاویہ، اس نے تو زندگی بھر میرے سارے غم اٹھانے کا وعدہ کیا تھا اور خود ہی مجھے زندگی کا سب سے بڑا غم دے گیا۔" آنسو اس کے گال سے پھسلتے ہوئے ٹھوڑی سے ٹپکنے لگے تھے اور شام کی شام ان آنسوؤں کے ساتھ تاریک ہوتی چلی گئی تھی۔



خوش نصیب نیچے آئی تو شامیر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

صحن میں کرسیاں بچھائے فضیلہ چچی اینڈ فیملی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ صیام دائیں ہاتھ ایسے شامیر کی کرسی پر استحقاق سے ہاتھ رکھے بیٹھی تھی جیسے شامیر کے اٹھ کر کہیں بھاگ جانے کا خطرہ ہو۔ منہا سامنے والی کرسی پر بیٹھی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ بے شک اس نے شامیر کو نظرانداز کرنے اور صیام کے اچھے مستقبل کے لیے اسے لفٹ نہ کروانے کا عندیہ دیا تھا لیکن اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر وہ شامیر کو کمپنی دے

ہی دیتی تھی۔ شاید اسے بھی برتھ کے جنگلات کی آگ کے قصوں سے دلچسپی ہو چلی تھی۔
پاکستان میں رہتے ہوئے بیشتر عوام کی طرح ان سب کو بھی یہی لگتا تھا کہ جیسی قیامت خیز گرمی پاکستان میں پڑتی ہے ایسی گرمی صرف جہنم میں ہی پڑتی ہوگی۔ ایسے میں یہ خبر ان سب کو حیران کر دینے کے لیے کافی تھی کہ کرہ ارض پر کوئی ایسا خطہ بھی ہے جہاں کے رہنے والوں کی رنگت گوری اور انداز فرنگی ہوتے ہیں لیکن سال کے کچھ مہینوں میں سورج اس ملک کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ برتھ کے درختوں میں آگ بھڑک اٹھتی ہے اور حکومت کی جانب سے کی جانے والی ہزار ہا کوششوں کے باوجود اس آگ پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔
طوطا بھائی کو شاید فہمینہ ممانی نے ــــ "مو تا" وہاں بٹھالیا تھا۔ کیوں کہ وہ اس وقت ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے ہنس رہے تھے۔ خوش نصیب کو یقین تھا جو لطیفہ ابھی سنایا گیا ہے اور جس پر دیگر اہل خانہ ہنس ہنس کر پاگل ہو رہے ہیں' اس لطیفے کا آدھا حصہ بھی طوطے بھائی کی عقل شریف تک نہیں پہنچا ہوگا۔
وہ ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ نہیں بلکہ انہیں گھور رہی تھی کہ معاً" شامیر اور اس کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔ خوش نصیب نے فوراً" نظروں کا رخ پھیرا اور عرفات ماموں کے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔ اتفاق سے وہ کچن میں موجود تھے اور کچن ٹیبل پر بیٹھے ماہ نور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ خوش نصیب نے انہیں کچن کی کھڑکی سے دیکھا اور وہیں آگئی۔ فہمینہ اور ماہ نور دونوں ہی وہاں موجود تھیں۔
"اسلام علیکم عرفات ماموں!" اس نے پیچھے سے جا کر ان کی گردن میں بازو حمائل کر دیے۔
"وعلیکم السلام۔۔ لو بھئی عید کا چاند نظر آہی گیا۔" وہ شرارت سے بولے' ساتھ ہی اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کیا۔ خوش نصیب جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔
"ایسے تو مت کہیں۔۔۔ مانا کہ میں خوب صورت ہوں لیکن اب اتنی بھی نہیں کہ چاند سے ہی تشبیہہ دے دی جائے۔" شرارت سے بولی۔
عرفات ماموں ہنس دیے۔ "حاضر جوابی کم نہیں ہوئی تمہاری۔" اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر بولے۔
"میں سوچ رہا تھا خالہ جان سے ملنے کے لیے مجھے اوپر تو آنا ہی تھا۔ تم سے بھی وہیں ملاقات کرلیں گے۔" اب وہ شکوہ کر رہے تھے۔
"خوش نصیب نے اپنے کان پکڑ لیے "ناراض کیوں ہوتے ہیں؟ میں ذرا مصروف تھی اسی لیے آنے میں دیر ہو گئی۔"
"ہاں تمہاری مصروفیت کی خبریں تو مل ہی چکی ہیں مجھے۔" انہوں نے مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھا۔
خوش نصیب کے دل میں چور تھا کھٹک سی گئی۔ "کیا مطلب؟"
"میں نے ماموں کو تمہارے اور صیام کے جھگڑے کا بتایا ہے۔" فہمینہ ہنستے ہوئے بولی۔ "اف! کاش ماموں آپ اس وقت وہاں موجود ہوتے ان دونوں نے تو اعلا پائے کے ریسلرز کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔"
عرفات ماموں محظوظ ہوتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ "کیا چیز ہو تم؟"
خوش نصیب ڈھٹائی سے دانت نکال رہی تھی۔ ان کی طرف جھک کر رازداری سے بولی۔ "صیام نے جلدی ہار مان لی اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔۔۔ ورنہ میرا پورا ارادہ تھا مکا مار کے کم سے کم اس کا ایک دانت ضرور توڑوں گی۔"
عرفات ہنس دیے۔ "کیوں کرتی ہو یہ لڑائی جھگڑے۔۔۔؟"
"میں کب کرتی ہوں؟ لوگوں کو مجھ سے جھگڑے کرنے کا شوق ہے۔ وہ محاورہ سنا ہے نا آپ نے' آبیل مجھے

مار۔"

"اس محاورے میں بیل خوش نصیب باجی کو ہی کہا گیا ہے۔" شیرو نے دانت نکوسے۔

"تم پھر آگئے۔۔۔ کیف کے چمچے!"

"اونہہ۔۔۔ بڑی بات ہے خوش نصیب!"

وہ منہ کے زاویے بگاڑنے لگی۔ فہمینہ اور ماہ نور اپنی باتوں میں مصروف ہو چکی تھیں۔ تب عرفات ماموں نے اس سے پوچھا۔

"صرف جھگڑے کرنے میں ہی مصروف رہتی ہو یا کوئی ڈھنگ کا کام بھی کیا ہے؟"

اس نے شکوہ کناں نظروں سے انہیں دیکھا۔۔۔ ڈھنگ کا کام؟ مطلب؟"

"ایڈمیشن فارم لایا تھا تمہارے لیے۔" انہوں نے یاد دلایا خوش نصیب نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ وہ چہرہ دیکھ کر سمجھ گئے۔

"وہ۔۔۔ وہ تو میں بھول ہی گئی۔"

"بتانے کی ضرورت نہیں ہے تمہارے چہرے پر لکھا ہوا دیکھ چکا ہوں میں۔" ناراضی سے بولے۔

"ایسی لاپروائی کے ساتھ تو تم اپنا مستقبل کبھی روشن نہیں کرپاؤ گی خوش نصیب! پتا نہیں دھیان کہاں رہتا ہے تمہارا۔"

"ہو جائے گا سب۔۔۔ فکر نہ کریں آپ۔" لاپروائی سے ہاتھ لہرا کر بولی۔ "مستقبل روشن کرنے کا ایک اور طریقہ ڈھونڈ لیا ہے میں نے۔"

"اور کیا ہے وہ طریقہ؟" انہوں نے قدرے ناراضی سے پوچھا۔ "ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے۔"

"یہ ابھی نہ پوچھیں۔۔۔" لجاجت سے بولی۔ "جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گی تو سب سے پہلے آپ کو ہی خوش خبری سناؤں گی۔"

عرفات ماموں نے خاموشی کے ساتھ اسے گہری جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ جیسے اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خوش نصیب کی نظر پڑی تو چونک گئی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

عرفات ماموں نے گہری سانس بھرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا جیسے بات بدل رہے ہوں۔ "تمہارے جو بھی ارادے ہوں بس کچھ ایسا مت کرنا جو تمہیں نقصان پہنچانے کا باعث بنے۔"

خوش نصیب نے انہیں دیکھا اور مسکرا دی۔ "اچھا لگتا ہے جب آپ میرے لیے اس طرح فکر مند ہوتے ہیں۔۔۔ کوئی تو ہے اس گھر میں جسے میری فکر رہتی ہے۔"

کرسی کی پشت پر پہلوانوں کے سے اسٹائل میں بازو پھیلائے بڑے شکر گزار انداز میں بولی تھی۔ عرفات ماموں کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

"کوئی اور بھی ہے اس گھر میں۔۔۔ جسے ہر وقت تمہاری فکر رہتی ہے۔"

"او پلیز۔۔۔ اب کیف کا نام مت لیجیے گا۔" بہت برا سا منہ بنا کر کہا تھا اس نے۔

"اور آپ بے فکر ہو جائیں۔۔۔ صرف اپنا آنے والا کل سنوار رہی ہوں اور میرا روشن مستقبل کسی کو تاریکیوں میں نہیں دھکیلے گا۔ یہ وعدہ ہے میرا۔" سامنے میز پر پڑی باسکٹ سے سیب اٹھا کر اس نے اپنی آستین سے رگڑ کر صاف کیا اور دانت کھڑچ کی آواز کے ساتھ سیب میں گاڑ دیے۔

☆ ☆ ☆

اپنے مالکان کی آمد کی خوشی میں بابا کبیر اور خاتون بی بی نے رات کا کھانا بطور خاص تیار کیا تھا۔ اور اتنا اہتمام کیا تھا کہ ڈائننگ ہال خوشبوؤں سے مہک اٹھا تھا۔ ان چاروں نے محض ان معصوم لوگوں کا دل رکھنے کے لیے لقمے زہر مار کرلیے تھے ورنہ بھوک کسی کو بھی نہیں تھی۔ ان کے دل اتنے بوجھل تھے کہ نوالے حلق سے اترتے ہی نہ تھے۔

"میری بیوی اور میں نے بڑی محنت سے کھانا بنایا ہے۔۔۔ آپ لوگ پیٹ بھر کر کھائیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔" بابا کبیر نے ادب واحترام سے کہا۔

"آپ نے بہت کھانا بنالیا ہے بابا! ہمیں بھوک ہی نہیں ہے۔" طالب ماموں نے کہا۔

"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں صاحب! لیکن جو جاچکا ہے' اپنی جان پر ظلم کرنے سے وہ واپس نہیں آجائے گا۔" بابا کبیر نے سابقہ انداز میں کہا۔

طالب ماموں خاموش رہے پھر ایک گہری سانس بھر کر نیپکن میز پر رکھ دیا۔

"میں سونا چاہتا ہوں۔" جاتے جاتے انہوں نے بابا کبیر کا کندھا تھپتھپایا اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

صاعقہ ممانی کی پلیٹ بھی جوں کی توں پڑی تھی۔

"کل کچھ نہ بنوایئے گا بابا کبیر! یہی کافی رہے گا۔ کھانے کی بے حرمتی ہوتی ہے۔" وہ سادہ مزاج عورتوں کی طرح بچا ہوا کھانا ایک پلیٹ میں جمع کرنے لگیں۔

"جی بہتر!" بابا کبیر کو مایوسی ہوئی تھی سب کے رویوں سے۔

"کبیر بابا! باہر تالاب کے پاس وسامہ نے اپنے ہاتھوں سے کچھ پودے لگائے تھے۔۔۔ میں دیکھ رہی تھی' وہ اب وہاں نہیں ہیں۔" آئے کت نے پوچھا۔

"وہ سوکھ گئے تھے بی بی! مالی نے انہیں نکال کر پھینک دیا۔"

آئے کت کی خوب صورت پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "کس سے پوچھ کر نکالا مالی نے؟ وہ وسامہ نے لگائے تھے۔ انہیں وہیں لگے رہنے دینا چاہیے تھا۔" اس نے ناراضی سے کہا۔

"وہ پودے تیز دھوپ میں رکھنے کے نہیں تھے بی بی! مالی نے وسامہ صاحب کو منع بھی کیا تھا۔" بابا کبیر نے کہا۔

"آپ وہی پلانٹس دوبارہ منگوائیں۔ مجھے وہ پودے اسی جگہ پر چاہئیں جو جگہ وسامہ نے ان پودوں کے لیے پسند کی تھی۔۔۔ سوکھ جائیں تو دوبارہ لاکر لگادیں۔ وسامہ کی کوئی یاد فلک بوس سے مٹنی نہیں چاہیے۔"

"لیکن بی بی!"

"آئے کت بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے بابا! وسامہ کی کوئی یاد فلک بوس سے مٹنی نہیں چاہیے۔" معاویہ نے ان کی بات کاٹ کر قطعیت سے کہا تھا۔

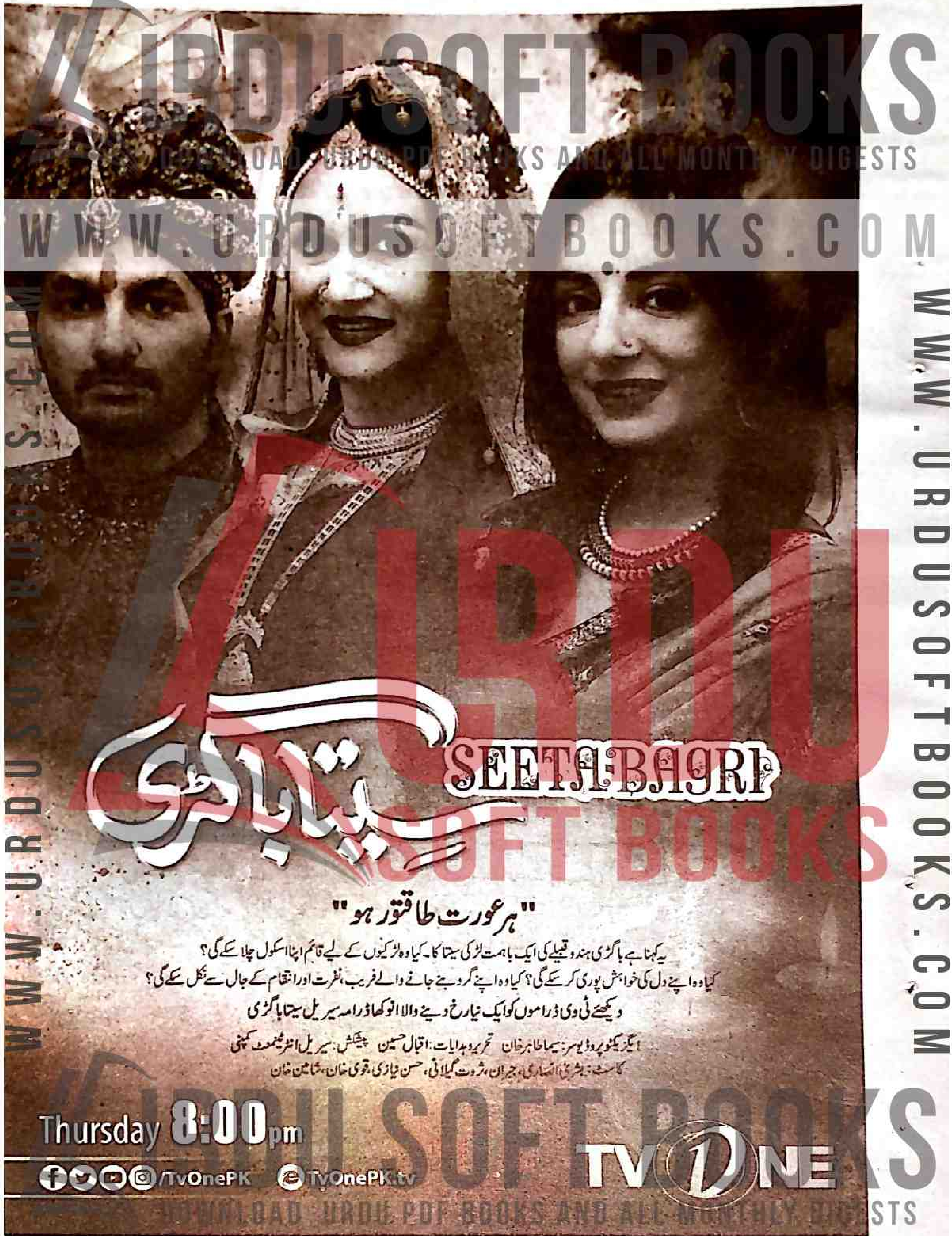
بابا کبیر کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن معاویہ کے تیور دیکھ کر خاموش ہو رہے۔

"جی بہتر۔" احترام سے کہا۔

"اور برآمدے میں جو کرسیاں رکھی رہتی تھیں؟" آئے کت نے دوبارہ پوچھا۔

"باہر پڑی خراب ہو رہی تھیں۔۔۔ میں نے اندر رکھوادی ہیں۔"

"انہیں بھی واپس لاکر رکھیں۔۔۔ یہ چند روز جو ہم فلک بوس میں ہیں اس دوران مجھے فلک بوس ویسا ہی چاہیے جیسا وسامہ کی موجودگی میں تھا۔"


سیتا باگڑی
SEETA BAGRI
"ہر عورت طاقتور ہو"
یہ کہنا ہے باگڑی ہندو قبیلے کی ایک باہمت لڑکی سیتا کا۔ کیا وہ لڑکیوں کے لیے قائم اپنا اسکول چلا سکے گی؟
کیا وہ اپنے دل کی خواہش پوری کر سکے گی؟ کیا وہ اپنے گرد بنے جانے والے فریب، نفرت اور انتقام کے جال سے نکل سکے گی؟
دیکھیے ٹی وی ڈراموں کو ایک نیا رخ دینے والا انوکھا ڈرامہ سیریل سیتا باگڑی
ایگزیکٹو پروڈیوسر: سیما طاہر خان تحریر و ہدایات: اقبال حسین پیشکش: سیریل انٹرٹینمنٹ کمپنی
کاسٹ: بشریٰ انصاری، جبران، ثروت گیلانی، حسن نیازی، قوی خان، شامین خان
Thursday 8:00pm
/TvOnePK
TvOnePK.tv
TV ONE

"جی بہتر۔"

☼ ☼ ☼

خوش نصیب پچھلے صحن میں آم کی موٹی شاخ پر ڈالے جھولے پر بیٹھی مستقبل کے خواب دیکھنے میں مگن تھی کہ شیرو دوڑا دوڑا آیا۔

"خوش نصیب باجی! خوش نصیب باجی!" سانس پھول رہی تھی ہاتھ میں عرفات ماموں کا موبائل تھا۔ بھاگا بھاگا آیا اور قریب رک کر کمر پر ہاتھ رکھ کر سانس بحال کرنے لگا۔ خوش نصیب نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

"تم پھر آ گئے میرا سر کھانے؟"

"لو۔ آپ کے دماغ میں کیا رکھا ہے جو میں کھاؤں گا۔" وہ الٹا چڑ کر بولا۔

"توبہ۔۔۔ ایسے بولتے ہوئے بالکل کیف کی فوٹو لگتے ہو۔" تیوری چڑھا کر بولی۔

فون کے دوسری طرف کیف نے ساری بات سنی تھی۔ اس کا الگ منہ بن گیا۔

"کیف جیسا کوئی نہیں ہو سکتا۔۔۔ اونہہ نالائق نصیبن!" لیکن ابھی اس کی کون سنتا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے آپ سے باتیں کرنے کا۔۔۔ وہ تو کیف بھائی کی وجہ سے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔" شیرو نے تنک کر کہا۔

"یہ پکڑیں موبائل۔۔۔ کیف بھائی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اوہو۔۔۔ کہا تو ایسے ہے جیسے کیف نہ ہوا کہیں کا شہزادہ ہو گیا۔" جھپٹ کر فون لیا۔

"ہاں تو کیف بھائی کسی شہزادے سے کم تھوڑا ہی ہیں۔" وہ ہر وقت کیف کی طرف داری کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کی آواز موبائل کے دوسری طرف بھی سنی گئی تھی اور بس نہ چل رہا تھا کہ شیرو کی بلائیں ہی لے ڈالے۔

"ہیلو۔۔۔"

"اتنی سریلی آواز ہے تمہاری۔۔۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ذرا پیار سے بھی بات کر لیا کرو۔"

"جس روز میں نے تم سے پیار سے بات کر لی سمجھ لینا تم خواب دیکھ رہے ہو یا میں مرنے کے قریب پہنچ چکی ہوں۔۔۔ اس کے علاوہ تو کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی جس کی بنا پر میں تم سے پیار سے بات کروں۔" اترا کر بولی تھی۔

"اس بات پر شرط لگالو۔۔۔ تم مجھے ماضی قریب میں "میرے پیارے کیف جی" کہہ کر بلایا کرو گی۔۔۔ میں ہار گیا تو میں تمہیں جان من کہہ کر بلا لیا کروں گا۔" جھٹ سے بولا۔

خوش نصیب کے گال تمتما اٹھے۔ کیف کمینہ واہیات انسان۔

"اور جس دن تم نے ایسا کہا میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔"

"اس پر بھی شرط لگا لیں؟" وہ متبسم لہجے میں بولا۔

"فون کیوں کیا ہے؟" اس سے کوئی بات نہ بن پڑی تو تلملا کر پوچھا۔

"تمہاری یاد میں مرنے والا ہو گیا تھا۔۔۔ سوچا دیدار نہیں کر سکتا تو آواز ہی سن لوں۔" ایسے کہا تھا جیسے کسی اور کے بارے میں بتا رہا ہو یعنی سرسری انداز۔ اچھے انداز سے کہتا تب بھی کون سا خوش نصیب نے یقین کر لینا تھا ابھی بھی موبائل کان سے ہٹا کر ایک لحظہ کے لیے دیکھا پھر بولی۔

"کھاؤ اپنے سر کی قسم۔"

"تمہارے سر کی قسم۔" جھٹ جواب آیا۔

"اپنے سر کی قسم کھاؤ۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"یار! آج اپنے سر کی قسم سے کام چلالو۔ میرے سر میں بہت درد ہے۔" معصوم سا بن کر بولا تھا خوش نصیب تلملا ہی گئی۔

"تو میرا سر فالتو ہے کہ تمہاری جھوٹی قسموں کی نذر ہو تا رہے۔ بچپن میں بھی تم میرے سر کی جھوٹی قسمیں کھا کر سچے بن جایا کرتے تھے۔" اسے پرانی باتوں پر از سرِ نو غصہ آیا تھا۔

وہ یاد کرکے ہنسنے لگا۔ "ان ہی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ ساری زندگی کے لیے تمہارا بے دام غلام بن کر رہوں گا۔ جورو کی غلامی کے اب تک کے سارے تاریخی ریکارڈ نہ توڑ دیے تو میرا نام بدل دینا۔" کھنکتا ہوا متبسم لہجہ شرارت سے بھرا ہوا تھا۔

خوش نصیب کا منہ اپنے اصل زاویے سے اتنا زیادہ بگڑ گیا کہ شاید کیف سامنے ہوتا تو پہچان بھی نہ پاتا۔

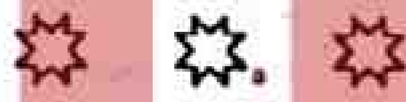
"لگتا ہے تم اس روز والا انتقام بھول گئے۔ بلاتی ہوں ابھی صیام کو۔"

"ارے! ایسا غضب نہ کرنا۔" وہ جلدی سے بولا۔

اس روز بھی فوراً" فون بند کر دیا تھا میں نے ورنہ صیام تو پیچھے پڑ جاتی۔ مانا میں لاکھوں میں ایک ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر دوسری لڑکی میری محبت میں مبتلا ہو۔"

خوش نصیب نے چڑ کر کال ہی کاٹ دی۔

"فارغ آدمی۔۔۔ ہونہہ۔" وہ دوبارہ جھولا جھولتے ہوئے مستقبل کے خواب بننے لگی۔



نیند پوری کرنے کے لیے وہ بلاشبہ ایک مشکل رات تھی۔ اپنے اپنے کمروں میں ان چاروں نے کروٹیں بدلتے رات گزار دی تھی۔ ہر وہ جگہ جہاں انسان نے اچھا وقت گزارا ہو اور خوب صورت یادوں کا منبع ہو وہاں غم کے انتہائی دور میں رہنا مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ تو فلک بوس میں ان کا مختصر قیام ایک مشکل وقت تھا۔ صبح کے قریب معاویہ کو نیند کے جھونکے آنے لگے لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ ایسا لگا جیسے کمرے کی اونچی چھت بڑی تیزی سے اس پر گر رہی ہو۔ وہ ہراساں ہو کر اٹھ بیٹھا اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ چھت' دیواریں سب اپنی جگہ سلامت تھے۔ اس نے سانس بحال کی اور آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو دیکھا صبح کے چہرے پر ابھی رات کا مہین پردہ پڑا تھا اور اس ادھ کھلی صبح میں بشام کا جوبن اپنے عروج پر دکھائی دیتا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے جوگرز پہنے اور اپر پہن کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ فلک بوس سناٹے کی زد میں تھا۔ کمروں کے دروازے ابدی خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے جب کہ مرکزی ہال کا وہ بڑا سا فانوس ہولے ہولے عادتاً" لرز رہا تھا۔ معاویہ نے منہ اٹھا کر اوپر دیکھا اوپری ہال رات کی ہلکی روشنیوں میں بڑا پر اسرار سا لگتا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور آگے بڑھا۔ آئے کت کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ چند لمحے جیسے بے اختیار دروازے کے باہر رکا۔ دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن پھر یہ سوچ کر ہاتھ گرا دیا کہ شاید وہ بھی شب بیداری کے بعد ابھی سوئی ہو۔ یہی سوچتا وہ باہر نکل آیا۔ فلک بوس کے باہر رات کے سرکتے ہوئے پردے کی اوٹ میں بشام سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ معاویہ نے بے اختیار ہاتھوں کو آپس میں رگڑا اور بے وجہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد سرونٹ کوارٹر والی سائیڈ سے اس نے بابا کبیر کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

"سلام صاحب! آپ بڑی جلدی اٹھ گئے۔ میرا خیال تھا دیر تک سوئیں گے۔" بابا کبیر ہمیشہ ماتھے تک ہاتھ

لے جا کر سلام کرنے کا عادی تھا اور اسے ہمیشہ معاویہ کی فکر رہتی تھی۔
"نیند نہیں آئی بابا۔۔۔!" معاویہ نے بے زاری سے کہا۔ "ساری رات عجیب عجیب خیال آتے رہے شاید۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"شاید، تھکن کی وجہ سے ایسا ہوا ہوگا۔" بابا کبیر نے جلدی سے اس کا جملہ مکمل کیا۔
معاویہ نے ان کی طرف دیکھا۔ "یا شاید اس آسیب کی وجہ سے۔۔۔؟" خدشہ تھا لہجے میں۔
بابا کبیر نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ نظریں جھکا کر بولے۔
"وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے صاحب! لیکن اللہ کے حکم کے بغیر یہ ناری مخلوق ہماری دنیا میں دخل نہیں دے سکتی۔"
معاویہ نے جیسے اچنبھے سے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ "کیا دوبارہ کچھ ہوا ہے؟" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ "کیا کسی نے دوبارہ اس عورت کی روح کو دیکھا ہے؟"
"دو ایک مقامی لوگوں نے یہ بات کی ہے کہ انہوں نے اسے رات کے اندھیرے میں یہاں دیکھا ہے۔" بابا کبیر نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔
"لیکن بشام میں ایسی باتیں گردش کرتی رہتی ہیں۔ ان پر دھیان نہ دیں۔"
"مجھے لگا وہ وسامہ کا وہم ہوگا۔۔۔ لیکن اگر کسی نے دوبارہ ذکر کیا ہے تو اس بات میں کوئی تو حقیقت ہوگی۔" وہ پریشان ہو گیا تھا۔
"صاحب! بشام کی آدھی سے زیادہ آبادی ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ انہیں چلتے پھرتے اپنے دیوی دیوتا نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کیا عجیب بات ہے کہ روحیں اور جن بھوت بھی نظر آنے لگیں۔" بابا کبیر نے ذرا بے زار لیکن احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہا تھا۔
"ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں اس ناری مخلوق کے معاملے میں بھی اللہ کے حکم کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ آپ فلک بوس آئے ہیں تو ہر فکر سے ذہن کو آزاد کر دیں اور اتنے ہی پرسکون رہیں جیسے پہلے آیا کرتے تھے۔" انہوں نے نرمی سے کہا تھا۔
معاویہ کی پیشانی پر الجھن آمیز بل پڑ گئے۔ بہت کچھ واضح ہو کر بھی اس کے لیے غیر واضح تھا۔
"آپ کے لیے ناشتہ بناؤں؟" بابا کبیر نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں ابھی نہیں۔۔۔" معاویہ نے کہا۔ "میں سب کے ساتھ ناشتہ کروں گا۔۔۔ اٹھ جانے دیں سب کو۔"
"آئے کت بی بی تو کافی دیر پہلے سے جاگ رہی ہیں۔"
اس بات پر معاویہ نے حیران ہو کر بابا کبیر کو دیکھا۔ "آئے کت جاگ چکی ہے لیکن کہاں ہے؟ میں نے اسے نہیں دیکھا۔"
"وہ فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان گئی ہیں۔"

"قبرستان؟ اتنی صبح۔" وہ پریشان ہو گیا۔ "اتنی دور اسے اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا۔"
"وہ اکیلی نہیں ہیں۔۔۔ میں نے خاتون بی بی کو ان کے ساتھ بھیجا ہے۔" بابا کبیر نے اپنی بیوی کا نام لیتے ہوئے کہا۔
"یہ اچھا کیا آپ نے۔" معاویہ نے گہری سانس بھر کر کہا تھا اس کے ذہن سے جیسے بوجھ ہٹ گیا تھا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

دانتوں میں کیڑا، مسوڑھوں سے خون

اپنے دانتوں کو بچائیں اس انجام سے



دانتوں اور مسوڑھوں کی مکمل حفاظت کے لیے استعمال کریں۔

ڈاکٹر ٹوتھ پیسٹ۔ علاج بھی بچاؤ بھی!

Anfords
Values Life

میرے ساتھ کچھ نہیں کیا

عاصمہ فرحین

آج کل میں بہت پریشان ہوں۔ میرا نام عرشی ہے اور سب مجھے پیار سے منی کہتے ہیں۔

نہیں... کہتیں اس لیے پریشان نہیں ہوں کہ سب منی کہتے ہیں۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں اور میں پانچویں نمبر پر ہوں۔ آگئے نا این جی اووالی ذہنیت پہ۔ میرے گھر میں دراثن بانی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

میں نے حال ہی میں میٹرک سائنس گروپ کے پیپر زدیے ہیں اور رزلٹ کا انتظار کر رہی ہوں۔ کند ذہن نہیں ہوں میں... اور نہ ہی کسی پیپر میں فیل ہونے کا خوف ہے۔ اور ہاں! میرے ابا ماڈرن تو نہیں ہیں۔ مگر بیٹیوں کے حقوق سے واقف ہیں۔ وہ مجھے پڑھنے سے منع نہیں کرنے والے۔

جسے بھی کوئی کام کروانا ہو۔ وہ مجھے آوازیں دیتا ہے۔

میں آپ کو شروع سے اپنی کہانی سناتی ہوں۔

ایک دفعہ میرے سب سے چھوٹے چھ سالہ بھائی ہادی کو گلی میں چوزے والا نظر آگیا۔

"چپل دو... اور چوزے لو۔" چوزے والے کی بات سن کر ہادی کو اور تو کچھ سوجھا نہیں۔ چپل کے بدلے چار بھگے منے سے پیلی چوزے لے آیا۔

جب عصر کے وقت چائے کا دور شروع ہوا۔ تو سب نے ان چوزوں کو صحن میں گھومتے پھرتے مشاہدہ کرتے ہوئے چوزوں کے ساتھ ساتھ ہادی کو بھی پیار کیا۔

پیار و محبت کا یہ سلسلہ اس وقت اختتام پذیر ہو گیا جب مغرب کی نماز کے لیے ابا کو چپلوں کی ضرورت پڑی۔

منی یہ کر دے... منی وہ کر دے... منی یہ لا دے... منی وہ لا دے بس... بس مجھے اتنا مسکین سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حسب موقع میں ان کاموں کی بدولت وہ چنگی ٹیکس بھی وصول کرتی ہوں۔ جو کہ عید پر میری ذاتی شاپنگ کے دوران نظر آتا ہے۔

میں... میں... میں آپ بور تو نہیں ہو گئے۔ ارے، ارے ڈائجسٹ مت رکھیے۔ مجھے دل کا بوجھ تو ہلکا کر لینے دیجیے۔ ورنہ یہ دکھی دل کس کو اپنی فریاد سنائے گا؟ کس سے اپنا غم ہلکا کرے گا؟

اب میری زبانی ہی میری پریشانی سن لیجیے۔ شرط میری ایک ہی ہو گی۔ ہنسے گا نہیں۔ اگر ہنسنے کا ارادہ ہے۔ تو منہ سے چھالیہ و پان تھوک دیجیے۔ ورنہ حلق میں اٹکنے کا خدشہ ہے۔

تفتیش کا سلسلہ جب ہادی تک پہنچا تو ہادی نے کہا۔ "ابا کی چپل تو وہ لے گیا۔"

کون لے گیا؟ سوال آیا تھا۔

"چوزے والا۔" ہادی کا جواب تھا۔

"کیوں؟" دوسری جگہ سے سوال آیا۔

"اس نے مانگی تھی۔" مبہم سا جواب ہادی نے دیا۔

"کیوں مانگی تھی؟" یہ سوال کڑا تھا۔

اب ہادی کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ میں جو کیاری کے پاس بیٹھی ہادی کو ہی دیکھ رہی تھی۔ یکدم ہادی کی نظر مجھ پر پڑی۔

"منی باجی نے کہا تھا۔" یکدم ہادی بولا۔ سب کی آنکھوں کا رخ میری طرف اور ابرو کا رخ آسمان پر پہنچ چکا تھا۔



"میں نے تمہیں کب کہا تھا؟" میں اسے گھورتے ہوئے بولی۔

ہادی تو ویسے ہی رونے میں اتنا ماہر تھا کہ اسی وقت ابو کے پیچھے لپٹ کر رونے لگا۔ تب میری سمجھ میں آیا۔ دوپہر کو میں فرحت آپی کا ناول "ہم سفر" پڑھ رہی تھی۔ سب گھر والے سو رہے تھے اور ہادی بار بار مجھے تنگ کر رہا تھا۔ جب چوزے والا آیا تھا۔ تو وہ میرے پاس آیا۔

"منی باجی۔۔۔ چپل دے دو۔۔۔ چوزے لوں گا۔"

جب میرے لاکھ منع کرنے کے بعد بھی وہ نہ مانا تو میں نے اکتا کر کہا۔ "جاؤ لے لو۔ بہت ساری چپلیں ہیں۔ کوئی سی بھی لے جانا۔"

لیکن یہ کہنا بھول گئی کہ پرانی چپلیں اسٹور میں کارٹن میں رکھی ہیں۔

ہادی کی سمجھ میں آیا یا نہیں آیا۔ اس نے سوچا کہ اچھی چپلیں دوں گا تو چوزے والا بھی اچھے چوزے دے گا۔ تب ہی وہ بھی فارمی کے بجائے اسے دیسی چوزے دے کر چلا گیا۔ پوری بات سمجھ لینے کے بعد جب میں نے بولنے کے لیے لب ہلائے۔ تو مجھے خود ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کہ میری آواز کنویں سے آرہی ہو۔ میں کہنے والی تھی۔

"اب اس میں میری غلطی تھوڑی تھی۔"

مگر بھلا ہو راضی کا۔ فوراً" بولا۔ "امی! منی باجی کل ہی کہہ رہی تھیں کہ غزالہ نے چار دیسی چوزے لیے ہیں مجھے بھی لا دو۔"

بجو بولیں "منی کو تو یہی کام آتے ہیں۔ پتا نہیں کب بڑی ہوگی۔"

اب میں ٹھنڈی سانس بھر کر ان سب کی باتیں سن رہی تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ انڈین سوپ کی طرح ایک کے بعد ایک نے کمنٹ پاس کرنے ہیں۔

جب سب کا جمع شدہ میرے خلاف مواد ختم ہو گیا۔ اور انتظار کرنے لگے کہ امی اور ابو میں سے مجھے کون ڈانٹتا ہے۔ مگر ابو اپنی دوسری چپل پہن کر نکل گئے اور امی ہادی کو چپ کرانے لگیں۔ جبکہ راضی اپنا داؤ خالی دیکھ کر مجھے گھور کر رہ گیا۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے۔ لوڈ شیڈنگ بہت ہو رہی تھی۔ دوپہر تین بجے بھیا بولے۔

"چلو۔۔۔ منی! سپر اسٹور چلتے ہیں کم از کم وہاں اے سی تو چل رہے ہوں گے۔" مجھے کون سی تیاری کرنی تھی؟ منہ دھویا۔۔۔ چادر اٹھائی اور ہم دونوں بہن بھائی سپر اسٹور پہنچ گئے۔ لسٹ کے مطابق چیزیں ٹرالی میں ڈالتے ڈالتے ہم برتنوں کے حصے میں آگئے۔ چیزوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے مجھے ایک بڑی باسکٹ نظر آئی۔

آج کل بجو کو کپڑے دھوتے ہوئے بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اور اس سے زیادہ پریشانی مجھے ہوتی تھی۔ کیونکہ چھوٹے سے ٹب میں کپڑے چھت تک لے جانے میں بہت چکر کاٹنے پڑتے تھے۔ اگر یہ باسکٹ لے لیتی۔ تو بہت سے مسائل حل ہو جاتے۔ غیر پرائس ٹیگ دیکھا۔ تو سو روپے تھا۔

بھیا کو دکھائی تو کہنے لگے۔ "لے لو۔"

آگے بڑھے تو ایک آنٹی مل گئیں پوچھا "بیٹا یہ باسکٹ کہاں سے لی؟" میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے جگہ بتادی۔

"کتنے کی ہے؟" اگلا سوال داغا گیا۔

"سو روپے کی۔" میں نے انکساری سے اس طرح جواب دیا۔ جیسے میری فرم اس مہنگائی میں باسکٹ سو روپے میں بیچ رہی ہے۔

آنٹی بھی سن کر ایسے خوش ہوئیں۔ جیسے ان کا پرائز بانڈ کھل گیا ہو۔ جب بل بنوانے لگے۔ تو بل دیکھ کر بھائی تھوڑا متذبذب ہو گئے۔ شاید بل میں کچھ غلطی تھی۔ انہوں نے چیزوں کو دوبارہ گننا کرنا شروع کیا۔ پھر کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے سے پوچھا۔

"یہ باسکٹ کتنے کی ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا "سات سو روپے کی۔"

بھیا نے میری طرف اور میں نے بھیا کی طرف دیکھا۔ خیر بھیا کچھ بولے نہیں۔ آخر بھیا بڑے تھے اور

میں ممی تھی۔

مگر واپسی پر ہم دونوں بہن بھائی ہنستے ہوئے آئے۔ یہ سوچ کر۔ کہ جب وہ آنٹی بل ادا کریں گی۔ تو ان کی کیا حالت ہوگی۔ جب سو والی باسکٹ سات سو روپے کی ملے گی۔

غلطی میری بھی نہیں تھی۔ دراصل اس طرف روشنی کم تھی اور سات کا ہندسہ اس طرح سے مٹا ہوا تھا کہ اندھیرے میں ایک کا ہندسہ نظر آرہا تھا۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے کام میری غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی میرے کھاتے میں ڈال دیے جاتے تھے۔

جیسے چوزے آئے۔ تو میری غلطی۔

جلدی مر گئے۔ تو بھی میری غلطی میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔

اگر خدانخواستہ جلدی بڑے ہو گئے۔ تو بھی میری غلطی کہ مجھے تو چوزے پالنے کا شوق ہی ہے۔

میں بے چاری بے قصور ہوتے ہوئے بھی باتیں سنتی تھی۔ آخر آپ کو... کیا کیا بتاؤں... اللہ سلامت رکھے۔ میری امی ابو کو جو میری ناز برداریاں کرتے تھے۔ خیر باقی تفصیل پھر کبھی بتاؤں گی۔ مگر ابھی میں کسی اور وجہ سے پریشان ہوں۔

ہوا یہ ہے کہ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ سب سے بڑی آپا شگفتہ جن کی شادی چار سال پہلے ہو گئی تھی۔ پھر بجو... پھر بھیا... پھر نینا آپی۔ پھر میں پھر تین چھوٹے بھائی۔ "راضی، عاصی اور ہادی۔"

نینا آپی کی منگنی بھی پھپھو کے بیٹے سے ہو گئی تھی۔ مگر بجو کا رشتہ ابھی تک نہیں ہو سکا تھا اور امی بہت پریشان تھیں۔

بہتیرے لوگ آچکے تھے۔ مگر کسی نہ کسی وجہ سے بجو کو مسترد کر دیا جاتا تھا۔ یہ نہیں کہ بجو کوئی ایسی... ویسی تھیں۔ بی اے پاس، سلیقہ مند، نازک سی بجو مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ امی اور ابو کی ایک ہی ڈیمانڈ تھی۔ کہ لڑکا کمانے والا ہو۔ مگر لڑکے والوں کی کوئی ایک ڈیمانڈ نہیں تھی۔ بلکہ بہت ساری ڈیمانڈز تھیں۔

اب ذرا ان کی باتیں سنیں۔ "لڑکی تو بہت اچھی ہے۔ مگر دبلی پتلی ہے۔ کچھ زیادہ ہی کمزور ہے۔"

"تو کیا آپ کو اس سے باکسنگ کروانی ہے۔" میں جلتی اور کلستی۔

ایک دفعہ مجھے بھی امی ابو بجو کے لیے لڑکا دیکھنے لے گئے۔ اس کو دیکھنے کے بعد امی کو پکا یقین تھا کہ ان کی بیٹی کو کوئی مسترد نہیں کر سکتا۔ مگر ایسا کیوں کر ہو بھلا؟ وہ لڑکے کی اماں تھیں۔ کہنے لگیں۔ "لڑکی کی عمر زیادہ لگتی ہے۔ اگر تیسرے نمبر والی ہو (اشارہ نینا آپی کی طرف) تو ٹھیک ہے۔"

غصہ تو مجھے اتنا آیا کہ اپنا سر دیوار سے دے ماروں۔ مگر درد مجھے ہی ہوتا۔ اس لیے باز رہی۔

کبھی کمنٹ آتا۔ "لڑکا موٹا ہے۔ لڑکی دبلی پتلی ہے۔"

کبھی کہتے "لڑکی کا قد لمبا ہے۔ اور لڑکا چھوٹے قد کا۔"

ان باتوں سے کچھ ہوتا یا نہیں ہوتا۔ مگر امی اور ابو کی ٹینشن بڑھ جاتی۔ کبھی کبھار مجھے لگتا کہ اگر ماں باپ کے بس میں ہو۔ تو وہ لڑکی کو فٹافٹ لڑکے کے گھر والوں کے مطابق کھینچ تان کر سائز صحیح کر دیں۔ تاکہ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو جائے مگر اللہ کا شکر ہے کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔

خیر سے آج کل بجو کا ایک رشتہ آیا ہوا تھا اور وہ کل ہی بجو کو دیکھ کر گئے تھے۔ اور انہیں بجو پسند آگئی تھیں۔ جس پر ہمیں اپنے گھر بلانے کا شرف بخشا گیا۔

ویسے عارف بھائی شکل و صورت میں برے تو نہیں تھے۔ مگر بات بات پر مسکرانا اور اپنے پان زدہ دانتوں کی نمائش کرنا، ہاتھ پر ہاتھ مار کر باتیں کرنا۔ اور جب شوق پوچھے گئے۔ "تو ہر جمعے کی صبح مرغا لڑوانا" سچ بتاؤں مجھے تو وہ کہیں سے آپا کے مزاج کے نہیں لگے۔

میں ان کی برائی نہیں کر رہی۔ ہر شخص کی اپنی عادت و اطوار اور انداز رہن سہن ہوتے ہیں اور اپنی

دنیا میں مگن ہر شخص اپنے ہی آپ کو بہتر سمجھتا اور جانتا ہے۔ مگر اسی طرح صنف نازک بھی اپنے ہونے والے پارٹنر کے بارے میں نرم و نازک احساسات رکھتے ہوئے زندہ رہتی ہے۔

اور میری نظر میں لڑکیوں کی ہزار خوبیوں کے مقابلے میں لڑکے کی صرف ایک خوبی دیکھنا زیادتی تھی۔

خیر سے آج میں امی سے لڑی بھی تھی۔ تو امی نے مجھے کہا ”کہ تم ابھی بچی ہو۔ زمانے کی اونچ نیچ نہیں سمجھتیں۔ جب میاں کما کر ہی نہ لائے گا۔ تو اس کی شکل کیا چاٹو گی؟“

خیر امی کی باتیں اپنی جگہ پر۔ مگر ہم بھی نئی نسل کے بچے تھے۔ اب میں چھت پر ہوا کھانے جا رہی ہوں۔ شاید کچھ ٹینشن دور ہو جائے۔ آپ بھی میرے لیے دعا کریں۔

☆ ☆ ☆

آج اتوار کا دن تھا۔ عارف بھائی کی پوری فیملی ہمارے گھر مدعو تھی۔ دراصل ان کی شادی شدہ بہنیں بھی آج آئی ہوئی تھیں۔ یہ دن بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ کیونکہ اگر وہ ہاں کر دیتیں تو رشتہ پکا تھا۔ کھانے کے دور کے بعد جب چائے بننے لگی۔ تو میں عارف بھائی کی بہن سدرہ کو اپنے ساتھ چھت پر لے گئی۔ باتیں کرنے کے لیے۔ خیر سے مجھے عارف بھائی پسند نہ آئے تھے۔ مگر سدرہ سے میری اچھی گاڑی چھننے لگی تھی۔ وہ تقریباً“ میری ہی ہم عمر تھی۔

اللہ اللہ کر کے نو بجے رات کو وہ سب چلے گئے۔ امی نے آج کے دن مہمان نوازی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور انہیں پکا یقین تھا کہ جواب ہاں میں ہو گا۔ مگر جواب تھا۔ کہ آہی نہیں رہا تھا۔ ناچار جب پندرہ دن گزر گئے۔ تو امی نے خود ہی فون کر لیا۔

تو گول مول سا جواب ملا ”نہیں جی۔۔۔ اس کی بڑی بہن کو وہ عارف کے حساب سے ٹھیک نہیں لگی۔ ہمارا بچہ ہنسی مذاق والا ہے اور آپ کی بیٹی تو بولتی ہی نہیں ہے۔“

امی نے۔۔۔ سنیں ان کی باتیں۔۔۔ اور؟ سنائیں ہمیں باتیں۔

”اللہ کا خوف نہیں ہے۔ اگر لڑکوں کی مائیں ہیں تو کیا ہوا؟“

”اللہ پوچھے گا۔ ان لوگوں سے۔ کم از کم اخلاقیات بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایک تسلی فون ہی کر دیتیں۔ مگر وہ بھی مجھے۔۔۔ یعنی بیٹی کی ماں ہی کو کرنا پڑا۔“

کبھی لڑکے والوں کو برا بھلا کہتیں۔ کبھی کہتیں ”میری بچی کی اچھی بھلی بات ہوتے ہوتے رہ گئی۔ پتا نہیں کس بد نظر کی نظر لگی ہے۔ کہیں پر بات پکی نہیں ہو پاتی۔“

”مجھے کہیں وہ مل جائے۔ پھر میں اس کا وہ حشر کروں گی۔“ امی اتنے جلال میں آتیں کہ مجھے کھانسی کے دورے پڑ جاتے۔ مجبوراً“ مجھے امی کا غصہ ٹھنڈا کرنا پڑتا۔

میں کہتی کہ ”امی بھلا کس کے پاس اتنا فالتو وقت ہے؟“

خدا گواہ ہے کہ یہ واحد ہمارے گھر کا ناخوشگوار اور میرے لیے خوشگوار واقعہ تھا۔ جس میں میرا نام نہیں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہم سب کو معلوم تھا کہ جب تک بجو کے لیے نئے رشتے کا کوئی دوسرا مرحلہ شروع نہیں ہوتا۔ امی نے اسی طرح اداس رہنا ہے۔ آج تائی اور تایا آئے تھے۔ مٹھائی لے کر قاسم بھائی کی جاب لگی تھی نا اس لیے۔

اب آپ پوچھیں گے کون قاسم بھائی۔۔۔؟

قاسم بھائی ہمارے تایا کے سب سے بڑے فرزند ہیں۔ ان سے دو بڑی بہنیں ہیں جو کہ پیا کے دیس سدھار چکی ہیں۔ جبکہ ایک چھوٹا بھائی عاصم ہے۔ تایا جی اور ابو مغرب کی نماز پڑھنے باہر چلے گئے اور خواتین یعنی تائی اور امی سر جوڑ کر باتیں کرنے لگیں۔

”سب کچھ ٹھیک تھا۔ پتا نہیں کس کی آہ لگ گئی؟

میری بچی کا اچھا بھلا رشتہ ہوتے رہ گیا۔" امی نے سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور اچھا رشتہ آجائے" تائی امی بولیں۔

"پتا! یہ جو حاسد ہوتے ہیں۔ کہیں پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سوچ رہی ہوں پیچھے والی گلی میں جو مولانا صاحب ہیں۔ ان سے ایسا تعویذ لاؤں کہ اس شخص کا منہ ہی بند ہو جائے۔ جس نے یہ کام کروایا ہے؟" امی تنک کر بولیں۔

میرا ہاتھ فوراً" اپنے منہ پر چلا گیا اور میرے منہ کا زاویہ بگڑ گیا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ جب میرا موڈ خراب ہو۔ تو میں چھت پر جاتی ہوں۔ کیونکہ اس سے میری ٹینشن دور ہو جاتی ہے۔ آرام آرام سے چلتی ہوئی جب میں سیڑھی کے آخری اور چھت کے پہلے زینے پر پہنچی۔ تو ایک مردانہ آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"تم فکر نہ کرو۔۔۔ بس دو تین دنوں میں ماریہ آپی اور تانیہ آئیں گی تب امی باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گی تاکہ چچا اور چچی کو منع کرنے کا موقع نہ ملے۔ اور ویسے بھی یہ جاب میں نے تمہاری وجہ سے کی ہے؟ ورنہ تم جانتی ہو کہ میں اپنے اسٹینڈرڈ سے کم والی جاب کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔"

یہ آواز قاسم بھائی کی تھی۔ دراصل برابر والا گھر تایا ابو کا تھا۔ وہ شاید اپنی چھت پر تھے اور بجو اپنی چھت پر۔ انہوں نے کیمسٹری میں ماسٹرز کیا تھا۔ دو سال ہو چکے تھے۔ مگر صرف اچھی جاب کی وجہ سے سیٹل نہیں ہو پا رہے تھے۔

"ویسے تمہارا شکریہ! اگر تمہارا رشتہ کسی اور سے ہو جاتا۔۔۔ تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرتا۔" قاسم بھائی شوخی سے بولے تھے۔

"اوہ۔۔۔ اوہ ابجو کا شکریہ۔۔۔ کیوں؟ شکریہ۔ تو آپ کو میرا ادا کرنا چاہیے تھا۔" میں الٹے ہاتھ پر سیدھے ہاتھ کا مکا بنا کر مارتی ہوئی بولی۔

اور یہ کیا؟۔۔۔ آپ؟ میرے پیچھے پیچھے اوپر آگئے؟

ہر بات کی تفتیش ضروری ہے کیا؟ شک کر رہے ہیں نا، آپ مجھ پر؟

میں نے کچھ نہیں کیا بھئی۔۔۔ میں بہت سیدھی سادی بچی ہوں۔

کیا۔۔۔ کیا امی کو بتائیں گے؟

رک جائیں۔۔۔ آپ لوگ امی کے پاس مت جائیں۔ ڈائجسٹ ہی پڑھتے رہیں۔ میں آپ کو سب کچھ سچ سچ اور ٹھیک ٹھیک بتاتی ہوں۔ اس دن جب میری امی سے بجو کے معاملے پر لڑائی ہوئی۔ تو میں اپنی ٹینشن دور کرنے کے لیے چھت پر چلی گئی۔

"آخر چچا کو اتنی جلدی کیا ہے؟ کون سی تمہاری عمر نکلی جا رہی ہے؟" یہ مردانہ آواز قاسم بھائی کی تھی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔

جواباً" مجھے رونے کی آواز آئی۔ جو کہ بلاشبہ بجو کی تھی۔

آگے میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں واپس آگئی۔ میری ٹینشن دور ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ بجو کی بات پکی ہونے والی تھی۔ اور قاسم بھائی بہت اچھے تھے۔ بالکل بڑے بھائیوں کی طرح۔ ہر ہفتے کے دن سموسے کھلاتے تھے۔ اور جمعرات کو جلیبیاں۔۔۔ اب سمجھ میں کچھ کچھ آرہا تھا۔۔۔ اگر بہنوئی بنتے تو۔۔۔ اور فائدے مل سکتے تھے۔

عارف بھائی۔۔۔ قاسم بھائی۔۔۔ قاسم بھائی۔۔۔ عارف بھائی۔۔۔ دونوں رات بھر میرے خواب میں آتے رہے۔

آخر جی کڑا کر کے۔۔۔ سوچ بچار کر۔۔۔ اللہ میاں سے پکی والی معافی مانگ کر بجو کی وجہ سے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔

اس دن جب عارف بھائی کی فیملی آئی تھی۔ تو میں سدرہ کو لے کر چھت پر گئی تھی۔ ہم دونوں باتیں کرتے کرتے۔۔۔ ڈراؤنی فلموں پر۔۔۔ اور فلموں سے جن بھوتوں پر آگئے تھے۔

"سدرہ! تمہیں معلوم ہے کہ اب بھی جن بھوت ہوتے ہیں۔" میں نے اس کے کان میں

سرگوشی کی۔

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں؟ جب میں چھوٹی تھی۔ تو ہمارے محلے میں لڑکے پر جن کی حاضری آتی تھی وہ بڑی بڑی فلاں فلاں زبان کھاتا تھا۔" سدرہ نے جھرجھری لیتے ہوئے بتایا۔

"ہم بھی بہت پریشان ہیں۔" میں رونی صورت بنا کر بولی۔

"تم کیوں پریشان ہو...؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"پچھلے سال ہم نانی کے گھر گاؤں گئے تھے۔ وہاں پر کھیتوں میں گھومتے گھومتے شام ہو گئی۔ راستے میں بجو کا پاؤں کہیں پڑ گیا تھا' جب سے وہ کم بخت جن عاشق ہو گیا ہے... اب بھی کبھار وہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس کی شادی کسی سے نہیں ہونے دوں گا۔"

میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔

"آہ! تو کیا ان کی شادی نہیں ہو سکتی؟ وہ تو بہت پیاری، بہت اچھی ہیں۔ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔" وہ بے قرار ہو کر بولی۔

"ارے نہیں پگلی... امی نے ایک بابا سے پوچھا تھا۔ تو انہوں نے کہا کہ جیسے ہی اس کی شادی ہو گی۔ وہ جن... بس ایک سال تک اس کے شوہر کو تنگ کرے گا۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور تم اور تمہاری فیملی تو ویسے بھی بہت اچھی ہے۔ مجھے یقین ہے عارف بھائی بجو کا بہت خیال رکھیں گے۔ اور ان کی خاطر ہر مصیبت مول لے لیں گے۔"

میں نے سدرہ کا ہاتھ تھام کر اس طرح کہا جیسے کہ ایک سمدھن اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اپنی سمدھن سے آخری وعدہ لینا چاہ رہی ہو۔

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں؟" سدرہ نے گھبرا کر کہا۔

سدرہ! "تم تو میری بہت اچھی دوست ہو نا، دیکھو کسی کو بھی یہ بات مت بتانا۔" اب میں نے اسے ساری بات بتا کر وعدہ لینا چاہا۔

"بھلا یہ بھی کوئی بتانے والی بات ہے۔" سدرہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"اب ہم نیچے چلیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔" کچھ دیر بعد سدرہ بولی۔ "نیچے ہمارا سامنا بجو سے ہو گیا۔ بجو کی شکل مرجھائی ہوئی تھی اور رنگ بھی کملایا ہوا تھا۔

"بجو! پہلے کے مقابلے میں کافی کمزور ہو چکی ہیں۔" میں نے سدرہ کے کان میں کہا۔ گھر والوں نے تو محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ ان کی شکل زرد کیوں ہو رہی تھی؟

خیر اس کے بعد میں نے سدرہ کو محفل میں واضح طور پر غائب پایا۔ اور ہوا... وہی جو کہ میرا اندازہ تھا۔ اگر آپ کسی کو ساری بات بتا کر کہیں کہ اب کسی کو نہ بتانا۔ تو یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔

جب ہی وہاں سے انکار سنا... میری تو باچھیں کھل گئیں... اب میں دعا مانگ رہی تھی کہ جلد ہی قاسم بھائی رشتہ بھیج دیں تاکہ یہ پریشانی جلد ہی ختم ہو جائے۔

آج اتوار کا دن بہت ہی روشن اور پر سکون ہے۔ مگر میں پھر بھی پریشان ہوں۔ میری پریشانیاں تو ختم ہی نہیں ہو رہیں۔ انڈین سوپ کی طرح بڑھتی جا رہی ہیں۔ دراصل آج قاسم بھائی اور بجو کی منگنی ہے اور صفائی کے ساتھ ساتھ کپڑے استری کرنا اور دیگر معاملات بھی میری ذمے داری ہیں۔

خیر سے ان سب سے تو میں چھٹکارا پا لوں گی۔ مگر اس معاملے کا کیا کروں؟

ارے بھئی... امی جمعرات کو مشکی بابا کے پاس جا رہی ہیں۔ مشک لینے تاکہ بجو کی زندگی کو آئندہ کسی کی آہ نہ لگے اور آئندہ کوئی بھی ان کے بچوں کی زندگی میں روڑے نہ اٹکا سکے۔

سنا ہے۔ کہ جب وہ مشک پڑھ کر دیتے ہیں۔ تو اس کی خوشبو سے اس انسان کو چھینکیں لگ جاتی ہیں۔ جس نے کسی کے ساتھ بھی کچھ الٹا سیدھا کیا ہو۔

آپ کو تو معلوم ہے نا... کہ میں کتنی سیدھی سادی معصوم سی بچی ہوں۔ کچھ ایسا ہو جائے کہ امی اس بابا کے پاس نہ جائیں۔

اور میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں نا ان سب کو تو میرے اوپر الزام لگانے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔

"کم آن۔۔۔ ہری اپ نوفل' حورین بیٹا۔ وی آر گیٹنگ لیٹ۔" عاشر نے جلدی جلدی ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے بچوں کو ناشتے کے لیے آواز دی۔ کیونکہ وہ کافی لیٹ ہو چکے تھے اور ابھی نہ جانے کتنا اور لیٹ ہونا تھا۔

"یس بابا! وی آر کمنگ۔" وہ دونوں بہن بھائی ناشتے کی ٹیبل پر عاشر کے منتظر تھے۔

"اوہ بیٹا! بیٹھے کیوں ہو' ناشتا شروع کرو۔" عاشر نے بیٹھتے ہی گرم چائے کا گھونٹ بھرا اور فرائی انڈے کی پلیٹ نوفل کی جانب کھسکائی۔

"بابا! آپ کو پتا ہے میں فرائی ایگ نہیں کھاتا۔ مجھے بوائل پسند ہے۔" نوفل نے برے برے منہ بناتے ہوئے پلیٹ پرے ہٹائی اور دودھ کا گلاس اٹھا کر پینے لگا۔

"بری بات ہے نوفل' ایسے نہیں کرتے۔ ایک تو بابا نے تمہارے لیے اتنی محنت سے ناشتا تیار کیا تمہیں پسند نہیں پھر بھی چپ چاپ کھا لینا چاہیے۔" خاموشی سے ناشتا کرتی حورین نے اس موقع پر نوفل کو سمجھانا اپنا فرض سمجھا مگر نوفل' وہ بھی عاشر کا ہی بیٹا تھا۔

"اوکے۔۔۔ آئی ایم سوری بیٹا! نیکسٹ ٹائم آئی ول بی کیئر فل۔۔۔" عاشر نے جھنجلا کے باقاعدہ معافی مانگنی

صائمہ نور

خلائی مخلوق

چاہی مگر نوفل ہنوز اینٹھا ہوا تھا۔ شاید ناراضی کی وجہ ماں کی عدم موجودگی تھی۔

"اوکے یار! بس کرو نا' میں کوئی خلائی مخلوق نہیں ہوں جو ہر کام پرفیکٹ کروں۔" عاشر تھوڑا غصے سے بولا۔ جملہ تو پرانا تھا جو بچوں نے اکثر اپنی ماں کے منہ سے سنا تھا' مگر آج باپ کے منہ سے سن کر ان کی آنکھوں میں جو حیرانی در آئی تھی اس پر عاشر خوب شرمندہ ہوا' وہ حیرانی درحقیقت اسے آئینہ جو دکھا گئی

تھی۔

عاشر اور سوہانہ کے پیار کی گاڑی زندگی کی اس حسین شاہراہ پر جو انہوں نے خود اپنے لیے چنی تھی، سبک رفتاری سے رواں دواں تھی۔ سوہانہ کی چھوٹی چھوٹی لاپروائیاں اور عاشر کا بھڑکتا ہوا غصہ کبھی کبھار اس گاڑی کے بریک کو بھی آزماتے اور راستے میں بھرتی کار کچھ دیر کے لیے ضرور ٹھہر جاتی مگر وہ ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔ وقت نے ثابت کرنا تھا۔

"سوہانہ! دیکھو نا یار میری پنک والی شرٹ نہیں مل رہی۔" عاشر نے خود ڈھونڈنے کی کوشش میں ناکام ہو کر مصروف سی پیپر چیک کرتی سوہانہ کو آواز دی۔

"اوہ ہاں وہ تو میں نے ڈرائی کلین کے لیے دی ہے۔" تھوڑا اٹک کر سوہانہ نے معروف انداز میں جواب دیا۔ عاشر کے متوقع غصے سے واقف جو تھی۔

"کیا... " عاشر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ لمحوں میں غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔ "کتنی بار منع کیا ہے میں نے کہ کلرڈ شرٹس ڈرائی کلین کے لیے نہ دیا کرو... بس اپنی جان چھڑانی ہوتی ہے تمہیں۔" عاشر کی آواز کافی بلند تھی۔

"آئی ایم ساری عاشر نیکسٹ ٹائم میں خیال رکھوں گی۔" وہ واقعی شرمندہ ہو رہی تھی۔ کپڑوں کے معاملے میں عاشر کی جذباتیت اور نفاست دونوں سے آشنا تھی۔

"واٹ سوری؟ اتنا سا خیال نہیں رکھ سکتیں تم... اتنی سی کیئر نہیں کر سکتیں کہ کون سے کپڑے ڈرائی کلین کے لیے دینے ہوتے ہیں اور کون سے گھر میں دھونے ہوتے ہیں، صرف خیال ہی تو رکھنا ہوتا ہے تمہیں، کون سا تم دھوتی ہو گھر میں ہر کام کے لیے ماسی آتی ہے، پھر بھی اتنی لاپروائی... حد ہے یار" سوہانہ کی معافی اور شرمندگی بھی عاشر کا غصہ کم نہ کر سکی تھی۔

"ماسی آتی ہے؟ لاپروائی؟ یہ کیا بول رہے ہو تم..." اب کے سوہانہ کے سر سے لگی اور تلووں میں بجھی... وہ بے ساختہ پیپرز کو ایک طرف اچھال کے عاشر کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ شادی کے بعد سوہانہ کی برا ماننے کی حس بری طرح متاثر ہو گئی تھی، مگر پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی، ثابت ہوا تھا۔ "گھر میں ہر کام کے لیے ماسی اس لیے آتی ہے کیونکہ میں صبح آٹھ بجے سے لے کر ڈھائی بجے تک اسکول میں ہوتی ہوں اور گھر کے کام کاج چھوڑ کر شوقیہ جاب تو نہیں کرتی اور جاب سے آکر بھی میں فارغ نہیں بیٹھتی کھانا پکانا، کھلانا، صفائی کرنا اور ماسی سے سارے کام کرواتے ہوئے اسے مینیج اور سپروائز کرنا میری ہی ڈیوٹی ہے؟" وہ ہاتھ نچا نچا کے بات کر رہی تھی۔

"اس ساری روٹین میں اگر کوئی کام میں بھول جاؤں تو تم اسے میری لاپروائی گردانتے ہو... بڑے ہی افسوس کی بات ہے۔" وہ کچھ دھیمی ہوئی۔ "اور اب تم مجھے طعنے دو گے کہ میں لاپروا ہوں" کہتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"طعنہ میں نے دیا یا تم مجھے دے رہی ہو کہ تمہیں میری کم آمدنی کی وجہ سے جاب کرنی پڑ رہی ہے۔" وہ بھی کچھ دھیما ہوا۔

"میں نے تمہیں کوئی طعنہ نہیں دیا، تم نے مجھے مجبور کیا بولنے پر... سارا کام ماسی کرتی ہے نا تو تم کرواؤ سب ماسی سے اب میں ایک منٹ بھی نہیں رکوں گی یہاں اس گھر میں..." وہ پھر سے غصے میں آئی تھی۔

"مرضی ہے تمہاری..." عاشر کا غصہ بھی کہاں اترا تھا۔ سو و بدو جواب دیا۔

"تم کیا سمجھ رہے ہو میں ایسے ہی بول رہی ہوں، جاؤں گی نہیں..." سوہانہ نے عاشر سے سوال کیا۔

"میں نے تمہیں کچھ کہا کیا... تم نے کہہ دیا ہے تو ظاہر ہے، جاؤ گی۔" عاشر بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے ایزی ہوا تھا۔

"اوکے... بائے... میں جا رہی ہوں۔" سوہانہ نے جانے کا حتمی فیصلہ کرتے ہوئے پیر پٹخا تھا۔

"جا رہی ہو تو پورا ہفتہ رک کر آنا۔" عاشر نے کچھ مزا لیتے ہوئے کہا۔

"مائی فٹ..." سوہانہ تلملا گئی تھی۔

"بابا! بھوک لگی ہے۔ آپ اب تک آئے کیوں نہیں۔" ٹھیک دن کے تین بجے حورین نے عاشر کے نمبر پر کال کی تھی۔ سوہانہ کو گئے ایک دن ہونے کو تھا اور عاشر کو اپنے اور بچوں کے کھانے تک کا ہوش نہ تھا۔

"اوہ۔ رئیلی سو سوری بیٹا میں واقعی بھول گیا۔ آپ تین منٹس ویٹ کرو، میں لنچ لے کر گھر آتا ہوں، پھر مل کر لنچ کریں گے۔"

"اوکے۔ بابا۔" حورین نے تھکن سے فون بند کیا، اسے شدید بھوک لگی تھی۔ عاشر گھر پہنچا تو تینوں نے مل کر لنچ کیا، اتنے میں ماسی بھی آچکی تھی۔ عاشر فارغ ہو کے کچھ دیر کے لیے صوفے پہ لیٹا تو کب' ہوش ہو گیا اسے خبر ہی نہ ہوئی۔

جب عاشر کی آنکھ کھلی تو پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یقیناً مغرب ہو چکی تھی اور بچے بھی سوئے ہوئے تھے۔ اگر سوہانہ ہوتی تو وہ کب کی شام کی چائے بمعہ لوازمات کے پی چکا ہوتا اور بچے ٹیوشن۔۔۔ مگر ابھی وہ نہیں تھی، اس کا ذہن خود بخود سوہانہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ سر جھٹک کر لائٹ جلائی تو منظر دیکھ کر حیران رہ گیا، جو چیز جہاں چھوڑی تھی وہیں پڑی تھی۔

گھر کا فرش دھول مٹی سے آزاد ضرور ہوا تھا، مگر پورا گھر جوں کا توں تھا۔ کچن کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ صرف وہ برتن دھوئے گئے تھے جو سنک میں رکھے تھے۔ عاشر کا سر گھومنے لگا۔ سوہانہ کی صرف ایک دن کی غیر موجودگی میں گھر کی ایسی حالت ہو گی، اس نے سوچا نہ تھا۔ واقعی سوہانہ سچ کہتی تھی۔ ماسی ضرور آتی تھی، مگر اس کے بغیر کئی کام ممکن نہ تھے۔ عاشر نے سوچا اور ٹھنڈی آہ بھری۔۔۔ اور اگر ایسے میں کسی کام میں بھول چوک ہو بھی جائے تو اسے طیش میں آکر لڑنے کے بجائے نظر انداز کرنا چاہیے یا آرام سے سمجھنا اور سمجھانا چاہیے۔ یک دم ہی اس کا دل سوہانہ کے لیے بے قرار ہونے لگا۔ وہ فوراً "فیصلہ کرتے ہوئے" بچوں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ بچوں کو اٹھا کر تیار ہونے کا بول کر خود فون ملا کر بیٹھ گیا۔

عاشر کا نمبر اپنے موبائل پر دیکھ کر سوہانہ کچھ ترنگ میں آئی اور مغرور ہو کر فون اٹھایا۔

"کہو کیسے فون کیا۔۔۔ ایک دن بھی نہیں گزرا تم نے تو ہفتے بھر کا کہا تھا۔" وہ زور دے کر بولی۔

"وہ دراصل میں نے ایک بات رئیلائز کی ہے۔" عاشر نے ہنسی روک کر کہا۔

"وہ کیا؟" سوہانہ پوری توجہ سے سن رہی تھی۔

"وہ یہ کہ تم ہمیشہ کہتی ہو نا کہ تم کوئی "خلائی مخلوق" نہیں ہو۔" عاشر نے ہنسی روک کر کہا۔

سوہانہ تھوڑی حیران ہوئی۔ "ہاں میں کہتی ہوں، مگر تم نے کیا رئیلائز کیا ہے۔" وہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

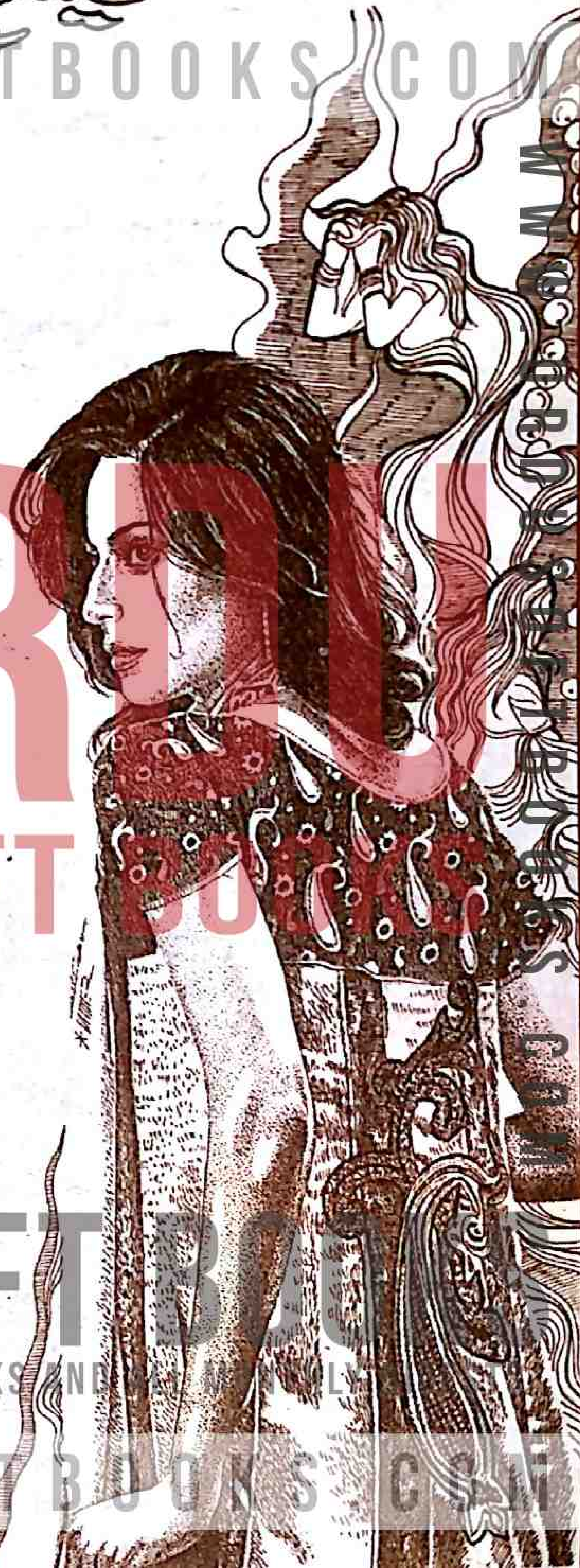
"یہی کہ تم سچ کہتی ہو، تم کوئی خلائی مخلوق نہیں ہو۔"

"عاشر!" سوہانہ زور سے چلائی، مگر آواز مان بھرے غصے سے پر تھی۔

☆

راشدہ رفعت

[illegible]



موسم بدل رہا تھا۔ طویل موسم گرما رخصت ہو گیا تھا اور ابھی سرما کے آنے میں بہتیرا وقت پڑا تھا۔ اگرچہ ابھی دن اور رات کا دورانیہ تقریباً برابر ہی تھا، پھر بھی دن کچھ سکڑے، سمٹے سے لگنے لگے تھے، یہ ایک ایسا ہی دن تھا انابیہ یونیورسٹی سے لوٹی تو تھکاوٹ سے برا حال تھا۔ ارادہ یہ ہی تھا کہ شاور لینے کے بعد کھانا کھائے گی اور پھر بستر پر پڑ جائے گی لیکن یہ ارادہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ پایا تھا۔ گھر پہنچتے کے ساتھ ہی ایمن کی روہانسی صورت دیکھنے کو ملی تھی۔

"امی، خالہ جان کی طرف گئی ہیں اور مجھ سے ہانڈی جل گئی۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے بتایا تھا۔

"جس ہانڈی میں توریاں پک رہی ہوں اس کا جلنا ہی بہتر" آپی کو اصل مسئلہ بتاؤ۔ شفیق کا تندور اور ہوٹل بند پڑا ہے۔ اب باہر سے پکی پکائی روٹی نہیں آ سکتی۔" اسامہ نے تھکے ہارے بیزار کن لہجے میں اطلاع دی۔ اسے کالج سے آئے دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے اور ابھی تک کھانا ملنے کے دور، دور تک امکانات نہ تھے۔

"تو میرا کیا قصور، میں تو آج کالج سے چھٹی کر کے پھنس گئی۔ صبح ماسی صاحبہ نے چھٹی کر لی۔ مجھے سارے گھر کی صفائی کرنی پڑی، پھر امی ڈھیر ساری توریاں دے کر خالہ کے گھر چلی گئیں۔ اتنی دیر میں سبزی بنی۔ ہانڈی چڑھا کر میں تھوڑی سی دیر کے لیے ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئی پھر پتا نہیں کیسے ہانڈی جل گئی۔" ایمن نے اپنا دکھڑا رویا تھا۔

"یار آپی پلیز، کوئی آملیٹ وغیرہ بنا کر روٹی ڈال دیں سچ بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔" اسامہ نے

اسے لجاجت سے مخاطب کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے کرتی ہوں کچھ انتظام لیکن امی کو خالہ کی طرف کیوں جانا پڑ گیا۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو گئی تھیں۔" اس نے خود کلامی کی۔ ایمن اور اسامہ نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

انابیہ نے شاور لینے کے بجائے ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا کیا۔ پھر جلدی سے باورچی خانے کی راہ لی۔ آلو پیاز کاٹ کر آملیٹ بنایا روٹی ڈالنے کے لیے فریج میں سے آٹا نکالا تو بمشکل دو روٹی کا گندھا ہوا آٹا ملا۔ تھکن سے برا حال تھا۔ اس نے آٹا گوندھنے کے بجائے میسر آٹے سے دو پتلی پتلی چپاتیاں پکا کر ایمن اور اسامہ کے آگے رکھیں۔

"بتاؤ، کچھ گزارا ہو جائے گا۔" اگرچہ وہ جانتی تھی کہ اسامہ کو بھوک لگی ہو تو وہ دو، تین چپاتیاں آرام سے تناول فرما سکتا ہے لیکن آج بے تحاشا تھکن کی وجہ سے اس نے تجاہل عارفانہ برتا تھا۔

"ہمارا گزارا تو ہو جائے گا لیکن آپ کیا کھائیں گی۔" ایمن نے پوچھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے یونی میں برگر لے لیا تھا۔ بس اب تھوڑی دیر سوؤں گی۔" وہ پیٹ میں بھاگتے دوڑتے چوہوں کو ریس جاری رکھنے کا اذن دے کر دانستہ جھوٹ بولتی بیڈ روم میں آگئی اور پھر بستر پر پڑ کر جو بے خبر سوئی ہے تو شام ڈھلے ہی آنکھ کھلی۔

آنکھ کھلنے کے بعد پہلا احساس بے تحاشا بھوک کا تھا۔ سلیپر پاؤں میں ڈال کر اس نے پھر کچن کا ہی رخ کیا تھا۔

کوکنگ رینج کے پاس کھڑی شخصیت کو دیکھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اب بہت جلد کچھ بہت مزے کا کھانا کھانے کو ملنے والا تھا، یہ طے شدہ بات تھی۔ ایمن اور اسامہ بھی ہیلپر کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔



"ہیلو ایوری باڈی کیا ہو رہا ہے؟" اس نے بشاشت سے انہیں مخاطب کیا۔ سلجوق نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"بچوں کو بھوکا مار دیا تم نے' ان کے کھانے کا بندوبست کر رہا ہوں۔"

"میں نے بھوکا مارا۔" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں پھر دونوں "بچوں" کو گھورا۔ "روٹی اور آملیٹ بنا کر نہیں دیے تھے کیا۔"

"وہ چپاتی تو کھاتے' کھاتے ہی ہضم ہو گئی تھی آپی! اب پھر سے زوروں کی بھوک لگی ہے۔" اسامہ نے مسکین سی شکل بنا کر جواب دیا۔

"تمہارا لنچ بھی ہضم ہو گیا اور مجھے دیکھو صبح سے دو سلائس اور چائے کے ایک کپ پر ہوں۔ اس وقت اتنی تھکن ہو رہی تھی کہ آٹا گوندھ کر روٹی ڈالنے کی ہمت ہی نہ ہوئی پھر جو سوئی۔"

"تم نے صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے۔" سلجوق نے اس کی بات کاٹ کر خفگی سے پوچھا۔ انابیہ نے مزے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم اپنا خیال کیوں نہیں رکھتیں، کتنی کمزور ہو گئی ہو۔ پراپر ڈائٹ لیتی نہیں ہو اسی لیے تو آئے روز بی پی لو رہتا ہے۔" سلجوق کو اس پر غصہ آیا تھا۔ وہ مسکراتی رہی۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے فروٹ باسکٹ میں سے سیب نکال کر دھویا تھا پھر چھری اور پلیٹ میز پر رکھے۔

"اس کرسی پر تشریف رکھیں اور سیب کاٹ کر کھا لیجئے۔ ابھی کھانا بننے میں تھوڑا ٹائم لگے گا۔"

"خوشبو تو بہت مزے کی آ رہی ہے' کیا بنا رہے ہو؟" اس نے حکم کی تعمیل کرتے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سلجوق بھائی تو جو بھی بناتے ہیں مزے کا ہی بناتے ہیں۔ آج چکن کڑاہی سے ملتی جلتی کوئی ڈش ہے۔ نام کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔" جواب اسامہ کی طرف سے آیا تھا۔

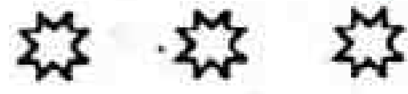
انابیہ مسکرا دی۔ سچ یہ ہی تھا کہ سلجوق کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ عام روایتی طریقوں کی پیروی بھی نہ کرتا تھا۔ ہر بار مختلف طریقے سے کچھ منفرد سا پکاتا اور سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔

"ایمن چندا! ڈریسنگ ٹیبل پر سے میرا سیل فون تو اٹھا کر لا دو۔ ذرا امی کو فون کر کے پوچھوں اب تک آئیں نہیں۔" انابیہ نے ایمن کو مخاطب کیا۔

"امی کا فون آیا تھا جب آپ سو رہی تھیں۔ انہوں نے خالہ کے ساتھ ان کی کسی نند کا حال پوچھنے جانا تھا۔ کہہ رہی تھیں دیر ہو جائے تو فکر مت کرنا۔ احتشام انکل جب آفس سے آئیں گے تو امی کو گھر چھوڑ جائیں گے۔" ایمن نے ماں کا پیغام کہہ سنایا۔

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ تمہارے انکل کو بلاوجہ زحمت ہو گی۔ چچی جان کو چاہیے تھا فون کر کے مجھے بلا لیتیں۔" سلجوق سنجیدگی سے بولا۔

"امی کو لینے آپ چلے جاتے تو ہمیں ایسی مزیدار کڑاہی کون بنا کر کھلاتا۔" ایمن کھلکھلائی تھی۔ سلجوق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کے چہرے پر یہ پیاری سی مسکراہٹ کتنی بھلی لگتی تھی۔ انابیہ اس کے چہرے پر سے نگاہیں نہ ہٹا پائی۔ اسی وقت سلجوق نے اسے دیکھا تھا۔ اسے اپنی جانب تکتا پا کر سوالیہ انداز میں بھنویں سکیڑی تھیں۔ انابیہ نے سٹپٹا کر نگاہیں چرا لیں۔ سلجوق کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔



"چند گھنٹوں کے لیے گھر سے کیا گئی پیچھے سے سب کو من مانی کا موقعہ مل گیا۔ غضب خدا کا دو کلو چکن ایک وقت میں بھون بھان کر کھا گئے۔"

ذکیہ بیگم کا قلق ختم ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔ حالانکہ کل رات وہ گھر لوٹیں تو سب کھانے کے لیے بیٹھ چکے تھے' وہ عین وقت پر طعام میں شریک ہوئی تھیں۔ بہت رغبت سے انہوں نے سلجوق کی بنائی ہوئی ڈش سے انصاف کیا تھا' وہ تو کھانے کے اختتام پر اسامہ نے ایک بار پھر سلجوق کی شان میں قصیدہ پڑھا تو

ذکیہ کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

"تم دونوں بہنیں ایک وقت کا کھانا بھی خود نہ بنا سکیں۔ سلجوق کو کچن میں گھسنے ہی کیوں دیا۔" رات سونے سے پہلے انہوں نے بیٹیوں کے بیڈ روم میں جا کر انہیں لتاڑا۔

"کیا ہو گیا امی۔ اتنا مزے کا ڈنر کروا دیا سلجوق بھائی نے اور آپ خفا ہو رہی ہیں۔" ایمن کو ماں کی ناراضی بے سبب لگی تھی۔

"کھانا تو مزے کا بننا ہی تھا۔ مٹھی بھر بھر مسالے جھونکتا ہے۔ بے دریغ آئل ڈالتا ہے اور پھر دیدہ دلیری دیکھو بنا پوچھے دو ڈھائی کلو چکن پکا لیا۔ دو دن کی ہانڈی بن جاتی اس میں اور تین وقت کھا لیتے۔ ایک وقت کے کھانے میں برابر کر دیا۔"

انہیں رہ رہ کر تاؤ چڑھ رہا تھا۔ اس مبالغہ آمیزی پر انابیہ بس ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔ سلجوق کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے ہی اتنی تنگ نظر اور کٹھور تھیں۔ گھر کے مالی حالات انتہائی تسلی بخش تھے۔ انہیں ہر نعمت وافر میسر تھی، جانے مرحوم جیٹھ کے بیٹے سے انہیں کیا پرخاش تھی کہ اس کا کھانا پینا پہننا اوڑھنا سب کھلتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ سلجوق خوش لباس بھی تھا اور خوش خوراک بھی۔ ذکیہ کھانے پینے کی چیزوں کو اس کی دسترس سے دور رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے رہتیں۔ ان کے اپنے بچے زمانے بھر کے نکھتے، فروٹ کاٹ کر انہیں پلیٹ میں سجا کر پیش کر دو، تب بھی سو نخروں سے کھاتے تھے۔ سلجوق کی نظر فروٹ باسکٹ پر پڑ جاتی تو وہ پھلوں کا "صفایا" کر دیتا۔ کبھی کسی فروٹ کا شیک بنا لیتا تو کبھی انتہائی مزیدار کریم والی فروٹ چاٹ بنا لیتا۔ نہ صرف خود کھاتا بلکہ سب گھر والوں کو کھلاتا۔ کبھی جگ بھر بھر ملک شیک بنا ڈالتا۔ ذکیہ اسے تو کچھ نہ کہہ پاتیں۔ اکیلے میں اولاد پر ضرور چڑھ دوڑتیں۔ بچے ماں کو تاسف سے دیکھ کر رہ جاتے۔

سلجوق منیر ذکیہ کے جیٹھ کا بیٹا تھا۔ ذکیہ کی شادی کے ڈیڑھ برس بعد ان کی جیٹھانی دوسرے بچے کی زچگی کے دوران انتقال کر گئی تھیں۔ سلجوق کی عمر اس وقت ساڑھے تین برس تھی۔ وہ دادا، دادی اور چچا کا بے تحاشا لاڈلا تھا اور یہ لاڈ ذکیہ کو بے پناہ کوفت میں مبتلا کرتا تھا۔ وہ خود امید سے تھیں لیکن شوہر کو ان کی اور ہونے والے بچے کی کوئی پروا نہ تھی۔ ان کی توجہ کا محور ان کا بھتیجا تھا، جس کو کم سنی میں ہی ماں سے محرومی کا صدمہ سہنا پڑا تھا حالانکہ اس چھٹانک بھر کے بچے کو ابھی اتنی عقل سمجھ کہاں تھی کہ وہ اس صدمے کو محسوس کر پاتا لیکن پورا گھرانہ اس کے نخرے اٹھانے میں مصروف رہتا اور یہ توقع ذکیہ سے بھی کی جاتی کہ وہ بن ماں کے بچے کا ماں کی طرح خیال رکھیں۔

جیٹھانی کے انتقال کے بعد گھر کی سب ذمہ داریاں خود بخود ذکیہ کے کندھوں پر آ گئی تھیں۔ ساس ضعیف تھیں اور دمے کی مریض، وہ صرف بستر پر بیٹھ کر ہدایات جاری کر سکتی تھیں اور یہ ہدایات زیادہ تر سلجوق کے

خیال رکھنے پر مشتمل ہوتی۔
"سلجوق کو یہ پسند ہے یہ پکالو۔ یہ ناپسند ہے یہ مت پکاؤ۔ اگر پکا ہی لیا ہے تو اس کے لیے اس کے من پسند سینڈوچ تیار کردو۔ وہ آج میلا یونیفارم پہن کر اسکول کیوں گیا ہے۔ اسے لنچ باکس تیار کرنے کے بجائے صرف پیسے کیوں دے دیے گئے۔ اس کی شرٹس کے بٹن ادھڑ گئے ہیں۔ ذکیہ فرصت کے وقت ذرا اس کی وارڈ روب سیٹ کردینا۔" اس طرح کی بہتیری نصیحتیں اور بہت سے کام ذکیہ کے ذمے لگتے رہتے' وہ مارے باندھے یہ سارے کام نمٹا دیتیں لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ سلجوق سے ان کی بیزاری میں اضافہ ہوتا گیا۔

ان کی خواہش تھی کہ جیٹھ دوسرا بیاہ رچالیں تاکہ انہیں کچھ تو سکون کا سانس ملے لیکن محبوب بیوی کے بچھڑنے کے بعد منیر احمد کا جینے سے جی ہی اچاٹ ہو گیا۔ معمولی سا اٹیک تھا مگر ان کا دل وہ بھی نہ سہار پایا، وہ بیوی کے پہلو میں ابدی نیند جا سوئے۔ ذکیہ کی گود میں چند ماہ کی انابیہ تھی وہ پہلوٹھی کی بیٹی کو سنبھالنے میں ہلکان ہوئے رہتیں۔ ساتھ ساتھ سلجوق کی "بھاری" ذمہ داری بھی مستقل طور پر ان کے سر پڑ گئی تھی۔

وہ بچپن میں بلا کا ضدی تھا۔ دادا' دادی اور چاچو کے پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا اور یہ بگڑا ہوا بچہ ذکیہ کو زہر سے بھی بدتر لگتا۔ خیر وقت گزرنے کے ساتھ سلجوق کی ضد کرنے کی عادت ختم ہو گئی۔ وہ اب بہت صلح جو قسم کا بچہ تھا۔ اپنے سے چھوٹی انابیہ کا خوب خیال رکھتا۔ بے جا فرمائشیں بھی چھوڑ دی تھیں لیکن اس سب کے باوجود وہ ذکیہ کے دل میں کبھی جگہ نہ بنا پایا۔

وہ انہیں ہمیشہ اپنے سر پر پڑنے والی بھاری ذمہ داری لگا کرتا۔ ایسی ذمہ داری جس سے گلو خلاصی ممکن نہ تھی۔ دادا' دادی طبعی عمر پوری کرکے رخصت ہوئے پھر بھی ذکیہ کی راجدھانی میں سلجوق کی اہمیت کم نہ ہو پائی۔

وہ اب بھی اپنے چاچو کا لاڈلا تھا۔ نجیب' بھتیجے پر خوب جان چھڑکتے اور ذکیہ جی ہی جی میں کلستی رہتیں۔ شروع شروع میں انہوں نے سلجوق کے خلاف میاں کے کان بھرنے کی بہت کوشش کی لیکن ایسی کوششوں کے نتیجے میں انہوں نے شوہر کو بھتیجے کے بجائے خود ان ہی سے متنفر ہوتے پایا تو پھر انہوں نے ایسی کوششیں ترک کردیں۔ سلجوق سے چڑنے کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ انہیں لگتا صرف سلجوق کی وجہ سے وہ اپنے شوہر اور سسرال والوں کے دل میں جگہ نہ بنا پائی تھیں۔ بھلا ایک پرائے بچے کو کس طرح وہ اپنی سگی اولاد کی طرح چاہ سکتی تھیں لیکن سب ان سے یہ ہی توقع لگائے بیٹھے تھے۔

نجیب اور ان کے مابین ہونے والی کھٹ پٹ کا بنیادی سبب سلجوق ہی ہوا کرتا۔ وہ بھتیجے کا خیال رکھنے کے بارے میں بیوی کو ہدایات دیتے رہتے اور سلجوق کے لیے ذکیہ کی چڑ میں اضافہ ہوتا رہتا۔ شوہر پر تو ان کا کیا بس چلتا ان کے تو بچے بھی اس کے دیوانے تھے۔ ذکیہ کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کون سی جادو کی چھڑی لاکر گھمائیں کہ یہ لڑکا ان کی زندگی سے دور چلا جائے لیکن ایسا ہونا ممکن نظر نہ آتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ سلجوق کی اس گھر میں حیثیت مزید مستحکم ہو گئی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد نجیب نے اسے جاب نہ کرنے دی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیا تھا۔ وہ اب بہت فخر سے اسے اپنا دایاں بازو کہتے تھے۔ ذکیہ کے خیال میں اس چھوٹے سے بزنس میں سلجوق کو کھپانے کی کوئی تک ہی نہ بنتی تھی وہ کہیں اور نوکری کرتا تو چار پیسے تو کما کر لاتا اب تو وہ صرف چاچا کے پیسے پر عیش کر رہا تھا۔ اس جیسے لاابالی لڑکے کو کام وام کی سمجھ بوجھ کہاں تھی۔ نجیب بلاوجہ اس کی تعریفیں کرکے اسے بانس پر چڑھائے رکھتے تھے۔

ذکیہ کے خیال میں اس لڑکے کو کسی بڑے ہوٹل

میں باورچی لگ جانا چاہیے تھا۔ بلا کا ذائقہ تھا کم بخت کے ہاتھ میں۔ اناہیہ' ایمن اور اسامہ اس کی کوکنگ کے دیوانے تھے۔ اکثر ذکیہ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سلجوق کی ماہرانہ کوکنگ سے استفادہ کرتے ـــــ بعد میں وہ بچوں پر خوب بگڑتیں لیکن بچوں کو ماں کے بگڑنے کی پرواہی کب تھی۔

اس سلجوق کی وجہ سے پہلے انہیں شوہر کی بے اعتنائی سہنا پڑتی تھی اور اب بچے بھی ماں کے جذبات سمجھنے کے بجائے سلجوق کا ہی دم بھرتے تھے۔ ذکیہ صرف کڑھتی رہتی تھیں کہ کڑھنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

✡ ✡ ✡

اس ماہ بجلی کا بل توقع سے بڑھ کر آیا تھا۔ ذکیہ اس وقت سے بڑبڑا رہی تھیں۔

"تمہارا باپ کوئی لینڈ لارڈ نہیں ہے نہ ہی تم کسی نواب کی اولاد ہو۔ اپنے اپنے کمروں میں اے سی چلا کر بیٹھے رہتے ہو۔ میں پوچھتی ہوں کسی ایک جگہ سب اکٹھے بیٹھ کر دن نہیں گزار سکتے۔" وہ خفگی سے بچوں سے مخاطب تھیں۔

"اب اے سی کہاں چلاتے ہیں امی! اب تو پنکھے کی ہوا بھی ٹھنڈی لگتی ہے۔ یہ پچھلے ماہ کا بل ہے اس بار اتنا نہیں آئے گا۔" اناہیہ نے ماں کو تسلی دی۔

"چچی جان بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔ ہم لوگوں نے مل کر بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ آج سے سب چچی جان کے کمرے میں مل کر بیٹھا کریں گے۔ اناہیہ اور ایمن! تم اپنی بکس' اسامہ تم اپنا موبائل اور میں اپنا لیپ ٹاپ لے کر چچی کے بیڈروم میں چلتے ہیں۔" سلجوق نے ان کی بات کی تائید کے ساتھ ہی تجویز پیش کی تھی۔ ذکیہ سٹپٹا گئی تھیں۔ اناہیہ سے ہنسی روکنا دوبھر ہو گیا۔

"اب میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ سب مل کر میرے کمرے پر ہلہ بول دو۔ بس تم سب لوگ ذرا کفایت شعاری کی عادت ڈالو پیسے درختوں پر نہیں اگتے۔" وہ رسانیت سے بولی تھیں۔

"بالکل ٹھیک کہا چچی جان!" سلجوق نے اس بار بھی تابعداری سے ان کی تائید کی لیکن اس کی بھوری آنکھوں کی شرارتی چمک بتا رہی تھی کہ اس کی نوک زبان پر کوئی اور فقرہ مچل رہا ہے۔ اتنے میں اس کا سیل فون بج اٹھا تو وہ فون سننے لاؤنج سے باہر چلا گیا۔

"تمہاری بتیسی کیوں اندر نہیں جا رہی؟" ذکیہ نے یک دم توپوں کا رخ اناہیہ کی طرف موڑ لیا۔ اس کی مسکراہٹ کو بریک لگ گئے۔

"اور اب ذرا کتابوں کا پیچھا چھوڑ دو۔ دو چار دن میں تمہاری خالہ جان اپنی نند اور اس کی جیٹھانی کو لے کر ہماری طرف آ رہی ہیں۔ اپنی نگرانی میں گھر کی تفصیلی صفائی کرواؤ پھر لنچ کا مینو بھی فائنل کرتے ہیں۔" انہوں نے اناہیہ کو مخاطب کیا۔

"فار گاڈ سیک امی! میرے فائنل پیپرز سر پر ہیں اور آپ کو دور پار کے رشتہ داروں کی دعوتیں سوجھ رہی ہیں۔ خالہ جان کی تو خیر ہے یہ ان کی نند اور جیٹھانی کس خوشی میں تشریف لا رہی ہیں۔" اس نے خفگی سے دریافت کیا۔

"دنیا سے کٹ کر تو نہیں رہ سکتے نا۔ رشتہ داروں سے ملنا ملانا پڑتا ہے اور ہاں ایک چکر پارلر کا بھی لگا لینا۔ کیسی بے رونق جلد ہو رہی ہے۔" انہوں نے ایک اور کام ذمے لگا دیا۔

"مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں اور آپ پارلر بھیج رہی ہیں۔ میں بس پروین کے سر پر کھڑے ہو کر گھر کی صفائی کروا لوں گی اور مجھ سے کوئی امید مت رکھیے گا۔ لنچ کا مینو میرے بجائے سلجوق سے ڈسکس کر لیں۔ بہترین مشورہ دے گا بلکہ میری مانیں تو ایک آدھ ڈش اسی سے بنوا لیجئے۔ مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔" اس نے ماں کو مفت مشورے سے نوازا تھا۔

"دماغ خراب نہیں ہے میرا اور ہاں یہ تم اتنے دھڑلے سے سلجوق کا نام کیوں لیتی ہو۔ چار سال بڑا ہے تم سے 'سلجوق بھائی کہہ کر پکارا کرو اسے۔ لوگ

خوامخواہ تمہاری عمر کے بارے میں غلط اندازے لگاتے ہیں۔" انہوں نے انابیہ کو ٹوکا تھا مگر اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

ماں کی خشمگیں نگاہیں خود پر مرکوز پا کر اس نے ہنسی کا گلا گھونٹا۔

"سلجوق کو بھائی کیسے کہہ سکتی ہوں آپ بچپن میں ٹوکتیں تو ہو سکتا ہے۔ مجھے عادت پڑ جاتی لیکن اب تو یہ ناممکن ہے۔"

اس نے سنجیدگی سے ہی جواب دیا۔ ذکیہ بیٹی کو گھور کر رہ گئیں وہ بیٹی کے دل کے حالات سے بے خبر نہ تھیں۔ جان گئی تھیں کہ ان کی بے وقوف بیٹی کس راہ پر قدم رکھ چکی ہے۔

جو لڑکا انہیں زہر سے بھی بدتر لگا کرتا تھا وہ اسے اپنی لاڈلی کی زندگی میں کیسے شامل ہونے دیتیں۔ انہیں دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نجیب بھی اس معاملے میں اپنے دو ٹوک خیالات کا اظہار نہ کر دیں۔ انہیں اس سب سے پہلے ہی کوئی قدم اٹھانا تھا اور وہ آج کل اسی مشن پر لگی ہوئی تھیں۔



"ایمن بیٹا! فریج میں سے کھیر کا ڈونگا نکال کر خود بھی کھیر کھالو اور بہن بھائی کو بھی پیالیوں میں ڈال کر دے دو۔"

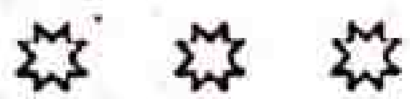
ذکیہ ایمن سے مخاطب تھیں۔ کل خالہ جان اور ان کے سسرالی رشتہ داروں کی زبردست سی ضیافت ہو چکی تھی۔ ڈشز کی تعداد اتنی تھی کہ سویٹ ڈش کھانے کی گنجائش ہی نہ بچی تھی۔ مہمانوں نے صرف چکھی تھی۔ ذکیہ نے کھیر کا ڈونگا اٹھا کر فریج میں رکھ دیا اور اب بچوں کی منت کر رہی تھیں کہ وہ کھیر کھا کر ختم کر دیں لیکن ان کے چٹورے بچوں کے حلق سے میٹھا مشکل سے ہی نیچے اترتا تھا۔ وہ چٹ پٹے کھانوں کے شوقین تھے اب بھی کسی نے کھیر کھانے کی ہامی نہ بھری۔ انابیہ کچن میں گئی تو ذکیہ کے آگے کھیر کا بھرا ہوا باؤل دیکھ کر چیخ پڑی۔

"کمال کرتی ہیں امی۔ شوگر لیول کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ آپ اتنی ساری کھیر کھائیں گی۔" ذکیہ ذیابیطس کی مریض تھیں۔ انابیہ کا چیخنا بنتا ہی تھا۔

"پھر کیا کروں پھینک دوں؟ رزق کی بے حرمتی کروں۔ تم تینوں نے تو کھانے سے انکار کر دیا۔ پروین کو دینا بھول گئی۔ ایسے مزے کی کھیر ہے۔ کیوں دودھ ڈال کر بنائی تھی۔ وہ تو شکر ہے اس ندیدے لڑکے کی نظر نہیں پڑی ورنہ اب تک تو چٹ کر چکا ہوتا۔"

ذکیہ کے کہنے پر انابیہ تاسف سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ اتنی ایمرجنسی میں کھیر کو ٹھکانے لگانے کی وجہ صرف یہ ہی تھی کہ کہیں سلجوق کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ اس چکر میں انہوں نے اپنی بیماری کو بھی نظر انداز کر دیا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ سلجوق کے معاملے میں ذکیہ کا ظرف اتنا ہی چھوٹا پڑ جاتا تھا۔

ڈیڑھ دو ماہ پہلے جب گھر میں آموں کی پیٹیاں آئی تھیں تو ذکیہ نے آم کھا کھا کر طبیعت بری طرح خراب کر لی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ ملازمہ کو دینے دلانے میں بھی بخل سے کام نہ لیتی تھیں لیکن ان کے شوہر کی کمائی پر سلجوق "عیش" کرے۔ یہ انہیں ہرگز گوارا نہ ہوتا تھا۔ انابیہ کبھی بھی ماں کی نفسیات سمجھ نہ پاتی تھی لیکن جب بھی وہ انہیں ایسی چھوٹی حرکت کرتے دیکھتی اس کے دل و دماغ پر بوجھ بڑھ جاتا۔ اب بھی وہ ماں سے بحث مباحثے میں الجھنے کے بجائے چپ چاپ واپس پلٹ گئی تھی۔



"تنویر گاڑی بیچ رہا ہے اس کا ارادہ نئی گاڑی لینے کا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، اس کی گاڑی خود خرید لوں۔ بہترین کنڈیشن میں ہے قیمت بھی مناسب ہے۔"

نجیب بیوی کی رائے چاہ رہے تھے۔ تنویر کا شمار ان کے بہترین دوستوں میں ہوتا تھا۔

"ہاں تنویر بھائی کی گاڑی تو شاندار ہے۔ کر لیجیے سودا۔" ذکیہ نے فوراً ان کی تجویز کی تائید کی۔

"بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ اب سلجوق کی بھی

اپنی گاڑی ہونی چاہیے۔ آخر اللہ نے سبب بنا ہی دیا۔" انہوں نے مطمئن انداز میں خود کلامی کی۔

"آپ گاڑی سلجوق کے لیے خریدنا چاہ رہے ہیں۔" ذکیہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نجیب صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں کہتی ہوں نجیب صاحب! آخر آپ اپنے بچوں کا حق کب تک بھتیجے پر لٹاتے رہیں گے۔ میں اب یہ ناانصافی ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" ذکیہ خم ٹھونک کر میدان میں آگئیں۔

"تمہارے بچوں کی کون سی خواہش اور فرمائش پوری نہیں کرتا میں۔ پچھلے سال تمہارے لاڈلے کو ہیوی بائیک نہیں دلوائی کیا۔" وہ چبا چبا کر بولے۔

"وہ لاڈلا آپ کا بھی اکلوتا بیٹا ہے لیکن آپ کو بھتیجے کے سوا کوئی نظر کب آتا ہے۔" ذکیہ نے ہمیشہ والا شکوہ دہرایا۔

"میں سلجوق پر کوئی بے جا عنایت نہیں کر رہا۔ وہ اگر میرے پاس کام کرنے کے بجائے کہیں جاب کر رہا ہوتا تو آج سے دو سال پہلے ہی گاڑی لے چکا ہوتا۔ مجھ سے تو وہ لگے بندھے جیب خرچ کے سوا لیتا ہی کیا ہے اور میری آدھی سے زیادہ ذمہ داریاں اس نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھی ہیں۔ لیکن میں تمہیں جتنا مرضی سمجھالوں یہ بات تمہاری موٹی عقل میں سما ہی نہیں سکتی۔" نجیب چبا چبا کر بولے۔

"بس بس جانے دیجیے نجیب صاحب! کیا مجھے نہیں پتا آج کل ایم بی اے کر کے بھی نوجوان جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ یہ پڑوس کے شبیر صاحب ان کا بیٹا ایم بی اے کر کے صرف بیس ہزار کی نوکری کر رہا ہے۔" ذکیہ نے بحث بڑھائی تھی۔

"شبیر صاحب کے بیٹے نے ایک عام سے ادارے سے ڈگری حاصل کی ہے بے وقوف عورت! تم سلجوق کی ڈگری کا اس سے کیسے موازنہ کر سکتی ہو۔ وہ بہترین یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہے۔" انہوں نے بیوی کی عقل پر ماتم کیا۔

"وہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں پہلے بھتیجے کی تعلیم پر

لاکھوں لٹا دیے اب اس کی ذات پر مزید شاہانہ اخراجات کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ عقل کے ناخن لیں نجیب صاحب! بیٹی بیاہنے کے قابل ہو گئی ہے۔ چار پیسے ہاتھ میں ہوں گے تو اس کے جہیز کی تیاری میں کام آئیں گے۔ آپ کے پاس فالتو پیسہ ہے تو مجھے دے دیں میں انابیہ کے زیور کا آرڈر دے دیتی ہوں۔" ذکیہ نے شوہر کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی آخری کوشش کی۔

"انابیہ کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے سکون سے پیپرز دے لینے دو پھر اس کی شادی کے بارے میں حتمی فیصلہ کر کے دنیا کے سامنے باقاعدہ اعلان کر دیں گے۔" نجیب صاحب نے سرسری انداز اپنایا تھا۔

"مطلب کیا ہے آپ کا؟" ذکیہ کے کان کھڑے ہوئے۔

"کوئی مطلب نہیں ہے میرا۔ تم بلاوجہ بحث بڑھا لیا کرو۔ شوہر تھکا ہارا، بھوکا پیاسا کام سے لوٹا ہے۔ بجائے اس کے چائے پانی پوچھو، تم نے اور ہی مسئلے چھیڑ دیے۔" نجیب صاحب نے انہیں جھڑکا تھا۔

ذکیہ کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر سلجوق کی وجہ سے ان میاں بیوی میں کھٹ پٹ ہوئی تھی۔ ایسے ہی تو وہ اس سے خار نہیں کھاتی تھیں۔ نجیب کی ادھوری بات نے ان کے اندر خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ فی الحال تو نجیب نے انہیں ٹال دیا تھا لیکن وہ بخوبی جانتی تھیں کہ سلجوق اور انابیہ کے حوالے سے نجیب کیا سوچ بیٹھے ہیں۔ کسی بھی ممکنہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذکیہ کا ذہن تیزی سے تانے بانے بننے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

اللہ اللہ کر کے انابیہ کے فائنل پیپرز نمٹے تھے۔ وہ پڑھائی سے جان چھوٹنے کی ڈھنگ سے خوشی بھی نہ منا پائی تھی کہ سلجوق نے اسلام آباد جانے کا شوشہ چھوڑ دیا۔ گھر والوں کے علم میں لائے بغیر اس نے وہاں کی ایک مشہور فرم میں جاب کے لیے اپلائی کیا تھا۔ دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے پر جانے کا کہہ کر وہاں انٹرویو بھی دے آیا اور جب اپائنٹمنٹ لیٹر موصول ہوا تو گھر والوں کو آگاہ کیا۔

"اتنی دور کیوں جا رہے ہو سلجوق! اس کے جانے کا سن کر انابیہ کے دل کو پنکھے لگ گئے۔ عجیب سی بے چینی نے اس کے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔

"میں اسلام آباد جا رہا ہوں دنیا سے تھوڑی جا رہا ہوں۔ تم اتنا ٹینس کیوں ہو رہی ہو بیہ۔" سلجوق نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔

انابیہ کچھ نہ بولی بس اس کی آنکھوں میں تیزی سے پانی جمع ہونے لگا۔ دونوں کے مابین آج تک کوئی عہد و پیمان نہیں ہوئے تھے۔ نہ دونوں میں سے کسی کو زبان سے محبت کا اظہار کرنے کی نوبت آئی تھی لیکن ان کے دل ساتھ دھڑکتے تھے اور یہ بڑی پاکیزہ اور باوقار قسم کی محبت تھی، شاید آج پہلی بار انابیہ اس کے لیے اپنے جذبات کی شدت ظاہر کر رہی تھی اور اس کے بہتے آنسو دیکھ کر سلجوق بے چین ہوا جا رہا تھا۔

"بہت اچھی آفر ہے بیہ! میں ایک بار اپنی صلاحیتیں آزمانا چاہتا ہوں اور پھر خود سوچو۔ کیا میں سدا یہاں چچا کے گھر ہی پڑا رہوں گا۔ مجھے بھی اپنا گھر بار بسانا ہے یار، اس کے لیے میرا علیحدہ سیٹ اپ ہونا ضروری ہے کہ نہیں۔" اس نے مبہم سے انداز میں مسکراتے ہوئے اس بے وقوف لڑکی کو کچھ سمجھانا چاہا تھا۔

"بس پتا نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔

سلجوق ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا، یہ کسی انہونی کا ہی تو خوف تھا جس کی وجہ سے سلجوق نے ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ذکیہ اسے کسی کھیت کی گاجر مولی نہیں گردانتی ہیں۔ وہ اپنے بارے میں ان کی غلط فہمی دور کرنا چاہ رہا تھا۔

وہ انہیں اپنے بل پر کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا اور اب قسمت نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ نجیب

نے اس کے فیصلے پر اعتراض نہ کیا تھا۔ وہ اتنی اچھی جاب ملنے پر خوش تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی اداسی بھی نہ چھپا پا رہے تھے۔

"میں تو سوچ رہا تھا کہ کاروبار کی ساری ذمہ داری تمہیں سونپ کر باقاعدہ ریٹائرڈ لائف گزاروں۔ تم نے تو یار میرے سارے خواب چکنا چور کر دیے۔" وہ مسکرا کر بھتیجے سے مخاطب تھے۔

"ابھی سے ریٹائرڈ لائف گزار کر کیا کریں گے چاچو۔ گھر بیٹھ کر چچی جان سے چونچیں لڑائیں گے۔ اچھا ہے ابھی اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھیں۔" اس نے بشاشت بھرے انداز میں انہیں چھیڑا۔

"مجھے تمہارے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں بیٹا! زندگی میں آگے بڑھنا اور ترقی کرنا تمہارا حق ہے لیکن مجھے سچ سچ بتاؤ کہیں تم ذکیہ کی باتوں سے برگشتہ ہو کر تو نہیں جا رہے۔ وہ بے وقوف عورت ہے یار! اس کی باتوں کو اتنی گہرائی سے مت سوچا کرو۔"

نجیب دلی خدشہ زبان پر لے آئے انہیں اندازہ تھا کہ ذکیہ کی باتوں کی سن گن سلجوق کو مل چکی ہے اس لیے اس نے یہاں سے دور جانے کا فیصلہ کیا ہے۔

"ارے نہیں چاچو! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ میں بس اپنی ڈگری کو کام میں لانا چاہ رہا تھا۔ آخر دن رات محنت کر کے جو ڈگری حاصل کی ہے اس کی مارکیٹ ویلیو کا بھی تو اندازہ لگائیں۔ یقین کریں میں صرف اپنی صلاحیتیں آزمانا چاہتا ہوں۔" اس نے انہیں بھرپور طریقے سے یقین دلانا چاہا۔ نجیب اس کا شانہ تھپکتے ہوئے مسکرا دیے تھے۔

گھر بھر میں صرف ذکیہ تھیں جو سلجوق کے فیصلے سے بے تحاشا خوش تھیں انہیں یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ یہ بلا اتنی آسانی سے سر سے ٹل سکتی ہے۔ برسوں سے ان کے سر پر دھرا یہ بھاری بوجھ یک دم ہی سرک گیا تھا۔ ان کے اطمینان کا عجب ہی عالم تھا۔ پھر انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کو گرین سگنل دے دیا۔

رفیعہ اپنی نند اور اس کی جیٹھانی کو پہلے بھی ایک بار یہاں لے کر آ چکی تھیں۔ مدحت ذکیہ کی چھوٹی بہن کی نند کی جیٹھانی تھیں۔ وہ اپنے اکلوتے بھائی کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ رفیعہ نے پہلے ذکیہ کی رضامندی چاہی پھر مدحت کو اپنی بھانجی کے بارے میں بتایا۔ کچھ دنوں پہلے ذکیہ کے ہاں ہونے والی ضیافت اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

مدحت کو انابیہ بے حد پسند آئی تھی وہ لوگ باقاعدہ رشتہ مانگنے آنا چاہ رہے تھے۔ اس وقت تو ذکیہ نے انابیہ کے امتحانات کا کہہ کر انہیں ٹال دیا تھا۔ اب رفیعہ سے کہہ دیا کہ وہ آنا چاہیں تو آ سکتے ہیں۔ مدحت اس بار اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کے ساتھ آئی تھیں اور انہوں نے انابیہ کے لیے باقاعدہ پیام ڈال دیا تھا۔

"لڑکا انجینئر ہے۔ اپنا شاندار ذاتی مکان ہے۔ گاڑی ہے۔ پھر فیملی بھی مختصر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اتنی محبت اور چاہت سے ہماری بیٹی کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ اللہ نے کیسے میری دعائیں سن لیں۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا نجیب صاحب کہ یوں گھر بیٹھے انابیہ کا اتنا اچھا رشتہ بھی آ سکتا ہے۔" ذکیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

"تمہاری ساری باتیں بجا ذکیہ! لیکن جب گھر میں لڑکا موجود ہے تو ہمیں باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" نجیب نے بیوی کو رسان بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

"گھر کے لڑکے سے آپ کی مراد سلجوق ہے؟" ذکیہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ یہ حیرت کا مصنوعی اظہار تھا۔ وہ بخوبی جانتی تھیں کہ جب بھی گھر میں انابیہ کی شادی کا ذکر چھڑے گا ان کے مجازی خدا سلجوق کو مضبوط امیدوار بنا کر میدان میں ضرور اتاریں گے۔ وہ میاں سے "مغزماری" کرنے کے لیے ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھیں۔

"ظاہر ہے میری مراد سلجوق سے ہی ہے۔ کیا کمی ہے اس میں ذرا بتاؤ۔ پھر اپنی آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا بچہ۔ ہم کسی دوسرے کو اس پر کیسے فوقیت دے سکتے ہیں۔" نجیب صاحب نے بھی مدلل انداز میں بات شروع کی تھی۔

"بس رہنے دیں نجیب صاحب! پہلے ساری زندگی بھتیجے کی ذمہ داری اٹھائی اب آپ چاہ رہے ہیں کہ بیٹی کی شادی کے بعد بھی بیٹی کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر دھری رہے۔ اس کے بال بچوں کی کفالت بھی آپ کو کرنی پڑے۔"

"بے کار کی باتیں مت کرو ذکیہ۔ سلجوق اب کما کھا رہا ہے۔ اس کی تنخواہ تمہارے تصور سے بڑھ کر ہے۔ وہ اپنی ذمہ داریاں خود نبھائے گا۔"

نجیب حتی الامکان کوشش کر رہے تھے کہ وہ اس معاملے پر بھڑکے بغیر بات کریں۔ ذکیہ کو پہلی بار سلجوق کے جانے پر اور نوکری کرنے پر افسوس ہوا لیکن انہوں نے کسی سے ہار ماننا کب سیکھا تھی۔

"کرلی آپ کے بھتیجے نے نوکری' جنہیں شاہانہ انداز میں بیٹھ کر کھانے کی عادت ہو' وہ کسی کی ماتحتی نہیں کر سکتے۔ چار چھ مہینے بعد بوریا بستر سمیٹ کر واپس نہ آیا تو میرا نام بدل دیجیے گا۔" ان کے کہنے پر نجیب بس انہیں کھا جانے والی نگاہوں سے گھور کر رہ گئے۔

"اور یہ تو بتائیں' بیٹی کا باپ ہو کر اس نواب کے سامنے خود اپنی بیٹی کا رشتہ پیش کریں گے۔ اس نے کبھی اس موضوع پر آپ سے بات کی؟" ذکیہ نے انہیں ایک اور پہلو سے گھیرنا چاہا۔ اس بار نجیب صاحب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

"حقیقت پسندی سے کام لیں نجیب صاحب! وہ اگر انابیہ سے شادی کا خواہش مند ہوتا تو کبھی تو آپ کے سامنے اشارے کنایوں میں ذکر چھیڑتا' ویسے تو آپ چچا بھتیجے کی خوب بے تکلفی تھی' کبھی اس نے کہا کہ چچا جان' انابیہ کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ مجھے اپنی فرزندی میں لے لیجیے۔" ذکیہ اپنی بات کو مزید مدلل انداز سے آگے بڑھا رہی تھیں۔

"میں خود اس سے اس کی رضامندی پوچھ لوں گا۔" نجیب نے ہار نہ مانی۔

"اور وہ بے چارہ آپ کے احسانات کے بوجھ تلے دبا آپ کو اپنے دلی جذبات سے آگاہ کر پائے گا۔ اسے مجبوری کے عالم میں اقرار کرنا ہی پڑے گا۔"

"تم بلاوجہ کے مفروضے مت گھڑو۔" نجیب جھنجلا گئے تھے۔

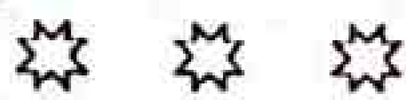
"یہ مفروضے نہیں حقیقت ہے نجیب صاحب اور پھر انابیہ اور سلجوق کا رشتہ طے کر دیا تو دنیا والوں کی زبانیں کون روکے گا سب کہیں گے یتیم بھتیجے کے سر پر سگے چچا نے اسی لیے دست شفقت رکھا تھا کہ وہ اس سے اپنی بیٹی بیاہنا چاہتے تھے۔ آپ کی ساری عمر کی نیکی رائیگاں جائے گی۔ دنیا یہ ہی کہے گی کہ سلجوق کو پڑھا لکھا کر کسی قابل بنانے میں آپ کا اپنا مفاد اور اپنی غرض پوشیدہ تھی۔"

ذکیہ نے لہجہ دھیما کر لیا تھا شوہر کے چہرے کے تاثرات سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ والا تیر عین نشانے پر لگا ہے۔ انہیں افسوس ہوا کہ وہ اتنی دیر سے بلاوجہ بحث کیے جا رہی تھیں انہیں تو پہلی دلیل ہی یہ دینی چاہیے تھی۔

"یہ سب تمہارا قیاس بھی تو ہو سکتا ہے۔" نجیب صاحب دھیرے سے بولے۔

"اچھا اب سب باتیں چھوڑیں۔ مجھے یہ بتائیں ایک بار لڑکا دیکھ کر آنے میں کیا حرج ہے' وہ لوگ کتنے پرجوش طریقے سے دعوت دے کر گئے ہیں اور میں سلجوق کو خود فون کر کے باتوں' باتوں میں انابیہ کے رشتے کا ذکر چھیڑ دوں گی اسے بتاؤں گی کہ ہم لڑکا دیکھنے جا رہے ہیں اگر اسے انابیہ میں دلچسپی ہوئی تو وہ فوراً آپ کو فون کھڑکا کر خود کو بھی بطور امیدوار پیش کر دے گا پھر ہم سوچ سمجھ کر فائنل فیصلہ کر لیں گے۔"

اس بار ذکیہ کی بات معقول تھی نجیب نے ہنکارا بھر کر بیوی کی بات سے اتفاق کیا تھا۔



ایک ذرا سے جھوٹ بولنے سے یہ معاملہ اتنے سہل انداز میں نمٹ جائے گا ذکیہ کو اس کا اندازہ ہی نہ تھا۔ انہوں نے نجیب کو کہہ دیا کہ وہ سلجوق کو انابیہ کے پرپوزل کے بارے میں بتا چکی ہیں۔ نجیب کا انتظار انتظار ہی رہا۔ سلجوق نے ان سے کوئی رابطہ نہ کیا۔

وہ بیوی کے ساتھ لڑکے والوں کے گھر چلے گئے۔ سنجیدہ اور بردبار سا معید انہیں اچھا لگا تھا۔ گھر والے بھی مہذب اور معقول تھے۔ بظاہر ان لوگوں میں کوئی ایسی کمی یا خامی موجود نہ تھی کہ جس کو بنیاد بنا کر انکار کیا جائے پھر بھی جانے کیوں نجیب کا دل مطمئن نہ تھا۔ وہ انہیں فوری ہاں نہ کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ ان سے سلیقے بچاؤ سے بات کرکے سوچنے کے لیے ذرا سی مہلت لینا چاہ رہے تھے لیکن جب مدحت (لڑکے کی بہن) نے ذکیہ کے آگے مٹھائی کی پلیٹ کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"پھر آنٹی! اب تو آپ نے ہمارا گھر بار اور بھائی دیکھ لیا۔ اب تو ہم آپ کی طرف سے ہاں سمجھیں نا۔"

"ہمارا دل اس رشتے پر مطمئن ہے۔ ہماری طرف سے تو سمجھیں یہ رشتہ پکا ہو گیا کیوں نجیب؟" سب مہمانوں کے بیچ بیٹھ کر ہاں کرنے کے بعد وہ کس معصومیت سے شوہر کی رائے جاننا چاہ رہی تھیں۔

نجیب جز بز تو بہت ہوئے مگر ان کے پاس مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"بس ہمیں شادی کی تاریخ جلدی کی چاہیے ہوگی آپ کو تو پتا ہے معید کی چھوٹی بہن کے فرض سے بھی ہم نے ساتھ ہی سبک دوش ہونا ہے اس کے سسرال والے جلدی مچا رہے ہیں، ورنہ ہم اتنی جلد شادی پر اصرار نہ کرتے۔" معید کی والدہ رسانیت سے مخاطب تھیں۔

"ہاں ٹھیک ہے نا باہمی مشورے سے کوئی تاریخ فائنل کرلیں گے۔"

ذکیہ نے مطمئن انداز میں جواب دیا تھا۔ سارے مرحلے بہت آسانی سے نمٹ گئے۔ سلجوق کا پتا کٹ چکا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے اس کے جوڑ کا لڑکا ڈھونڈ لیا تھا۔ ابھی تک انہوں نے کوشش کی تھی کہ اس معاملے کی بھنک بچوں کو نہ پڑے۔ حالانکہ ایمن نے معید کے گھر والوں کے آنے جان پر سن گن لینے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے بہت خوب صورتی سے اسے ٹال دیا تھا۔

"جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ انابیہ کا رشتہ مانگ رہے ہیں یہ لوگ لیکن ہم کون سا اقرار کر رہے ہیں۔" انہوں نے گول مول سا جواب دیا تھا۔ اور اب واضح "اقرار" کرنے کے بعد انہوں نے بچوں کو اس بارے میں آگاہ کیا تھا۔ انابیہ کی پیشانی چوم کر اس کے اچھے مستقبل کے لیے ڈھیروں دعائیں بھی دی تھیں۔

"معید کے ساتھ میری بیٹی کی چاند 'سورج کی جوڑی ہوگی۔ ایسا شاندار بر تو نصیب والیوں کو ملتا ہے بس اللہ نظر بد سے بچائے۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ انابیہ ششدر کھڑی ماں کو تکتی رہی۔ اس کے چہرے پر اتنی بے یقینی تھی کہ ذکیہ کو نگاہیں چرانا پڑ گئیں۔ انابیہ تو ساکت و جامد کھڑی رہی لیکن بعد میں ایمن ان سے جواب طلبی کرنے ضرور آئی۔

"آپ نے یہ کیا کر دیا امی! ہم تو آپی کے حوالے سے صرف سلجوق بھائی کو سوچتے تھے۔ آپی خود سلجوق بھائی کو چاہتی ہیں۔ آپ نے ان کی جگہ کسی اور کو کیسے دے دی؟" ایمن خفگی سے استفسار کر رہی تھی۔

"اپنی عمر سے بڑی باتیں مت کرو ایمن۔ میں نے انابیہ کے لیے بہترین فیصلہ کیا ہے اور اگر انابیہ کسی احمقانہ سوچ میں مبتلا تھی تو تم اسے سمجھاؤ۔ الٹا تم اس کی وکالت کرنے میرے پاس آ گئیں۔" انہوں نے ایمن کو بری طرح جھڑک کر مخاطب کیا۔

"لیکن سلجوق بھائی......!"

"کیا سلجوق بھائی؟" انہوں نے درشتی سے اس کی بات کاٹی۔

"میں نے سلجوق کے سامنے انابیہ کے رشتے کا ذکر کیا تھا اگر اسے دلچسپی ہوتی تو وہ تمہارے ابو سے رابطہ کرتا۔ ہم لڑکی کے ماں باپ ہو کر خود سے یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات انابیہ کو بھی سمجھاؤ۔ جو فیصلہ ہو گیا وہ اسے خوشدلی سے قبول کرلے۔ معید، سلجوق سے ہزار گنا اچھا لڑکا ہے۔ انابیہ اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔"

ذکیہ نے بات ہی نہ شادی تھی لیکن اس بار مقابل شوہر نہیں ان کی اپنی اولاد تھی جو اس سفید جھوٹ پر اتنی آسانی سے اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ ایمن نے رات کو ہی سلجوق کو فون کھڑکا دیا۔

اس نے سلجوق سے ماں کی بات کی تصدیق چاہی۔ سلجوق کے تو یہ سننے کے ساتھ چھکے چھوٹ گئے تھے۔

"کیا کہہ رہی ہو ایمن! انابیہ کا کوئی پروپوزل آیا ہوا ہے؟" اس نے متوحش انداز میں دریافت کیا۔

"پروپوزل آنا پرانی بات ہو گئی ہے سلجوق بھائی۔ یہاں انابیہ کی بات پکی ہو کر شادی کی ڈیٹ فکس ہونے جا رہی ہے۔ کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیجیے۔" ایمن نے اسے اکسایا تھا۔

سلجوق نے بنا کچھ کہے کال کاٹ دی۔ ایمن اس کی ذہنی حالت کی ابتری کا اندازہ کر سکتی تھی۔ وہ یقیناً" شدید شاک کے عالم میں تھا۔ انابیہ البتہ شاک کی کیفیت سے نکل چکی تھی۔

"میرا دل اسی انہونی سے کانپتا تھا ایمن! لیکن میں جانتی ہوں جو ہو گیا وہ واپس نہیں پلٹ سکتا۔" وہ عجیب بے بس سے انداز میں مسکرا کر بولی تھی۔ ایمن اس کے چہرے پر چھائی مردنی دیکھ کر کانپ گئی تھی۔

"حوصلہ کرو آپی! سلجوق بھائی آئیں گے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے بہن کو تسلی دی۔

"امی ابو ان لوگوں کو زبان دے چکے ہیں۔ زبان سے پھرنا اتنا آسان ہوتا ہے کیا۔ کل وہ لوگ شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آ رہے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" انابیہ چھوٹی بہن کی نسبت زیادہ حقیقت پسند تھی۔

"میں ابو کو امی کی غلط بیانی کے بارے میں بتاؤں گی۔ ابو یقیناً" اسٹینڈ لیں گے۔ انہیں سلجوق بھائی سے پیارا اور کون ہو سکتا ہے۔" ایمن پرامید تھی۔

"اور امی کے متعلق کیا خیال ہے انہیں دنیا میں سب سے زیادہ چڑ سلجوق سے ہے۔ وہ تو موسم کا پھل بھی اس سے چھپا کر رکھتی تھیں۔ اپنی لاڈلی بیٹی کیسے اس کے حوالے کر سکتی ہیں۔ سلجوق کو کوئی فائدہ نہ پہنچ جائے امی اس ڈر سے اپنا ذاتی نقصان بھی کر لیتی تھیں اور اب بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اپنی بیٹی کا دل اجاڑ کر انہوں نے سلجوق کی آنکھوں کے خواب نوچ لیے۔ بتاؤ امی کا یہ سودا مہنگا ہے یا سستا۔"

انابیہ عجیب سے انداز میں ہنسی تھی۔ بہن کی ذہنی حالت دیکھ کر ایمن خوف زدہ ہو گئی۔ اس نے سلجوق کو فون کر کے من و عن ساری باتیں بتا دیں۔

"آنے کا کوئی فائدہ نہیں سلجوق بھائی۔ آپی حقیقت تسلیم کر چکی ہیں امی آپ کی اور آپی کی شادی کسی قیمت پر نہیں ہونے دیں گی اور اگر ابو کو امی کی غلط بیانی کے بارے میں پتا چل گیا تو گھر میں بہت فساد برپا ہو جائے گا۔ امی صرف آپ کی ضد میں کوئی انتہائی قدم اٹھا کر خود کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہیں۔ امی کی سائیکی بہت عجیب ہے سلجوق بھائی!" ایمن مضطرب انداز میں اس سے مخاطب تھی۔

"پھر مجھے بتاؤ میں کیا کروں ایمن۔ میں انابیہ کے بغیر زندہ کیسے رہ پاؤں گا۔" سلجوق سسک اٹھا تھا۔

"میں آپ دونوں کی پاکیزہ محبت کی امین ہوں سلجوق بھائی! لیکن شاید آپ دونوں کا ساتھ قسمت میں لکھا ہی نہ تھا۔" ایمن نے آنسو بہنے تھے۔

سلجوق نے ذکیہ کو فون کر کے صرف اتنا کہا تھا "دنیا میں مجھ سے زیادہ نہ تو کوئی آپ کی بیٹی کو چاہ سکتا ہے نہ اس کا خیال رکھ سکتا ہے۔ آپ نے میری ضد میں اپنی ہی بیٹی کا نقصان کر دیا۔"

سلجوق کی بات سن کر ایک لمحے کو ذکیہ کا دل کانپا تھا لیکن پھر انہوں نے نخوت سے ہونہہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

بیٹی کی شادی پر ذکیہ نے جی بھر کر ارمان نکالے تھے۔ نجیب کی بار بار کی تاکید کے باوجود سلجوق شادی میں نہ آیا۔ مہندی والی رات بھی وہ سلجوق کو فون کر کے اس پر بے پناہ خفگی کا اظہار کر رہے تھے جب ایمن نے باپ کو ٹوکا تھا۔

"پلیز ابو! میں اس موقع پر آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی لیکن آپ سلجوق بھائی سے بدگمان مت ہوں۔

وہ اپنا بھرم سلامت رکھنا چاہتے ہیں۔ امی نے ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"کیا مطلب؟" نجیب ہکا بکا رہ گئے۔ ایمن کو احساس ہو گیا کہ وہ غلط موقع پر غلط بات کر گئی ہے۔

"اس وقت آپی کو صرف آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ صرف آپ کے اور امی کے جھگڑے سے بچنے کی خاطر آپی نے یہ قربانی دی ہے آپ ان کی یہ قربانی ضائع مت ہونے دیجیے گا۔" ایمن کہہ کر رکی نہیں تھی۔ نجیب صاحب اپنی جگہ پر ساکت کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

سسرال میں انابیہ کا پرتپاک استقبال ہوا تھا۔ انابیہ ابھی تک اپنے احساسات سمجھنے سے قاصر تھی۔ شاید عجیب سا احساس جرم تھا جس میں وہ مبتلا ہو رہی تھی۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں ایمان داری کی قائل تھی اور ابھی تک اس نے زندگی میں کوئی کام ایسا نہ کیا تھا جس پر بعد میں پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اب وہ ایک شخص کے نکاح میں آچکی تھی جو چند گھنٹوں پہلے تک اس کے لیے ایک اجنبی سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ اس نے تو معید کی تصویر تک دیکھنے کی زحمت نہ کی تھی۔ لیکن اب اس کے جذبوں پر اصولی اور شرعی طور پر معید کا حق ہونا چاہیے تھا لیکن وہ اپنے دل کو کسی بھی قسم کے جذبے سے خالی محسوس کر رہی تھی۔

انابیہ کے دل کا کاغذ کورا نہیں تھا اور اس کے نزدیک یہ بھی بددیانتی کی ہی ایک قسم تھی۔ کتنے دن تک وہ اللہ سے گڑگڑا کر دعا کرتی رہی تھی کہ اس کے دل کی سلیٹ سے سلجوق کا نام مٹ جائے۔ وہ نئی زندگی کا آغاز پوری ایمان داری سے کرنا چاہ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ خود کو تسلی بھی دیتی، سلجوق اور اس کے مابین آج تک اظہار محبت کا مرحلہ تک طے نہ ہوا تھا۔ دونوں کے دل ساتھ دھڑکتے تھے تو یہ ایک بے اختیاری فعل تھا۔ اسے خود ساختہ شرمندگی کے احساس سے نکلنا ہوگا بہت جتن کر کے انابیہ خود کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

سسرال پہنچ کر رسموں کا ایک تھکا دینے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ شروع میں مدحت باجی نے معید کو بھی زبردستی اس کے ساتھ بٹھا کر کچھ رسمیں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چند لمحوں بعد ہی اٹھ گیا تھا۔

"آپ لوگ پتا نہیں کس مٹی کے بنے ہیں۔ مووی بنوا کر تھکتے نہیں آخر اور کتنا فوٹو سیشن ہوگا۔"

وہ بیزاری سے بہنوں سے مخاطب ہوا اس کے لہجے کی بیزاری کو انابیہ نے شدت سے محسوس کیا۔ میرج ہال میں بھی جب معید کو اس کے ساتھ بٹھا کر سلامی کی رسم ہوئی تھی۔ جب بھی وہ اس کی خالہ زاد بہنوں کے ہنسی مذاق اور شوخ فقروں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے عجیب انداز میں بیٹھا رہا۔

"دولہا بھائی تو بہت ریزرو اور سنجیدہ مزاج کے شخص لگتے ہیں یوں لگ رہا ہے کہ ان سے تو بات کرنے سے پہلے بھی اپائنٹمنٹ لینی پڑے گی۔" انابیہ کی ایک کزن نے شوخی سے فقرہ اچھالا تھا۔

جواب معید کے بجائے معید کے کسی دوست یا کزن کی جانب سے آیا تھا۔ جوتا چھپائی کی رسم میں بھی معید نے سالیوں سے بارگیننگ کے بجائے فوری طور پر مطلوبہ رقم تھما دی تھی۔ لڑکیاں منہ مانگی رقم پا کر بھی بدمزہ سی ہو گئیں اور پھر رخصتی کا ہی شور اٹھ گیا تھا۔

"شاید معید بھائی اجنبی اور انجان لوگوں میں کمفرٹیبل فیل نہیں کر رہے دیکھنا اپنے گھر جا کر کیسی چونچالی پر اتر آئیں گے۔"

انابیہ کی ایک سہیلی نے اس کے کان میں گھس کر تبصرہ کیا تھا یا اسے تسلی دی تھی اور یہاں "اپنے" گھر میں معید کا رویہ دیکھ کر انابیہ کو اندازہ ہو گیا کہ سنجیدگی بھرا لیا دیا انداز فقط بیزاری کا اظہار ہے لیکن وہ اس بے زاری کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی کچھ دیر بعد یہ وجہ بھی پتا چل گئی۔

"ہٹو! ہٹو! رابعہ چچی کو راستہ دو۔ وہ دلہن کو سلامی

دینے آرہی ہیں۔" معید کی کزن نے اس کے گرد جمگھٹا لگا کر کھڑے بچوں بچیوں کو گھرک کر ایک طرف ہٹایا تھا۔

"انہیں بھی چین نہیں ملا تشریف لے ہی آئیں۔" انابیہ کی سماعت نے طنزیہ فقرہ کیچ کیا تھا یہ آواز بلاشبہ اس کی ساس کی تھی۔

"مدحت، دلہن پر سے مرچیں وار دینا۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔"

نگہت آنٹی نے اس بار با آواز بلند اپنی بڑی بیٹی کو پکارا تھا۔ کمرے میں ایک دم خاموشی سی چھا گئی تھی۔ وہیل چیئر پر بیٹھی رابعہ بیگم کا چہرہ بھی قدرے پھیکا پڑ گیا تھا۔

وہیل چیئر گھسیٹ کر لانے والی نیلما کے ہاتھ بھی ایک پل کو ساکت ہوئے۔ وہ جانتی تھی کمرے میں موجود ساری پبلک اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی متمنی ہے۔ وہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر ماں کی وہیل چیئر معید کی نئی نویلی دلہن کے پاس لے گئی۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری ہے بہو۔ بہت بہت مبارک ہو نگہت بھابھی!" رابعہ نے انابیہ کو پیسے دے کر نگہت بیگم کو خوش دلی سے مبارک باد دی۔

"اللہ کا شکر ہے ورنہ لوگوں نے تو اس شادی کی راہ میں روڑے اٹکانے اور میرے بیٹے کو ورغلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔"

نگہت کے انداز پر رابعہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی تھیں۔ انابیہ نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر رابعہ بیگم کو دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہیں لیکن وہ بلا کی خوب صورت خاتون تھیں۔

چہرے کی ملائمت اور سوگوار سی مسکراہٹ۔ انابیہ کو وہ پہلی نگاہ میں ہی اچھی لگی تھیں۔ اللہ جانے نگہت آنٹی کو ان سے کیا پرخاش تھی جو وہ ان کی طرف طنزیہ فقرے اچھالے جا رہی تھیں انابیہ، ساس کی زبان کے جوہر دیکھ کر کچھ خائف سی ہو گئی تھی۔

"آئیں امی! آپ کی دوا کا ٹائم ہو رہا ہے۔" نیلما سے بھی مزید برداشت نہ ہوا تھا۔ وہ وہیل چیئر گھسیٹے ہوئے لے گئی۔

"پڑ گئی ہو گی کلیجے میں ٹھنڈ۔ میرے بیٹے کو قابو کر کے سمجھ رہی تھی کہ میدان مار لیا اب پتا چلا ہو گا کہ۔"

"افوہ امی! یہ کوئی وقت ہے ایسی باتیں کرنے کا۔" مدحت نے بوکھلا کر ماں کو ٹوکا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں انابیہ کی طرف اشارہ کر کے صورت حال کی نزاکت سمجھنے کی استدعا کی تھی۔ نگہت بیگم کچھ بڑبڑا کر خاموش ہو گئیں۔

"آپی پلیز! اب یہ فوٹو سیشن بند کر کے مہمانوں کے سونے کی جگہ بنائیں میرے بیڈ پر سب نے اپنے سوئے ہوئے بچے لٹا دیے ہیں۔ میں چند گھنٹوں کی تو پرسکون نیند لے لوں۔ کل صبح سے پھر یہ ہی ہیکٹک روٹین ہو گی۔"

انابیہ کی چھوٹی نند نے جھنجلائے ہوئے انداز میں بڑی بہن کو مخاطب کیا۔ کل انابیہ کا ولیمہ تھا تو مہوش کی بارات آنی تھی۔ مایوں کی دلہن مہوش کا غصے اور کوفت سے برا حال تھا۔ اسے سونے کے لیے کوئی جگہ ہی نہ مل رہی تھی۔

"ہاں ہاں میں کرتی ہوں انتظام، پہلے انابیہ کو اس کے بیڈ روم میں چھوڑ آؤں۔" مدحت آپی نے چھوٹی بہن کو جواب دیا۔ پھر وہ انابیہ کو اس کے سجے، سجائے بیڈ روم میں لے آئی تھیں۔

"امی کی باتوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں انابیہ! دراصل رابعہ چچی کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیٹی نیلما سے معید کی شادی کروا دیں۔ نیلما نے بھی معید پر ڈورے ڈالنے کی بہت کوشش کی۔ معید ان ماں بیٹیوں کے بچھائے جال میں پھنس بھی گیا تھا، وہ تو امی نے کچھ پیار محبت، کچھ دھونس زبردستی سے معید سے اپنی منوا لی۔ اب یہ تمہارے اوپر ہے کہ تم کتنی جلد معید کے دل میں جگہ بناتی ہو۔"

مدحت آپی نے کتنے آرام سے اسے ساری اسٹوری سنا دی تھی۔ وہ اسے ایزی ہو کر بیٹھنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ انابیہ کے لبوں پر تھکی ہاری سی استہزائیہ

مسکراہٹ بکھر گئی۔ معید کی بیزاری کی اصل وجہ اب سمجھ میں آئی تھی، وہ اس رشتے پر راضی ہی نہ تھا۔ یہ ہی بتایا تھا نا مدحت آپی نے کہ ان کی والدہ محترمہ نے کچھ پیار محبت اور کچھ دھونس زبردستی سے معید سے اپنی منوائی تھی وہ نگہت آنٹی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا چکی تھی کہ پیار محبت سے نہیں بلکہ وہ صرف دھونس اور زبردستی سے اپنے بیٹے کو یہ بندھن جوڑنے پر راضی کر پائی ہیں۔

"تو میری پیاری امی! یہ تھا وہ بہترین بر جو آپ نے اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے ڈھونڈا ہے۔ بہت اچھا ہوا' میرے ساتھ یہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ امی نے جو کچھ سلجوق کے ساتھ کیا تو ان کی بیٹی بدلے میں یہ ہی ڈیزرو کرتی تھی۔"

انابیہ خود اذیتی کی انتہاؤں پر تھی۔ اس کی توقع کے عین مطابق اس کے بیزار شکل والے دولہا نے اس پر ایک نگاہ التفات تک نہ ڈالی تھی۔ وہ تو جیسے کمرے میں اس کی موجودگی سے بھی بے نیاز تھا۔

انابیہ کو بے نیازی کے اس مظاہرے پر کوئی ہتک محسوس نہ ہوئی تھی۔ وہ تو خود حالات سے فرار چاہتی تھی۔ اپنے تھکے ہارے ذہن کو ہر قسم کی سوچوں سے آزاد کرکے وہ فی الوقت ایک پرسکون نیند لینا چاہتی تھی۔ وہ حیرت انگیز طور پر اس اجنبی جگہ پر بھی اسے بہت پرسکون نیند آگئی تھی۔



ولیمہ کی تقریب شہر کے مشہور میرج ہال میں منعقد ہو رہی تھی۔ وہ اور مہوش کئی گھنٹے پارلر میں گزار کر سیدھے میرج ہال پہنچے تھے۔ مہوش کی بارات بھی ابھی ذرا دیر پہلے پہنچی تھی۔ نکاح سے پہلے عجیب و غریب صورت حال رونما ہو گئی۔

"نگہت آنٹی وغیرہ حق مہر میں بہت بھاری رقم لکھوانا چاہ رہے تھے۔ مہوش کے سسرالیوں نے ان کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔"

"آپ خود بتائیں بہن یہ باتیں کوئی اس وقت طے کرنے والی ہیں ایسا کوئی مطالبہ تھا تو انہیں پہلے جتانا چاہیے تھا نا۔"

مہوش کی ساس نے ذکیہ بیگم کو مخاطب کر کے پوچھا۔ سب جانتے تھے وہ نگہت کی سمدھن ہیں۔ اب بھی وہ بہت جھٹکے سے اسٹیج کے عین سامنے کی نشستوں پر براجمان تھیں۔ مہوش کی ساس نے انہیں اہمیت دی تو ذکیہ بیگم کو بہت اچھا لگا انہوں نے ان کی بات کی تائید میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا تھا۔

"کل یہ لوگ بارات لے کر آپ کے ہاں آئے تھے۔ بتایئے ذرا کیا آپ لوگوں نے بھی ان سے لاکھوں میں حق مہر لکھوایا ہے۔" مہوش کی ساس نے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ میرے میاں تو یوں شرطیں طے کرنے سے سخت خار کھاتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ تو باہمی اعتماد کا معاملہ ہوتا ہے۔ یوں زور' زبردستی سے اپنی شرائط تھوڑی منوائی جاتی ہیں۔"

ذکیہ بیگم نے بہت مدبر بن کر جواب دیا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کا یہ قول آج کی تقریب میں بار بار دہرایا جائے گا۔ مہوش کی ساس نے اپنی سمدھن کو جا پکڑا تھا۔

"بھئی' جب آپ لوگوں نے اپنی بہو کا حق مہر ہزاروں میں لکھوایا ہے تو ہم سے لاکھوں کا مطالبہ کیوں کر رہے ہیں۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ ہم نے حق مہر کم لکھا ہے۔ انابیہ کا حق مہر بھی اتنا ہی لکھا گیا ہے۔" نگہت بیگم نے دھڑلے سے جھوٹ بولا تھا۔

"آپ کی سمدھن تو کچھ اور فرما رہی ہیں۔"

مہوش کی ساس نے استہزائیہ انداز میں انہیں مخاطب کیا اور پھر تو بات بڑھتی ہی چلی گئی۔ پہلے لڑکی والوں اور لڑکے والوں کی خواتین میں تو تکرار ہوئی پھر دونوں طرف کے مرد بھی بیچ میں کود پڑے' نگہت بیگم کے بھائی معاملے کو زیادہ ہوا دے رہے تھے۔ بھائیوں کی شہ پر وہ بھی خوب شیر ہو رہی تھیں۔ تو تکرار بڑھنے لگی تو دونوں دلہنوں کو اسٹیج پر سے واپس برائیڈل روم میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ ہنگامہ بڑھتا دیکھ کر ذکیہ کو

اختلاج ہونے لگا۔

شیریں مزاج سمدھن کا یہ تو کوئی اور ہی روپ تھا۔ ان کی زبان سے بیٹی کے سسرالیوں پر تڑتڑ گولہ باری جاری تھی۔ ذکیہ بیگم نے بہت اپنا بن کر سمدھن کو سمجھانا چاہا تھا۔

"بیٹی کا معاملہ ہے نگہت بھابھی! جوش کے بجائے ہوش سے کام لیں۔ یہ وقت جذبات سے کام لینے کا نہیں ہے۔" انہوں نے پورے خلوص سے سمدھن کو صورت حال کی نزاکت سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ تو چپ ہی رہیں جی۔ آپ کی وجہ سے ہی یہ فساد برپا ہوا ہے اگر کہہ دیتیں کہ انابیہ کا بھی حق مہر اتنا ہی لکھا گیا ہے تو ان لوگوں کو اتنی بات بڑھانے کا موقع ہی نہ ملتا۔" نگہت بیگم نے ترش لہجے میں سمدھن کو مخاطب کیا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے ذکیہ بیگم کو فساد کی جڑ قرار دے دیا تھا۔

"تو میں جھوٹ بول دیتی؟" ذکیہ بیگم کو بھی اس انداز پر غصہ سا آگیا۔

"ایک جھوٹ بولنے سے کوئی قیامت ٹوٹ پڑتی۔ آج سے پہلے تو جیسے آپ نے کبھی کوئی جھوٹ بولا ہی نہ ہو گا۔" انہوں نے نخوت سے کہا۔ ذکیہ بیگم سے اس بار کوئی جواب نہ بن پڑا۔

جانے کیوں اس موقع پر انہیں اپنا کچھ عرصہ پہلے بولے جانے والا ایک "بے ضرر" سا جھوٹ یاد آیا تھا۔ وہ خاموش کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ معید ماں کا ہاتھ زبردستی پکڑ کر دلہنوں والے کمرے میں لے آیا تھا۔

"خدا کے واسطے امی! ہوش کے ناخن لیں۔ بارات کے واپس جانے کی باتیں شروع ہو گئی ہیں۔ ماموں لوگوں کو سمجھائیں اب بات مزید نہ بڑھائیں۔ وہ لوگ جتنا حق مہر لکھ رہے ہیں انہیں لکھنے دیں۔"

"تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا معید! ان لوگوں نے تو آج ہی اپنی اوقات دکھادی۔ آئندہ میری بچی کے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ ایسی تھرڈ کلاس تو بری لے کر آئے ہیں پھر ہمارا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ارے ہم نے تو لاکھوں کا زیور اور لاکھوں کی بری چڑھائی ہے بہو بیگم کو۔ پھر بھی ان کی والدہ محترمہ ان گھٹیا اور نیچ لوگوں کی سائیڈ لے رہی ہیں۔"

نگہت بیگم کے کہنے پر انابیہ کا دل ڈوب سا گیا۔ اس کی چھٹی حس پھر بہت کچھ غلط ہونے کا اشارہ دینے لگی تھی۔

"خدا کے لیے امی اپنی عزت کا کچھ تو خیال کریں۔ باہر دنیا تماشا دیکھ رہی ہے۔ اگر کچھ لکھوانا ہی تھا تو ان لوگوں سے پہلے طے کر لیا ہوتا۔" معید بری طرح جھنجلا رہا تھا۔ ماں آنے والے وقت کی سنگینی کو سمجھنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

"مجھے تجھ سے اسی بزدلی کی توقع تھی معید۔ تو جا کر ایک طرف بیٹھ جا اپنے ماموؤں کو معاملہ نمٹانے دے۔ تیرا کیا خیال ہے اگر مہوش کے سسرالیوں سے پہلے ہم اپنا مطالبہ منواتے تو وہ مان جاتے۔ بے وقوف لڑکے! یہ ہی وقت ہے ان سے اپنی بات منوانے کا۔ ماہانہ دس ہزار جیب خرچ اور پچاس لاکھ حق مہر۔ یہ تیری بہن کی سیکیورٹی کے لیے ضروری ہے اور ایسے ہی گیدڑ بھبکیاں دے رہے ہیں۔ بارات واپس لے کر جانے کی' مجھے پتا ہے ان کا۔ اتنی جرات نہیں ہے ان میں۔"

نگہت بیگم نے بیٹے کو سمجھانا چاہا تھا اتنے میں ان کی بھاوج ہانپتے کانپتے آئی تھیں۔

"بارات واپس جانا شروع ہو گئی ہے نگہت!"

نگہت بیگم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ معید استہزائیہ انداز میں ماں کو دیکھنے لگا۔ نگہت بیگم بوکھلا کر باہر نکلی تھیں۔ لیکن معید جانتا تھا کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔



"میری تو سمجھ سے باہر ہے۔ کیسے ناعاقبت اندیش لوگ ہیں۔"

ذکیہ نجیب سے مخاطب تھیں بیٹی کے ولیمہ سے وہ بنا کھائے پیے لوٹے تھے۔ رسم کے مطابق انابیہ کو بھی

ان کے ساتھ آنا تھا لیکن اس صورت حال میں تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ سمدھن سے اس بارے میں پوچھتیں۔ ان کی بیٹی کی بارات واپس لوٹی تھی۔ وہ تو اپنے حواسوں میں ہی نہ تھیں۔

انابیہ کے بارے میں سوچ سوچ کر ذکیہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ بیٹی کے سسرال والوں کے جو الگ ڈھنگ آج سامنے آئے تھے وہ ششدر رہ گئی تھیں۔ اپنی تشویش کا اظہار وہ نجیب سے بھی نہ کر سکتی تھیں سچ تو یہ تھا کہ وہ خود میں نجیب سے آنکھیں ملانے کی ہمت بھی نہ پا رہی تھیں۔

نجیب کے اطوار بھی بالکل بدلے بدلے لگ رہے تھے بیٹی کی رخصتی کے بعد سے وہ بالکل خاموش تھے۔ ذکیہ کو ان کی خاموشی سے خوف سا آرہا تھا۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ وہ کچھ تو بولیں، چاہے ذکیہ کو برا بھلا ہی کہہ لیں لیکن نجیب نے تو جیسے اپنے ہونٹوں پر قفل چڑھا لیا تھا۔ اور ذکیہ کے جی کی بے قراری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔



انابیہ نے کتنے ہی لوگوں کے منہ سے دبی زبان میں اپنے سبز قدم ہونے کے بارے میں سن لیا تھا۔ کل وہ رخصت ہو کر اس گھر میں آئی اور آج گھر کی بیٹی دلہن بن کر بھی بنا رخصتی کے گھر واپس آگئی۔ کل کے برعکس انابیہ آج عجیب سے خوف میں مبتلا تھی۔ کل اس کے سسرال والے اس کے چاؤ، چونچلے اٹھا رہے تھے اور آج کسی کو اس سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔

گھر سے مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے تھے۔ مہوش کے سابقہ سسرالیوں کو کوسنے دے دے کر نگہت بیگم کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ رشتہ داروں نے انہیں تسلی دلاسا دے کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے میں ہی عافیت جانی تھی۔ معید ڈاکٹر کو لے آیا تھا نگہت بیگم کو سکون آور انجکشن لگا تو وہ کچھ دیر میں نیند کی وادی میں اتر گئیں۔

تھکا ہارا معید بیڈروم میں داخل ہوا۔ اس کی ایک دن پرانی دلہن۔ اس کی شکل پر ایک نگاہ ڈالتے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنی سہمی ہوئی اور ہراساں ہے۔ معید کو اس پر بے ساختہ ترس آیا۔ کل کی بات اور تھی کل وہ اس کی ماں کی پسند اور اس کے سر پر زبردستی تھوپی ہوئی لڑکی تھی لیکن آج معید کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ آئندہ آنے والے دنوں میں اس کے گھر والے اس ارمانوں سے لائی گئی بہو کے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ وقتی طور پر ہی سہی مگر اس کی ہمدردیاں انابیہ کی طرف ہو گئی تھیں۔

"پلیز تم ریلیکس ہو جاؤ۔ اس گھر میں چھوٹے موٹے ہنگامے تو خیر معمول کی بات ہے لیکن ابھی جو شور شرابا اور ہنگامی کیفیت تھی یہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ تمہیں ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں نہ ہی اپنے متعلق کسی کی الٹی سیدھی بات پر دھیان دو۔"

وہ اس سے نرمی سے مخاطب تھا۔ انابیہ جواب میں کچھ نہ بولی بس نگاہیں جھکا کر اس کی بات سنے گئی۔ معید اٹھ کر کمرے کے دروازے تک گیا تھا پھر باہر ہانک لگائی تھی۔

"مدحت آپی! کچھ کھانے کو لادیں۔ کیا بھوکا مارنے کا ارادہ ہے؟"

"تمہیں آج کے دن بھی کھانے کی سوجھ رہی ہے۔" مدحت کی کٹیلی آواز انابیہ تک بخوبی پہنچ گئی تھی۔

"فضول کی جذباتی باتیں چھوڑیں۔ مہوش کو بھی کھانا کھلائیں خود بھی کھائیں اور ہمیں بھی لا کر دیں۔" اس نے بہن کے طنز کو چنداں اہمیت نہ دی تھی۔

"ہم تو گھر میں کھانا پکا کر تمہارے ولیمہ میں شرکت کرنے گئے تھے نا کچھ نہیں پکا ہوا گھر میں، ایک رات بھوکے سو جاؤ گے تو قیامت نہیں آجائے گی۔" مدحت آپی نے بھائی پر اپنا غصہ نکالا۔ معید نے برا سا منہ بنا کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔

"اپنے بچوں کو فیڈر بھر بھر دودھ پلا کر سلایا ہے۔

میرے کھانا مانگنے پر چراغ پا ہو رہی ہیں۔" اس نے بھناتے ہوئے انداز میں خود کلامی کی پھر روم ریفریجریٹر سے سیب نکال کر انابیہ کی طرف بڑھایا۔

"تم دوپہر بھی بنا کچھ کھائے 'بیوٹی' پارلر چلی گئی تھیں۔ فی الحال یہ کھاؤ میں کھانے کا بھی کچھ انتظام کرتا ہوں۔" انابیہ کو اس لمحے کوئی بہت شدت سے یاد آیا تھا۔

"اٹس اوکے۔ مجھے بھوک نہیں۔" اس نے دھیرے سے انکار کیا۔

معید نے کندھے اچکا کر آفر واپس لے لی تھی۔ وہ پینٹ سے سیب رگڑ کر صوفے پر بیٹھ کر سیب کھانے لگا تھا۔ ایک ہاتھ میں سیل فون پکڑ کر میسیج ٹائپ کرنے لگا۔

انابیہ کو اس کے انداز پر حیرت ہو رہی تھی وہاں میرج ہال میں وہ جس وقت ماں کو جھنجلاتے ہوئے سمجھانا چاہ رہا تھا تو کتنا ذمہ دار بھائی لگ رہا تھا اور اس وقت اتنا مطمئن تھا جیسے بہن کی بارات واپس جانے سے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو۔ چند لمحوں بعد اس نے فون کان سے لگا لیا تھا۔

"کب سے میسیج کر رہا ہوں۔ تم ریلائی کیوں نہیں کر رہیں۔"

"نہیں خیر' ایسی بات نہیں۔ میں نے تو صرف یہ کہنا تھا کہ اگر کھانے کا کچھ انتظام کر سکتی ہو تو کر دو۔ بھوک سے دم نکل رہا ہے اور یہاں نیچے کی سچویشن کا تو تم اندازہ کر سکتی ہو۔ کھانا مانگنے پر صرف جھاڑ ہی کھانے کو ملی ہے۔" معید کسی بہت اپنے سے دکھڑا رو رہا تھا۔ انابیہ کی سماعتیں اسی گفتگو کی جانب لگی تھیں۔

"اچھا اچھا شرم بھی کر لوں گا۔ تم فی الحال فوری طور پر کچھ کھانے کو لا کر دو دو بندوں کا کھانا.... ہاں ہاں تمہیں نیچے شیروں کی کچھار میں نہیں بلا رہا۔ بس مجھے مس کال دے دینا میں سیڑھیوں کے پاس آکر ٹرے پکڑ لوں گا۔ اچھا بابا ٹھیک ہے۔" اس نے مسکرا کر کال کاٹ دی۔

یک طرفہ گفتگو سن کر بھی انابیہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ معید کس سے اتنی بے تکلفی سے مخاطب تھا۔ صبح ناشتے کے وقت معید کی خالہ زاد کزن نے اسے تفصیل سے اس کی اور نیلما کی لو اسٹوری سنادی تھی۔ نیلما جو معید کی چچا زاد تھی اور اپنی معذوریوں کے ساتھ اوپر والے پورشن میں رہتی تھی۔ معید گوڈوں گوڈوں اس کے عشق میں مبتلا تھا مگر ماں نے جذباتی ہتھکنڈے استعمال کر کے اسے اس عشق سے دستبردار کروالیا۔

اس کی اور معید کی زندگی کی کہانی میں کتنی مماثلت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اب بھی دھڑلے سے اپنی محبوبہ سے بات کر رہا تھا اور انابیہ سلجوق کا تصور کرتے ہوئے بھی یہ سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ کہیں اس بددیانتی پر اس کا رب اس کی پکڑ نہ کر لے۔

بارہ' چودہ منٹ بعد معید کے سیل فون پر مس کال آئی تھی وہ پھرتی سے اٹھ کر باہر گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں خوان پوش سے ڈھکی ایک ٹرے تھی۔

"اب بغیر نخرے کیے فوراً آجاؤ۔ ورنہ مجھے اتنی بھوک لگی ہے کہ میں سب کچھ ہڑپ کر جاؤں گا۔"

معید کے کہنے پر وہ کھانے میں شریک ہو گئی۔ بھوک سے تو اس کا بھی دم نکل رہا تھا۔ بگھارے بینگن اور مونگ کی بھنی ہوئی دال کے ساتھ گرم گرم چپاتیاں۔ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ معید کے سامنے بیٹھ کر بہت جھجکتے ہوئے کھانا کھایا تھا۔

"دیکھ لو! سب قسمت کے کھیل ہیں آج وہاں میرج ہال میں آٹھ 'نو ڈشز تھیں لیکن نصیب میں یہ بگھارے بینگن اور دال ہی لکھی تھی۔ پھر بھی اللہ کا شکر ہے اس نے بھوکا تو نہیں سلایا۔"

کتنے دوستانہ انداز میں وہ اس سے "نصیبوں کے کھیل" پہ بات چیت کر رہا تھا۔ انابیہ نے خاموش رہنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

معید کا کہنا بجا تھا اس رات گھر میں جو ہنگامہ اور

شور شرابا برپا تھا آئندہ آنے والے دنوں میں وہ ہنگامہ قدرے سرد پڑ گیا تھا۔ افسوس کرنے کے لیے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس وقت تو نگہت بیگم مہوش کے سابقہ سسرالیوں کو جی بھر کر کوسنے دیتی تھیں لیکن لوگوں کے جانے کے بعد جیسے سب کچھ نارمل ہو جاتا۔

روایتی دلہنوں کی طرح انابیہ کے چاؤ، چونچلے نہیں اٹھائے گئے تھے بلکہ نگہت بیگم نے ولیمہ کے دو دن بعد ہی اسے کچن کی ذمہ داریاں اٹھانے کا کہہ دیا تھا۔

"دیکھو بہو! تم اب گھر کی فرد ہو۔ مدحت اپنے گھر بار کی وہ کب تک یہاں آکر ہمیں پکا کر کھلائے۔ مہوش بے چاری صدمے سے باہر نہیں نکلی ہے۔ ورنہ کل کی بچی اسے تو چائے تک نہیں بنانی آتی اور میں ٹھہری سدا کی مریض۔"

"اسے مختصراً" یہ بتا دیں کہ اب کچن کا کام اس نے سنبھالنا ہے۔ بلاوجہ اتنی لمبی تمہید باندھ رہی ہیں۔" قریب بیٹھے معید نے ماں کو ٹوک دیا تھا۔

"کیسے بیوی کی حمایت میں فوراً" بول پڑا۔ برداشت ہی نہ ہوا کہ ماں اس کی بیوی کو کچن میں بھیجے۔ ارے ہمارا ظرف دیکھو دنیا جہان کہہ رہی ہے کہ کیسی سبز قدم لڑکی ہے۔ نند کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا۔ ہم نے پھر بھی لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرے حالانکہ سارا فساد بہو بیگم کی اماں کا پھیلایا ہوا تھا۔ نہ ان کم بختوں کے کان میں بیٹی کے حق مہر کی بات پھونکتیں نہ وہ ذلیل لوگ اتنی ڈھٹائی اور خباثت کا مظاہرہ کرپاتے وہ تو......"

"جاؤ انابیہ! چائے بنا لاؤ۔ سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔" معید سے اس کی شکل پر ہوائیاں اڑتی دیکھی نہ جاسکی تھیں، اس نے اسے کچن میں بھیج دیا پھر یہ ہی کچن انابیہ کی جائے پناہ بن گیا تھا۔

وہ کچن کے کاموں میں مصروف رہتی۔ دماغ کاموں میں الجھا رہتا تو دل میں جھانکنے کا کم ہی موقع ملتا۔ آہستہ آہستہ اسے گھر والوں کے مزاج اور عادتوں کا بھی اندازہ ہو گیا تھا۔

نگہت بیگم چٹخارے دار کھانا کھانے کی شوقین تھیں۔ وہ ان کا من پسند کھانا بنا لیتی تو چند گھنٹے کے لیے ان کے طرف سے چھٹکارا مل جاتا۔ مہوش ابھی تک ڈپریشن کے فیز سے ہی نہ نکلی تھی کبھی گھنٹوں کمرے میں بند رہتی۔ کبھی بلاوجہ گھر والوں سے لڑنا، جھگڑنا اور الجھنا شروع کر دیتی۔ انابیہ بھی چونکہ اب گھر کا فرد شمار ہوتی تھی اس لیے اسے بھی کوئی خاص استثنیٰ حاصل نہ تھا۔ مہوش اس کے کیے گئے کاموں پر بلاوجہ کی تنقید بھی کرتی اور حلق پھاڑ کر چیخنے چلانے بھی لگتی۔

مدحت آپی بھی روز ہی میکے کا چکر لگاتی تھیں ان کا برتاؤ انابیہ کے ساتھ قدرے بہتر تھا بلکہ وہ ماں، بہنوں کو بھی انابیہ کے ساتھ رویہ بہتر رکھنے کی ہدایت کرتی رہتیں۔

"اس لڑکی کی شرافت سے ناجائز فائدہ مت اٹھائیں امی! اگر یہ آپ لوگوں کا رویہ اپنے گھر والوں کے علم میں لے آئی تو وہ اسے لاوارثوں کی طرح یہاں نہیں چھوڑیں گے۔ پھر خود سوچیں یہ آپ لوگوں کی جلی کٹی کیوں برداشت کرے جب اسے شوہر کی توجہ اور محبت بھی حاصل نہیں ہے۔ وہ تو اوپر والوں کے ہاں ابھی بھی اسی آزادی سے آتا جاتا ہے۔ معید کو نیلما کے چنگل سے چھڑانے کا یہ ہی ایک طریقہ ہے کہ آپ گھر والے انابیہ کو سپورٹ کریں۔" مدحت دبی زبان میں ماں کو سمجھانے کی کوشش کرتی۔

"ارے جاتا رہے نیلما کے پاس۔ اب کون سا نیلما کی اس سے شادی ہو سکتی ہے۔" نگہت، معید کی شادی کے بعد کم از کم نیلما کے حوالے سے مطمئن ہو گئی تھیں۔ مدحت کا سمجھایا صرف سب سے چھوٹی وردہ کی سمجھ میں آتا تھا وہ انابیہ کو بھابھی سمجھ کر عزت بھی دیتی تھی اور کبھی کبھار اسے کمپنی بھی دینے کی کوشش کرتی۔

معید آفس سے رات گئے لوٹتا تھا جب کبھی جلدی آجاتا تب بھی رات گئے سے پہلے اس کے درشن نہ ہو پاتے۔ وہ رابعہ اور نیلما کے پاس اوپر چلا جاتا۔

حیرت انگیز طور پر انابیہ کو اس لڑکی سے کسی قسم کا حسد محسوس نہ ہوتا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس

نے معید پر اپنا حق سمجھنا ہی شروع نہ کیا تھا۔

نیلما بہت پرکشش لڑکی تھی۔ گھر والے اسے تیز طرار خرانٹ، چالاک ماسی اور جانے کس کس لقب سے نوازتے تھے لیکن گھر والوں کی فطرت سمجھنے کے بعد انابیہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ رابعہ چچی اور نیلما سے بری طرح چڑتے ہیں اور جب انسانوں کے بیچ چڑ کا رشتہ قائم ہو جائے تو دوسرے بندے کی خوبیاں بھی خامیوں میں بدل جاتی ہیں۔ فی الحال اسے نیلما سے نفرت یا حسد محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اب وہ اس ابنارمل طرز زندگی سے تھکنے لگی تھی۔

ایمن بار بار فون کر کے اسے گھر آنے کا کہتی مگر اس کا گھر جانے کو بھی دل نہ چاہتا۔ زندگی کی ان کٹھنائیوں کی ذمہ دار صرف اس کی ماں تھی لیکن اب ماں بھی اس کی وجہ سے اتنی پریشان رہنے لگی تھی کہ اس کا جی نہ چاہتا وہ میکے جا کر اپنی اجڑی شکل دکھا کر ماں کو مزید پریشان کرے۔ پندرہ بیس دن بعد معید کو ہی خیال آیا۔

"بہت دن ہو گئے، تم نے اپنے گھر کا چکر نہیں لگایا۔ تمہارے گھر والے بلاوجہ پریشان ہوں گے۔ دو چار دن کے لیے چلی جاؤ۔"

انابیہ کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ بکھر جاتی، اسے انابیہ کے ماں، باپ کی بازپرس کا خوف تھا۔ ذکیہ کی برداشت کا پیمانہ اب واقعی لبریز ہونے کو تھا۔

"یہ تو نے اپنی کیا حالت بنالی ہے انابیہ... ارے تیری نند کی شادی نہ ہو سکی تو آخر اس میں تیرا کیا قصور۔ نئی نویلی دلہنوں کے چہرے پر کیسی رونق ہوتی ہے۔ تیری ویران آنکھیں دیکھ کر میرا دل ہول جاتا ہے۔ معید تو ٹھیک ہے نا تیرے ساتھ؟" وہ متوحش انداز میں پوچھتیں۔

"بہت تھکی ہوئی ہوں امی! کوئی اور بات کریں۔"

اس کے پاس ماں کے کسی سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

"تم باپ، بیٹی مل کر میرا دماغ خراب کر دو گے۔ ارے غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ مان لیا میرا انتخاب صحیح نہ تھا۔ لیکن مسئلے کا کوئی حل بھی تو ہونا چاہیے۔ تمہارے باپ نے مجھے خاموشی کی مار، مارنا شروع کر رکھی ہے۔ بلاضرورت کلام تک نہیں کرتے۔ تم آئی ہو تو منہ سے کچھ نہیں پھوٹتیں۔ یہ ایمن ہے، یہ اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی رہتی ہے کہ اگر میں تمہاری شادی سلجوق سے کروا دیتی تو تم اس کے سنگ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہوتیں۔ مان لیا بھئی مجھ سے غلطی ہو گئی اگر سلجوق..."

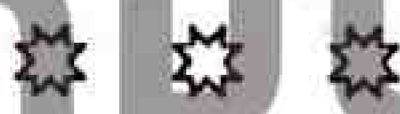
"پلیز امی! خاموش ہو جائیں۔" انابیہ سے مزید ضبط نہ ہو سکا تھا۔ اس کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔

"میں تمہاری خالہ سے بات کرتی ہوں۔ آخر اسی کی نند کی گارنٹی پر تمہارا رشتہ دیا تھا میں نے۔ اگر تمہارے سسرال والے تمہارے ساتھ اپنا رویہ درست نہیں کرتے تو تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے دوبارہ اس جہنم میں جانے کی۔ ہم آخر ان لوگوں سے دب کر کیوں رہیں۔ میری شہزادیوں جیسی بیٹی کو مٹی میں رول دیا انہوں نے..."

"آپ نے اپنی شہزادیوں جیسی بیٹی کے لیے اس جہنم کا انتخاب خود کیا تھا، امی! اور اب مجھے باقی زندگی اسی جہنم میں گزارنی ہے۔ آپ نہ خالہ جان وغیرہ کو درمیان میں ڈالیں گی۔ نہ ابو کو پریشرائز کریں گی کہ وہ آپ کے ساتھ میرے سسرال آکر ان لوگوں کی خبر لیں... ابو کے سامنے اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کا بی پی پہلے ہی نارمل نہیں رہتا۔ انہیں قطعاً" پریشان نہ کریں۔ بلکہ سب اچھا ہے کی رپورٹ دیں۔" انابیہ نے ماں کو قطعیت بھرے انداز میں مخاطب کیا۔

"ہاں... وہ تو جیسے اندھے ہیں نا۔ تیرے چہرے پر چھائی مردنی انہیں نظر نہیں آتی کیا۔" ذکیہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

انابیہ نے دوبارہ سر ہاتھوں پر گرا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے سوا کوئی جائے فرار نہ تھی۔



معید اپنا فون چارجنگ پر لگا کر اوپر والوں کی طرف

گیا ہوا تھا۔ اس کا فون تواتر سے بجنے لگا۔ انابیہ نے بیل فون کی اسکرین پر سرسری نگاہ ڈالی۔ "باس کالنگ۔" جگمگا رہا تھا۔ اس نے وقفے وقفے سے بجتے فون کو نظرانداز کر کے الماری ٹھیک کرنی شروع کر دی۔ گھنٹے بعد معید کی واپسی ہوئی تھی۔

"تو گڈ! بارہ مسڈ کالز۔" اس نے فون دیکھتے کے ساتھ ہی پریشانی کے انداز میں خود کلامی کی۔ پھر فوراً" ہی فون کان سے لگایا تھا۔ مگر اس بار دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔

"اتنی دیر تک فون بجتا رہا اور تمہارے کان پر جوں تک نہ رینگی۔" اس نے اپنی جھنجلاہٹ انابیہ پر اتاری۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟" انابیہ نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں دریافت کیا۔

"کوئی ضروری بات ہوگی۔ تب ہی بار بار فون آرہا تھا نا۔ تم چار سیڑھیاں چڑھ کر مجھے فون اوپر پکڑانے نہیں آسکتی تھیں۔" معید کے کہنے پر انابیہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اب ایسے کیوں گھور رہی ہو؟" وہ مزید جھنجلایا۔

"آئندہ اتنی بار فون بجا تو پکڑا دوں گی۔" انابیہ نے بحث میں پڑنا غیر ضروری خیال کیا۔ معید کچھ ہڑبڑا کر خاموش ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نگہت بیگم مہوش کو ساتھ لے کر بازار گئی تھیں۔ ڈاکٹر کی یہ ہی ہدایت تھی کہ اس کا دھیان بٹانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ معید آفس، جب کہ وردہ اسکول گئی ہوئی تھی۔ انابیہ روٹین کے کاموں میں مصروف تھی۔ اتنے میں دروازے پر بیل بجی۔ انابیہ نے ذرا سا گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔

"بی بی جی! مہربانی کر کے یہ سبزی اوپر دے دیں۔ نیلما بی بی جی اسکول جاتے ہوئے کہہ گئی تھیں۔ میں بہت دیر سے بیل بجا رہا ہوں، مگر شاید گھنٹی خراب ہے۔"

ادھیڑ عمر سبزی والا بہت لجاجت بھرے انداز میں اس سے مخاطب تھا۔ انابیہ نے چپ چاپ سبزی کا شاپر تھام لیا۔ اوپر والے آنے جانے کے لیے بیرونی زینہ استعمال کرتے تھے۔ صرف معید تھا جو گھر کے اندر کھلنے والا زینہ بڑے دھڑلے سے استعمال کرتا تھا اور آج پہلی بار انابیہ وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ کچھ فطری تجسس بھی تھا کہ آخر وہ اوپر جا کر دیکھے تو سہی' وہ کیسے لوگ ہیں۔

رابعہ بیگم وہیل چیئر پر بیٹھی اخبار کے مطالعے میں مشغول تھیں۔ قدموں کی چاپ پر گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان کے چہرے پر ایک پل کو حیرت بھرے تاثرات ابھرے تھے۔ مگر اگلے ہی پل انہوں نے اسے خوش دلی سے مخاطب کیا۔

"آؤ بیٹا' رک کیوں گئیں؟" انہوں نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

انابیہ کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ بہت خوب صورت اور باوقار خاتون ہیں۔ معذوری کے باوجود کتنا صاف ستھرا حلیہ تھا۔ سلیقے سے بنے ہوئے بال' استری شدہ جوڑا' نازک سے فریم والا سنہری چشمہ اور ہونٹوں پر شفیق سی مسکراہٹ۔

"وہ میں یہ سبزی دینے آئی تھی۔ آپ لوگوں کی شاید بیل خراب ہے۔" انابیہ نے اپنی آمد کی وضاحت دی۔

"اچھا بیٹھو تو سہی۔ سبزی دینے کے بہانے سہی تم اوپر تو آئیں۔ میں روزانہ معید کو کہتی ہوں' دلہن کو لے کر اوپر آؤ۔ میں تو تمہاری دعوت کرنا چاہ رہی تھی۔۔۔ لیکن پھر نگہت بھابھی وغیرہ کی وجہ سے رک گئی۔ مہوش کی وجہ سے سب پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔"

وہ دھیمے لہجے میں مخاطب تھیں۔ انابیہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اتنے میں ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"نوراں! دلہن کے کھانے پینے کے لیے کچھ لاؤ بھئی۔۔۔ پہلی بار دلہن اوپر آئی ہے۔" ملازمہ اسے سلام

کرکے بہت اشتیاق سے تکنے لگی تھی۔ جب رابعہ نے ملازمہ کو نرمی سے ٹوکا تھا۔

"نہیں رہنے دیجیے۔ میں بس جاؤں گی۔" انابیہ نے منع کرنا چاہا۔

"ذرا اور دیر کو تو بیٹھو بیٹا۔ میں تو ویسے ہی لوگوں سے بات کرنے کو ترستی ہوں۔ نیلما تو صبح اسکول چلی جاتی ہے۔ شام کو کالونی کے بچے اس کے پاس ٹیوشن پڑھنے آجاتے ہیں۔ اس سبزی والے کا بیٹا بھی نیلما کا شاگرد ہے۔ بھلامانس شخص ہے۔ سبزی ترکاری خود پکڑا جاتا ہے۔"

"آپ کی ٹانگیں۔۔۔" انابیہ نے بے ساختہ پوچھا تھا۔ سوال پوچھنے کے بعد احساس ہوا کہ پہلی ملاقات میں ہی اتنے منہ پھٹ انداز میں ان کی معذوری کے بارے میں استفسار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کے چہرے پر دکھ کے بادل چھا گئے۔

"بہت خوف ناک ایکسیڈنٹ تھا میں نے اپنی ٹانگیں اور اپنا شوہر اس حادثے کے نتیجے میں کھو دیے تھے۔ نیلما جب دس برس کی تھی۔" انہوں نے دھیرے سے بتایا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔" انابیہ فقط یہ ہی کہہ پائی۔ اتنے میں ملازمہ کولڈ ڈرنک اور نمکو لیے چلی آئی۔ انابیہ نے گلاس تھام لیا تھا۔

"نیچے آنٹی وغیرہ نہ آگئے ہوں۔ مارکیٹ تک گئے تھے' انہیں میرے یہاں آنے کا پتا چلا تو سخت خفا ہوں گی۔" انابیہ کو یک دم خیال آیا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو گھونٹ بوتل پی کر گلاس واپس ملازمہ کو تھمایا۔

"میں چلتی ہوں آنٹی۔۔۔ موقع ملا تو پھر آؤں گی۔" وہ عجلت بھرے انداز میں واپس پلٹ گئی۔

"کتنی حیرت کی بات ہے نوراں۔۔۔ دلہن ہم سے بدگمان نہ تھی۔ حالانکہ بدگمان ہونا اس کا حق بنتا ہے۔" انہوں نے خود کلامی کا سا انداز اختیار کیا۔

"ہاں جی بڑی سوہنی کڑی تھی۔" نوراں نے اپنے ہی انداز سے ان کی تائید کی۔ وہ مسکرا دی تھیں۔

"ہم کیا ہر وقت سر جھاڑ منہ پہاڑ حلیے میں رہتی ہوں۔ تمہاری بری کی تیاری میں میں نے اپنی ٹانگیں گھسا دی تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی اور خوب صورت جوڑا موجود ہے۔ تم پہنتیں کیوں نہیں۔" مدحت آپی نے اس کی کلاس لی تھی۔

"پہن لوں گی۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔

"کب پہنوگی۔ جاؤ ابھی پہن کر مجھے دکھاؤ۔ تیار شیار رہوگی' تب ہی تو معید کے دل میں گھر کر سکوگی۔" انہوں نے اسے سمجھانا چاہا۔

ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ نہا دھو کر بری کا ایک فینسی سوٹ زیب تن کر لیا۔ مدحت آپی کو مطمئن کرنے کے لیے کاجل اور لپ اسٹک بھی لگائی۔ حالانکہ آج دل پر عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ مدحت آپی نے اسے دیکھ کر سراہا تھا۔ ان کے پاس بیٹھی مہوش کچھ دیر اسے عجیب و غریب انداز میں تکتی رہی۔ پھر جھٹکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ذرا دیر بعد حواس باختہ وردہ ان کے پاس آئی تھی۔ مہوش آپی نے اپنے جہیز والے سوٹ کیس میں سے بھابھی جیسا سوٹ نکالا ہے اور وہ اسے آگ لگا رہی ہیں۔

معید جو ابھی آفس سے لوٹا تھا۔ وردہ کی بات سن کر تیزی سے مہوش کے کمرے کی طرف بھاگا۔ نگہت بیگم اور مدحت آپی بھی پیچھے لپکی تھیں۔ انابیہ بھی خود کو روک نہ پائی۔ معید جوتوں سے سوٹ مسل کر آگ بجھا رہا تھا۔ ساتھ ہی مہوش کو اس حماقت پر اسے ڈانٹ بھی رہا تھا۔

"یہ بن سنور کر مجھے چڑاتی ہیں۔ جلاتی ہیں مجھے۔ ایسے ہی جوڑے میرے بھی بنے تھے۔ مگر مجھے پہننا نصیب نہ ہوئے۔ پھر یہ کس خوشی میں پہنتی ہیں۔"

مہوش اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے ہذیانی انداز میں چلائی تھی۔ انابیہ اس الزام پر ساکت کھڑی رہی۔ اس سے وضاحت دینے کے لیے لب بھی نہ کھولے گئے۔

"اب سنگی مجسمہ بن کر یہاں کیوں کھڑی ہو۔ دفع ہو جاؤ۔ کپڑے بدلو جا کر۔"

نگہت بیگم بھی اس پر چلائی تھیں۔ ان کے تیور دیکھ کر وہ واقعی خوف زدہ ہو کر کمرے میں بھاگی تھی۔

اس نے فوراً کپڑے تبدیل کرلیے۔ باہر سے اب بھی لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ معید 'ماں' بہنوں پر بگڑ رہا تھا۔ مدحت آپی کس کی سائیڈ پر تھیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر معید چلایا تھا۔

"چپ ہو جائیں' فون سننے دیں۔" خاموشی چھا گئی تھی اور پھر اس خاموشی کا دورانیہ طویل ہو گیا تھا۔ انابیہ نے ڈرتے ڈرتے کمرے سے باہر جھانکا۔ سب اسی کو دیکھنے لگے۔ وہ مزید گھبرا گئی تھی۔

"انابیہ فٹافٹ چادر پہنو۔ ہمیں اسپتال جانا ہے تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" معید نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔

"کیا ہوا ہے میرے ابو کو؟" اس کا سارا ڈر' خوف پل بھر میں رخصت ہوا۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح معید کی طرف لپکی۔

"خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بروقت ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ معمولی سا اٹیک تھا۔"

معید نے اپنی شرٹ اس کے ہاتھوں سے چھڑواتے ہوئے نرم لہجے میں بتایا تھا۔ مگر وہ تو اٹیک کا لفظ سن کر ہی لڑکھڑا گئی تھی۔ معید نے لپک کر اس کو سہارا دیا۔

"میرے ابو میری پریشانی نہیں سہار پائے' مجھے اسی چیز کا خدشہ تھا۔ صرف ان کی خاطر میں اس پاگل خانے میں رہ رہی تھی۔ اگر انہیں کچھ ہوا تو آپ سب کو عدالت میں گھسیٹوں گی۔ اپنے باپ کو مارنے کا مقدمہ کروں گی آپ لوگوں پر۔۔۔"

وہ واقعی اپنے حواس میں نہ تھی۔ معید نے بہت مشکل سے مدحت آپی کے ساتھ مل کر اسے گاڑی میں بٹھایا تھا۔ گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔ تو وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ معید دلاسے کا ایک لفظ تک نہ کہہ سکا تھا۔

اسپتال پہنچ کر معید نے ریسپشن سے معلومات لی تھیں۔ کوریڈور میں اسے اپنے سسرال والے کھڑے نظر آگئے تھے۔ ایک چہرا اجنبی تھا۔ معید اس کو نہ پہچان پایا تھا۔ جبکہ انابیہ تیر کی تیزی سے اسی کے پاس لپکی تھی۔

"ابو کیسے ہیں' سلجوق۔۔۔ پلیز کوئی بری خبر مت سنانا۔"

"چاچو بالکل ٹھیک ہیں بیہ۔۔۔ حالت بالکل خطرے سے باہر ہے۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں روم میں شفٹ کر دیں گے۔" سلجوق نے اسے نرمی سے تسلی دی۔

"تم اتنی دور کیوں چلے گئے سلجوق۔ اگر ابو کو کچھ ہو جاتا۔ کیا کرتے ہم۔ بولو نا تم نہ ہوتے تو کون سنبھالتا ہمیں؟" وہ اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ اس وقت وہ اپنے حواسوں میں نہ لگ رہی تھی۔ سلجوق اس کی سراسیمہ حالت دیکھ کر بری طرح پریشان ہوا تھا۔ پھر اس کا شوہر صورت حال سمجھتے ہوئے اسے حوصلہ دینے آگے بڑھا۔

"انکل بالکل ٹھیک ہیں انابیہ! پلیز حوصلہ کرو۔"

معید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تھپتھپایا تھا۔ انابیہ نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوا کر رخ پھیر کر سلجوق کی جانب کر لیا۔ معید خفیف سا ہو گیا۔ سلجوق خود انابیہ کی بکھری حالت دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"پاگل ہوئی ہو بیہ۔۔۔ بجائے اس کے چھوٹے بہن' بھائی کو حوصلہ دو۔ تم اپنے حواس کھو رہی ہو۔ میں نے کہا نا چاچو بالکل ٹھیک ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہم دیکھ لیں گے انہیں۔" سلجوق نے اس بار اسے قدرے سختی سے ڈپٹتے ہوئے سمجھایا تھا۔ انابیہ نے سسکیوں کا گلا گھونٹا تھا۔ پھر قدرے فاصلے پر کھڑے اسامہ اور ایمن کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر اتنا ہراس تھا کہ اسے سلجوق کی بات ماننا ہی پڑی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے ایمن اور اسامہ کو ساتھ لپٹایا تھا۔

معید نے حیرانی سے بیوی کو دیکھا' جس نے ابھی تک ماں کے آنسو پونچھنے کی زحمت نہ کی تھی۔ معید خود ہی ساس کے پاس جا کر انہیں تسلی دلاسا دینے لگا۔

⭐ ⭐ ⭐

نجیب صاحب تین دن اسپتال میں گزار کر گھر لوٹ آئے تھے۔ ان کی حالت اب تسلی بخش تھی۔ پھر سلجوق کے آنے سے انہیں خود بخود ہی حوصلہ مل گیا تھا۔

"کتنی ناقابل یقین بات ہے نا آپی۔ جب ابو کی طبیعت بگڑنا شروع ہوئی اسی وقت سلجوق بھائی گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے بعد میں مجھے بتایا کہ وہاں اسلام آباد میں ان کا دل بے حد گھبرا رہا تھا۔ اسی لیے انہوں نے فوری طور پر گھر آنے کا فیصلہ کیا۔ ورنہ میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ کی شادی کے بعد اب وہ پلٹ کر کبھی گھر نہیں آئیں گے۔"

"یہ دلوں کے معاملے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں آپی۔۔۔" ایمن' انابیہ سے مخاطب تھی۔ انابیہ نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ بس ہولے سے مسکرا دی تھی۔

نگہت بیگم' مدحت کے ساتھ نجیب صاحب کا حال پوچھنے آئی تھیں اور معید کا تو روز ہی چکر لگ جاتا تھا۔ بلکہ وہ انابیہ کے آنے کے اگلے ہی دن ایک بیگ میں اس کے کپڑے اور ضرورت کا سامان لے کر آیا تھا۔

"تم خالی ہاتھ گھر سے نکلی تھیں۔ ضرورت کا جو سامان مجھے سمجھ میں آیا۔ میں نے بیگ میں ڈال دیا۔ تم جتنے دن چاہو آرام سے یہاں رہ سکتی ہو۔"

"یہ میرا گھر ہے' یہاں میری ضرورت کی ہر چیز موجود ہے' آپ نے یہ بیگ لانے کی بلاوجہ زحمت کی۔" وہ رکھائی سے بولی تھی۔

"سچ ہے بھئی۔۔۔ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔" وہ باآواز بلند بڑبڑایا تھا۔

اس کے بعد بھی اس نے آنا جانا ترک نہ کیا۔ روز آفس سے واپسی پر وہ سسر کی مزاج پرسی کرنے آجاتا۔

"آپ نے میرے ابو پر اچھا داماد ہونے کا تاثر چھوڑ دیا ہے۔ اب روز' روز آنے کی پریکٹس مت دہرایا کریں۔ بلاوجہ آپ کے معمولات متاثر ہوتے ہیں۔"

انابیہ ایک دن اسے کہے بغیر نہ رہ پائی تھی۔ معید بس اسے گھور کر ہی رہ گیا۔ لیکن اس کے بعد اس نے واقعی آنا کم کر دیا تھا۔ ذکیہ' سلجوق کے خوب واری صدقے جا رہی تھیں اور ماں کا یہ بدلا روپ انابیہ کو مزید اذیت میں مبتلا کر رہا تھا۔

ذکیہ کو اس گھر کے لیے سلجوق کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔ اسامہ تو ابھی بہت چھوٹا اور ناسمجھ تھا۔ سلجوق نہ ہوتا تو وہ تو شاید نجیب کو بروقت اسپتال بھی نہ لے جا پاتیں۔ بے ہوش نجیب ہوئے تھے اور حواسوں نے ان کے کام چھوڑا تھا۔ اسامہ کو صورت حال سے نمٹنے کا کوئی طریقہ ہی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ پھر غیبی فرشتے کی مانند سلجوق کی آمد ہوئی۔ پریشانی کے عالم میں بھی ذکیہ نے سکون کا سانس لیا تھا اور اب جب کڑے دن گزر چکے تھے۔ وہ پھر بھی سلجوق کو واپس نہ بھیجنا چاہ رہی تھیں۔

"دفع کرو نوکری کو بیٹا۔۔۔ تمہارے چچا کا کاروبار آخر تم نے اور اسامہ نے ہی تو سنبھالنا ہے۔ بس اب نوکری کا شوق پورا ہو گیا۔ گھر واپس آجاؤ۔" وہ مان بھرے لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔ جیسے وہ نوکری اپنے شوق کی خاطر ہی تو کرنے گیا تھا۔

"ابھی تو میں نے چھٹیاں بڑھوالی ہیں چچی جان! لیکن جاب چھوڑنا فی الحال میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ ہاں میں کوشش کروں گا کہ اگر یہاں میرا ٹرانسفر ممکن ہو سکا۔ ہماری کمپنی اپنی ایک برانچ یہاں بھی لانچ کر رہی ہے۔" سلجوق کے کہنے پر ذکیہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"تو پھر اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔" وہ مطمئن ہو گئی تھیں۔ پاس بیٹھی انابیہ کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی اور یہ مسکراہٹ سلجوق کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ پائی تھی۔ ذکیہ اٹھ کر چلی گئیں تو سلجوق انابیہ کے پاس آبیٹھا۔

"اب تو چاچو کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس یہ پھر تم

اتنی پریشان اور اپ سیٹ کیوں رہتی ہو۔" سلجوق سے ضبط نہ ہو سکا تو پوچھ بیٹھا۔ پچھلے کئی مہینوں سے وہ اپنی ناکام محبت کا ماتم منانے میں مصروف تھا۔ یہاں اس کے سب دوست احباب یہ ہی کہہ رہے تھے کہ وہ پہلے والا سلجوق لگتا ہی نہ تھا۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ انابیہ کا ساتھ قسمت کی ستم ظریفی کی وجہ سے ممکن نہ ہو سکا تو کیا ہوا۔ وہ پہلے کی طرح اسے اپنا بہترین دوست سمجھ کر اپنے مسئلے تو اس کے ساتھ بتا سکتی ہے۔ سلجوق نے اب بھی اس کے ساتھ پہلے والا برتاؤ اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ ہی ہلکی پھلکی نوک جھونک، ہنسی مذاق، لیکن انابیہ کا پھس انداز دیکھ کر وہ جھنجلا جاتا تھا۔ تنگ آکر اب اس نے صاف صاف پوچھ لیا تھا کہ آخر وہ اتنی الجھی ہوئی اور پریشان کیوں ہے۔

"نہیں۔۔۔ میں پریشان تو نہیں، اب تو ابو کی طبیعت خاصی بہتر ہے۔" انابیہ نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

"اور وہ تمہارے میاں صاحب۔ چار دن ہو گئے انہوں نے چکر نہیں لگایا۔" سلجوق نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"بس آفس کی مصروفیت ہے، آج کل دیر سے گھر جاتے ہیں۔" اس نے معید کے نہ آنے کی مختصر سی توجیہ پیش کی۔

"ویسے آپس کی بات ہے بیہ! مجھے چچی کے ذوق کا اندازہ تھا، میں اسی لیے ڈر رہا تھا کہ اللہ جانے انہوں نے تمہارے لیے کیا نمونہ پسند کیا ہوگا۔ لیکن یار بندہ تو ٹھیک ٹھاک اسمارٹ ہے۔ پرسنالٹی بھی زبردست ہے۔" سلجوق نے توصیفی انداز اختیار کیا۔

"معید دل کے بھی بہت اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں میرا، اچھا چھوڑو یہ باتیں۔ بتاؤ چائے پیو گے۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ میں اپنے لیے چائے بنانے لگی ہوں۔" انابیہ نے اٹھتے ہوئے موضوع ہی لپیٹ دیا۔

"ایک کپ میرا بھی بنا لینا۔" سلجوق نے گہرا سانس اندر کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ وہ چپ چاپ کچن کی طرف مڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری ساس کا میرے پاس فون آیا تھا۔" ذکیہ نے انابیہ کو مخاطب کیا۔

"مجھے بھی دو چار بار فون کر چکی ہیں۔" اس نے انہیں سپاٹ سے انداز میں بتایا تھا۔

"ہاں یہ ہی کہہ رہی تھیں کہ بہو بیگم نے تو گونگے کا گڑ کھا لیا ہے۔ کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتیں۔ آپ ہی بتا دیں کہ بیٹی کو گھر ہی بٹھائے رکھنا ہے یا سسرال واپس بھیجنے کا ارادہ بھی ہے۔" ذکیہ نے نگہت بیگم کے الفاظ دہرائے۔

انابیہ جانتی تھی کہ ماں نے اختصار سے کام لیا ہے۔ نگہت بیگم نے اور بھی بہت سی طنزیہ باتیں کی ہوں گی۔

"انابیہ میری بچی! میری بات سنو۔" ذکیہ اس کے قریب آن بیٹھی تھیں۔ بہت پیار سے اس کی پیشانی پر بکھری لٹیں سمیٹیں، پھر ہمت مجتمع کر کے اس سے صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"میرا انتخاب غلط نکلا۔ یہ لوگ جیسے نظر آتے تھے، ویسے نہیں نکلے۔ معید اتنا برا نہیں ہے، لیکن کیا فائدہ ایسے شوہر کا جو بیوی کو سسرال میں اس کا جائز مقام نہ دلوا سکے۔"

ذکیہ بات کی تمہید باندھ رہی تھیں۔ انابیہ بنا کچھ بولے خالی خالی نگاہوں سے انہیں تکے گئی۔

"نہیں بہو کی نہیں، ایک نوکرانی کی ضرورت تھی۔ سارے گھر کا بار تیرے کندھوں پر ڈال دیا۔ جلی کٹی الگ سناتے ہیں، ارے تو کوئی لاوارث تھوڑی ہے۔ ہم نے بیٹی بیاہی ہے، بیچی تھوڑی ہے۔ کیا کمی ہے میری بچی میں، جو ہم ان کا ایسا سلوک برداشت کریں۔" ذکیہ کی آنکھوں میں اب آنسو بھر آئے تھے۔

"تو پھر؟" انابیہ اس لمبی تمہید سے اکتا گئی تھی۔

"اب تجھے واپس وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر انہیں تجھے اپنے گھر میں بسانا ہے تو پھر ہماری شرائط ماننی پڑیں گی۔ معید تجھے الگ گھر لے کردے۔ ارے انہوں نے بھی تو اپنی بیٹی کے لیے کیا کچھ ڈیمانڈز نہیں کی تھیں۔"

"پھر کیا ہوا۔ ان کی بیٹی کا گھر بس گیا؟" انابیہ نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں پوچھا۔

"تو ٹھیک ہے نا' میں بھی اپنی بچی کو ان ناقدرے لوگوں کو کیوں سونپوں' ناک سے لکیریں کھینچ کر شرطیں مانتے ہیں تو ٹھیک' ورنہ مجھے بھی پروا نہیں کہ معید کے ساتھ تیرا گھر بستا ہے یا نہیں۔ معید پر دنیا ختم نہیں ہوتی اور مجھے بھی اپنی غلطی کی تلافی کا موقع مل جائے گا۔ سلجوق گھر کا بچہ ہے۔ اب بھی تیرا طلب گار ہوگا۔ تیرے ابو کی بیماری کے بعد ہمارے گھر کو ویسے بھی اس کی ضرورت ہے اور اس سب سے بڑی بات کہ تیرے ابو۔۔۔"

"امی پلیز۔۔۔ آگے ایک لفظ اور نہیں۔۔۔" انابیہ غصے کی شدت سے کانپنے لگی تھی۔ ذکیہ اس کی حالت دیکھ کر قدرے خائف ہوئی تھیں۔

"ایمن!" انابیہ نے اونچی آواز میں بہن کو پکارا۔ ایمن یوں پکارے جانے پر گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی تھی۔

"میرے بیگ میں میرے کپڑے وغیرہ ڈالو اور سلجوق کو دیکھو اگر جاگ گیا ہے تو اس سے کہو گاڑی نکالے۔ مجھے ابھی گھر جانا ہے۔"

ذکیہ 'ارے' ارے' کرتی رہ گئیں' مگر وہ ان کی مزید کچھ سنے بغیر کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

لگتا تھا اتنے دنوں سے کسی نے اس کے کمرے میں جھانک کر نہ دیکھا تھا۔ ہر سو بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ فرنیچر پر دھول کی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ معید آفس سے لوٹا تو انابیہ کمرے کی بکھری حالت سنوار کر اب الماری ٹھیک کر رہی تھی۔

"خاہ تو آپ تشریف لے آئی ہیں۔" وہ یقیناً اس کی آمد سے بے خبر تھا۔ جب ہی بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔ انابیہ خاموشی سے کام میں لگی رہی۔

"ویسے دعوے تو آپ بڑے بڑے کر کے گئی تھیں۔ مثلاً "اس پاگل خانے میں دوبارہ نہ آنے کا دعوا۔ بائی دا وے ارادہ کیسے بدلا؟" وہ اسے شرارتی انداز میں چھیڑ رہا تھا۔

"کیونکہ پاگلوں کے ساتھ رہ' رہ کر میں خود آدھی پاگل ہو چکی ہوں۔ اب میرا نارمل لوگوں میں رہنا ممکن نہیں۔ یہ پاگل خانہ ہی میرا آخری ٹھکانا ہے۔" وہ تڑخ کر بولی تھی۔

"زبردست بھئی' تم تو ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے مزید امپریس کرتی جا رہی ہو' ورنہ تمہارے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ تم انتہائی دبو اور بزدل سی لڑکی ہو' لیکن اس روز تمہاری زبان کے جوہر دیکھ کر میں اش اش کر اٹھا۔ کیسا للکارا تھا میری ماں کو۔ واہ مزا آگیا تھا۔" وہ سر دھنتے ہوئے اس کی اس دن کی باتیں یاد کرنے لگا۔

"تم نے اگر اپنی یہ ہی پرفارمنس برقرار رکھی تو یقین کرو میرے گھر والے ایک دم سیدھے ہو جائیں گے۔" معید نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے' آپ کو سیدھا کرنے کے لیے مجھے کون سا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔" وہ تپ کر بولی تھی۔

"ہائیں! کیا مطلب' میں۔۔۔ میں تو یار بڑا سیدھا سادہ' شریف اور بیبا سا بندہ ہوں۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"جی جی ٹھیک کہا۔ بالکل جلیبی کی طرح سیدھے ہیں آپ۔۔۔" وہ بری طرح چڑ کر بولی تھی۔ معید ہنس پڑا تھا۔

"کس کے ساتھ آئی ہو۔" وہ اب دوستانہ لہجے میں مخاطب تھا۔

"سلجوق چھوڑ گیا ہے۔" انابیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"سلجوق۔۔ ویسے ان موصوف کا کیا حدود اربعہ ہے۔ اچانک سے منظر عام پر آئے ہیں یہ۔" معید نے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

"بہت خوب معید صاحب! خود بیوی کی آنکھوں کے سامنے کزن سے عشق لڑا رہے ہو اور بیوی کے کزن کی انکوائری ہو رہی ہے۔" انابیہ نے استہزائیہ انداز میں سوچا تھا، مگر بولی تو صرف اتنا۔۔

"میرے مرحوم تایا کا بیٹا ہے، پہلے ہمارے گھر ہی رہتا تھا۔ اب جاب کی وجہ سے اسلام آباد میں تھا۔ نئی نئی جاب تھی، اس وجہ سے ہماری شادی پر بھی چھٹی نہیں مل سکی تھی، لیکن اب ابو کی طبیعت کی وجہ سے ہو سکتا ہے یہیں ٹرانسفر کروا لے۔" انابیہ نے جانے کیوں اتنا تفصیلی جواب دیا۔

"چلو۔۔ اچھا ہے، آنٹی وغیرہ کو سہولت ہو جائے گی۔ ایک، دو ملاقاتوں میں خاصا ڈیسنٹ اور سمجھ دار انسان لگا ہے مجھے۔ انکل بھی اس کی موجودگی میں خاصے ریلیکس لگتے ہیں۔" معید نے سادہ سے انداز میں کہا۔ انابیہ نے سر ہلا دیا تھا۔

"پھوپھو سے ملاقات ہوئی تمہاری؟" معید کو خیال آیا تو فوراً" پوچھا۔

انابیہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ اسے وردہ کی زبانی پتا چلا تھا کہ آج کل ان لوگوں کے ہاں کویت سے ان کی چھوٹی پھوپھو آئی ہوئی ہیں۔ فی الحال ان کا قیام اوپر رابعہ چچی کی طرف تھا۔

انابیہ کو ان کے تذکرے میں کوئی خاص دلچسپی محسوس نہ ہوئی تھی۔ ابھی تک اس گھر میں اس نے معید کے ننھیالی رشتہ داروں کو آتے دیکھا تھا اور ان لوگوں کا انابیہ پر کبھی بھی اچھا تاثر نہ پڑا تھا۔

نگہت بیگم کے میکے والے ان ہی کی طرح منہ پھٹ قسم کے لوگ تھے۔ نو دولتیے اور شوباز بھی۔۔۔ اللہ جانے کویت سے آئی ہوئی پھوپھی کے کیا رنگ ڈھنگ ہوں گے، لیکن معید ان کا ذکر بہت محبت سے کر رہا تھا۔

"تم سے ملنے کا بہت شوق ہو رہا تھا پھوپھو کو۔ اگر آج تم نہ آئیں تو کل میں انہیں تم سے ملوانے لے جاتا۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ انابیہ اس تذکرے میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود لے گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ تمہارے تایا کا بیٹا کیا مستقل طور پر یہاں آگیا ہے؟"

نگہت بیگم اس سے مخاطب تھیں۔ کل جب سلجوق اسے سسرال چھوڑنے آیا تھا تو نگہت بیگم اس سے بہت تپاک سے پیش آئی تھیں۔ اب بھی وہ کرید کرید کر اسی کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ اس کی تعلیم اور جاب کا سن کر بھی خاصی متاثر ہوئی تھیں۔

"اور شادی وادی کا کیا ارادہ ہے۔ کوئی لڑکی تو پسند نہیں کر رکھی؟" وہ پُرتجسس انداز میں پوچھ رہی تھیں۔ انابیہ ان کے انداز پر کچھ چونکی ہوئی تھی۔ اندر کہیں خطرے کی گھنٹی بھی بجنے لگی۔ اتنے میں معید کی پھوپھو کی آمد ہوئی تو یہ ذکر ادھورا رہ گیا۔

انابیہ انہیں دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس کی توقع کے برعکس وہ خاصی ینگ خوب صورت اور ماڈرن سی خاتون تھیں۔ انابیہ سے بہت محبت اور اپنائیت سے ملیں۔ اسے بہت سے قیمتی تحائف بھی دیے۔ انابیہ کو ان کا پُرخلوص انداز اچھا لگا تھا۔

رابعہ آنٹی کے بعد شاید وہ دوسری سسرالی رشتہ دار تھیں جنہوں نے انابیہ پر اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ معید ان سے خاصا بے تکلف تھا اور وہ معید کے ہنسی مذاق کو بھرپور انجوائے کرتے ہوئے خود بھی اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے اس کو اس کی پیاری اور من موہنی سی بیوی کا ذکر کر کے اسے خوش قسمت، خاوند کا خطاب دیا تو معید نے فوراً" ہی موضوع پلٹ دیا۔

انابیہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ

پھوپھی، بھتیجے کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر کچن میں چلی آئی۔ جہاں بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔

دن اسی بے کیف انداز میں گزرے جا رہے تھے۔ معید کی وہی معمولات تھے۔ وہ آفس سے آکر اپنا بیشتر وقت اوپر گزارتا۔ انابیہ گھر کی ذمہ داریوں میں الجھی رہتی۔

☼ ☼ ☼

ثمینہ پھوپھو چند دن کے لیے اپنے سسرالی رشتہ داروں کے پاس ایبٹ آباد گئی ہوئی تھیں۔ پندرہ بیس دن وہاں گزار کر وہ کل واپس لوٹی تھیں۔ ان کا قیام اب بھی اوپر رابعہ چچی کی طرف ہی تھا۔

دو تین دن سے انابیہ کی طبیعت خاصی گری گری سی تھی۔ آج صبح ٹمپریچر بھی ہو گیا تھا۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس نے ناشتے کے بعد ٹیبلیٹ لے لی تو وقتی افاقہ ہو گیا۔ تمکنت بیگم آج مہوش کو ساتھ لے کر مدحت آپی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔

انابیہ نے مارے باندھے گھر کے کام نپٹائے، پھر بیڈ روم میں جا کر لیٹ گئی تھی۔ دوا کا اثر ختم ہوا تو بخار دوبارہ چڑھنے لگا تھا۔

وردہ کے اسکول سے آنے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور اس کی روٹی ڈال کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دی۔ وردہ اسکول سے آگئی تو انابیہ مطمئن ہو کر واپس بیڈ روم میں آگئی۔ اب اسے گیٹ پر بجنے والی بیل کا دھیان نہیں رکھنا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے سو سکتی تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا، مگر پھر بھی آنکھ لگ گئی۔

آنکھ کھلی تو نقاہت سے برا حال تھا۔ ٹمپریچر بہت بڑھ چکا تھا۔ دوپہر کو وہ بنا کھائے پیے سو گئی تھی۔ اب خالی پیٹ دوا لینا ناممکن تھا اور وہ خود میں اتنی ہمت نہ پاتی تھی کہ اٹھ کر کچن تک ہی چلی جائے۔ آہستہ آہستہ کپکپی بھی چڑھنا شروع ہو گئی تھی۔

باہر معید کی آواز آئی تو اس نے بے ساختہ سکون کا سانس لیا۔ معید میں کم از کم اتنی انسانیت ضرور تھی کہ وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر ڈاکٹر کے لے جاتا،

لیکن اس کا انتظار، انتظار ہی رہا۔ معید نے بیڈ روم میں آکر جھانکا تک نہیں۔ کافی دیر انتظار کے بعد وہ ہمت مجتمع کرتی اٹھی اور باہر لاؤنج میں آئی۔

"معید کہاں ہیں؟" سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے وردہ سے پوچھا۔ اگر وہ اوپر بھی تھا تو وہ وردہ سے کہہ کر اسے نیچے بلوانے والی تھی۔ اب اس کپکپاتے وجود کو سنبھالنا اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہو گیا تھا۔

"بھیا تو نیلما آپی کو ڈاکٹر کے ہاں لے گئے ہیں، انہیں فلو اور بخار ہو رہا تھا۔"

وردہ نے ٹی وی دیکھتے ہوئے مگن سے انداز میں جواب دیا۔ وہ کبھی کبھار نیلما سے پڑھنے اوپر چلی جاتی تھی۔ اس لیے نیلما کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے لہجے میں وہ نفرت اور بے زاری نہ ہوتی تھی جو اس کی باقی نندوں اور ساس کے لہجے میں ہوتی تھی۔

وردہ کا جواب سن کر انابیہ کی ہمت ایک دم ہی ڈھے گئی تھی۔ وہ گرنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھی۔ اسی لمحے وردہ کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ بخار کی حدت سے تمتماتا ہوا چہرہ اور کانپتا وجود۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے انابیہ بھابی....؟"

وردہ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ اتنے میں دروازے پر بیل ہوئی تھی۔

"یہ لیں بھابی! پانی پئیں، میں ذرا گیٹ پر دیکھ آؤں۔ اللہ کرے امی وغیرہ آگئے ہوں۔" وہ اسے پانی کا گلاس تھما کر بوکھلائے ہوئے انداز میں بیرونی دروازے کی طرف لپکی۔ واپسی پر وہ اکیلی نہ تھی۔

"بھابی! آپ کے میکے والے ہیں۔" اس نے انابیہ کے پاس آکر دھیرے سے بتایا۔

سلجوق اور ایمن کو آتا دیکھ کر انابیہ کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اب اس کے اپنے آچکے تھے۔ زبردستی ہمت مجتمع کرنے کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ گرم گرم آنسو گال بھگونے لگے تھے۔

"آپی! کیا ہوا آپ کو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔"
ایمن لپک کر اس کے پاس آئی۔
"او میرے خدا! آپ کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔" ایمن نے اس کا ہاتھ چھوا تو چیخ ہی پڑی۔
سلجوق نے بھی اس کی کلائی تھام کر بخار کی شدت کا اندازہ لگانا چاہا۔ انابیہ کی حالت دیکھ کر اس کے چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔
"ڈاکٹر کو چیک کروایا۔ کوئی میڈیسن لی ہے کیا۔"
ایمن متوحش انداز میں پوچھ رہی تھی۔ انابیہ بنا جواب دیے آنسو بہاتی رہی۔
"بھابھی تو کئی گھنٹوں سے کمرے میں تھیں۔ میں سمجھی آج امی وغیرہ گئے ہوئے ہیں۔ بھابھی کو کوئی کام نہیں ہے، تو ریسٹ کر رہی ہیں' ابھی بھابھی بیڈ روم سے نکلی تھیں تو آپ لوگ آ گئے۔" وردہ نے کچھ ہکلاتے، بوکھلاتے بتایا تھا۔
"ایمن، بیہ کو سہارا دے کر گاڑی تک لاؤ۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں۔"
سلجوق نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ باقی رام کہانی بعد میں بھی سنی جا سکتی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر بھی ایمن اس سے طبیعت کے اتنے بگڑنے کا سبب پوچھتی رہی مگر سلجوق نے اسے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ قریب ترین کلینک پر پہنچنے میں فقط پانچ منٹ لگے تھے اور جس وقت ایمن اور سلجوق، انابیہ کو سہارا دے کر کلینک کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے تو سامنے سے معید اور نیلما آتے دکھائی دیے۔ معید انہیں دیکھ کر بری طرح سٹپٹایا تھا۔ انابیہ کی حالت دیکھ کر یہ سٹپٹانا، گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں بدل گیا تھا۔
"کیا ہوا اسے؟" اس نے پریشان لہجے میں استفسار کیا۔
"بہت خوب... یہ سوال تو شاید ہمیں آپ سے پوچھنا چاہیے۔ ہم اسے آپ کے گھر سے یہاں لائے ہیں۔" سلجوق نے بہت مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے فقط یہ فقرہ بولنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔
"انابیہ! تمہاری طبیعت خراب تھی تو مجھے بتا نہیں سکتی تھیں کیا؟" معید بے پناہ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے انابیہ سے مخاطب ہوا۔
"آپ آفس سے آنے کے بعد بیڈ روم میں آئے نہیں اور مجھے آپ کا سیل نمبر بھی نہیں پتا تھا۔ ورنہ فون کر کے بلا لیتی۔" وہ سوکھے لبوں پر زبان پھیر کر بمشکل بولی اور یہ دو فقرے ہی معید کو شرمندگی کے گڑھے میں دھکیلنے کے لیے کافی تھے۔ ساتھ کھڑی نیلما کا چہرہ بھی خفت اور شرمندگی سے سرخ سا پڑ گیا تھا۔
"نیلم! تم جا کر گاڑی میں بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔" معید کو سچویشن آکورڈ ہونے کا بخوبی احساس تھا۔ اس نے گاڑی کی چابی نیلما کو تھمائی۔ وہ فوراً" ہی وہاں سے چلی گئی۔
"آؤ ڈاکٹر صاحب ابھی فری ہیں، چیک اپ کروا لیتے ہیں۔" انابیہ کا ہاتھ تھام کر وہ ڈاکٹر کے کمرے میں لے گیا۔ سلجوق اور ایمن بس ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

"اپنا سیل فون دو..." معید اس سے مخاطب تھا۔ اس نے چپ چاپ فون اسے تھما دیا۔
"تم نے آج تک اپنے سیل فون میں میرا نمبر تک محفوظ کرنے کی زحمت نہیں کی۔ میں نے نمبر سیو کر دیا ہے۔" اس نے سیل فون واپس انابیہ کو تھمایا۔
"آج تم نے اپنے گھر والوں کے سامنے مجھے شرمندہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وردہ سے لے لیتیں میرا نمبر، جب طبیعت اتنی خراب ہو رہی تھی تو تمہیں مجھے فون کر کے آفس سے ہی بلا لینا چاہیے تھا۔ میں فوراً" آ جاتا۔"
"ہاں جیسے آفس سے آنے کے بعد فوراً" آ ہی گئے تھے میرے پاس..." انابیہ نے جل کر سوچا تھا۔ کلینک سے وہ معید کے ساتھ ہی واپس آئی تھی۔
"پلیز! آپ لوگ بھی گھر آئیے، لیکن انابیہ میرے ساتھ ہی جا رہی ہے۔" معید ڈاکٹر سے اس کا چیک اپ کروا کر باہر نکلا تو پہلے تو انابیہ کی حالت کے بارے میں

ڈاکٹر کا کہا بتا کر ان کی تشویش دور کی' پھر سلیقے سے ہموار لہجے سے ٹکر دو ٹوک انداز میں انہیں یہ باور کروایا کہ انابیہ واپسی پر اس ہی کے ساتھ گھر جائے گی۔

"نہیں ہم بھی بس گھر ہی جائیں گے۔ ایمن اپنے لیے شاپنگ کرنے گئی تھی۔ کچھ بدلتے موسم کے کپڑے انابیہ کے لیے بھی لیے تھے ہم بس وہ ہی دینے آئے تھے۔"

سلجوق نے سنجیدگی سے بتایا۔ معید ایک بار پھر دل میں شرمندہ ہوا۔ وہ آج تک انابیہ کو شاپنگ پر نہ لے کر گیا تھا۔ نہ ہی کبھی اس سے اس کی کوئی ضرورت پوچھی تھی۔

واپسی کے سفر میں گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ انابیہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے رہی۔ نیلما خاموشی سے باہر کے نظاروں کو تکتی رہی۔ گھر کے سامنے گاڑی رکی۔ نیلما پرس میں سے چابی نکال کر بیرونی زینے کا دروازہ کھولتی اوپر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

معید' انابیہ کو سہارا دے کر اندر لے آیا۔ نگہت بیگم اور مہوش گھر لوٹ چکی تھیں۔ اس کی طبیعت کے بارے میں رسمی سا استفسار کر کے انہوں نے معید سے بازار سے کھانا لانے کا کہا تھا۔

معید ان سنی کرتا اسے لے کر کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت سے وہ اس کی خدمت میں ہی مصروف تھا۔ دودھ کے ساتھ دوا کھلائی۔ تکیوں کے سہارے بیڈ پر لٹایا۔ پھر ذرا سی دیر میں اس کے لیے دلیہ بنا لایا۔

"نخرے کیے بغیر فوراً" یہ پیالہ خالی کرو۔ دیکھا ہے' کتنی کمزوری اور نقاہت ہو رہی ہے۔ پیٹ میں کچھ جائے گا' تب ہی تو طبیعت سنبھلے گی نا۔"

اس نے دلیہ کھانے سے انکار کیا تو معید نے اسے ڈپٹ دیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر میں چائے' بسکٹ لے آیا تھا۔

انابیہ کو اب طبیعت میں خاصا افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ دوا نے آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی معید نے اس سے سیل فون مانگ کر اپنا نمبر سیو کیا تھا۔

"تمہارا بھائی مجھے ایسی کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا' لیکن بھئی اس کا ناراض ہونا بنتا تھا۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا اور میری بہن کی یہ حالت ہوتی تو میں تو سامنے والے کا جبڑا توڑ دیتا۔ قصور واقعی میرا تھا۔" کس فراخ دلی سے وہ اپنا قصور تسلیم کر رہا تھا۔ انابیہ اپنے عجیب و غریب مزاج والے شوہر کو دیکھ کر رہ گئی۔ اسے اپنا اصل قصور آج تک نظر نہ آیا تھا۔ وہ اسے بیوی کا رتبہ دینے کو تیار نہ تھا۔ آج تک اسے اس کا جائز حق نہ دیا تھا۔ ہاں اپنی چھوٹی موٹی غلطیاں اور کوتاہیاں بہت فراخدلی سے مان لیتا تھا۔

اگلے دن ذکیہ' بھی سلجوق کو ہی ساتھ لے کر اس کا حال پوچھنے چلی آئی تھیں۔ نگہت آج سمدھن سے بہت اچھے طریقے سے ملی تھیں۔ مہوش کو چائے کے ساتھ مزید اہتمام کرنے کی بھی ہدایت کر دی۔ ذکیہ سے گفتگو کے بجائے انہوں نے زیادہ وقت سلجوق کا انٹرویو لینے میں گزارا تھا۔ شاید اسی لیے سلجوق گھبرا کر جلدی اٹھ گیا۔

"پھر چکر لگانا بیٹا..... بہن کا گھر ہے تو سمجھو اپنا ہی گھر ہے۔ آتے جاتے رہا کرو۔" آج ان کے لہجے کی مٹھاس کا عجیب ہی عالم تھا۔

سلجوق اور ذکیہ رخصت ہوئے تو انابیہ نے کچن میں جانے کا سوچا۔ آج طبیعت میں خاصا افاقہ محسوس ہو رہا تھا اور نہ بھی ہوتا۔ تب بھی اسے اپنی ڈیوٹی سنبھالنی ہی تھی' مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی' جب نگہت نے اسے کچن میں جانے سے منع کر دیا۔

"جاؤ ..... آج آرام کر لو۔ پک جائے گا کھانا بھی۔"

انہوں نے کمال فراخ دلی سے اجازت دی۔ وہ ممنون ہو کر واپس بیڈ روم میں چلی آئی۔

شام کو معید آفس سے لوٹا تو پہلے کمرے میں آ کر اس ہی کی خیریت پوچھی۔ وہ اس عنایت پر ڈھنگ سے خوش بھی نہ ہو پائی تھی کہ وہ موبائل چارجنگ پر لگا کر اپنے معمول کے مطابق اوپر والوں کے پاس چلا گیا تھا۔

انابیہ پھر یاسیت میں گھر گئی۔ کبھی کبھار اسے لگتا کہ وہ بھی مہوش کی طرح ڈپریشن کی مریضہ بن کر رہ جائے گی۔ وہ کتنی بے مقصد زندگی جیسے جا رہی تھی۔ کبھی محبت کی راہ کی مسافر وہ بھی رہی تھی۔ مگر شادی کے وقت اس نے اللہ سے کتنی گڑگڑا کر دعا مانگی تھی کہ اس محبت کی جگہ وہ اس کے شوہر کی محبت دل میں ڈال دے۔ وہ پوری ایمان داری اور سچائی کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کرنا چاہتی تھی۔ اگر معید کی محبت اور التفات نصیب ہوتا تو ہو سکتا تھا وہ اب تک پرانی محبت فراموش بھی کر چکی ہوتی۔ ایسا تب ہی ممکن تھا۔ اگر معید اپنی سابقہ محبت کو فراموش کر دیتا، لیکن وہ تو ہر روز تجدید محبت کرنے اوپر چلا جاتا تھا۔

"کیا نصیب پائے ہیں تم نے بھی انابیہ بی بی!" وہ خود پر ترس کھانے لگی، اتنے میں ہی موبائل وقفے وقفے سے بجنے لگا۔ اس نے موبائل اسکرین پر نگاہ ڈالی، آج پھر معید کے باس اسے یاد فرما رہے تھے۔ جب دوبارہ کال آئی تو انابیہ نے چارجر کا پلگ نکال کر موبائل اٹھا لیا۔

پچھلا تجربہ یاد تھا اور معید کی تاکید بھی یا پھر آج وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ معید، نیلما کے پاس بیٹھ کر گپیں لگاتا کیسا لگتا ہے۔ وہ چھاپہ مار موڈ میں دبے پاؤں اوپر گئی تھی۔ نیلما کے رونے کی آواز سن کر اس کے قدم تھم گئے تھے۔

"پھوپھو! آپ ہی اسے سمجھائیں، آخر یہ ہمارا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں ثمینہ پھوپھو سے مخاطب تھی۔ تنہائی میں گپیں لگنے کے بجائے یہ تو کوئی محفل سجی ہوئی تھی۔ بلکہ شاید عدالت جمنا کہنا زیادہ مناسب تھا، کیونکہ نیلما نے معید کو کٹہرے میں کھڑا کر رکھا تھا۔

"یہ روزانہ دندناتا ہوا اوپر آجاتا ہے۔ میں اس کی شکل تک نہیں دیکھتی، اپنے ٹیوشن کے بچوں کے ساتھ مصروف رہتی ہوں۔ یہ بلا مقصد امی کے پاس بیٹھ کر کئی کئی گھنٹے گزار دیتا ہے۔

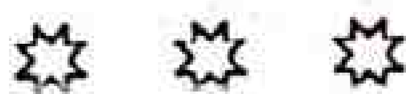
"ہاں تو آخر اپنی چچی کے پاس ہی بیٹھتا ہوں نا۔ آخر تمہیں کیا تکلیف ہے۔" معید تنک کر بولا تھا۔

"مجھے تکلیف یہ ہے کہ میری شخصیت داغ دار ہوتی ہے۔ مان لیا۔ ہم نے ماضی میں طوفانی محبت کی تھی لیکن میں نے اس محبت کا گلا جب ہی گھونٹ دیا تھا جب یہ اپنے گھر والوں کی بلیک میلنگ کے آگے ہار گیا تھا۔ خدا اور رسول کو گواہ بنا کر جب ایک لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا ہے تو آخر اسے اس کا حق کیوں نہیں دیتا۔ کل میرے نہ نہ کرنے کے باوجود یہ زبردستی مجھے ڈاکٹر کے ہاں لے گیا۔ میں ٹیوشن والے بچوں کی موجودگی کی وجہ سے مجبور ہو گئی اور وہاں ڈاکٹر کے ہاں جب اس کی بیوی اپنے گھر والوں کے ساتھ پہنچی تو یقین کریں پھوپھو میرا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ وہ کیا سوچتی ہو گی میرے بارے میں، مجھے کسی مظلوم کی بددعا سے بہت ڈر لگتا ہے پھوپھو! میری زندگی تو پہلے ہی بہت کٹھن ہے، صرف امی کی معذوری کی وجہ سے کبھی کبھار اس کی مدد لینا میری مجبوری بن جاتی ہے اور یہ اسی مجبوری کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ آخر یہ ہمارا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔ مجھے اس کی محبت سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔"

نیلما کا روتے روتے گلا بیٹھ گیا تھا۔ رابعہ بیگم بالکل خاموش تھیں۔ ان کے چہرے پر برسوں کی تھکن سمٹ آئی تھی۔ ثمینہ پھوپھو نے کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہے مگر اسی پل ان کی نگاہ دروازے کے باہر لہراتے آنچل پر پڑی۔ ان کی حیرت بھری نگاہوں کا سب نے ہی تعاقب کیا۔ انابیہ کو پتا چل گیا کہ وہ نگاہوں میں آچکی ہے۔ بہت جھجکتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"بہت دیر سے آپ کا فون بج رہا تھا۔" معید کی کاٹ کھانے والی نگاہوں سے خائف ہو کر اس نے فوراً موبائل والا ہاتھ آگے کیا۔

"نیچے چلو۔ میں آتا ہوں۔" معید نے موبائل نہیں تھاما تھا۔ وہ سر ہلاتی فوراً واپس پلٹ گئی۔



"اچھی بھلی لڑکی ہے اناب یہ کی نند' خوب صورت پڑھی لکھی' بس بارات واپس لوٹنے کے صدمے کی وجہ سے تھوڑی سنکی ہوگئی ہے۔ شادی ہوجائے تو خود ہی بھلی چنگی ہوجائے گی اور اچھی بات تو یہ ہے کہ میری اناب یہ کی زندگی میں سکون آجائے گا۔"

ذکیہ سلجوق سے مخاطب تھیں بظاہر گفتگو کا کوئی مقصد نہ تھا لیکن وہ بین السطور کیا کہنا چاہ رہی تھیں صاف ظاہر تھا۔ ایمن نے تاسف سے ماں کو دیکھا۔ سلجوق کے ساتھ ان کا بدلا ہوا برتاؤ دیکھ کر وہ سمجھنے لگی تھی کہ ماں کو غلطی کا احساس ہوگیا ہے لیکن اب اندازہ ہوا کہ ان کی فطرت میں کوئی بدلاؤ نہ آیا تھا وہ اب بھی اتنی ہی خود غرض تھیں۔

ایمن کو ڈر تھا کہ سلجوق اناب یہ کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پینے پر تیار نہ ہوجائے۔ مہوش جیسی زبان دراز' بدتمیز' منہ پھٹ اور پھوہڑ لڑکی سے سلجوق جیسے شان دار شخص کا کوئی جوڑ تھا بھلا' ایمن نے ایک اکتائی ہوئی نگاہ ذکیہ پر ڈالی' جو اب مہوش کی خوب صورتی کا قصیدہ پڑھ رہی تھیں پھر اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر سلجوق کو دیکھا اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔

ایمن اس کی سوچوں کے بارے میں کوئی اندازہ نہ لگاپائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"نگہت بھابھی اول روز سے ہی رابعہ بھابھی سے چڑنے لگی تھیں۔" ثمینہ پھپھو اناب یہ کے پاس بیٹھ کر اسے اس گھر کے ماضی کی سیر کروا رہی تھیں۔

"رابعہ بھابھی بہت خوبصورت تھیں۔ سگھڑ اور سلیقہ مند بھی' پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ امی ابا کی خدمت گزار اور فرماں بردار بہو۔ امی ابا جو پہلی بہو کے تجربے کے بعد خوف زدہ سے ہوگئے تھے اتنی اچھی بہو پاکر پھر سے جی اٹھے۔ رابعہ بھابھی نے میرے والدین کی بہت خدمت کی وہ انہیں دعائیں دیتے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

احمد بھائی' نگہت بھابھی کو ٹوکتے رہتے کہ وہ بھی رابعہ بھابھی سے سبق سیکھیں وہ کیسے شوہر کے دل اور سسرال والوں پر راج کررہی ہیں' شوہر کے منہ سے بھاوج کی تعریف سن کر نگہت بھابھی دیورانی سے مزید خار کھانے لگیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کے دلوں میں بھی چاچی کے خلاف بغض بھرنے کی بہت کوشش کیں۔ بیٹیاں ماں کے نقش قدم پر چل پڑیں لیکن معید پر ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر نہ ہوا وہ زیادہ وقت چچی کے پاس ہی گزارتا۔

چچا چچی اس پر جان چھڑکتے تھے اور ان کی اکلوتی نیلما سے بھی اس کی خوب ہی دوستی تھی۔ پھر ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں توفیق بھائی جان کی بازی ہار گئے۔ رابعہ بھابھی کو عمر بھر کی معذوری مل گئی' خوش قسمتی سے نیلما کو اس حادثے میں خراش تک نہ آئی۔ احمد بھائی نے اس کڑے وقت میں بھاوج کا بہت خیال رکھا۔ نیلما پر بھی شفقت کی انتہا کردی لیکن نگہت بھابھی نے اس ہمدردی کے قطعاً" غلط معنی لیے شاید وہ رابعہ بھابھی کے بے پناہ حسن سے خائف تھیں۔ رہی سہی کسر ان کے میکے کی عاقبت نااندیش خواتین نے پوری کردی۔ انہوں نے نگہت بھابھی کو باور کروایا کہ احمد بھائی دراصل بیوہ بھاوج سے عقد ثانی کے چکر میں ہیں۔

احمد بھائی دل کے دورے میں جان کی بازی ہار گئے لیکن مرتے دم تک وہ بیوی کے ذہن کا خناس نہ نکال سکے۔

باپ کے بعد معید نے چچی اور نیلما کا خیال رکھنے کی ذمہ داری اٹھالی۔ نیلما اور معید محبت کے اٹوٹ بندھن میں بھی بندھ چکے تھے حالانکہ میں نے اس وقت بھی معید کو سمجھانے کی بہت کوشش کی میں جانتی تھی کہ نگہت بھابھی جیتے جی نیلما کو معید کی زندگی میں شامل نہ ہونے دیں گی لیکن معید نے نیلما سے بہت عہد و پیمان کر رکھے تھے۔ اسے گمان تھا کہ وہ ضد کرکے ماں سے اپنے دل کی بات منوالے گا۔ لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ اللہ جانے نگہت بھابھی نے سلیپنگ پلز کھائی تھیں یا وہ بھی صرف ایک ڈراما تھا۔

بہر طور معید اس بلیک میلنگ کے آگے ہار گیا اور تمہیں بیاہ لایا۔"

ثمینہ پھپھو نے گہرا سانس اندر کھینچا تھا 'انابیہ دم سادھے انہیں سن رہی تھی۔

"یہاں سے معید کی بے وقوفی شروع ہوتی ہے۔ نیلما کے سرد و سپاٹ رویے کے باوجود اس نے وہاں کے پھیرے لگانا نہ چھوڑے۔ یہ اس کے اندر کا گلٹ تھا۔ وعدے نہ نبھانے پر شرمندگی کا اظہار اور یہ باور کروانا مقصود کہ وہ ہرگز بھی بے وفا نہیں۔ شادی ہونا الگ بات لیکن وہ اپنی محبت میں سچا ہے۔ لیکن تم بھی اس کی زندگی کی انمٹ سچائی تھی۔ وہ چاہ کر بھی تمہیں نظر انداز نہیں کرپاتا۔ اس نے خود میرے سامنے اعتراف کیا ہے کہ اس کا دل تمہاری طرف کھنچنے لگا ہے لیکن اسے تمہارے سنگ ہنسی خوشی زندگی گزارنا خود غرضی لگتا ہے۔ کیا کروں بچے! میرے بھتیجے کو موٹی عقل اس کی ماں سے وراثت میں ملی ہے۔"

ثمینہ پھپھو بے چارگی سے بولی تھیں۔ انابیہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں نے معید کے بہت کان کھینچے ہیں اور میرا ارادہ اس کے کان مزید کھینچنے کا ہے۔ میں اس کی زندگی میں تمہارا جائز مقام دلوا کر رہوں گی۔ تم بغیر کسی قصور کے سزا کیوں بھگتو۔"

ثمینہ پھپھو نے پیار سے اس کے ہاتھ تھپکتے ہوئے تسلی دی۔ وہ بدقت مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میرا خیال تھا میں سلجوق کو مہوش کے لیے راضی کرلوں گی۔ بہت راگ الاپتا تھا انابیہ سے محبت کا۔ اس کے لیے اتنی ذرا سی قربانی بھی نہیں دے پایا۔ مجھ سے کہا ہے کہ میں انابیہ کی چچی ساس کی بیٹی کے لیے اس کا رشتہ مانگوں۔" ذکیہ نے بہت غصے سے ایمن کو آگاہ کیا تھا۔

"بہت خوب صورت لڑکی ہے' بس خوب صورتی دیکھ کر ریجھ گیا لیکن نہ بھئی۔ مجھے کتنی نفلوں کا ثواب ملے گا اس لڑکی کا رشتہ مانگ کر۔ نگہت بیگم تو پہلے ہی اپنی دیورانی سے خار کھاتی ہیں۔ وہ تو اپنی بیٹی کے لیے سلجوق پر نظریں جمائے بیٹھی ہیں۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو یہ رشتہ ہو جائے تو میری انابیہ کی زندگی میں سکون ہو جائے گا لیکن اگر اس نیلما کا رشتہ مانگ لیا تو نگہت بیگم تو میری بچی کی زندگی اور اجیرن کردیں گی۔ سلجوق سے کہہ دیتی ہوں کہ میں نے رشتہ مانگا تھا مگر لڑکی والوں نے انکار کردیا۔" ذکیہ منصوبہ بنا رہی تھیں۔

"اللہ کے واسطے امی! آپ اس بار ایسا کچھ نہیں کریں گی۔ کوئی جھوٹ نہیں بولیں گی۔ سلجوق بھائی کی قربانی کو رائیگاں مت جانے دیں۔ انہوں نے جس لڑکی کا رشتہ مانگا ہے' وہ آپ کے داماد کی پہلی محبت ہے اور اس محبت کی وجہ سے ہی معید بھائی کی زندگی میں انابیہ آپی کو اس کا جائز حق نہیں ملا۔"

ایمن نے ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے وہ یہ انکشاف سن کر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

"انابیہ نے کبھی مجھ سے ذکر کیوں نہ کیا۔ ماں کو چھوڑ کر چھوٹی بہن کو دل کا حال کہہ سنایا۔" ذکیہ ششدر تھیں۔

ایمن ان سے یہ نہ کہہ پائی تھی کہ ان جیسی ماؤں کو اعتماد میں نہ لینا ہی عین دانش مندی ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

شادی بخیر و خوبی نمٹ گئی تھی۔ آج ولیمہ کی تقریب تھی اسٹیج پر اس وقت نیلما اور سلجوق بیٹھے تھے۔ ہر کوئی جوڑی کو سراہ رہا تھا دونوں ہی بے تحاشا خوب صورت لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ نیلما کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ تھی اور سلجوق وقفے وقفے سے اس کے کان میں سرگوشی کررہا تھا۔ دور ایک ٹیبل پر معید بیٹھا یک ٹک دونوں کو تک رہا تھا۔ اتنے میں ثمینہ اس کے قریب آئی تھیں۔

"ایسے مت دیکھو معید! وہ اب کسی کی امانت

ہے۔" انہوں نے بھتیجے کو نرمی سے ٹوکا۔

"میں حیران ہوں پھپھو کہ یہ میرے علاوہ بھی کسی کے ساتھ اتنا خوش رہ سکتی ہے۔" معید بے یقین تھا۔

"یہ بے وفائی نہیں ہے میری جان۔ یہ حقیقت پسندی ہے۔ یہ اپنے جیون ساتھی کے لیے ایمان داری کا اظہار ہے' آسمان پر لکھا جو رشتہ اللہ کی رضا سے زمین پر طے پائے اس کو صدق دل سے قبول کرنا اور نباہ لینا ہی عین عقل مندی ہے' نیلما نے زندگی میں بہت کٹھن وقت گزارا ہے' اب زندگی کی خوشیوں پر اس کا بھی کچھ حق ہے۔ اس کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنو بلکہ اس لڑکی کو اس کی خوشیاں لوٹاؤ جو تمہارے نام سے جڑ کر تمہارے گھر آئی ہے۔ اسے خوش رکھنا تمہارا شرعی اور اخلاقی فرض ہے۔"

پھپھو نے اسے پیار سے سمجھایا۔ معید نے گہرا سانس اندر کھینچتے ہوئے انابیہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ بھی ایک کونے میں کھڑی اسٹیج کی جانب ہی تک رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں سلجوق کہ تم خوشی کا یہ بے ساختہ اظہار کس کو دکھا کر کیا جتانا چاہ رہے ہو۔ معید تک تمہارا پیغام بہت اچھی طرح پہنچ جائے گا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں اب میری زندگی کی کٹھنائیاں ختم ہونے کا وقت بھی آگیا ہے لیکن میری خواہش ہے سلجوق کہ تم جتنا خوش آج نظر آرہے ہو آئندہ آنے والی زندگی میں تمہیں اس سے بڑھ کر حقیقی مسرت حاصل ہو اور مجھے پتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ تم رشتے نبھانے والے شخص ہو اور نیلما بھی بہت اچھے دل کی پیاری لڑکی ہے۔ یہ تمہارے دل کو پھر سے دھڑکنا سکھادے گی۔ تم دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بھرپور وقت گزارو گے۔ ان شاء اللہ گزارو گے۔"

انابیہ نے صدق دل سے دونوں کے لیے دعا کی تھی پھر دھیرے سے آنکھیں پونچھ کر دلہن کو سلامی دینے اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"اگر میں کہوں کہ تم آج بہت خوب صورت لگ رہی تھیں تو تم کہو گی کہ کیسا کمینہ شخص ہے' محبوبہ کے رخصت ہوتے ہی بیوی پر ڈورے ڈالنے لگا۔"

انابیہ ونی جھمکے اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ رہی تھی جب اس کے کانوں میں معید کی آواز پڑی۔

"خود سے مفروضے قائم مت کریں۔ میری تعریف کرنا چاہ رہے ہیں تو شوق سے کریں۔" وہ کان سہلاتی مسکرا کر اس کے پاس آن بیٹھی' معید بے چارگی سے سر کھجا کر رہ گیا تھا۔

"میں نے نیلما سے بے تحاشا محبت کی تھی تم جانتی ہو نا یہ بات۔" وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ انابیہ نے گہرا سانس اندر کھینچا ابھی اسے ماضی کا محبت نامہ سننا تھا۔

"تم شادی کی پہلی رات مجھے بالکل اچھی نہ لگی تھیں۔" نیلما کے ذکر سے چھلانگ لگا کر وہ پھر سے اس کے ذکر پر آگیا۔ انابیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی' اپنے شوہر کی الجھی بکھری ذہنی حالت کا اسے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

"لیکن ولیمہ والی رات جب تم بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے انتہائی حواس باختہ شکل بنائے بیٹھی تھیں تب تم سیدھا میرے دل میں اتر گئیں' میں بھول گیا کہ میں امی کی ضد پر زبردستی تمہیں بیاہ کر لایا ہوں اور میں نے ساری عمر تم سے سیدھے منہ بات نہیں کرنی تھی۔"

"ساری عمر؟" انابیہ نے خفگی اور حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"ہاں تو بھئی پوری بات تو سن لو۔ کیا کہہ رہا تھا میں۔" وہ ٹوکے جانے پر جھنجلایا۔

"آپ کہہ رہے تھے کہ میری حواس باختہ شکل سیدھی آپ کے دل میں اتر گئی۔" انابیہ نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں! لیکن وہ ایک لمحے کی فیلنگ تھی اگلے ہی پل میں نے خود پر لعنت بھیجی تھی' میں نے نیلما سے وفا نبھانے کے کتنے وعدے کیے تھے اور مجھے شادی کی دوسری رات ہی بیوی اچھی لگنے لگی تھی۔"

"یہ محبت اللہ دلوں میں ڈالتا ہے۔" انابیہ نے اسے

ملامت کے احساس سے نکالنا چاہا۔

"ہاں بھئی۔ لیکن مجھے تو اس وقت اس بات کا ادراک نہیں تھا نا۔ اور پھر مجھے تم پر ترس آیا تم صبح سے بھوکی پیاسی تھیں۔ تم نے ناشتا بھی برائے نام کیا تھا اور لنچ سے پہلے ہی تم اور مہوش یار لے چلے گئے تھے میں نے تمہیں سیب دینا چاہا تو تم نے بھوک نہیں ہے کہہ کر انکار کر دیا لیکن جب میری منت سماجت پر نیلما نے کھانے کی ٹرے پکڑائی تو تین چپاتیوں میں سے دو تم ہی کھا گئیں۔ حالانکہ میں نے نیلما سے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ دو بندوں کا کھانا بھیجنا ہے۔"

انابیہ کی گھورتی نگاہیں خود پر مرکوز پا کر اس نے قدرے خائف ہو کر گفتگو کا سلسلہ روکا۔

"آپ میرے نوالے گن رہے تھے؟" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"ارے نہیں یار! لیکن جب مجھے اپنے نوالے پورے نہ ملے تو بس جب ہی یہ اندازہ لگایا کہ تین میں سے دو چپاتیاں تو تم ہی کھا گئی ہو۔" اس غیر مہذب سی بات پر انابیہ نے پھر اسے گھورا تھا۔

"ہاں تو کیا فرق پڑتا تھا۔ میں تو پہلے بھی ایک سیب کھا چکا تھا۔" معید دفاعی انداز پر اتر آیا۔

"اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ تم مجھے زیادہ اچھی لگنے لگیں۔ لیکن ساتھ ہی میں خود پر زیادہ لعنت ملامت بھیجنے لگا یہ کوئی بات تھی بھلا محبت کسی سے کی شادی کسی اور سے اور پھر جس سے شادی کی اس سے ایک اور محبت شروع کر دی۔ یہ کوئی شریفوں کا شیوہ تو نہ تھا نا؟" وہ مسکین شکل بنائے پوچھ رہا تھا۔

"بالکل نہ تھا۔" انابیہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کی تائید کی وہ اس غیر متوقع تائید پر خوشی سے کھل گیا یعنی انابیہ کی سمجھ میں اس کی بات آ رہی تھی۔

"میں اپنے دل کی لعنت ملامت سے خائف ہو کر تمہارے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے اوپر چچی کے ہاں چلا جاتا تھا۔ وہاں جا کر نیلما کی نظروں کے وار سہنے پڑتے، چچی جان مجھے الگ سمجھاتیں کہ اگر میں نے اوپر ان کے ساتھ وقت گزارنے آنا ہی ہوتا ہے تو میں دلہن کو ساتھ لایا کروں۔ ان کا روزانہ دیا جانے والا یہ لیکچر مجھے ازبر ہو گیا تھا پھر بھی کئی کئی گھنٹے بیٹھا یہ لیکچر سنتا رہتا۔ بور تو بہت ہوتا لیکن دل کی عدالت میں سرخرو ٹھہرتا کہ میں ابھی نیلما سے ہی وفا نباہ رہا ہوں اور اپنی ماں کی منتخب کردہ لڑکی سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن جب میں تمہیں دیکھتا تو ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا۔ قصور میری ماں کا تھا۔ تمہارا تو نہ تھا پھر میں تمہیں کیوں بے اعتنائی اور بے رخی کی مار مار رہا تھا۔ تم یقین مانو دل، دماغ اور ضمیر کی اس کشمکش نے مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔"

وہ بے چارگی بھرے لہجے میں بولے جا رہا تھا۔ اور انابیہ بنا ٹوکے اسے سن رہی تھی۔

"لیکن جس روز تمہارے ابو کی طبیعت بگڑی اور تم نے میرا گریبان پکڑ کر جھنجوڑا۔ اس دن تو میرا دل تمہارے جلووں کی تاب ہی نہ لایا تھا اور تم فصیل دل توڑتی سیدھا میرے دل میں اتر گئی تھیں اب میرے دل پر نیلما کے ساتھ ساتھ تمہارا راج تھا۔"

انابیہ جو اس اعتراف محبت پر ڈھنگ سے خوش بھی نہ ہو پائی تھی نیلما کے ذکر پر پھر سے اس کا جی مکدر ہو گیا۔ معید اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے دل کا حال پا گیا تھا۔

"سوری انابیہ آج یہی ہے کہ نیلما میری زندگی کی اٹوٹ سچائی ہے میں نے اسے دیوانہ وار چاہا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھنے میں بہت دیر لگی کہ اس کا ساتھ میرے نصیب میں ہی نہ لکھا تھا لیکن مجھے یہ ماننے میں بھی کوئی عار نہیں کہ میرے رب نے مجھے اس کا بہترین اور حسین ترین نعم البدل عطا کر دیا ہے، اب میں رب کی عطا کردہ اس نعمت کی قدر کروں گا اس سے محبت کروں گا اور کوشش کروں گا کہ دوبارہ اپنی پچھلی محبت کا ذکر کر کے اس کا دل دکھانے کا باعث نہ بنوں میری پچھلی محبت میرے دل کے کونے میں خوب صورت یاد بن کر زندہ رہے گی لیکن اب میری ساری وفائیں میری

پیاری سی بیوی کے نام ہوں گی، وہ بیوی جو نا صرف میرے بیڈ روم میں موجود ہے بلکہ پورے طمطراق سے میرے دل کی مسند پر بھی براجمان ہے۔"

اس بار اظہار محبت مکمل تھا۔ انابیہ کا دل مطمئن ہو گیا۔

اسے معید پر کوئی غصہ نہ تھا نہ اس کی کسی بات سے اختلاف ہوا تھا۔ جو کچھ معید کے ساتھ بیتا بالکل وہ ہی واردات اس کے دل کے ساتھ بھی تو ہوئی تھی لیکن وہ مشرقی عورت تھی وہ اپنے شوہر کے سامنے دھڑلے سے اپنے ماضی کی محبت کا ذکر نہیں کر سکتی تھی۔ جو حقیقت اس کے شوہر کو اب سمجھ میں آئی تھی وہ حقیقت انابیہ نے نکاح کے وقت ہی تسلیم کرلی تھی۔ سلجوق کی محبت کو دل کے ایک گوشے میں خوب صورت یاد بنا کر چھپا لینے کے بعد وہ پوری ایمانداری اور سچائی سے معید کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ نکاح کے بولوں کی طاقت سے شوہر کی محبت اس کے دل میں بھی جنم لے چکی تھی۔ ہاں شوہر کے لبوں سے اظہار محبت سننے میں کافی وقت لگا تھا مگر خیر سے آج وہ مرحلہ بھی طے ہوا تھا۔

"امی اور مہوش نے تمہیں بہت ٹف ٹائم دیا لیکن میں اب تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کوئی اس گھر میں تمہاری حیثیت کو چیلنج نہیں کرے گا۔ پھوپھو نے مہوش کے لیے ایک رشتہ بھی ڈھونڈ لیا لڑکا ان کے سسرالی عزیزوں میں سے ہے۔ بہت کھاتا کماتا اور بے حد شریف۔ بے چارے کو مہوش کے ساتھ نباہ کرنا ہی پڑے گا اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ لڑکا کویت میں مقیم ہے اور شادی کے بعد بیوی کو بھی وہیں رکھے گا۔" معید نے آج کے دن کی دوسری اچھی خبر سنائی تھی۔

"مجھے مہوش سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں میں ہمیشہ اسے اس کے ڈیپریشن کے مرض کی وجہ سے رعایت دے دیتی تھی۔ اللہ کرے وہ شادی کے بعد بھلی چنگی ہو جائے اور خوش باش زندگی گزارے۔" انابیہ نے پورے خلوص سے کہا۔

"ہاں وہ وہاں خوش اور ہم یہاں خوش۔" معید نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ انابیہ مسکرا دی تھی۔

"تمہیں پتا ہے کہ امی کی خواہش تھی وہ سلجوق کو مہوش کے لیے پھانس لیں۔"

معید کے کہنے پر انابیہ خاموش رہی لیکن دل میں یہ ضرور سوچا کہ شوہر کی زبان و بیان کی اصلاح بھی بہت ضروری ہے۔ تہمت آنٹی جیسی بھی تھیں اسے ماں کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہیے تھے۔

"ویسے بندہ وہ گریٹ ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ رابعہ چچی کو بھی اپنے ساتھ رہنے پر رضامند کر چکا ہے۔ وہیں تمہارے گھر کے آس پاس کوئی گھر کرائے پر بھی لے لیا ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں وہ تو ابو کی خواہش تھی کہ دلہن رخصت ہو کر ہمارے گھر جائے ورنہ سلجوق نے تو مکان ڈھونڈ لیا تھا۔" انابیہ بولی۔

"میں امی کی وجہ سے مجبور ہوں ورنہ رابعہ چچی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتیں۔ مائیں تو بیٹوں کے گھر ہی اچھی لگتی ہیں نا۔" وہ اس بار دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

"سلجوق ان کا بیٹوں سے بڑھ کر خیال رکھے گا۔"

انابیہ نے اسے تسلی دی۔
"ویسے پتا نہیں امی کو رابعہ چچی سے کیا چڑ ہے۔ زندگی گزر گئی امی کی چڑ ختم نہ ہوئی۔"
"کسی سے چڑنے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ ہونا ضروری نہیں معید! یہ عموماً" بلاوجہ ہی ہوتی ہے۔" انابیہ دھیرے سے بولی اسے اس پل ذکیہ یاد آئی تھیں جو مارے باندھے جوق کی نیلما سے شادی پر راضی تو ہو گئی تھیں لیکن شادی کی ساری تقریبات کے دوران ان کے چہرے پر عجیب سی بیزاری واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔
"اچھا یار! چھوڑو ساری باتیں' دنیا جہان کی باتیں کر ڈالیں اور وہ بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔" معید نے گہری سانس اندر کھینچی۔
انابیہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا وہ کس بات کا ذکر کر رہا تھا اس کی سوالیہ نگاہوں پر معید مسکرایا۔
"تو میں تم سے یہ پوچھ رہا تھا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تم آج کی تقریب میں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں تو تم یہ تو نہیں کہو گی کہ۔"
"میں ہرگز بھی کچھ نہیں کہوں گی آپ ایک بار کہہ کر تو دیکھیں۔" انابیہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بری طرح جھنجلائی تھی۔
"تم آج بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔" معید نے جھٹ حکم کی تعمیل کر ڈالی۔
"صرف خوب صورت۔" انابیہ نے اتنی مختصر سی تعریف پر حسب توفیق گھورا۔
"خوب صورت نہیں حسین بلکہ حسین ترین جیسے پرستان سے آئی کوئی پری' جیسے مغلیہ دور کی کوئی شہزادی' جیسے۔۔۔"
معید اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلا کر بہت پیار بھرے لہجے میں سرگوشیاں کرنے لگا۔ اس اظہار محبت پر انابیہ کو زوروں کی ہنسی تو آئی لیکن اس نے ہنسی پر قابو پا کر معید کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ جیون ساتھی کے لبوں سے یہ بچکانہ سی تعریفیں بھی کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ اس نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

آج کا دن بہت روشن اور چمک دار تھا۔ معید کو آفس گئے دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ انابیہ کچن سمیٹ کر بیڈ روم میں چلی آئی معید آفس جانے سے پہلے بہت بے ترتیبی پھیلانے کا عادی تھا لیکن آج یہ بکھری ہوئی چیزیں سمیٹتے ہوئے انابیہ کو قطعاً" غصہ نہ آ رہا تھا۔ معید کے باڈی کلون کی مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔
انابیہ کو اس پل وہ شدت سے یاد آیا تھا۔ ہینگر بیڈ پر ڈال کر اس نے اپنا سیل فون اٹھا لیا اگر کوئی یاد آ رہا تھا تو اسے بتانے میں کوئی حرج تو نہ تھا۔ اس نے اسکرین کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے معید کا نام تلاشنا چاہا اسے ناکامی ہوئی حالانکہ معید نے اپنا نمبر خود اس کے فون میں محفوظ کیا تھا۔
فون بک میں ایم سے شروع ہونے والے فقط دو نام سیو تھے اور وہ دونوں انابیہ کی سہیلیوں کے تھے انابیہ نے انگلیوں کی حرکت سے ناموں کی فہرست الٹی پلٹی۔ ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بلاوجہ ایم کی فہرست چھانٹ رہی تھی۔ معید کا نمبر اسے ڈی والی فہرست میں ملا۔
اپنے ڈارلنگ کو مس یو کا میسج بھیج کر وہ سیل فون واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھنے والی تھی کہ یکدم کچھ خیال آنے پر رک گئی۔
مسکراتے لبوں کے ساتھ اس نے ایک اور میسج ٹائپ کر کے کسی اور شخص کو سینڈ کیا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ میسج میلوں دور بیٹھے شخص کے فون پر ریسیو ہوا تھا۔ میسج پڑھ کر ایک خوب صورت سی مطمئن مسکراہٹ اس شخص کے لبوں پر بکھر گئی۔ اسکرین پر تین حرفی میسج اب بھی جگمگا رہا تھا۔
"تھینک یو جوق"

☆



میمونہ صدف

زنگ

پارو...

پروین بخت ... دو فٹیے مکان کی مکین ' چار فٹی عورت ' گٹھیا کے مرض میں مبتلا آدھی معذور اور باقی معزول ' اپنی پرانی زنگ آلود صندوقچی میں سے ماضی نکال نکال کر ہر طرف بکھیر رہی ہے۔

صحن کی اٹھتی دھول ' پانی کی پھوار مانگتی تھی تاکہ بیٹھ سکے اور نسیم اسی دھول کی صفائی کرتی ' کھانس کھانس کر دہری ہوئی جا رہی تھی۔

"بی بی... پانی کب آئے گا؟ سارا گھر مٹی مٹی ہوا پڑا ہے۔"

پچھلے کنویں پر نصب پرانی موٹر چل چل کر بوڑھی ہوتی ہفتے بھر سے بند پڑی تھی سو پانی گلی کے نکڑ پر لگے ہینڈ پمپ سے بھر کر لایا جاتا اور یہ کام بھی نسیم کرتی تھی۔ اور نسیم بس اتنا پانی بھر کر لاتی کہ پینے کے کام آ سکے۔

اندر پنکھے کی گھرر گھرر میں پارو ' ساون بھادوں کے اس حبس میں سر تا پیر شرابور کرسی پر جمی پینڈولم کی مانند جھول رہی تھی۔

اس مکان کی ہر شے فالتو اور ناکارہ ہے... خود پارو بھی... کمرے میں ہر سو بکھرا سامان بھی... ننھے منے اونی سوئیٹر ' موزے اور دستانے ہاتھ سے بنی پھندنوں والی ٹوپیاں اور کاٹن کے کڑھے شلوار قمیص پاجامے... سوتی نیکر ' شرٹ اور رنگا رنگ رومال... سب فرحان کا ہے مگر کسی کا بھی نہیں... سب ہاتھوں کے بنے ہیں ' فرحان جیسے گویا بالکل وہی...

ایک ایک شے اس کے ہاتھوں کی بنی ' سالوں سے

سمیٹی، فرحان کے بیٹے کے لیے، اپنے ہونے والے پوتے کے لیے۔ بیٹے کی نشانی سمجھ کر۔
وہ رہ رہ کر پھر پلٹتی اور ماضی کھنگالتی ہے۔ اسے ماضی دکھ دیتا ہے اسے حال بھی سکھی نہیں کرتا۔
وہ قسمت کی دھنی کبھی نہیں رہی، جب سے وہ پیدا ہوئی عزرائیل کا ہاتھ بٹانے پر مامور، قابض روح بنی رہی۔ وجود کو لپیٹ لپیٹ کر رخصت کرنا اس پر فرض کر دیا گیا۔

وہ ماں کی کوکھ میں تھی تو اس کا باپ جل مرا۔ وجود لیے دنیا کا حصہ بنی تو شفیق ماں کا سایہ معدوم ہو رہا۔ نزہت خالہ نے اس پر رحم کھایا اور گلے لگایا، جلد ہی وہ خون تھوکنے پر آ گئیں۔
پھر وہ ماموں کے ہاں آ گئی جو اس کی چھتر چھایا بنے اور چھت سے گر گئے۔
سو یوں پروین بخت، بد بخت بنی۔ دوسروں کے لیے کم بخت، ایک گیند کی مانند ادھر ادھر گول ہوتی رہی۔
دین محمد عرف دینو ٹھیکے دار اسے بیاہ کر لے گیا۔ سب اچھا تھا، سپنا تھا مگر وہ جو اجل کی ٹھیکے دار تھی اس کی کیسے جان بخشی کرتی۔ کسی ہاتھا پائی میں ایک مزدور کے ہاتھوں دینو ٹھیکیدار قتل ہو گیا۔ وہ جو اس وقت فرحان کے وجود کو اپنے وجود میں لیے پھرتی تھی، خائف ہو گئی کہ اب اس اکلوتے رشتے کو بھی اندر ہی اندر نہ نگل جائے۔
مگر پھر قسمت نے اس کے حق میں اشارہ کیا۔ پروین بخت عرف پارو۔ موت بانٹنے کی مسند پر فائز اس عہدے سے معزول ہوئی اور بدلے میں فرحان اسے بخش دیا گیا۔
واحد رشتہ جو اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ جو اس کا ذکر بنا، تسبیح کے دانوں پر جاری رہا تو وہ مرغ باد نما جی اسی کے رخ پر رہتی۔
"فرحان یہ، فرحان وہ۔ فرحان کھاؤ، فرحان پیو۔ فرحان اٹھو، فرحان بیٹھو۔"
فرحان۔ فرحان۔ فرحان۔

وہ اس کی ساری زندگی کا نقطہ بنا اور پوری زندگی پر پھیل گیا۔
اسے مشین چلا چلا کر، کپڑے سی سی پالا، پڑھایا لکھایا اور بیاہا تو وہ سسرالی سلیٹ بن گیا۔ ہر حکم وہاں سے لکھا جاتا اور بیگم سے پڑھا جاتا۔
"صالحہ اس دو فٹے مکان میں نہیں رہ سکتی اماں۔ اس کا دم گھٹتا ہے۔"
"میں بھی تو یہیں رہتی ہوں۔" اور وہ سادی ماں بیوی اور ماں کا فرق نہیں سمجھ سکی۔
"آپ یہاں رہنے کی عادی ہیں اماں۔"
"یہاں رہنے کی عادی ہوں، تیرے بغیر رہنے کی عادی نہیں ہوں۔"
"عادت کا کیا ہے اماں! ہو ہی جاتی ہے۔" وہ ماں کو یہ دلاسا دے سکتا تھا، وہ بیوی کو ایسا دلاسا نہیں دے سکتا تھا۔
"ہاں عادت کا کیا ہے، ہو ہی جاتی ہے۔" یہ خود کو دی جانے والی تسلی تھی۔
سو سسرال کی تختی سسرال میں جا لگی۔

٭ ٭ ٭

"موٹر کب ٹھیک ہو گی بی بی۔" نسیم بالٹیاں، ٹب بھر کر اب پنکھے تلے بیٹھی پسینہ سکھا رہی تھی۔ یہ تو فرحان ہی بنا سکتا تھا جو ماں کی طرح ماں کا کام بھی بھول جاتا تھا۔
ابھی صبح ہی اس نے فون کیا تھا۔ بیٹے کی خوش خبری سنائی۔ اور پارو بھی خوشی میں ایسی باؤلی ہوئی کہ موٹر کی یاددہانی کرانا بھول گئی۔
"اماں! میرا بیٹا وہ پرانے کپڑے کیسے پہن سکتا ہے؟"
"جیسے میرے بیٹے نے پہنے۔"
"وہ تیس سال پرانی بات ہے اماں۔"
یہی بات وہ بھول گئی تھی۔ کہ بات تیس سال پرانی تھی۔
"ان سے تیری خوشبو آتی ہے فرحان۔ میں نے

برسوں اس خوشبو کو اپنے پوتے کے لیے ان کپڑوں میں قید رکھا۔"

"اماں! ان سے ٹرنک کی بدبو آتی ہے۔"

"میں نے انہیں سونگھا ہے... میں ہر ہفتے انہیں سونگھتی ہوں۔"

"میں نے انہیں سال بھر پہلے سونگھا تھا... ٹرنک کی اس بدبو کو۔"

اور فون کے ساتھ دل بھی کٹ گیا۔

"مجھے اجازت دو بی بی... میری بہو کے دن پورے ہیں۔ کیا خبر کب میری ضرورت پڑ جائے... پہلا بچہ ہے نا۔"

وہ حسرت سے فرحان کے سارے ننھے منے کپڑوں کو دیکھ کر نظریں چرا رہی تھی۔

"نسیم! یہ سب اپنے پوتے کے لیے لیتی جا..." وہ جلدی جلدی وہ سارا ڈھیر سمیٹنے لگی۔ نسیم ہکا بکا کھڑی تھی۔

"مگر بی بی یہ تو آپ کے پوتے کے ہیں..."

"ضرورت سے زیادہ چیز اپنے لیے نہیں رکھی جاتی... جیسے یہ مال اور میں..."

نسیم اتنا سامان لپیٹ لپیٹ تھکنے لگی... وہ بس یہی کہے جاتی۔

"مالک تیرے کام بنائے..."

"ہاں وہی بنائے تو بنائے..."

☼ ☼ ☼

پارو گھٹنے پکڑے، نسیم کو رخصت کرنے پھاٹک بند کرنے اٹھی... ادھر نسیم گئی، ادھر مکینک بمع اوزار داخل ہوا۔

"ماں جی! مالک نے بھیجا ہے موٹر ٹھیک کرنے کے لیے۔"

"چلو شکر ہے۔ تیرے مالک کو خیال تو آیا میرا۔" (ادھر تجھے خیال آیا، ادھر اسے خیال آیا...)

اندر کہیں فون کی گھنٹی بجے چلی جا رہی تھی... اس گھر میں فرحان کے فون کے سوا کسی اور کے فون کی گھنٹی نہ بجتی تھی۔

"اماں صبح کے لیے معذرت..."

"چھوڑ پرے..." وہ بس ایک فون سے ہی سب بھول گئی... ماں جو تھی۔

اور وہ لمبی وضاحتیں دینے لگا جسے سنتی وہ مکینک کو پردے سرکائے تکنے لگی... کام ختم ہی تھا بس۔ اتنا سا کام اور ہفتے بھر کی پریشانی۔

"اچھا یہ بتا۔ مکینک کی مزدوری کیا دوں؟"

"مکینک..." وہ رکا... "اوہ... اماں قسم سے بالکل بھول گیا۔" وہ رکا۔ "کل ہی بھیجتا ہوں مکینک کو۔"

اور پارو فون چھوڑ اس کے پیچھے لپکی جو پھاٹک کی سمت بڑھ رہا تھا۔ بھلا پکڑے تو پوچھے تو کون ہے؟ کہاں سے ٹپکا کس نے بھیجا...؟

وہ پھاٹک عبور کر گیا اور پارو ایک پٹ سے لگی کھڑی تھی۔ پھاٹک سے باہر چوڑی لمبی گلی خالی پڑی تھی... اڑوس پڑوس کے سب ہی دروازے بند تھے۔

کہاں گیا یہیں تو تھا ابھی... ابھی کے ابھی نکلا... بالکل ابھی۔

"ماں جی! مالک نے بھیجا ہے موٹر ٹھیک کرنے..."

اس نے مڑ کر موٹر کو دیکھا "مالک نے...؟"

پھاٹک کھلا تھا، موٹر چالو تھی اور گلی بالکل خالی...

✡

سرورق کی شخصیت

ماڈل	رانیہ خان
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

سمیرا گل عثمان

اچھی بہو

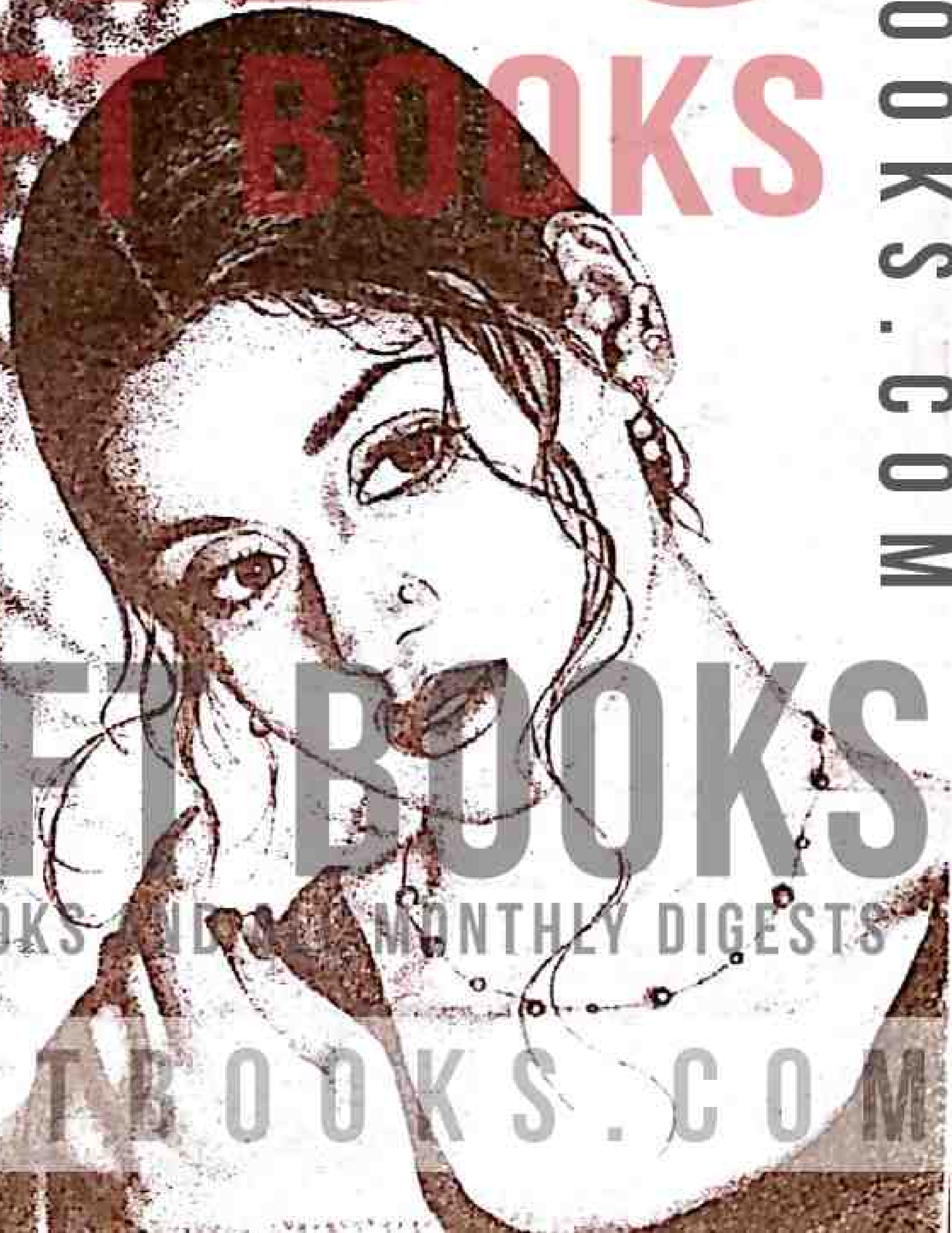
"مجھے گھریلو سلیقہ مند پڑھی لکھی لڑکی نہیں چاہیے، بس لڑکی خاندانی ہو۔" عذرا بیگم نے یہ بات کوئی دسویں بار وچولن کو باور کروائی تھی۔ گھونٹ گھونٹ پانی پیتی بنو کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"ہر لڑکی خاندانی ہی ہوتی ہے۔ کوئی بھی انسان درخت پہ تو نہیں اگتا۔"

"لو بھلا، یہ کیا بات ہوئی۔ ارے خاندان تو سب کے پاس ہوتا ہے لیکن خاندانی رکھ رکھاؤ، شرافت، اعلیٰ حسب نسب اور رشتوں کو جوڑ کے رکھنے کا فن بھلا ہر کسی میں کہاں ہوتا ہے۔" عذرا بیگم نے اس سے بھی زیادہ برا مانا تھا۔ آج کل وہ اپنے بڑے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھ رہی تھیں اور بڑی بہو کے انتخاب پر کوئی سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ آخر جیسی لڑکی ہوگی دوسری آنے والی بھی تو اسی کے نقش قدم پر چلے گی۔

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی، ہاں مگر ایک لڑکی ہے میری نظر میں دو بھائیوں کی اکلوتی بہن

ناولٹ





ہے' خوب صورت' پڑھی لکھی خاندانی بھی۔ میرا دیکھا بھالا گھرانہ ہے میرے ساتھ جاکر نظر ڈال آنا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" وہ نیم رضامندی سے بولیں۔

"اور اب اتنی دور کیا بس میں بیٹھ کر جاؤں گی۔ کوئی کرایہ وغیرہ تو دے دیں۔" وہ اپنا برقعہ سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی تو عذرا بیگم نے پانچ سو کا نوٹ اسے تھما کر رخصت کیا۔

"آپا! آپ بھی کن چکروں میں پڑ گئی ہیں۔ اپنی فیملی میں' جاننے والوں میں کتنی لڑکیاں ہیں' ان میں سے کوئی پسند کرلیتیں۔" فہمیدہ بیگم ان کی نند تھیں۔ ایک ہی کالونی میں گھر تھا تو اکثر آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔

"نہیں بھئی میں تو اچھی طرح دیکھ بھال کر چھان پھٹک کر بہو لاؤں گی۔ شادی تو عمر بھر کا معاملہ ہے۔ ایک ہی بار کرنی ہے تو کیوں نہ بندہ سوچ سمجھ کر کرے۔" ان کے اپنے نظریات تھے فہمیدہ بیگم ان سے متفق نہیں تھیں۔ بہو کی تلاش نہ ہوئی گوہر نایاب ہو گیا۔ ان کے اپنے گھر میں دو لڑکیاں تھیں تو بھلا بھائی کو باہر جانے ضرورت کیا تھی مگر اب اپنی زبان سے کیا کہہ سکتی تھیں۔

"کل چلنا تم بھی میرے ساتھ' بس کوئی اچھی سی لڑکی پسند آجائے تو یہ کام بھی ختم ہو چھ ماہ سے لڑکیاں دیکھ رہی ہوں۔ لاہور سے لے کر اسلام آباد تک کھنگال ڈالا ہے مگر جہاں عدنان کی قسمت۔"

☼ ☼ ☼

"کیا ضرورت تھی اتنا تردد کرنے کی؟ پہلی بار وہ لوگ دیکھنے آرہے ہیں اور آپ نے لوازمات کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ کولڈ ڈرنکس' چکن روسٹ' بڑا کافی تھے۔" ردا نے کچن میں جھانکا تو ماں کو صبح سے مصروف دیکھ کر ناگواری سے بولی۔ خود وہ ابھی پارلر سے آئی تھی۔

"تمہارے ابا کہہ رہے تھے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ بس آگے جو تمہارے نصیب۔" بریانی کو دم پہ رکھ کے اب وہ بے دم سی کرسی پہ گر چکی تھیں۔

"ابا کو بھی بس بہانہ چاہیے مہمانوں کا' ورنہ تو ان کی خوش خوراکی کیا ہم سے ڈھکی چھپی ہے۔" سلاد کے لیے اس نے فریج سے ضروری سامان باہر نکالا تو حرم پیچھے سے آکر بولی۔

"تو کیا حرج ہے اسی بہانے ہماری بھی دعوت ہو جاتی ہے۔"

"تمہیں مل گئی فرصت۔" ردا نے مڑ کر اسے گھورا۔

"میں تو تمہاری تاریخ پر ہی آتی مگر کل میرا پیپر ہے اور اس نقار خانے میں صبح سے ایک لفظ نہیں پڑھا گیا۔" اس کا اشارہ اپنے گھر کی جانب تھا۔ وہ جوائنٹ فیملی میں رہتی تھی۔ اس کے ابو چار بھائی تھے اور چاروں کے بالترتیب' دو' چار' تین اور پانچ بچے تھے وہ سب سے بڑی تھی باقی سب چھوٹے۔

"یہ ہمارا گھر نہیں مچھلی بازار ہے۔" وہ اکثر کہتی۔

"اچھا تم اسٹڈی میں بیٹھ کر پڑھ لو لیکن جب مہمان آئیں تو تمہیں میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھنا پڑے گا۔ آخر کو تم میری اکلوتی دوست ہو۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گی۔" وہ کہہ کر اسٹڈی روم میں چلی آئی پھر اچانک خیال آنے پر اس نے اپنا حلیہ دیکھا کپڑے تو ٹھیک تھے مگر شکن آلود تھے۔ منہ صبح ایک بار دھویا تھا۔ بال کیچر میں جکڑے ہوئے تھے۔

"خیر مجھے کیا' وہ کون سا مجھے پسند کرنے آرہے ہیں۔" سر جھٹک کر وہ دوبارہ کتاب میں گم ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"اپنی پھوپھو کو فون کرو' تیار ہو گئی ہیں تو نکل آئیں۔" سفید کڑھائی والے سوٹ کے ساتھ میچنگ جوتے' بیگ اور دونوں بازوؤں میں موٹے موٹے کڑے پہنے وہ جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ آمنہ نے پھوپھو کا نمبر ملایا اتنے میں عزہ بھی کمرے سے نکل آئی تھی۔

"ہم کب جائیں گے ساتھ۔" آئمہ نے عزہ کی تیاری کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بس ایک بار لڑکی پسند آجائے پھر تم دونوں بھی چکر لگا آنا اب پہلی بار تو سب لوگ نہیں جاسکتے نا۔" وہ کافی پرجوش تھیں۔

فہمیدہ بیگم کا جانے کا دل تو نہیں تھا مگر بار بار فون پہ اتنا اصرار کیا گیا تھا کہ وہ تیار ہو کر باہر نکل آئی تھیں۔

لڑکی والوں کا گھر ٹھیک تھا لڑکی کی ماں۔ کافی خوش مزاج، وضع دار خاتون تھیں، لڑکی بھی پیاری تھی مگر ساتھ بیٹھی رف حلیے والی لڑکی بھی کافی پرکشش دکھائی دے رہی تھی عزہ نے ردا سے فارغ ہو کر اب اس کے انٹرویو کا آغاز کر دیا تھا۔

"آپ ان کی کزن نہیں؟"

"نہیں دوست۔"

"قریب ہی رہتی ہیں۔"

"ہاں اسی لائن میں، جس گھر سے بہت شور کی آوازیں آرہی ہوں گی، سمجھ لیں وہ گھر ہمارا ہے۔" وہ کہہ کر خود ہی ہنسی۔

"اصل میں یہ جوائنٹ فیملی میں رہتی ہے۔" ردا نے وضاحت کی۔

"چند سالوں میں شاید گینز بک میں بھی آجائیں۔ آخر بتیس سالوں کا ریکارڈ ہے۔" وہ کہاں باز آنے والی تھی۔ ردا نے کہنی مار کر خاموش کرایا۔

مگر عذرا بیگم کے کان کھڑے ہو چکے تھے وہ اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیسی لگی تمہیں ان کی فیملی؟" سارا کچن سمیٹ کر اس نے اپنے اور حرم کے لیے چائے بنائی تھی اور اب دونوں اسٹڈی میں بیٹھی تھیں اور ردا کو اس کی رائے جاننے کی بے چینی تھی۔

"تمہارے لحاظ سے تو اچھی ہے۔"

"کیا مطلب۔" ردا نے ابرو اچکائے۔

"دیکھو بھئی صاف بات ہے مجھے تو اتنی بڑی فیملی پسند نہیں۔ میں تو اس لڑکے کے ساتھ شادی کروں گی جو اکلوتا ہو اور تمہیں چونکہ بڑی بڑی فیملیز میں رہنے کا شوق ہے تو تمہارے لیے تو ٹھیک ہے۔" ردا اب کی بار خاموش ہی رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حرم کو جوائنٹ فیملی سسٹم سے کتنی چڑ ہے۔

☼ ☼ ☼

"لڑکی تو بہت پیاری ہے، سوچنے کی بات ہی نہیں ہمیں پسند ہے امی آپ ان کو اسی سنڈے انوائیٹ کر لیں۔" عزہ نے اپنی رائے کے ساتھ اگلا پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا تھا۔

"ایسے کیسے انوائٹ کر لیں پہلے ہم بھی دیکھنے جائیں گے پھر ہی کوئی بات فائنل ہوگی۔" ثانیہ نے فوراً ٹوکا۔

"اور نہیں تو کیا ہمارا اتنا ڈیشنگ بھائی ہے اسے کون ناپسند کر سکتا ہے۔" آئمہ نے کہہ کر امی کی سمت دیکھا۔ وہ ابھی تک خاموش تھیں۔

"امی آپ کو لڑکی پسند نہیں آئی۔"

"میں حرم کے متعلق سوچ رہی ہوں۔ بس وہی

ٹھیک ہے۔" انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا۔ عزہ کا منہ پھول گیا۔

فہمیدہ بیگم نے سنا تو انہیں الگ دکھ ہوا' لوئر مڈل کلاس فیملی تھی۔ دو بہن بھائی تھے۔ عام سا گزارے لائق گھر تھا اگر ایسی ہی لڑکی کے ساتھ رشتہ جوڑنا تھا تو ان کی بیٹیاں کیا حرم سے کم تھیں۔

یہ بات اڑتی اڑتی عذرا بیگم کے کانوں تک پہنچی اور پھر بڑے دھڑلے سے انہوں نے کہا تھا۔

"میں نے اس لڑکی کی ماں کی وجہ سے یہ رشتہ جوڑا ہے۔ وہ بتیس سالوں سے اکٹھے رہ رہی ہے اور تم تو سسرال میں چھ ماہ بھی نہیں ٹکی تھیں۔ آخر جیسی ماں ہوگی ویسی ہی بیٹی ہوگی نا اور مجھے اپنے بچوں کو ہمیشہ جوڑ کے رکھنا ہے' اسی لیے تو میں نے اس لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔"

☼ ☼ ☼

حرم الگ ردا سے نظریں چرا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے اس کے حق پر ڈاکا ڈالا ہے اس نے اپنی امی کو لاکھ منع کرنا چاہا تھا مگر اتنا اچھا رشتہ بھلا کون ٹھکراتا ہے۔ امی کے پاس ہزار تاویلیں تھیں۔

"وہ کون سی تمہاری سگی بہن ہے یا پھر ہماری ان کے ساتھ کوئی رشتہ داری ہے محلے داری ہے۔ نار ملنی ہے تو رکھیں' نہیں تو خیر صلا۔" لو جی بات ختم۔

مگر وہ اپنے دل میں اسی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ آخر ردا خود اس سے ملنے چلی آئی اس نے بہانہ بنا دیا کہ وہ گھر نہیں ہے۔

ردا کا دل بے حد برا ہوا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ حرم گھر میں ہی ہے۔

دونوں کی اتنی گہری دوستی ایک رشتے کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی۔ نیا گھر' ایک بالکل الگ ماحول اوپر سے نندوں کا جمگھٹا۔ وہ مہارانیاں اپنی روٹین' اپنی من مرضی کی مالک تھیں۔ شروع کے چند دن تو خیریت رہی کہ وہ دلہناپے کے دن تھے۔

اب اصل زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

ایک روز ساس نے پاس بٹھا کر کہا۔ "بیٹا! ہمارے گھرانے کی بہوئیں دن چڑھے تک نہیں سوتیں۔"

ٹیچے میں ہاتھ ڈالنے کی دیر تھی بس پھر تو جیسے سب کو ایک فل ٹائم ملازمہ مل گئی کوئی بھی اسے کام کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔

پہلی صبح اس کی چھ بجے ہوتی تھی کہ ساس سسر سات بجے تک ناشتہ کرلیتے تھے۔ دونوں کا اپنا پرائیویٹ اسکول تھا۔

پھر نو بجے تک عدنان کو آفس جانا ہوتا تھا۔ اس کے بعد آئمہ آجاتی۔

"بھابھی! جلدی ناشتہ بنا دیں مجھے اکیڈمی جانا ہے دیر ہو رہی ہے۔" اسٹول پہ چڑھ کر بیٹھ جاتی اور چمچ بجا بجا کر حکم چلاتی۔

اس کے بعد ثانیہ اور عزہ۔ "بھابی ناشتہ" ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھ کر دونوں اخبار پڑھتیں ساتھ ساتھ مارننگ شو چل رہا ہوتا۔

"کام والی نہیں آرہی۔ دو روز سے گھر کی صفائی نہیں ہوئی۔" اس نے جاکر عزہ سے پوچھا۔

"وہ تو بس شادی کے دنوں تک تھی۔ امی نے اس کو فارغ کردیا ہے۔" وہ بتا کر پھر ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

عزہ شادی شدہ تھی۔ اس کی ایک بیٹی تھی عصبور اور اب وہ ایک بار پھر امید سے تھی۔ اس کا زیادہ قیام میکے میں ہی ہوتا تھا۔

دوسری ثانیہ جو سسرال والوں سے ناراض ہو کر آئی تھی۔

اپنی دانست میں دونوں مہمان تھیں اس لیے وہ کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔

"صفائی کرنے سے پہلے ڈسٹنگ کرو۔" اس نے جھاڑو اٹھائی تو سماعت سے عزہ کی آواز ٹکرائی۔

"پوچا بیٹھ کر لگاؤ' کپڑے کو اچھی طرح سے نچوڑ لو پہلے ہم نے خالی وائپر لگا دیا ہے اب خشک کپڑے سے ٹاٹ بھی لگاؤ۔"

"دارے سرف ڈال کر نہیں دھویا فرش' اسی لیے

میلا میلا سا لگ رہا ہے۔" جب تک وہ کام کرتی رہی ایسے ہی جملے گونجتے رہے اور آخر میں یہ دل جلا فقرہ سننے کو ملا۔

"بھابھی کب سے صفائی میں لگی ہوئی ہو' اب کھانے کی فکر بھی کرلو' مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔"

ثانیہ نے چکن کریلے نکال کر سلیب پہ رکھ دیے۔

"پہلے ذرا مجھے مینگو شیک بنادو میری تو کنڈیشن ہی ایسی ہے۔ بھوک بالکل برداشت نہیں ہوتی۔" عزہ نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ جوس بنا کر لائی۔

"عصبور کا فیڈر شاید کچن میں رکھا ہے۔ دھو کر اس میں دودھ ڈال دو۔" اس کی ساس کا اپنا پرائیویٹ اسکول تھا۔ ڈھائی بجے وہ گھر آئی تھیں۔

"ابھی تک تم نے دوپہر کا کھانا نہیں بنایا' حد ہے بھئی کاہلی اور نکمے پن کی' میں نے اپنے ٹائم پہ پانچ بچے پالے ہیں اسکول بھی چلاتی تھی اور گھر بھی سنبھالتی تھی مگر آج کل کی لڑکیاں' ایک کام میں گھنٹوں لگا دیتی ہیں۔" آدھ گھنٹے بعد اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔

"یہ کیا؟ کریلے اور روٹیاں ساتھ میں سیلڈ۔" اب نیا اعتراض۔

"امی! میٹھے میں کچھ نہیں اور چاولوں کی کوئی ڈش تو ہے ہی نہیں۔" آئمہ نے دیکھتے ہی منہ بسورا تھا۔ کھیر کے نام پہ عصبور کے کان کھڑے ہوئے "مامی! میں نے کھیر کھانی ہے۔" ساتھ ہی فرمائشی پروگرام بھی نشر ہوا۔

"اور میں نے بریانی۔" آئمہ نے روٹی سائیڈ پہ رکھ دی تھی۔

حرم نے ابھی پہلا نوالہ ہی توڑا تھا۔ سب کی نظریں اس پر مرکوز ہو گئیں۔

منہ کو جاتا اس کا ہاتھ رک گیا۔ اسے اٹھنا ہی پڑا۔

شام کو وہ کچھ دیر کے لیے کمرے میں آئی تو حماد نے دروازہ بجایا۔

"بھابھی یہ مٹن ہے دو چار مسالے ڈال کر ذرا جلدی سے بھون دو پھر مجھے کلب جانا ہے۔" وہ کہہ کر یہ جا وہ جا۔ اسے آج کل باڈی بلڈنگ کا شوق چڑھا ہوا تھا۔

"حرم میرے کل اسکول کے لیے کپڑے استری کر دو۔" وہ پکا کر فارغ ہوئی تو آئمہ نے اپنے لا کر رکھ دیے۔

"ہمارے بھی دو' دو جوڑے استری کر دو۔ ایمرجنسی میں کہیں جانا ہی پڑ جاتا ہے۔" عزہ نے دو سوٹ اپنے اور ثانیہ کے لا کر دے دیے۔

کچھ دیر میں شام کی چائے کا آرڈر آ گیا۔

"ساتھ سموسے اور نگٹس بھی تل لینا۔" اس نے بنا کر سب کو سرو کیا پھر برتن دھو کر کچن صاف کیا عدنان کے آنے کا ٹائم بھی ہو رہا تھا۔

فریش ہو کر اس نے نیا سوٹ پہنا' ہلکا سا میک اپ کیا۔

اب وہ اس کی ستائشی نگاہوں کی منتظر تھی مگر اسے بھلا کہاں اجازت تھی سب کے بیچ سے اٹھ کر خاص اسے سراہنے کے لیے اوپر آتا۔

آٹھ بجے اس کی کمرے میں واپسی ہوئی۔

"میں سوچ رہی تھی کہیں باہر گھومنے چلیں' شادی کے بعد سے ہم کہیں بھی نہیں گئے۔" اس نے بڑے لاڈ سے فرمائش کی تھی۔

"امی سے پوچھ لو۔" وہ سوچتے ہوئے بولا تو وہ اسے گھورتے ہوئے باہر چلی آئی۔ اب کیسے پوچھے' بہرحال ایک بہانہ سوجھ ہی گیا۔

"امی میرے گلے میں خراش اور سوزش ہے' ہم ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں۔" بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔ امی کا سر ہلکا سا اثبات میں ہلا تھا۔ وہ مزید کچھ سنے بغیر الٹے قدموں واپس۔

"لے لی ہے اجازت اب چلیں۔" وہ کمرے میں آ کر بولی تو عدنان نے توصیفی نظروں سے اسے دیکھا مگر یہ کیا... گھر واپس آئے تو ساس نے آواز دے کر لاؤنج میں ہی روک لیا تھا۔

"کہاں ہیں میڈیسن؟"

"میڈیسن... کون سی میڈیسن۔" عدنان نے اچنبھے سے پوچھا۔ اس کی ساس بالکل سامنے کھڑی

تھی۔ حرم آنکھوں سے کوئی اشارہ بھی نہ کر سکی اسے کیا پتا تھا اتنی تفتیش ہو گی تو کوئی میڈیسن بیگ میں رکھ ہی لیتی۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا ضرور کہیں گھومنے نکلے ہیں۔" ثانیہ نے اپنے اندازے کی درستی پر ماں کو دیکھا۔ "کیا تھا جو ہمیں بھی ساتھ لے جاتے، اتنے دنوں سے کوئی آؤٹنگ ہی نہیں ہوئی، عصبور اتنا بور ہو رہی تھی۔" عزہ نے بھائی کو گھورا جو شادی کے بعد کیسا طوطا چشم سا بنا کھڑا تھا۔

"اور تو اور واپسی پہ ہمارے لیے کچھ لے ہی آتے۔" آئمہ نے بھی منہ بسورا۔

"لے کر کیسے آتے یہ تو خود بیماری کا بہانہ بنا کر نکلے تھے۔" ثانیہ نے پھر ماں کو دیکھا کہ اب وہ کوئی ایکشن لیں۔

"جاؤ بیٹے تم اوپر جا کر آرام کرو، تھکے ہوئے دفتر سے آئے ہو اور بیوی سیر سپاٹے کو لے کر نکل گئی۔" انہوں نے بیٹے کو اوپر جانے کا اشارہ کیا تو حرم نے بھی اس کی معیت میں قدم بڑھائے۔

"تم رکو۔" خاص اسے کہا گیا تھا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے عدنان کو دیکھنا چاہا مگر وہ زینہ عبور کر چکا تھا۔

اب اسے اکیلے ہی پیشی بھگتنی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ ایک چھوٹی سی تفریح پر اتنا بڑا ہنگامہ ہو جائے گا۔

"میں تمہیں اس گھر میں بیاہ کر لائی تھی کہ تم نے رشتوں کو برتا ہے۔ تمہیں رشتوں کی پہچان، ان کا لحاظ ہے۔ ان کی قدر ہے اور تم اپنی ماں کی طرح سسرال میں ہر رشتے کو نہ صرف ساتھ لے کر چلو گی بلکہ دل سے ان کی عزت بھی کرو گی۔ تاحیات نبھاؤ گی انہیں۔ اور تم نے تو پہلے ہی قدم پر مجھے اچھا خاصا مایوس کیا ہے۔" وہ خاصی دلبرداشتہ لگ رہی تھیں۔

حرم کو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنی پڑی اور یہ یقین دہانی بھی کرانی پڑی کہ آئندہ ایسی غلطی کی مرتکب وہ دوبارہ کبھی نہیں ہو گی۔

"تم نے امی سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔" کمرے میں آئی تو عدنان بھی منہ پھلائے کھڑا تھا۔

"غلطی ہو گئی۔" لب کچلتے ہوئے اس نے خود کو بہت روکا پھر بھی دو چار آنسو رخساروں پر لڑھک ہی آئے اب نہ چاہتے ہوئے بھی عدنان کو اپنا لہجہ نرم کرنا پڑا۔ اب بھلا نئی نویلی بیوی روتی ہوئی کس کو اچھی لگتی۔

"کوشش کرنا دوبارہ کسی کو تم سے کوئی شکایت نہ ہو۔"



چند دنوں بعد اسے ایک نئی خبر ملی فہمیدہ پھوپھو نے اپنے بیٹے کی منگنی ردا سے کر دی تھی۔ اس کی مٹھائی لے کر وہ ان کے گھر آئی تھیں۔

"اتنی جلدی کیا تھی، پہلے بیٹیوں کا سوچتیں۔" عذرا بیگم نے سنتے ہی اعتراض کیا تھا کہ ابھی دونوں بچیاں جوان ہیں ان سے پہلے بیٹے کی منگنی کر دی۔"

"ان کا بھی اللہ مالک ہے اور یہ حرم کیوں کپڑے دھو رہی ہے؟ ملازمہ کہاں ہے تمہاری کافی دنوں سے مجھے نظر نہیں آئی۔" بات بدلنے کی خاطر انہوں نے پوچھا اور کامیاب بھی رہیں۔

"گھر میں چار چار لڑکیاں ہیں تو ملازمہ کا کیا کام، اب خود ہی مل جل کر کر لیتی ہیں۔ ویسے بھی ملازمہ کے کام تو مجھے پسند بھی نہیں آتے تھے۔" پھوپھو کو سن کر برا تو بہت لگا جانتی تھیں۔ بھاوج کی بیٹیوں کے نخرے، وہ بھلا کب کوئی کام کرتی تھیں مگر مصلحتاً خاموش رہیں۔

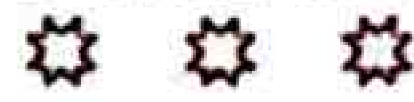
"ویسے تمہیں کیا سوجھی اس گھر میں رشتہ کرنے کی، جس لڑکی کو ہم نے مسترد کر دیا تھا اسے تم بہو بنانے جا رہی ہو۔" انداز استہزائیہ تھا۔

"وہ لڑکی تو مجھے پہلی نظر میں پسند آ گئی تھی۔" لہجے کی گرمی پہ بمشکل ہی انہوں نے قابو پایا تھا۔

"مگر میری بہو سے زیادہ اچھی نہیں ہو سکتی۔"

"چلو یہ تو وقت ہی بتائے گا۔" وہ کہہ کر اٹھ گئیں تو عذرا بیگم نے قدرے جتاتی ہوئی نظروں سے حرم کو دیکھا۔

"دیکھ لو بھلا چیلنج کر کے گئی ہے تمہاری پھوپھی ساس۔ اب تمہیں ہی میرے دعووں کا بھرم رکھنا ہے۔" اور حرم بچاری محض سر ہی ہلا سکی۔
مگر کب تک۔



چند ہی دنوں میں وہ اکتا گئی تھی۔ اس نے جا کر اپنی امی سے شکایت کی تو انہوں نے صبر، حوصلے اور درگزر کے اسباق رٹوا کر واپس بھیج دیا۔ اسے نندوں کے حکم نامے سے اب چڑ ہونے لگی تھی۔ ہر وقت بس کام ہی کرتے جاؤ۔ وہی لگی بندھی روٹین، نہ کوئی آؤٹنگ نہ تفریح، زندگی جمود کا شکار ہونے لگی تھی۔

وہ سب اسے کام ایسے بتاتیں جیسے وہ کوئی چھوٹی بچی ہے یا پھر کل وقتی ملازمہ۔ ان کے لیے ہل کر پانی پینا بھی محال تھا اسی لیے تو اسے جوائنٹ فیملی سے چڑ تھی۔

اپنے گھر کے حالات اس کے سامنے تھے۔ اس کی چھ پھوپھیاں تھیں۔ بمشکل ان کو بھگتایا۔ اس کے ابو پانچ بھائی تھے اور ان کے ڈھیر سارے بچے، بچپن میں انہیں کمروں میں بند کر کے رکھا جاتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پہ چاچیوں، تائیوں میں تو تو، میں میں شروع ہو جاتی تھی۔

اس کی امی کو لڑائی جھگڑے سے شدید نفرت تھی۔ وہ فطری طور پر صلح جو قسم کی خاتون تھیں۔ خاموش، سر جھکائے اپنا کام کیے جاتیں بلکہ دوسروں کے حصے کا کام بھی اپنے ذمے لے لیتیں۔ ان کے گھر میں بھی امی کو ہر کام کے لیے ایسے ہی آوازیں دی جاتیں۔

اسے امی پہ غصہ آتا تھا کہ وہ کیوں آگے سے منہ توڑ جواب نہیں دیتیں۔ کیوں سب کی جی حضوری کرتی ہیں۔ اور آج وہ خود بھی سب کر رہی تھی۔

وہ عدنان سے کیسے کہے کہ وہ الگ رہنا چاہتی ہے۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی ساس کی جذباتی بلیک میلنگ میں نہیں آئے گی۔ ویسے بھی اس کی طبیعت آج کل سست سی تھی۔ مزاج بھی چڑچڑا رہنے لگا تھا اس سے اب نندوں کی بے تکی باتیں نہ تو بیٹھ کر سنی جاتی تھیں اور نہ ہی بات بے بات مسکرایا جاتا تھا۔ وہ ان سے بیزار ہونے لگی تھی۔

حالات شاید اس کے حق میں تھے جو چند روز بعد اسے عدنان سے اپنی بات منوانے کا موقع مل ہی گیا تھا۔ عدنان کو بخار تھا۔ وہ دو روز سے گھر پر تھا اور اس کی روٹین دیکھ رہا تھا۔

"شوہر کی تیمارداری کی کوئی فکر نہیں۔ دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جاؤ۔" وہ اکیلا کمرے میں بور ہونے لگا تھا۔

"گھر کے کام کون دیکھے گا" وہ ہاتھ چھڑا کر باہر نکل آئی۔

سب لوگ ناشتا کر چکے تھے۔ برتن دھو کر اس نے کچن صاف کیا صفائی کی۔ کھانا بنایا۔ کپڑے استری کیے اور پھر چھت پر اپنے کمرے میں آئی تو اچانک اس کا بی پی لو ہو گیا۔

"ایک تو گرمی ہے اوپر سے اس حالت میں اتنے کام کرو گی تو یہی سب ہو گا۔" عدنان اس کے لیے گرم دودھ میں گلوکوز گھول کر لایا تھا اور ساتھ ڈپٹ بھی رہا تھا۔

"میں نے سب کا خیال رکھنے کے لیے کہا تھا مگر تم تو ان کی ملازمہ ہی بن گئی ہو۔ کوئی ضرورت نہیں کل سے ان کے کام کرنے کی، اپنی حالت دیکھو کیسے رف حلیے میں سارا دن رہتی ہو۔ آج کے بعد بس اپنا خیال رکھنا ہے۔" وہ دو دن میں ہر وقت "بھابھی" کی پکار سن سن کر تنگ آ چکا تھا۔

ہر کام کے لیے ہر بات کے لیے بھابی کو آواز دی جاتی تھی۔

"سوچ لیں! یہ نہ ہو کہ بات بڑھ جائے۔" وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ اس کی خاطر کس حد تک جا سکتا ہے، ویسے بھی اس نے کبھی اس سے ساس، نندوں کی شکایتیں نہیں لگائی تھیں نہ ہی زیادہ کام کا شکوہ کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی یہ سب وہ خود محسوس کرے۔

"جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" اس نے کہہ کر سر جھٹک دیا۔

✡ ✡ ✡

اگلے روز اس نے ساس سسر کا ناشتا بنایا۔ عدنان کو آفس بھیجا اور خود ناشتہ کرکے برتن سمیٹ رہی تھی جب حسب معمول آئمہ نے کچن میں جھانکا۔

”بھابی میرا ناشتہ۔“

”میں تو ناشتہ کر چکی ہوں۔ ایسا کرو تم اپنے لیے ناشتہ خود بنالو۔“ وہ کہہ کر کچن سے باہر نکل آئی۔ اس کا رخ اپنے کمرے کی سمت تھا۔ بیڈ روم میں آکر اس نے دروازہ بند کیا اور خوب لمبی تان کر سوگئی۔

گیارہ بجے جب دوبارہ اٹھ کر نیچے آئی تو ثانیہ اور عزہ ناشتہ کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی دونوں کا منہ پھول گیا۔

”دو‘ چار بار تمہارا دروازہ بجایا تھا۔ یہ کوئی ٹائم ہے سونے کا‘ سارا گھر بکھرا پڑا ہے اور تم محترمہ دروازہ بند کیے سو رہی ہو۔ رات بھر جاگ کر کیا پہرہ دیا تھا۔“

”پہرے کا تو پتا نہیں لیکن یہ ضرور سوچا تھا کہ میرے آنے سے پہلے ہر کام کے لیے ملازمہ تھی تو اب کیوں نہیں ہے۔ ہر کام کے لیے میرا ہی منہ کیوں دیکھا جاتا ہے۔“ وہ مزے سے کہہ کر صوفے پہ بیٹھ گئی اور اپنے سامنے اخبار پھیلا لیا۔

عزہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ثانیہ تھوڑی جذباتی تھی‘ جلد غصے میں آجاتی تھی ”ہاں تو تمہارا گھر ہے تو سنبھالنا بھی تو تمہیں ہی پڑے گا۔“

”اگر میرا گھر ہے تو ہر فیصلے کا اختیار بھی مجھے ہونا چاہیے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اب صفائی‘ کپڑے‘ برتن وغیرہ کے لیے ملازمہ رکھ لینی چاہیے۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

”امی کے ہوتے ہوئے فیصلہ کرنے والی تم کون ہوتی ہو۔“ عزہ نے اپنے بڑے پن کا رعب جھاڑنا چاہا مگر سامنے بھی حرم تھی جو اگر دو مہینے خاموش رہی تھی تو کسی مصلحت کے تحت‘ مگر اب اسے کسی کا لحاظ نہیں رہا تھا۔

”میں نے تو ابھی صرف سوچا ہے اور امی کا فیصلہ میری مرضی کے عین مطابق ہی ہوگا کیونکہ آپ دونوں تو مہمان ہیں‘ آج نہیں تو کل اپنے گھر چلی جائیں گی اور امی اس عمر میں کام کرنے سے تو رہیں۔ آئمہ کی اپنی مصروفیات ہیں اور مجھے تو عدنان نے سختی سے کام کرنے سے منع کیا ہے۔“ اس نے اٹھ کر فریج میں سے دو سیب نکالے اور لے کر دوبارہ کمرے میں چلی آئی مگر اب اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔

اتنی بہادری کا مظاہرہ جو کر آئی تھی‘ اس کا انجام نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ وہ سارا دن کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ عدنان کو فون کرکے صورت حال سے آگاہ کیا اور خود یہاں سے وہاں چکراتی رہی۔

عزہ اور ثانیہ نے خوب بڑھا چڑھا کر ماں کو بھڑکایا تھا۔



”حرم! یہ کیا سن رہی ہوں میں‘ ارے میں تو تمہیں بڑی اچھی خاندانی لڑکی سمجھ کر لائی تھی اس گھر میں اور تم نے آتے ہی میرے بیٹے کو میرے مقابل کھڑا کر دیا ہے۔“ لاؤنج میں سب ہی موجود تھے۔ رات کا کھانا آج باہر سے آیا تھا مگر اسے کسی نے بھی شریک ہونے کی دعوت نہیں دی تھی۔

عذرا بیگم نے عدنان کو روکا تو وہ حرم کو بھی بلا لایا۔ ابھی پہلا نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ عذرا بیگم تاک تاک کر جملے کرنا شروع ہو گئی تھیں۔

”آج تم نے کھانا نہیں بنایا تو کیا ہم بھوکے مر گئے ہیں۔“

”امی! یہ ناانصافی ہے۔ آپ سارا کام اس سے کرواتی ہیں۔“ عدنان نے دبا سا احتجاج کیا تھا جو انہیں کسی تیر کی مانند لگا۔

اپنا ہی تیر خطا ہو کر جیسے واپس آیا تھا۔

”تو کیوں نہ کرواؤں کام‘ یہ کیا کسی منسٹر کی بیٹی ہے۔ اپنے گھر تو کبھی اچھا کھانا‘ پہننا‘ اوڑھنا نصیب نہ ہوا۔ وہ کیا کہاوت ہے ”آگئی مائی تے پھٹ گئی کائی“ یہاں ضرورت سے زیادہ دیکھ کر اپنی اوقات بھول گئی ہے۔“

تنفر بھرا لہجہ حرم کو اندر تک سلگا گیا تھا۔

"میں نہیں آئی تھی آپ کے پاس' آپ نے خود پسند کیا تھا مجھے' خود مجھے بیاہ کر اس گھر میں لے کر آئی ہیں۔" اس سے بھی ضبط نہیں ہوا تھا۔

"منسٹری بیٹی نہیں تو کیا ہوا میری بیوی تو ہے نا' اور یہی حوالہ اب اس کی پہچان ہے۔" عدنان کو بھی ماں کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔

"بیوی کے سامنے بیٹھ کر ماں کو باتیں سنا رہے ہو۔" عزہ نے ابرو چڑھائے۔

"ہاں اب یہی دن دیکھنا تھا مجھے' چار دن بیوی کی شکل دیکھ لی اب ماں کی کیا وقعت رہ گئی ہے۔ سال پوس کر جوان کیا۔ پڑھایا' نوکری مل گئی۔ شادی ہو گئی اس کے تو سارے کام ہو چکے ہیں اب بھلا ماں کی کیا ضرورت ہوگی۔" وہ فوراً ہی آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

ثانیہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں "معافی" مانگنے کا اشارہ کیا تھا۔

"امی بات کو غلط رنگ مت دیں۔ جب ہم ملازمہ افورڈ کر سکتے ہیں تو کیا ضرورت ہے حرم کو کام کرنے کی۔" وہ واپس اصل موضوع پر آیا تھا۔

"ہاں غلط رنگ تو میں دے رہی ہوں۔ کیا کہنا چاہتے ہو میں رنگ باز ہوں' ڈھونگ کرتی ہوں' اب تو ماں مکار فریبی ہی لگے گی۔"

"امی پلیز اب ختم کر دیں بات' کل سے کام والی آجایا کرے گی۔ حرم کو ویسے بھی آج کل ریسٹ کی ضرورت ہے۔"

"دیکھا! بیوی کا کتنا خیال ہے اور ماں کی کوئی پروا نہیں۔"

"آپ کی پروا کیوں نہیں ہے۔ میں آپ کے کام کرنے سے تو اسے منع نہیں کر رہا۔" خلاف توقع اس بار وہ نرمی سے بولا تھا جس کا عذرا بیگم نے خوب فائدہ اٹھایا۔

"گھر کے کام بھی یہی کرے گی۔" ان کا زور اپنی ہی بات پر تھا دراصل وہ سوچ رہی تھیں کہ ایک چھٹانک بھر کی لڑکی بھلا ان کے مقابل کیسے آسکتی ہے۔

وہ عذرا بیگم تھیں گھر میں بھی میڈم اور اسکول میں بھی میڈم' انہیں اپنی منوانے کی عادت تھی۔ آج تک ہر کسی پر بس رعب ہی جماتی آئی تھیں اور حرم کو بھی اپنے رعب میں رکھنا چاہتی تھیں۔

مگر عدنان بھی ٹھان چکا تھا کہ وہ حرم کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دے گا۔

"ٹھیک ہے۔ حرم! کل سے تم کوئی کام نہیں کرو گی۔" وہ کہہ کر اٹھ گیا حرم نے بھی اس کی تقلید کی۔

✡ ✡ ✡

اس نے کاموں سے ہاتھ کیا کھینچا۔ ہر بندے نے اس کے خلاف محاذ کھول لیا۔ گھر میں کوئی بھی اس سے سیدھے منہ تو کیا الٹے منہ بھی بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ کچن میں کھانا بنانے جاتی تو کبھی گھی غائب ہو جاتا کبھی ٹماٹر' لہسن' پیاز چھپا لیے جاتے۔ عدنان نے ایک روز پوچھ لیا۔

"پہلے تو تم اتنے مزے کا کھانا بناتی تھیں اب ٹیسٹ کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔" اب وہ کیا کہتی' اسے تفصیل بتانا پڑی۔ جواب سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

ایک طرف بیوی تھی دوسری طرف ماں' بہنیں۔ وہ کرے تو آخر کیا.....

بہرحال اس نے سوچ لیا تھا وہ سب کے حقوق ادا کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔

"میں یہ سب بتا کر آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔" وہی بیویوں کا مخصوص جملہ' ہر بات میاں کو بتانا ضروری ہے پھر پریشانی کی پشیمانی الگ سے۔ تو تھوڑا بچا کر رکھو۔

حرم کو اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اب افسوس ہو رہا تھا۔

عذرا بیگم نے اس روز کے بعد سے عدنان سے بھی بات نہیں کی تھی۔ وہ دل میں بے حد دکھی اور ملول تھا۔

"کیا تم گھر کا اب کوئی کام نہیں کرتیں۔" اچانک اسے خیال آیا وہ زیادہ تر اوپر اپنے کمرے میں بند رہتی

ہے۔"

"ایک دوبار کوشش کی تھی لیکن ثانیہ نے جھاڑو چھین لی۔ کہنے لگی "بی بی! تم جاکر آرام کرو۔ ہم کرلیں گے سارے کام۔"

"یہ ثانیہ اور عزہ' پتا نہیں انہیں اپنے گھر میں چین کیوں نہیں ملتا۔" وہ جز بز ہوا۔

"شادی کے بعد لڑکیوں کو میکے کے معاملات میں زیادہ مداخلت نہیں کرنی چاہیے مگر وہ تو جلتی پہ تیل کا کام کرتی ہیں۔" حرم نے محتاط سا بیان دیا۔ اس پر بھی عدنان نے ٹیڑھی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"تم میری بہنوں کے خلاف بات کررہی ہو۔"

"نہیں میں تو بس سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ زیر لب مسکرائی تو عدنان بھی ہنس پڑا۔ سیڑھیاں اترتی ثانیہ کے کانوں میں ہنسی کی آواز گونجی تو وہ تن فن کرتی ماں کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"ایک ہم ہیں جو اتنی ٹینشن لے کر بیٹھے ہیں اور وہ بیوی کے گھٹنے سے لگا قہقہے لگا رہا ہے۔ ذرا جو اسے احساس ہو کہ ہم نے یہ دو' چار روز کتنی اذیت میں گزارے ہیں۔ بجائے اس کے کہ امی سے معافی مانگتا' بیوی کو دو ہاتھ لگاتا' اس کے ساتھ بیٹھا باتیں مٹھار رہا ہے۔" ثانیہ کا لہجہ آگ اگل رہا تھا۔

سر پہ پٹی باندھ کر لیٹی عذرا بیگم بھی اٹھ بیٹھیں۔

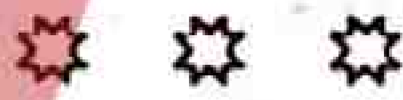
"اس کے تو دل کی دنیا آباد ہے۔ اس کے تو سارے ارمان پورے ہوگئے خوب صورت پڑھی لکھی بیوی مل گئی اس چالاک' عیار لڑکی کے ہاتھ کاٹھ کا الو لگ گیا۔ اب اس پر اپنی مرضی چلا رہی ہے۔ بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے جو اس فتنے کو بیاہ کر گھر لے آئی۔ میرا اتنا سیدھا فرمانبردار بیٹا چھین لیا مجھ سے۔" نمناک لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

"پھوپھو کے گھر سے آج مٹھائی آئی تھی۔ ردا نے زینی کا رشتہ اپنے بھائی سے کیا ہے' اس کا بھائی تو اتنا پڑھا لکھا اور قابل ہے' سرکاری نوکری ہے اس کے پاس۔" آئمہ نے چائے میز پر رکھی اور ساتھ ساتھ نیوز اپ ڈیٹ سے بھی آگاہ کیا۔

"کیسی ہیرا لڑکی تھی بس میں تو اس وقت کو پچھتا رہی ہوں۔" عذرا بیگم کا دکھ اس خبر پر کچھ مزید گہرا ہوا تھا۔

"پھوپھو تو بڑی خوش تھیں اور اتنی تعریفیں کررہی تھیں ردا کی کہ سارا گھر میری بہو نے سنبھالا ہوا ہے۔ میں تو اب ان جھنجٹوں سے بالکل آزاد ہوں زینی کی ساری شاپنگ وہ کررہی ہے۔ نئے ڈیزائن کا فرنیچر' کراکری' خوب صورت ملبوسات' میں تو ان کی نوک جھونک پر حیران ہو رہی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ آپس میں نند بھاوج ہیں۔" آئمہ ان کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی اور عزہ' ثانیہ کے چہرے کے زاویے مزید بگڑتے جارہے تھے۔

عذرا بیگم کو اپنے ہتک آمیز جملے یاد آئے۔



موسم آج بے حد خوشگوار تھا۔ سرمئی بادلوں سے ڈھکا آسمان' ہلکی ہلکی بونداباندی اور سبک روی سے چلتی ہوا۔ وہ آفس سے جلدی اٹھ آیا تھا۔ حرم ٹیرس پہ کھڑی موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ عدنان کو اچانک سامنے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

"ایسا حسین موسم ہو' من چاہا ساتھ ہو اور ساتھ پکوڑے مل جائیں تو کیا ہی بات ہے۔" بارش کی دو چار بوندیں اوک میں بھر کر اس نے حرم کی جانب اچھالیں۔

"اچھا! آپ فریش ہو جائیں۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے سیڑھیاں اتر گئی۔ عدنان گنگناتے ہوئے چینج کرنے کے ارادے سے کمرے میں چلا آیا۔

دو منٹ میں وہ جاکر واپس آچکی تھی۔

"کیا ہوا۔" وہ قمیص کے کف فولڈ کرتا اس کے قریب چلا آیا۔

"دیا سلائی عزہ نے کہیں چھپا دی ہے۔ میں سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اس نے مجھے آتے دیکھا اور اٹھا کر لے گئی۔" حرم کا چہرہ خفت سے سرخ ہو رہا تھا۔

باہر بارش بے حد تیز ہو چکی تھی اور عدنان نے لباس بھی تبدیل کرلیا تھا غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط کرلیا۔

"بے وقوف ہے وہ، میں سمجھاؤں گا اسے' یہ کیسی چیپ حرکتیں کررہی ہے آج کل عزہ۔" حرم کیا کہتی وہ خاموش ہی رہی مگر اس کے کچھ سمجھانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

اگلی صبح وہ عدنان کے لیے ناشتہ بنانے کچن میں گئی تو بیلن اپنے اسٹینڈ میں نہیں تھا اور اس کے بغیر اسے روٹی بنانی نہیں آتی تھی۔

بریڈ' انڈا' دیکھ کر عدنان کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔

"تمہیں پتا بھی ہے مجھے بریڈ نہیں پسند۔" اور جواب میں وہ پھٹ پڑی تھی۔

"اور کتنا ذلیل کروائیں گے مجھے' اپنے ہی گھر میں قیدیوں کی طرح رہ رہی ہوں۔ ان سب کی تحقیر آمیز نظریں' چبھتی باتیں اور یہ اوچھی حرکتیں' اب مزید برداشت نہیں کرسکتی۔ میرا نان نفقہ' لباس' رہائش آپ کی ذمہ داری ہے۔ بس مجھے الگ رہائش چاہیے۔ اپنی عزت نفس کے معاملے میں اب کوئی کمپرومائز نہیں کروں گی۔" اس کا انداز اتنا قطعی تھا عدنان درحقیقت اب کچھ سوچنے پہ مجبور ہوگیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ جب گھر میں اس کی عزت نہیں ہو رہی تو میں کیوں اسے جھکنے پہ مجبور کروں۔ ویسے بھی اپنے والدین کی خدمت میری ذمہ داری ہے اور بیوی کا خیال بھی مجھے ہی کرنا ہے تو چلو عدنان چکی کے دو پاٹوں میں پسنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" آخر فیصلہ ہوگیا تھا۔ اوپر کا پورشن الگ کرکے اس نے حرم کو وہیں لاؤنج میں اوپن کچن سیٹ کروادیا تھا۔ اب وہ ہر چیز میں اپنی مرضی کی مالک تھی۔

سیڑھیاں بھی لان کی سمت لگوادی تھیں۔ نیچے والوں سے اب اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

عذرا بیگم نے ان کے الگ ہونے کی ٹینشن سر پہ سوار کرلی تھی۔ آئے روز ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا اس پر لوگوں کی چہ میگوئیاں۔ پہلے ہی بہت بے عزتی محسوس کررہی تھیں۔ اس پر آج فہمیدہ نے راستے میں روک لیا تھا۔

"یہ میں نے کیا سنا ہے' عدنان الگ ہوگیا ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ اتنی خاندانی لڑکی ڈھونڈی تھی تم نے' بقول تمہارے جو تا عمر رشتوں کو جوڑے رکھنے والی تھی پھر کیا ہوا؟ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور اس نے اپنی مسجد الگ بنالی۔

اب میری بہو کو ہی دیکھ لو آتے ہی میری ساری ذمہ داریاں بانٹ لیں۔ خیر سے بیٹی کا نصیب بھی کھل گیا۔ بڑی ہی سلجھی ہوئی بچی ہے۔" وہ بھی ادھار رکھنے والوں میں سے نہیں تھیں اور پھر آج تو موقع بھی تھا دستور بھی۔

عذرا بیگم کو زمان و مکاں گھومتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اسکول جانے کے بجائے واپس گھر چلی آئی تھیں۔ آئمہ لاؤنج میں کھڑی اکیڈمی جانے کو بالکل تیار تھی۔

ماں کا غیض سے بھرا چہرہ دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔ "کیا ہوا ہے امی۔" وہ بیگ رکھ کر آگے بڑھی۔

"کہاں ہے وہ حرافہ' بے غیرت۔" انہوں نے آئمہ کے ہاتھ جھٹک دیے اب ان کا رخ سیڑھیوں کی سمت تھا۔

"ساری زندگی لگادی میں نے اس گھر کو بنانے میں اور آج یہ مالک بن کر بیٹھ گئی۔ میرا اتنا فرمانبردار بیٹا مجھ سے چھین لیا' اللہ کرے' تمہیں زندگی میں بھی کوئی سکھ نصیب نہ ہو۔ جس طرح تم نے مجھے جلایا ہے ساری عمر تم بھی تڑپتی رہو۔ جس خوشی کی آس لے کر بیٹھی ہو وہ کبھی تکمیل کو نہ پہنچے۔" گرل کا دروازہ اندر سے بند تھا اور نہ وہ تو شاید آج اسے دھکے مار کر گھر سے ہی نکال دیتیں۔

لرزتی ٹانگوں کے ساتھ اندر کھڑی حرم نے بے ساختہ کانوں کو ہاتھ لگائے۔ وہ خوب اونچا اونچا بول رہی تھیں۔ گالیاں' کوسنے' بددعائیں' ان کی آواز سن کر

عزہ اور ثانیہ بھی اٹھ کر آ گئی تھیں۔

"امی چلیں نیچے پلیز ریلیکس کریں خود کو' اس طرح آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" ثانیہ بمشکل کھینچ تان کر نیچے لائی تھی۔

"اس کی وجہ سے محلے کے لوگ مجھے باتیں سنا رہے ہیں۔" تہمینہ کا استہزائیہ انداز ان کا دماغ کھولا رہا تھا۔ ثانیہ اور عزہ نے بہت ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کا بی پی خطرناک حد تک شوٹ کر گیا تھا۔

فوراً" انہوں نے حماد اور ابو کو کال کی۔ بروقت انہیں اسپتال لے جایا گیا تھا۔

عدنان کو حرم نے فون کر کے بتایا تھا۔ وہ گھر آیا تو لاؤنج میں آئمہ مل گئی۔

"امی کس اسپتال میں ہیں؟" اس نے آئمہ کو روک کو پوچھا۔

"تم کو اس سے کیا۔ وہ جئیں یا مریں تم جاؤ۔ اپنی بیگم کی دلداریاں کرو۔ اس کے ناز نخرے اٹھاؤ۔" عزہ اندر کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔

"آئمہ! میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔" اس نے عزہ کو سرے سے نظر انداز کر دیا تھا جو آئمہ کو بے حد برا لگا۔ بڑی بہن تھی وہ۔

"مجھے نہیں پتا اور اگر پتا بھی ہوتا تو میرے خیال سے عزہ باجی ٹھیک کہہ رہی ہیں' آپ کو بتانے سے کیا فائدہ' آپ کو دیکھ کر۔ امی کی طبیعت اور خراب ہو گی۔" آئمہ نے بھی بدتمیزی سے جواب دیا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

حماد اور ابو کو کال کی۔ کوئی بھی فون ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

"عدنان کھانا لاؤں۔" حرم کوئی دسویں بار پوچھنے آئی تھی اس نے بے دلی سے پہلے کی طرح انکار میں سر ہلا دیا۔

"پلیز عدنان تھوڑا سا کھا لیں' لنچ بھی نہیں کیا آپ نے۔" وہ اس کے قریب بیٹھی اصرار کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔

اس نے آج زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا۔ دال' چاول اور رائتہ۔

"تمہیں بھوک ہے تو تم کھا لو۔" وہ نرمی سے بولا۔

"آپ کے بغیر میں بھی نہیں کھاؤں گی۔" اس نے ٹرے سائیڈ پہ رکھ دی۔

"میں امی سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ ان کی بے رخی اور ناراضی مجھے بہت تکلیف دے رہی ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ نم ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے گوشے پانیوں سے بھیگ گئے۔

اس کو اتنا دل گرفتہ اور ملول دیکھ کر حرم بے حد پریشان ہو گئی تھی۔

"میں اگر امی سے معافی مانگ لوں تو۔"

"انہوں نے کہا ہے میں تم سے تب تک بات نہیں کروں گی جب تک تم حرم کو گھر سے نکال نہ دو۔" اور یہ سن کر حرم کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے۔" وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

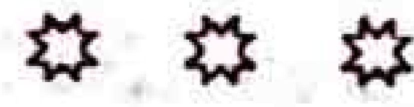
"بے قصور کو میں سزا نہیں دے سکتا۔ جانتی ہو اولیول کے بعد امی نے مجھے المنہاج میں داخل کروا دیا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ میں دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینوی تعلیم بھی حاصل کروں اور اب مجھے خود غلط رستے پہ چلنے کا حکم سنا رہی ہیں۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی' جب وہ خود اتنے ارمان اور چاؤ کے ساتھ تمہیں بیاہ کر اس گھر میں لائی ہیں تو اب ایسا سلوک کیوں کر رہی ہیں۔" وہ ذہنی طور پر خود بھی بے حد تھکا ہوا تھا۔ اس سوال کا جواب بہت طویل تھا' حرم نے سوچا وہ خاموش ہی رہے۔

یہ روایتی چپقلش تو ازل سے چلتی آ رہی تھی۔ عورت اپنی راج دھانی میں شراکت برداشت نہیں کر سکتی۔ اسے یاد تھا جب اس کے بھائی کی شادی ہوئی تھی تو امی نے اپنا سارا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں اپنے ہی گھر میں مجھے اپنا وجود اجنبی سا لگ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا دور ختم ہو چکا

ہے۔

"حرم کھانا کھالو۔ تمہارے لیے بھوکا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر اس کا دھیان بٹانے کو بولا تھا۔

حرم نے پلیٹ میں تھوڑے سے چاول نکال کر اس کی سمت بڑھائے جو بے دلی سے ہی سہی مگر وہ کھانے پہ مجبور ہو گیا تھا۔



بہت سارے دن یونہی گزر گئے تھے۔ وہ اس کے بعد بھی دو' تین بار گیا تھا مگر ای کا رویہ ہنوز برقرار تھا۔ وہ مایوس سا اٹھ کر آگیا۔ پیچھے اختر میاں ان کو سمجھا رہے تھے۔

"جوان بیٹے کے ساتھ تمہارا رویہ مناسب نہیں اور یہ مطالبہ تو کسی صورت قابل جائز نہیں ہے۔ اپنی خوشی سے تم بہو کو بیاہ کر لائی تھیں۔ اب گھر سے نکالنے کا کہہ رہی ہو اور پھر وہ امید سے بھی تو ہے۔ اس حالت میں تمہیں اس کا خیال کرنا چاہیے' پہلے کیا کم جگ ہنسائی ہو چکی ہے۔ وہ تو بچی ہے نادان ہے' تم ہی ضد چھوڑ دو۔"

"ارے واہ! آپ بھی الٹا مجھے سنا رہے ہیں۔ چار دن اس کی بیوی نے کام کیا کرلیے' اس کی تو جان پر بن آئی تھی۔ دیکھا نہیں تھا اس روز کیسے بات کر رہا تھا۔ بغیر کسی سے مشورہ کیے اسے کچن بنوا دیا۔ لان میں سیڑھی لگالی دوسرے کی بیوی نے بھی اس کی دیکھا دیکھی ایسا ہی کیا تو ہم بوڑھوں کو کون پوچھے گا۔ بیٹیاں تو اپنے گھر بار والی ہیں۔" وہ ان کی حمایت پر بھڑک اٹھی تھیں۔

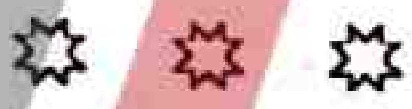
اختر میاں نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ ویسے بھی وہ تو شروع سے ہی بیوی کے ہم نوا رہے تھے۔ ذرا سا اختلاف ہو بھی جاتا تو وہ انہیں ایسی ہی چار باتیں سنا کر خاموش کرادیتی تھیں۔

"سارے رشتے دار' محلے والے پوچھ رہے تھے کہ آپ کی بہو نے تو نیچے جھانکا تک نہیں کہ ساس زندہ بھی ہے یا مرگئی' وہ کون سا میری بچی سے الگ کر بیٹھتی گھڑے گھڑے ہی احوال دریافت کر جاتی۔" حالانکہ وہ خود اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں تھیں۔

"فہمیدہ آپا کی بہو نے کیسے سارے گھر کو اکائی کی طرح یکجا کر رکھا ہے اور اس نے ہمارا بیٹا ہی ہم سے چھین لیا۔ چار دن میں ہی پہلے کر الگ ہو گئی" انجانے میں وہ جس لڑکی کی تعریف کر گئی تھیں اختر میاں کی سوئی وہیں اٹک گئی۔

"ویسے آپا ہیں جوہر شناس' خود کی اگر نظر کمزور تھی تو آپا کی عقل پہ ہی بھروسا کر لیتیں کیسی ہیرا صفت لڑکی کو ٹھکرا دیا اب بیٹھی اس کے گُن گا رہی ہو۔"

"آپ کو تو بہانہ چاہیے آپا کے گن گانے کا۔" سر جھٹک کر انہوں نے کروٹ بدل لی پھر دل میں سوچا اچھا ہوتا جو آپا کی عقل پہ بھروسا کر ہی لیتی۔



عدنان نے نیچے کے چکر لگانے نہیں چھوڑے تھے۔ آتے جاتے ماں کا احوال دریافت کرتا' بہنوں کی خبر گیری' عصبور سے لاڈ' وہ جانتا تھا سب اس سے خفا ہیں۔ بات کا جواب تو مل جاتا تھا مگر انداز میں جو اک سرد مہری سی تھی' وہ اس پہ پہروں کڑھتا رہتا تھا۔

آج عصبور کا برتھ ڈے تھا۔ وہ آفس سے آتے ہوئے اس کے لیے گفٹ لایا تھا۔ نیچے لاؤنج میں سالگرہ کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس نے حرم کو بھی تیار ہونے کے لیے کہا تھا۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر عدنان کی خوشی کی خاطر وہ تیار ہو گئی تھی۔ دونوں نے ہی آج کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ تیار ہو کر لاؤنج میں بیٹھے اس انتظار میں تھے کہ کوئی بلانے آئے گا مگر جب نیچے سے تالیوں اور ہیپی برتھ ڈے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں تو حرم نے بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

عدنان خود بھی شرمندہ سا ہو گیا۔

"میں ذرا چینج کرلوں۔" وہ کہہ کر اٹھ گئی مگر عدنان نے اس کی کلائی تھام لی تھی۔ پھر اسے اپنے قریب کھینچ

لیا۔

"احماب اپنا موڈ خراب مت کرو ہم آج باہر ڈنر کریں گے۔ میں گاڑی نکال رہا ہوں۔ تم نیچے آجاؤ۔"

بہر حال وہ ایک خوشگوار شام گزار کر گھر آئی تھی۔

تھری سوٹ' ریلی کا پیکٹ' ببی' ایک پیارا سا جوتا' جھنجھنا' وہ چھوٹے کھلونے' فیڈر کور اور بہت سی ایسی ہی چیزیں تھیں۔

جنہیں وہ مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ ہمارے لیے نہیں ہے۔ عزہ باجی کی ڈلیوری میں چند روز رہ گئے ہیں تو یہ سب۔ میں نے ان کے لیے خریدا ہے، ہم ضرور جائیں گے شاید اسی بہانے ان کی ناراضی کچھ کم ہو جائے۔" وہ افسردگی سے کہہ رہی تھی۔ عدنان نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی نظر میں حرم کی عزت کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔

مگر جس روز وہ بے بی کو دیکھنے اسپتال گئی۔ آمنہ' ثانیہ اور امی نے اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا اور عزہ نے تو وہ چیزیں لینے سے ہی انکار کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

حرم کا دل بے حد برا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اب ساری زندگی ان لوگوں کو بھی منہ نہیں لگائے گی' ویسے بھی اس کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ وہ عدنان کی نظر میں اچھی تھی تو باقی اسے کسی کی پروا بھی نہیں تھی۔

نیچے آج کل حماد کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔

"پچھلی بار جیسی غلطی اس بار نہیں دہراؤں گی چھوٹے گھر کی لڑکی لا کر ہم نے بڑی غلطی کی۔ نالی کے کیڑے کو برسات کا پانی مل جائے تو اپنی اوقات بھول جاتا ہے اس لڑکی کو۔ ہمارے گھر رہنے کا طور طریقہ نہیں آیا۔ اس بار تو بڑی اونچی فیملی میں حماد کا رشتہ جوڑا ہے۔ لڑکی خوب صورت' پڑھی لکھی اور بڑی تمیز دار سلیقہ مند ہے۔" عذرا بیگم ہر آئے گئے کے سامنے یہ چند جملے ضرور دہراتی تھی۔

حرم کو یقین تھا بیٹیوں نے خوب رٹا لگوایا ہو گا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھی اس کی پیاری سی گول مٹول سی بچی تھی عدنان نے اس کا نام مشعل رکھا تھا لیکن وہ ان کی پری تھی۔ ایک پیارا سا گھر' وفادار شوہر اور کیوٹ سی بے بی اس کی زندگی مکمل تھی اور دوسروں کی باتوں پہ اب خوامخواہ دل جلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ویسے بھی جس کی جتنی سوچ ہوتی ہے وہ اسی کے مطابق اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور اسے اپنی ساس کے فضول خیالات جاننے میں اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

لیکن حماد کو اب نئے سرے سے تیار کیا جا رہا تھا۔

"بس چار دن کے یہ چونچلے ہیں' اس کے بعد تم بھی بدل جاؤ گے۔" وہ عصیور کو گود میں بٹھا کر چاکلیٹ کھلا رہا تھا جب عزہ نے کسی قدر ناراضی سے کہا تھا۔ اس کی گود میں ننھا احمد تھا جو اب چھ ماہ کا ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک میکے میں تھی۔

اصل میں اس کا میاں فیکٹری میں جاب کرتا تھا اور بقول اس کے سترہ ہزار میں اس کا گزارا نہیں ہوتا تھا تو وہ سال کے دس مہینے میکے میں ہی رہتی تھی۔

دوسری ثانیہ اس کی اپنی جٹھانیوں سے نہیں بنتی تھی۔ مہینے میں دس بار تو وہ لڑ جھگڑ کر میکے آجاتی تھی۔ اس بار جھگڑا طویل ہو گیا تھا وہ الگ ہونا چاہتی تھی۔ اس کے سسرال والے کئی چکر لگا چکے تھے مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پہ قائم تھی اور اب وہ حماد کی اچھی طرح سے برین واشنگ کر رہی تھی کہ وہ بھی عدنان کی طرح انہیں چھوڑ کر الگ ہو جائے گا۔ اسے بھی ماں کا خیال نہیں ہو گا۔ بہنوں کی پروا نہیں ہو گی۔ بیوی کے آتے ہی وہ انہیں بھول جائے گا۔ ان کے بچوں سے پیار نہیں کرے گا۔۔۔۔ بہت طویل فہرست تھی۔

اور حماد ہر وقت جی جان سے قسم کھانے کو تیار رہتا تھا کہ وہ عدنان جیسا زن مرید نہیں ہے۔ وہ ان کے ساتھ ایسا کبھی نہیں کرے گا بلکہ وہ تو اپنی بیوی کو پہلے روز ہی سمجھا دے گا کہ اگر چاہتی ہو کہ میں تمہیں خوش رکھوں تو تمہیں میرے گھر والوں کو خوش رکھنا ہو

گا اور اس کی یہ باتیں سن کر ان کا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔

"کیسی بات کر رہی ہو عزہ آپی، یہ تو میری پیاری سی گڑیا ہے اور ہمیشہ رہے گی۔" حماد نے اسے گدگدایا تھا۔ وہ زور و شور سے ہنسنے لگی۔

"چلو دیکھ لیں گے، چند دن کی بات ہے پھر تمہارے کمرے میں جائے گی اور تمہاری بیوی آنکھوں کے اشارے سے اسے باہر نکال دیا کرے گی۔"

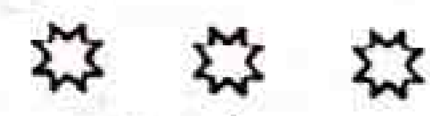
"وہ کوئی حرم تھوڑی ہے اور نہ میں عدنان بھائی جیسا ہوں۔" وہ جھٹ برامان گیا۔

"بس بس تم ہر وقت ایسی باتیں مت کیا کرو۔ حماد کو ہم جانتے ہیں اسے بہت پیار ہے ہم سے۔" ثانیہ نے آکر بڑے لاڈ سے کہا تھا۔

اور حماد کی بیوی انعم' وہ واقعی بڑی پیاری' پڑھی لکھی' صاف گو اور کسی حد تک منہ پھٹ تھی۔ اول تو اسے حجلہ عروسی میں حماد کے خیالات اور اس کی باتوں سے کوفت ہو رہی تھی جو اپنی والدہ محترمہ اور تین عدد بہنوں کے مدار سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔

وہ منتظر تھی کہ وہ کوئی اپنی اور اس کی بات کرے اس کے حسن کو سراہے' اپنی محبت کا اعتماد بخشے۔ کوئی شوخی بھرا جملہ' ان کہی سرگوشی' شرارت بھری والہانہ نگاہوں کا تصادم۔ مگر اس کا انتظار' انتظار ہی رہا اور اسے نیند آنے لگی۔

"مجھے اپنے گھر والوں سے تمہارے متعلق کبھی کوئی شکایت نہ ملے۔" حماد اب اس سے اپنے عہد کی تجدید چاہتا تھا مگر دیکھا کہ وہ تو سو چکی تھی۔



اگلے روز ناشتے کی میز پر سب جمع تھے' انعم کو بھی کمرے سے نکل کر وہیں آنا پڑا۔ عدنان کو بھی اوپر سے نیچے طلب کیا گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی عذرا بیگم کی پیشانی پر ان گنت بل نمودار ہوئے۔

"تمہاری بیوی کو ہماری۔ عزت کا کوئی خیال بھی ہے ہر کوئی پوچھ رہا تھا کہ بڑی بہو کہاں ہے۔ بارات

میں کیوں نہیں آئی؟ گھر میں جو بات ہے وہ اپنی جگہ' لیکن اب اس کا اشتہار کیا زمانے بھر میں لگواؤ گے۔ شام کے فنکشن میں آج اسے لے کر آنا یہ تمہارا کام ہے۔"

"جی امی۔" وہ تابع داری سے سرہلا کر اوپر چلا گیا۔

"بھابی سے کیا کوئی ناراضی ہے۔" انعم نے بعد میں آئمہ سے پوچھا تھا۔

"وہ ہے ہی ایسی' بڑی لڑاکا اور فسادن ہے۔ آتے ہی ہمارے گھر کو دو حصوں میں بانٹ دیا حالانکہ ہماری امی کی کتنی خواہش تھی کہ دونوں بھائی مل کر رہیں ہم نے اتنی کوشش کی مگر وہ...." منہ پھلا کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اب تم نہ اس کے جیسی ہو جانا۔" عزہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"یہ نہیں ہو سکتی' ہمارا بھائی حماد ایسا نہیں ہے۔" ثانیہ نے محبت سے حماد کو دیکھا۔

"ہاں تو اور کیا' یہ مردوں کی ہی ڈھیل ہوتی ہے جو عورتیں سر پہ چڑھ جاتی ہیں اگر ان کی رسی ذرا کھینچ کر رکھیں تو کیا مجال ہے جو وہ کوئی حکم عدولی کر جائے۔"

"حماد' امی کے فرمودات پر بڑے زور و شور سے سرہلا رہا تھا۔ انعم نے کسی قدر ناگواری سے اسے دیکھا۔

عدنان' حرم کی منتیں کر رہا تھا۔

"حرم پلیز' میری خاطر چلی جاؤ۔"

"بن بلائے کیسے چلی جاؤں؟ مایوں' مہندی' ڈھولک' بارات یہ تو کسی کو میرا خیال نہیں آیا۔ اب منہ اٹھا کر ولیمہ اٹینڈ کرنے پہنچ جاؤں۔" وہ جانتی تھی کہ آج ہی اسے کیوں بلوایا جا رہا ہے۔

"امی نے بلایا ہے ان ہی کے کہنے پر تم سے کہہ رہا ہوں۔"

"مجھے نہیں جانا۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔

"حرم پلیز۔" عدنان نے آخر منا کر ہی دم لیا تھا۔

اور اس کا شک صحیح نکلا۔ اسٹیج پر سب انعم کے ساتھ پوز بنا بنا کر تصویریں بنوا رہی تھیں۔ آئمہ اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلا رہی تھی۔ ثانیہ نے اس کا ہاتھ

تمام کر۔ سب سے متعارف کروایا تھا بس یہی سب دکھانے کے لیے اسے بلایا جا رہا تھا۔

وہ میز سے اٹھ کر باہر نکل رہی تھی جب راستے میں روا مل گئی۔

"حرم کیسی ہو۔" گرمجوشی بھرا انداز' جیسے دونوں کے مابین کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بھی مسکرا دی۔

"اور سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟ میں نے سنا تھا تم الگ ہو گئی ہو۔ ویسے تمہاری تو دیرینہ خواہش تھی علیحدہ رہنے کی' جوائنٹ فیملی' رشتے' تو کبھی تمہیں پسند ہی نہیں تھے پھر آخر تم نے اپنا الگ گھر بنا ہی لیا۔" پرانی جون میں ہنستے ہوئے وہ کافی بے تکلفی سے بولی تھی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے بھی جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا تھا اور پھر معذرت کر کے ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ اسے اس ٹاپک پر کوئی بات کرنی ہی نہیں تھی۔

عدنان اس کے پیچھے ہی آ رہا تھا۔ "اتنی کیا جلدی ہے کھانا تو کھالو۔"

"میں کھا چکی ہوں۔" وہ بیزاری سے بولی۔ اس سے پہلے بھی بہت سے رشتے داروں نے اس سے کن سوئیاں لینے کی کوشش کی تھی۔ لوگوں کو سب پتا ہوتا ہے پھر بھی اتنے معصوم بن کر سوال کرتے ہیں کہ جیسے ان سے بڑا بے خبر تو کوئی ہے ہی نہیں۔۔۔

"اچھا یہ بات تھی۔"

"ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا۔"



اس بار ثانیہ اور عزہ نے اپنی حکمت عملی بدل لی تھی۔ وہ انعم کو حماد کے سامنے کسی کام کے لیے نہیں کہتی تھیں بلکہ خود بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتیں اور بعد میں وہی روٹین جو حرم کے ساتھ تھی مگر وہ حرم جتنی بامروت ہرگز نہیں تھی۔

رات وہ آئمہ' عزہ اور ثانیہ کے مشترکہ کمرے میں آئی تھی اور اس نے آئمہ سے کہا تھا "آئمہ یار! حماد تو نو بجے اسکول جاتے ہیں اور تمہیں آٹھ بجے نکلنا ہوتا ہے تو تم اپنا ناشتہ خود بنا لینا میرے لیے سویرے اٹھنا بے حد مشکل ہے۔" اس نے کہہ کر باری باری تینوں کے چہرے دیکھے جن پر ناقابل یقین سی کیفیت تھی۔

"مگر آئمہ تو پڑھائی میں اتنی بزی ہوتی ہے' وہ تو کوئی کام کرتی ہی نہیں۔ اس کے پاس کہاں اتنا وقت ہوتا ہے۔" ثانیہ نے حد برا مانتے ہوئے کہا تھا۔

"چھوڑو یار! ناشتا بنانے میں ٹائم ہی کتنا لگتا ہے۔ اور پھر میری ہی ایج فیلو ہے آئمہ کوئی اتنی بچی بھی نہیں کہ وہ بریڈ نہ سینک سکے۔" بولتے بولتے اس نے لمبی جمائی لی۔

"مجھے تو نیند آ رہی ہے۔" کہہ کر اٹھ گئی۔ سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

"اتنی بھی بھولی اور معصوم نہیں ہے جتنا ہم نے سمجھ رکھا تھا۔" عزہ کو اپنے اچھے گمان پر افسوس ہوا۔

"بڑے پر پرزے نکل آئے ہیں ایک لمحے میں کٹ گریں گے" ثانیہ نے دانت کچکچاتے ہوئے بند دروازے کو دیکھا۔

"اب میرے لیے صبح ناشتہ کون بنائے گا۔" آئمہ کو اپنی ہی فکر تھی۔

"بس ایک دو روز کی بات ہے' دیکھنا خود ہی لائن پر آ جائے گی۔" ثانیہ اس کا علاج سوچ بیٹھی تھی۔ انعم نے کمرے سے باہر نکل کر گہری سانس خارج کی جیسے بڑا معرکہ سر کر آئی ہو۔ اگلے روز اس نے حماد کو آفس بھیجا پھر خود ناشتہ کیا جب ثانیہ اور عزہ اٹھیں تو اس نے چیزیں سمیٹنی شروع کر دیں۔

"تم نے ناشتہ نہیں بنایا۔" ثانیہ کچن میں جھانک کر آئی تھی۔ ٹھنڈا چولہا اور جھوٹے برتن۔۔۔ اس کا میٹر یک دم ہی گھوما تھا۔

"بنایا تھا اور کر بھی لیا۔ میں لاؤنج دھونے لگی ہوں ناشتہ کر کے وائپر لگا دیجئے گا اور عزہ آپی سے کہیں' ناشتہ کرنے کے بعد وہ کچن صاف کر دیں۔ اب ظاہر ہے جب کام والی نہیں ہے تو پھر سارے کام ہمیں ہی کرنے ہیں۔" اس نے کہہ کر جھاڑو اٹھائی اور شڑپ

شڈپ فرش دھونے لگی۔ ثانیہ کی طرف دیکھنے کی بھی اس نے کوشش نہیں کی تھی اور اس کا طمانیت بھرا انداز ثانیہ کو آگ لگا رہا تھا اور یہ آگ اس نے حماد کی سماعت کو جھلسا کر ٹھنڈی کی تھی۔

وہ کمرے میں آیا تو انعم ٹی وی دیکھ رہی تھی' سب سے پہلے ریموٹ اٹھا کر اس نے ٹی وی بند کیا تھا۔

"تم نے آئمہ سے خود ناشتہ بنانے کے لیے کہا تھا۔"

وہ سب سے چھوٹی لاڈلی سی بہن ہے ہماری' جب تک اس کی پڑھائی مکمل نہیں ہو جاتی وہ کوئی کام نہیں کرے گی۔" اس کا انداز خاصا روٹھا ہوا خفا خفا سا تھا۔

"مگر۔۔۔"

"اگر تم نے کل اس کا ناشتہ نہ بنایا تو میرا بھی مت بنانا۔" بس فیصلہ سنا دیا تھا اس نے۔ انعم نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا مگر اگلے روز اس نے حماد کو ناشتہ بنا کر دیا تو وہ بغیر ناشتہ کیے ہی اسکول چلا گیا تھا۔

ایک روز اس نے پوچھا تھا۔ "آئمہ اور ثانیہ اپنے سسرال کیوں نہیں جاتیں؟" تو اس نے کس قدر تیز خفگی بھری' برہم نگاہوں کو ترچھا کر کے اسے دیکھا تھا۔

"کیوں؟ تمہیں کیا اعتراض ہے۔ یہ گھر ان کے باپ کا ہے' وہ جب تک دل چاہے گا یہاں رہیں گی۔ دوبارہ میں کبھی تمہارے منہ سے ایسی بات نہ سنوں۔" اور پھر اس سے اگلے دن عصبورہ نے اس کے بیڈ روم میں گھس کر اس کا سارا میک اپ خراب کر دیا تھا۔ ایک پیارا سا شوپیس تھا جو خاص اس کے بھائی نے اسے گفٹ کیا تھا وہ بھی توڑ دیا تھا۔ اسے عصبورہ پہ بہت غصہ آیا تھا۔

لائیز' مسکارا' آئی شیڈ' کیوٹکس' لپ اسٹک ہر چیز تہس نہس ہو چکی تھی۔

"عصبورہ یہ کیا کیا ہے تم نے۔" اس نے ذرا غصے سے ہی پوچھا تھا۔

اور حماد نے ایک ایک کر کے اس کی ساری چیزیں فرش پہ پھینک دی تھیں "آج کے بعد بچی سے اس لہجے میں بات مت کرنا۔"

وہ باہر لاؤنج میں بیٹھی تھی اس کا ذہن حماد کے رویے میں الجھا ہوا تھا۔

عزہ نے اسے آواز دی۔

"انعم یہ ذرا عصبورہ کو واش روم لے جانا۔"

"عزہ باجی! اپنے بچوں کے کام تو خود کیا کریں' ان کے لیے فیڈر بنانا' واش روم لے جانا' ڈریس چینج کروانا آپ کا کام ہے میرا نہیں ہے۔" غصے میں وہ بالکل بے لحاظ ہو گئی تھی۔

شام کو اس بات پہ بھی اچھا خاصا تماشا ہو گیا۔ وہ جو سوچ رہی تھی حماد اس سے خفا ہے وہ اس کی پسند کا کھانا بنائے گی تو موڈ خود بخود خوشگوار ہو جائے گا۔

مگر ان باتوں کے بعد وہ اور بھی خفا ہو گیا تھا۔

"وہ تمہارا اتنا خیال رکھتی ہیں اور تم ان کا ذرا سا کام نہیں کر سکتیں۔"



آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے سوچا تھا پہلے کھانا بنالے پھر آکر آرام کرے گی۔ ابھی تین بجے تھے اور حماد سکول سے پانچ بجے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر آتا تھا لنچ میں وہ سلاد وغیرہ ہی کھاتا تھا اور گھر آتے ہی اسے کھانا چاہیے ہوتا تھا' فریج کھول کر دیکھا' چکن کا پیکٹ رکھا ہوا تھا۔ چکن کڑاہی اور ساتھ روٹیاں بھی ابھی ڈال لیتی ہوں۔ کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے کچن سمیٹا اور اسے پہلے کہ وہ باہر نکلتی عذرا بیگم کچن میں تشریف لا چکی تھیں۔

"یہ کیا؟ تم نے روٹیاں بھی بنا دیں۔" ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھاتے ہی ان کے ابرو تن گئے تھے۔

اف یہ ساس کی گھوریاں مگر وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ کمال اطمینان سے کھڑی رہی۔

"صبح سے اسکول گیا تھکا ہارا شام کو گھر آتا ہے اور تم اسے تازہ روٹی نہیں بنا کر دے سکتیں۔" ساس کا صدمے کے مارے برا حال تھا۔

"روز تازہ ہی بناتی ہوں' آج ذرا طبیعت خراب تھی تو۔۔۔۔"

"یہ آج کل کی لڑکیوں کی طبیعت ہر وقت اتنی خراب کیوں رہتی ہے۔ میری بھی تو تین بیٹیاں ہیں' یہ ڈرامے انہوں نے تو کبھی نہیں کیے۔" دیکھ بھی رہی تھیں' اسے فلو تھا۔ ساتھ گلا خراب مگر اب ان کو کون سمجھائے مگر وہ سمجھا سکتی تھی۔

"میکے میں کون ڈرامے کرتا ہے۔ یہ تو سسرال میں کرنے کا کام ہے۔ جہاں وہ جاتی ہی نہیں۔" بڑبڑاہٹ کے ساتھ وہ کہہ کر چلی آئی لیکن عذرا بیگم نے سب سنا تھا اور سن کر سن رہ گئی تھیں۔

یہ لڑکی تو ان کی سوچ سے زیادہ چالاک تھی۔

"خیر جتنی بھی چالاک ہو جائے جب تک میرا بیٹا میرے قابو میں ہے یہ محض بڑبڑا ہی سکتی ہے حماد سے کہہ کر اسے ذرا سیدھا کرواتی ہوں۔"

☆ ☆ ☆

حرم دیکھ رہی تھی' عدنان کا رویہ اس کی فہم سے بالا تر تھا۔ دو ہفتے کے لیے وہ بزنس ٹور پر گیا تھا اور اب اسے گھر آئے بھی ہفتہ ہو چکا تھا اور ہفتہ بھر سے ہی وہ خاموش تھا۔ جانے کون سا جرم سرزد ہوا تھا اس سے جس کی سزا مل رہی تھی۔

مطلب سے زیادہ بات نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ تو مطلب کی بھی بات نہیں کر رہا تھا۔ پری میں بھی اس کی دلچسپی برائے نام ہی تھی۔ ابھی بھی وہ پری کو سلا کر لاؤنج میں آئی تو وہ ٹیرس پہ کھڑا تھا ورنہ اس ٹائم وہ بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہوتا تھا اور تاثرات ایسے سپاٹ کہ وہ لاکھ چاہنے کے باوجود بھی اسے مخاطب نہیں کر پاتی تھی۔

اس کے وجود سے اتنی فراموشی' لاتعلقی بھلا وہ کیسے برت سکتا تھا۔

آج اس نے بھی اس کھور رویے کی وجہ دریافت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اسی ارادے سے وہ ٹیرس پہ آئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں ادھ جلا سگریٹ پکڑے خلا میں جیسے کچھ گھور رہا تھا۔

"عدنان۔" وہ اس کے پاس چلی آئی۔

آواز پر بھی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔

لیکن یہ حرم کی بھول تھی وہ نہ صرف اسے سن چکا تھا بلکہ وہ تو پہلے سے ہی اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

"حرم۔۔۔ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔" سرد لہجہ' لاتعلق انداز۔

"کیا؟" وہ کچھ سمجھی تھی کچھ نہیں۔ اس کا تو دماغ ہی چکرا گیا تھا۔ یہ کیسا حکم نامہ تھا۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ پری میرے پاس رہے گی' تمہیں اس گھر سے جو کچھ بھی لینا ہو لو اور چلی جاؤ۔"

"لیکن کیوں چلی جاؤں؟ کیا قصور ہے میرا؟" وہ تو پہلے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھل پائی تھی پری کی بات کہہ کر تو اس نے اس کا کلیجہ ہی نوچ ڈالا تھا۔

"تمہارا قصور۔۔۔۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"تم ایک بہروپی ہو' بڑا سوانگ رچایا ہے تم نے اور میں کٹھ پتلی کی طرح تمہارے اشاروں پر ناچتا رہا۔ میرے جذبات سے کھیلی ہو تم' تمہاری خاطر میں نے

آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے سوچا تھا پہلے کھانا بنالے پھر آکر آرام کرے گی۔ ابھی تین بجے تھے اور حماد اسکول سے پانچ بجے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر آتا تھا۔ لنچ میں وہ سلاد وغیرہ ہی کھاتا تھا اور گھر آتے ہی اسے کھانا چاہیے ہوتا تھا' فریج کھول کر دیکھا چکن کا پیکٹ رکھا ہوا تھا۔ چکن کڑاہی اور ساتھ روٹیاں بھی ابھی ڈال لیتی ہوں۔ کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے کچن سمیٹا اور اسے پہلے کہ وہ باہر نکلتی' عذرا بیگم کچن میں تشریف لا چکی تھیں۔

"یہ کیا؟ تم نے روٹیاں بھی بنا دیں۔" ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھاتے ہی ان کے ابرو تن گئے تھے۔

اف یہ ساس کی گھوریاں مگر وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ کمال اطمینان سے کھڑی رہی۔

"صبح سے اسکول گیا تھکا ہارا شام کو گھر آتا ہے اور تم اسے تازہ روٹی نہیں بنا کر دے سکتیں۔" ساس کا صدمے کے مارے برا حال تھا۔

"روز تازہ ہی بناتی ہوں' آج ذرا طبیعت خراب تھی تو۔۔۔"

"یہ آج کل کی لڑکیوں کی طبیعت ہر وقت اتنی خراب کیوں رہتی ہے۔ میری بھی تو تین بیٹیاں ہیں' یہ ڈرامے انہوں نے تو کبھی نہیں کیے۔" دیکھ بھی رہی تھیں' اسے فلو تھا۔ ساتھ گلا خراب مگر اب ان کو کون سمجھائے مگر وہ سمجھا سکتی تھی۔

"میکے میں کون ڈرامے کرتا ہے۔ یہ تو سسرال میں کرنے کا کام ہے۔ جہاں وہ جاتی ہی نہیں۔" بڑبڑاہٹ کے ساتھ وہ کہہ کر چلی آئی لیکن عذرا بیگم نے سب سنا تھا اور سن کر سن رہ گئی تھیں۔

یہ لڑکی تو ان کی سوچ سے زیادہ چالاک تھی۔

"خیر جتنی بھی چالاک ہو جائے جب تک میرا بیٹا میرے قابو میں ہے یہ محض بڑبڑا ہی سکتی ہے حماد سے کہہ کر اسے ذرا سیدھا کرواتی ہوں۔"



حرم دیکھ رہی تھی' عدنان کا رویہ اس کی فہم سے بالا تر تھا۔ دو ہفتے کے لیے وہ بزنس ٹور پر گیا تھا اور اب اسے گھر آئے بھی ہفتہ ہو چکا تھا اور ہفتہ بھر سے ہی وہ خاموش تھا۔ جانے کون سا جرم سرزد ہوا تھا اس سے جس کی سزا مل رہی تھی۔

مطلب سے زیادہ بات نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ تو مطلب کی بھی بات نہیں کر رہا تھا۔ پری میں بھی اس کی دلچسپی برائے نام ہی تھی۔ ابھی بھی وہ پری کو سلا کر لاؤنج میں آئی تو وہ ٹیرس پہ کھڑا تھا ورنہ اس ٹائم وہ بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہوتا تھا اور تاثرات ایسے سپاٹ کہ وہ لاکھ چاہنے کے باوجود بھی اسے مخاطب نہیں کر پاتی تھی۔

اس کے وجود سے اتنی فراموشی' لاتعلقی بھلا وہ کیسے برت سکتا تھا۔

آج اس نے بھی اس کٹھور رویے کی وجہ دریافت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اسی ارادے سے وہ ٹیرس پہ آئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں ادھ جلا سگریٹ پکڑے خلا میں جیسے کچھ گھور رہا تھا۔

"عدنان۔" وہ اس کے پاس چلی آئی۔

آواز پر بھی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔

لیکن یہ حرم کی بھول تھی وہ نہ صرف اسے سن چکا تھا بلکہ وہ تو پہلے سے ہی اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

"حرم۔۔۔ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔" سرد لہجہ' لاتعلق انداز۔

"کیا؟" وہ کچھ سمجھی تھی کچھ نہیں۔ اس کا تو دماغ ہی چکرا گیا تھا۔ یہ کیسا حکم نامہ تھا۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ پری میرے پاس رہے گی' تمہیں اس گھر سے جو کچھ بھی لینا ہو لو اور چلی جاؤ۔"

"لیکن کیوں چلی جاؤں؟ کیا قصور ہے میرا؟" وہ تو پہلے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھل پائی تھی پری کی بات کہہ کر تو اس نے اس کا کلیجہ ہی نوچ ڈالا تھا۔

"تمہارا قصور۔۔۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"تم ایک بہروپی ہو' بڑا سوانگ رچایا ہے تم نے اور میں کٹھ پتلی کی طرح تمہارے اشاروں پر ناچتا رہا۔ میرے جذبات سے کھیلی ہو تم' تمہاری خاطر میں نے

اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا۔ اپنی ماں سے الگ ہو گیا تاکہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو مگر تمہیں تو کوئی تکلیف تھی ہی نہیں، تم تو بہت بڑی پلانر ہو۔ ایک پلاننگ کے تحت تم نے سارا گیم اسٹارٹ کیا اور اس میں کامیاب بھی رہیں۔ ویل ڈن۔" بات ختم کر کے آخر میں اس نے تالی بجائی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ اس کی باتیں سن کر بھونچکی رہ گئی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں حرم! تمہارے سارے حجاب اتر چکے ہیں۔ اب کوئی نیا چہرہ خود پہ سجانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہاری اور ردا کی ساری باتیں میں نے سن لی تھیں۔" وہ اب دونوں ہاتھ ریلنگ پہ ٹکائے اسے دیکھ رہا تھا۔

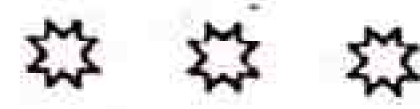
اور اس کے ذہن میں وہ ساری ویڈیو کسی فلیش کی طرح چل رہی تھی ہوٹل کی لابی میں ردا کے ساتھ ٹاکرا اور جان چھڑانے کی خاطر کہے چند الفاظ۔

"عدنان میری بات سنیں آپ کو......"

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، تمہارے پاس ٹائم کم ہے، ڈرائیور نیچے گاڑی میں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہے، جاؤ یہاں سے۔" اچانک ہی اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"عدنان!"

"جاؤ......" اس بار وہ دھاڑا تھا۔ نچلا لب کاٹتے ہوئے اس نے بمشکل آنسو پیے اور نفی میں گردن ہلاتی دو قدم پیچھے ہٹی اور پھر سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔



پری نے رات میں اسے اتنا تنگ کیا تھا اس کے لاکھ سنبھالنے سے بھی وہ چپ نہیں ہو رہی تھی، بالآخر وہ اسے اٹھا کر نیچے چلا آیا۔ امی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا وہ ابھی تک جاگ رہی تھیں، وہ جا کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

"میں نے نکال دیا ہے اسے گھر سے، اب تو میرے ساتھ اپنی ناراضی ختم کر لیں۔"

وہ شرمندہ تھا نادم تھا عذرا بیگم کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا، تو ان کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں، آخر ان کا بیٹا ان کے پاس لوٹ آیا تھا ان کی جلتی سلگتی انا کو جیسے قرار مل گیا تھا۔ انہوں نے بیٹے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پری کو ان کی گود سے لے لیا تھا۔ پری کو وہ آج پہلی بار دیکھ رہی تھیں ورنہ اس کی پیدائش پر کوئی اسے دیکھنے نہیں گیا تھا۔

اگلی صبح عزہ اور ثانیہ کو پتا چلا تو وہ بے حد خوش ہوئیں۔

"دیکھا خون کے رشتے اپنے ہی ہوتے ہیں جو ہزار بار ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتے اور اس کے ساتھ اس کا جو رشتہ تھا، کچے دھاگے سے بھی زیادہ نازک، جو ایک بار ٹوٹ جائے پھر جتنا بھی جوڑ لو، ایک گرہ تو لگ ہی جاتی ہے۔"

"ان جیسوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے جو شوہر کو قابو کرنے کے چکر میں اسے رشتوں میں الجھا دیتی ہیں پھر آخر پلڑا تو ماں کا ہی بھاری ہوتا ہے، بیوی کی کیا اوقات پیر کی جوتی ایک چھوڑ ہزار مل جائیں گی۔" صاف لگ رہا تھا وہ النعم کو سنا رہی تھیں۔

اور آئمہ نے تو حد ہی کر دی تھی۔

"امی! اب جان چھڑا لیں اس سے، ہمارے بھائی کو رشتوں کی کمی ہے کیا، کتنے لوگ ہم سے ناراض ہو گئے تھے جب ہم نے بھائی کا وہاں رشتہ کیا تھا۔" وہ بیٹھی ان کے جلے کٹے تبصروں پر جز بز ہوتی رہی اسے تو حرم پہ ترس آ رہا تھا بچی کے بغیر کیسے اس نے رات گزاری ہو گی، وہ یہی سوچ رہی تھی لیکن اس کی ساس نے اسے زیادہ سوچنے نہیں دیا تھا اور پری کی ذمہ داری اسے سونپ دی تھی۔

"اب میں بھلا اس عمر میں کیا بچے پالوں گی علو بہو سنبھالو اسے، آج سے اسے اپنی بچی ہی سمجھو۔" اور وہ حق دق ساس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"لے لو بھابی تجربہ ہی سہی، آخر کل کو اپنے بچے بھی تو پالنے ہیں۔" آئمہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا وہ شش و پنج کا شکار اب کیا کرے۔

لیکن ثانیہ نے پری کو اٹھا کر اس کی گود میں ڈال دیا تھا۔

✿ ✿ ✿

وہ اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے تو آئی تھی مگر اس کا دل بے حد برا ہو رہا تھا۔

''اتنی سی بچی کو ماں سے جدا کروا رہی تھیں۔'' من پر بچے سنبھالنے کے چکر میں ہلکان ہو رہی تھی' اس نے بھلا کب بچے سنبھالے تھے من کے گھر میں یہ کام گورنس کرتی تھی' کھانا شیف بناتا تھا' ہر کام کے لیے الگ سے ملازمہ تھی۔ وہاں تو بس اسے حکم چلانا ہوتا تھا لیکن یہاں کا ماحول ان کے ماحول سے بالکل الٹ تھا اس کے ڈیڈی نے تو خاصا سوچ سمجھ کر یہاں رشتہ کیا تھا' ان کے خیال میں تو پڑھی لکھی روشن خیال فیملی تھی۔ اب اندر کا ماحول کیسا ہوگا یہ تو نہیں پتا تھا۔ ہر بار جب وہ میکے کا چکر لگا کر آتی تھی تو بی بی نصیحتوں کا پلندہ اس کے ساتھ باندھ دیتی تھیں۔

''بیٹا! صبر برداشت سے کام لینا' ناز بیٹیوں کے اٹھائے جاتے ہیں' بہوؤں کے نخرے سسرال میں کوئی نہیں دیکھتا' مجھے یقین ہے ایک دن تم سب کے دل میں جگہ بنالوگی۔''

مگر بی بی کو کون سمجھائے جب بہو سے ملازمہ کی طرح کا برتاؤ کیا جائے گا تو وہ کب تک صبر و برداشت سے کام لے گی آخر عزت نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کام کرنے کے لیے یہ اس کا گھر تھا اور حق جتانے کے لیے تم کون ہو۔

''چپ کرواؤ اسے' سونے بھی نہیں دے رہی۔'' حماد نے کوئی چوتھی بار اسے کہا تھا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے اسے دیکھا جنہیں نظرانداز کرتے ہوئے وہ کروٹ بدل گیا تھا' باہر نکل کر اس نے دیکھا سب کمروں کے دروازے بند تھے۔

عدنان بھائی بھی اوپر اپنے پورشن میں جا کر سو چکے تھے۔ وہ واپس کمرے میں آگئی۔

''اس بچی کی وجہ سے میرے اور حماد کے مابین فاصلے مزید بڑھ جائیں گے۔'' وہ اس کی اپنے جانب کی گئی پشت کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

وہ تو پہلے ہی کمرے میں لیٹ آ تا تھا اور آج جب وہ آیا تو وہ بچی کے ساتھ مصروف تھی' اس کا انتظار کرتے کرتے وہ سو چکا تھا۔

نئی نئی شادی شدہ زندگی میں جب انہیں ضرورت تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزاریں تب بیچ میں اتنی بھاری ذمہ داری آگئی تھی۔

انعم کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں لیکن پری کا سونے کا کوئی موڈ نظر نہیں آرہا تھا وہ تو اب گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی حماد کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے وہ اسے اٹھا کر ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

''حیرت ہے سب کیسے مزے سے سو رہے ہیں اتنا رو رہی ہے یہ' مگر مجال ہے جو کوئی اٹھ جائے۔'' آئمہ کے بیڈروم سے باتوں کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی شاید وہ فون پر کسی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔

انعم نے وال کلاک دیکھا ڈیڑھ بجے وہ بھلا کس کے ساتھ باتیں کر رہی ہوگی۔

ہلکا سا کھٹکھٹانے پر دروازہ کھل گیا۔

''بھابی تم اس وقت۔'' انداز میں ہی ناگواری تھی۔

''آئمہ یہ بہت رو رہی ہے۔'' انعم خجل سی ہو گئی اس کے چہرے پہ صاف لکھا تھا۔

''تو میں کیا کروں۔'' مگر وہ ڈھیٹ بنی اندر آگئی۔

''آپ اس کا ڈائپر چیک کریں۔'' بادل نخواستہ اس نے مشورہ دیا اور اس خیال سے ہی کہ اب اسے یہ کام بھی کرنا پڑے گا اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔

''ضرور اس نے ڈائپر گندا کیا ہوگا اسی لیے اتنی بے چین سی لگ رہی ہے۔'' اور اس کا خیال ٹھیک ہی تھا انعم نے چیک کر لیا تھا۔

''اب اس کو چینج کون کرے گا۔'' مسکین سی شکل بنا کر اس نے آئمہ کو دیکھا۔ اور آئمہ اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے بے اختیار نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میں ـــــ" اس نے سینے پہ الٹا ہاتھ رکھا "کبھی نہیں ـــــ سوچنا بھی مت ـ" اس کا انداز اتنا قطعی تھا ـ کہ اس نے درخواست کا خیال ہی جھٹک دیا ـ

"چلو تم مجھے گائیڈ تو کر سکتی ہو اتنی چھوٹی ہے یہ تو میرے ہاتھوں سے پھسل جائے گی ـ" اب آواز میں مسکینیت تھی ـ

"اس کے لیے عزہ باجی سے مشورہ لیں ـ" اس نے صاف ہری جھنڈی دکھائی ـ

"ایک نمبر کی کمینی ہے یہ آئمہ ـ" وہ دل ہی دل میں اسے صلواتوں سے نوازتی اب خود کوشش کرنے لگی تھی ـ

☼ ☼ ☼

اصل مشقت تو جیسے اب شروع ہوئی تھی ' ہر کام اس سے الٹا پلٹا ہو رہا تھا پری کو اس کی گود میں ڈالنے کے بعد سب جیسے اس کے وجود کو یکسر فراموش کر چکے تھے ' حماد کے کام کرنے میں مشکل ' اس پر نیند پوری نہیں ہو رہی تھی ' کھانا تک تو وہ ڈھنگ سے نہیں کھا سکتی تھی ـ چائے کو دوبارہ گرم کیا لیکن پینے سے پہلے ہی پھر ٹھنڈی ہو چکی تھی دو روز سے اس نے کپڑے نہیں بدلے تھے بال نہیں سنوارے تھے ـ

صبح وہ نماز کے لیے اٹھی پری کو امی کے پاس چھوڑنا چاہا تو وہ واک پہ جا چکی تھیں نماز قضا ہو گئی اب حماد کے کپڑے پریس کرنے تھے ناشتہ بنانا تھا ـــــ آئمہ کے پاس لے کر گئی ـ

"نہیں مجھے اکیڈمی سے دیر ہو رہی ہے ـ" ثانیہ تو سو رہی تھی ' عزہ کے کمرے کا رخ کیا اور وہ ـ

"ارے اتنی مشکل سے میں نے ابھی رحمت کو سلایا ہے اس کے شور سے اس کی بھی نیند خراب ہو جائے گی ـ" وہ الٹے قدموں واپس مڑی اس نے پری کو پرام میں ڈالا اور خود کچن میں چلی آئی اس نے رو رو کر گھر چھوڑ محلہ سر پر اٹھا لیا تھا ـ

عدنان بھائی نے دیکھا تو بے حد خفا ہوئے ـ

"یہ کیا تم نے بچی کو بالکل ہی بے یار و مددگار چھوڑ دیا ـ حد ہے لاپروائی کی بھی ' نہیں سنبھال سکتی تھیں تو بتا دیا ہوتا ـ" وہ غصے میں اٹھا کر اوپر لے گئے اب پھر سارا ملبہ اس پہ گرا ـ

ثانیہ نیند سے اٹھ کر آ گئی ' عزہ نے کمرے سے جھانکا ' آئمہ کو اب دیر نہیں ہو رہی تھی ـ حماد بغیر ناشتہ کیے ہی چلا گیا ـ ساری لعنت ملامت اسی کے حصے میں آئی ـ

"کوئی کام تمہیں ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا ' بالکل ہی کیئر لیس ہو ' ہر بار تمہاری وجہ سے مجھے شرمندگی ہوتی ہے ـ" یہ وہ اس سے کہہ کر گیا تھا ـ

"میں کیا سپرمین ہوں ـ" اسے سارا غصہ خود پہ آیا ـ

نئی نئی شادی شدہ زندگی تھی ' الگ ماحول ' انجانے لوگ ' کچھ ٹائم تو لگتا ہے ایڈجسٹ ہونے میں ' لیکن نہیں بیٹیوں کو ہر طرح کی آزادی ہے مگر بہو کو کوئی مارجن نہیں ملے گا ـ" وہ روہانسی ہونے لگی ـ

☼ ☼ ☼

حرم کا رو رو کر برا حال تھا بمشکل گھر والوں نے سنبھالا ' ہر کوئی پوچھ پوچھ کر تھک چکا تھا کہ آخر بات کیا تھی جس کی وجہ سے عدنان نے تمہیں گھر سے نکال دیا ہے ـ

"بس ایک مس انڈر اسٹینڈنگ ہے دو چار روز میں سب ٹھیک ہو جائے گا ـ" وہ جیسے ہر کسی کو تسلی دیتی ' امی ' ابو عدنان سے ملنا چاہتے تھے بات کرنا چاہتے تھے ـ مگر اس نے بڑی مشکل سے انہیں روک رکھا تھا ـ

اس کی اپنی حالت انتہائی خستہ حال اور ابتر ہو رہی تھی دو ' چار لقموں سے زیادہ اس سے کھایا نہیں جاتا تھا ' ساری رات کروٹیں بدلتے آنکھوں میں کٹ جاتی تھی ـ

ہر دم اسے پری کا خیال آتا تھا اور خود پر غصہ بھی کہ وہ کیوں اسے چھوڑ آئی تھی ' اب کون سنبھالتا ہو گا گھر والوں سے تو کوئی توقع رکھنا ہی فضول تھا کہ کوئی اسے

منانے آئے گا بلکہ وہ تو بے حد خوش ہوں گے ان کی تو دلی مراد بر آئی ہے۔

بھابی اسے کمرے سے نکال کر چھت پر لے آئی تھیں اس کا کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں کر رہا تھا اپنی ہی سوچوں نے جیسے اسے تھکا ڈالا تھا۔

اور وہ تھیں کہ اس کا دل بہلانے کی خاطر جانے کہاں کہاں سے باتیں نکال کر سنا رہی تھیں حرم کا دل چاہ رہا تھا کاش ان کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش کروا دے اس کا ذہن اتنا بوجھل تھا کہ ماؤف ہونے لگا تھا۔

اور بھابی کی آواز جیسے کانوں میں ہتھوڑے کی مانند برس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آؤ حرم بیٹھو کیا حال ہے تم کبھی ملنے ہی نہیں آئیں۔" وہ ردا کے گھر گئی تھی آنٹی نے اس کا پرتپاک استقبال کیا تھا ایک ہی سانس میں ڈھیروں سوال کر ڈالے۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بدقت مسکرائی۔

"ردا بھی آئی ہوئی ہے۔" وہ اسے ساتھ لیے لاؤنج میں چلی آئی۔ ردا وہیں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی ہاتھ میں چائے کا مگ تھا۔

کیسا بے فکر اطمنیت بھرا انداز تھا۔ حرم کو اسے دیکھ کر چبھن سی ہوئی۔

"تمہیں کیسے رستہ بھول گیا۔" وہ اٹھ کر گرمجوشی سے ملی۔ لیکن حرم کا انداز یونہی ساتھا' سپاٹ اور سرد۔

"تم دونوں بیٹھو۔ میں چائے بھجواتی ہوں۔"

"خالی چائے نہیں آج تو کھانا کھا کر جائے گی۔ اب آ ہی گئی ہے تو میں اتنی جلدی جانے نہیں دوں گی۔" ردا اس کے روٹھے روٹھے انداز کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"اب بتاؤ کیا بات ہے۔" وہ جانتی تھی ضرور کوئی خاص بات ہے تب ہی تو وہ آئی ہے ورنہ تو ایک رشتے کی وجہ سے دونوں کی دوستی ختم ہو چکی تھی۔

"ردا! تمہیں اگر مجھ پر غصہ تھا تو تم مجھ سے بات کرتیں میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم مجھ سے اس طرح بدلہ لو گی۔" اس نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ردا پہلے حیران ہوئی پھر پریشان۔

"کیسا بدلہ حرم اور پھر کس بات کا' تمہارا نصیب اس شخص کے ساتھ ہی لکھا تھا اور خدانخواستہ تم کوئی غاصب نہیں ہو تم نے جان بوجھ کر میرے لیے آئے رشتے کو اپنی جانب ملتفت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ تم بج سنور کر میرے نمبر کاٹنے ان کے سامنے آئی تھیں بلکہ میں تو زبردستی تمہیں گھسیٹ کر لے گئی تھی۔ اب اگر انہیں تم پسند آگئیں تو مجھے یا مما کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ مما نے تو کہا تھا کہ ان کے لیے تم بھی بیٹی جیسی ہو۔ میرا نہیں تو تمہارا سہی اور بعد میں بھی میں تم سے ملنے گئی مگر تم نے ملنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔

اور ویسے بھی میں اپنے گھر میں خوش ہوں تو تم کیسے سوچ سکتی ہو کہ میں تمہارا برا چاہوں گی جب مجھے تم پہ غصہ ہی نہیں ہے کوئی گلہ' شکوہ نہیں۔ ہے تو بدلہ لینے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

"شادی سے پہلے ہر لڑکی لاابالی ہوتی ہے' اس کے خیالات بھی میچور نہیں ہوتے اور بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہم ایسے ہی کہہ دیتے ہیں۔ اپنے گھر کے ہنگامے سے عاجز آکر میں کہا کرتی تھی کہ میں تو کسی اکلوتے لڑکے سے شادی کروں گی۔ ہاں ٹھیک ہے' مجھے جوائنٹ فیملی سسٹم پسند نہیں تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے سسرال میں رہنے یا رشتوں کو نبھانے کی کوشش نہیں کی۔ اب اگر حالات کے زیر اثر ہم الگ ہو گئے تو کیا ضروری تھا کہ تم ان پرانی باتوں کا حوالہ دیتیں۔"

"حرم میں تو مذاق......"

"تمہارے مذاق نے میرا گھر برباد کر دیا ہے ہر جگہ مذاق کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ عدنان نے تمہارا ہر لفظ سنا اور بدگمان ہو کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ دو ماہ کی

بچی چھوڑ کر آئی ہوں۔ تم نے تو تول دیا اب میں ترازو کے دوسرے پلڑے میں کون سی دلیل یا وضاحت رکھوں کہ تمہارے کیے کا بوجھ کم ہو جائے۔" بات کرتے کرتے اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ ردا کو ڈھیروں ندامت نے آن گھیرا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس وقت وہ کتنی اذیت سے گزر رہی ہے۔

"سچ ہے انسان کو سب سے زیادہ رسوا اس کا دوست ہی کرتا ہے۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رک جاؤ حرم' پلیز' دیکھو میں مانتی ہوں میری غلطی ہے۔ مجھے ان نزاکتوں کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ میں عدنان بھائی۔۔۔"

لیکن حرم رکی نہیں تھی اور وہ سوچ رہی تھی حرم کا مسئلہ وہ ضرور حل کرے گی چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔



"اتنا بڑا قدم تم نے اٹھایا کیسے' تمہاری جرات کیسے ہوئی کہ تم اتنے بڑے فیصلے کرتی پھو اور وہ بھی بغیر کسی اجازت کے" بڑے کمرے میں عدالت لگی تھی۔ حماد اس پہ خوب برس رہا تھا اور باقی جملہ افراد ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اس میں امی اور عدنان بھائی کی نگاہیں قہربار تھیں جیسے بس نہ چل رہا ہو کہ اسے تہس نہس کر دیں۔

"اتنی چھوٹی سی بچی کو ماں سے چھین لیا آپ لوگوں نے اور سنبھالنے کے لیے مجھے دے دی' اتنے بڑے گناہ کا بوجھ میں نہیں اٹھا سکتی تھی۔" اسے آخر اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی غلط کام تھوڑی کیا تھا اس نے' دوٹوک جواب دیا۔

"اچھا تو میری بچی بوجھ تھی تمہارے لیے۔" عدنان نے اپنی پسند کا مطلب نکالا اور پھر غصہ بھی ہوئے۔

"نہیں سنبھال سکتی تھیں تو پہلے ہی منع کر دیتیں۔ اس کی گود میں ڈال کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس کی ساس کو تو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسے سنگین جرم کا ارتکاب اس نے کیا ہے۔ یہ چھٹانک بھرکی لڑکی

"آفت، فتنہ۔"
کیسے قینچی کی طرح زبان چل رہی تھی اس کی کٹ کٹ کٹ۔ ذرا جو اپنے کیے پر نادم ہو۔
ہوا کچھ یوں تھا کہ دو ہی دن میں تنگ آ کر اس نے پری کا سامان پیک کیا تھا اور چوری چھپے سب سے نظر بچا کر اسے حرم کے گھر چھوڑ آئی تھی۔ اب اس کی اس حرکت پر سب کا جلال میں آنا فطری تھا۔
عدنان دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بیٹھ گیا۔ بہنوں نے حماد کے خوب کان بھرے۔ ساس کا واویلا ہنوز جاری تھا۔
تنگ آ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔
"معافی مانگو جا کر امی سے اور عدنان سے اور ابھی کہ ابھی پری کو واپس لے کر آؤ۔" وہ نیا حکم نامہ لیے پیچھے ہی آیا تھا۔
"مجھے نہیں مانگنی کسی سے بھی معافی اور نہ ہی میں پری کو لینے جاؤں گی۔" وہ ڈھٹائی سے بولی بلکہ دیدہ دلیری سے۔
"تو ٹھیک ہے پھر اپنا سامان اٹھاؤ اور نکلو میرے گھر سے۔"
"تم مرد آخر اور کر بھی کیا سکتے ہو۔" وہی ازل سے چلتی داستان ایک دھمکی کی صورت کہ گھر تو میرا ہے۔
جا رہی ہوں مگر ایک بات یاد رکھنا، جو مرد رشتوں میں توازن نہ رکھ سکے وہ کبھی گھر نہیں بسا سکتا۔" اس نے اپنا بیگ پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہی کچھ ہونے والا ہے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ حماد ٹائپ لڑکے کے ساتھ اس کا گزارا بہت مشکل ہے، جس نے اپنے رشتے کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی تھی کہ تم سے تب خوش ہوں گا جب میری ماں تم سے خوش ہو گی اور اس کی ماں خوش ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔
اب وہ اس کے لیے اپنی زندگی کے قیمتی سال کیوں برباد کرتی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب دوبارہ کبھی اس گھر میں نہیں آئے گی۔

☆☆☆

وہ چلی گئی تھی اور کسی نے بھی اسے نہیں روکا تھا۔

کچھ دن گزرے تھے۔ گھر میں آئمہ کو کچھ لوگ دیکھنے آ رہے تھے۔ لڑکا اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ عمیر نے اپنے گھر والوں کو بمشکل رضامند کیا تھا۔
آئمہ کی سج دھج دیکھنے لائق تھی۔
گھر میں ملازمہ باہر سے آنے لگی تھی۔ ثانیہ اس کے سر پہ کھڑی صفائی کروا رہی تھی۔ عذرا بیگم نے آج خود کچن سنبھال رکھا تھا۔
وہ لوگ آئے اور دیکھ کر چلے گئے۔ شام کو عمیر کی کال آئی۔
"کیا بنا؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
"بننا کیا ہے۔ امی کو تمہاری فیملی بالکل پسند نہیں آئی' کہہ رہی تھیں لڑکی تو ٹھیک ہے لیکن انہیں فیملی پر اعتراض ہے۔" وہ بھی بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بولا تھا۔
آئمہ کو سن کر حیرت ہوئی۔ "کیوں' ہماری فیملی میں ان کو کیا برائی نظر آ گئی۔" ساتھ برا بھی لگا۔
"یار! تمہاری دونوں بھابیاں روٹھ کر میکے بیٹھی ہوئی ہیں۔ دو بہنیں ہیں' وہ سسرال کے بجائے یہاں رہتی ہیں۔ امی کو تمہارے گھر کا ماحول بالکل پسند نہیں آیا۔ ان کا کہنا ہے' تمہاری امی ایک خود غرض خاتون ہیں جو بیٹیوں کے چکر میں بیٹوں کا گھر خراب کر رہی ہیں اور دوسرا یہ کہ انہیں وہم ہو گیا ہے کہ کل کو ہمارے گھر آ کر تم بھی ہم بہن بھائیوں کو ایسے ہی تقسیم کر دو گی۔ ان کی خواہش ہے کہ بہو بے شک خوب صورت' پڑھی لکھی' سلیقہ مند نہ ہو لیکن خاندانی ہو۔"
"یہ سب تم کہہ رہے ہو۔" اس کا لہجہ اچانک درشت ہوا۔
"میں نہیں' یہ میری امی کے خیالات ہیں جو میں تمہارے گوش گزار کر رہا ہوں۔" وہ بھی خاصا خفا لگ رہا تھا۔
"اب ہمارا واسطہ ہی ایسے لوگوں سے۔۔۔"
"یہ کہانی تمہاری امی نے بھی سنائی تھی لیکن اپنے

لوگ بُرے نہیں ہو سکتے۔ بُرائی تم لوگوں کے اندر ہی ہے اور جانتی ہو امی نے تمہارے آس پڑوس سے بھی معلوم کروایا ہے۔ یار! تم لوگوں کی فیملی ریپوٹیشن بالکل اسپائل ہو کر رہ گئی ہے۔ لوگ پیچھے اتنا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"تمہاری امی کی تو۔۔۔" دل ہی دل میں بول کر دانت کچکچائے گئے۔

"عمیر! تم کیسے میری فیملی کے متعلق اس طرح سے بات کر سکتے ہو۔"

"تمہیں حقائق سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ میں امی کو منانے میں لگا ہوں تم بھی یہ سارے ایشوز سولو کرنے کی کوشش کرو۔" کہہ کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر سیل فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔

☆ ☆ ☆

اس نے عمیر کی ساری باتیں امی کو بتا دی تھیں۔

"امی سن رہی ہیں آپ! اس عورت کی گز بھر لمبی زبان ہے۔ کوئی ضرورت نہیں تمہیں وہاں شادی کرنے کی' ہماری طرف سے تو صاف جواب ہے۔"

ثانیہ کو تو اس خاتون کے خیالات سن کر گویا پتنگے ہی لگ گئے تھے۔

"اور نہیں تو کیا' مجھے تو بڑی خود پسند قسم کی خاتون لگ رہی تھیں۔" عزہ بھی ثانیہ کی ہم خیال تھی۔

"تم لوگوں سے کسی نے رائے نہیں مانگی۔ بہتر ہوگا کہ اپنے سسرال جانے کی تیاری کرو اور امی آپ عدنان سے کہیں کہ وہ حرم کو گھر لے کر آئے۔ حماد کے ساتھ میں جاؤں گی انعم کو لینے' بس طے ہو گیا۔"

"ایسے کیسے طے ہو گیا۔ تم سے کس نے کہا کہ ہم سسرال جا رہے ہیں' ابھی تک ہمایوں نے میرے مطالبے پر غور نہیں کیا اور عزہ کا حال تو تم جانتی ہی ہو' کن کنگلوں میں رشتہ جوڑ دیا ہے اور کوئی ضرورت نہیں حرم اور انعم کی طرف دار بننے کی' ہمارے بھائیوں کو رشتوں کی کمی نہیں ہے۔"

"تم دونوں میکے میں بیٹھی رہیں نا تو رشتوں کی کمی تمہارے میاؤں کو بھی نہیں ہو گی۔" تینوں آپس میں الجھ رہی تھیں۔ جھگڑ رہی تھیں۔

مگر عذرا بیگم تو آئمہ کے ایک جملے میں ہی الجھ گئی تھیں۔

"اس کی ماں کی خواہش ہے لڑکی خاندانی ہو۔" آج برسوں بعد جیسے کسی نے ان کے منہ پر طمانچہ دے مارا تھا تو کیا وہ خاندانی۔۔۔ اس سے زیادہ وہ سوچ ہی نہیں سکیں۔

"بہوؤں کو کیا چاہیے ہوتا ہے تھوڑی سی جگہ اور محبت کے دو جملے۔" ان کے کانوں میں اپنی ہی کہی کبھی کی بات گونجی۔

اچھی بہو گھر لانے کے چکر میں وہ اچھی ساس بننا بھول گئی تھیں۔

"کوئی کچھ بھی کہے میں شادی کروں گی تو عمیر سے۔" آئمہ ابھی تک بول رہی تھی۔

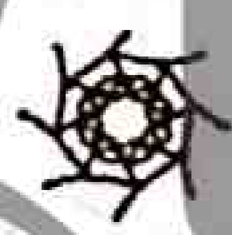
"تمہاری ساس کی کوئی فضول ڈیمانڈ ہم نہیں مانیں گے۔" ثانیہ بھی بضد تھی۔

"اور نہ ہی اس گھر سے جائیں گے۔" عزہ نے باور کروایا۔

"امی آپ کچھ کہتی کیوں نہیں۔" آئمہ نے مدد طلب نظروں سے ماں کو دیکھا تو وہ غائب دماغی سے تینوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

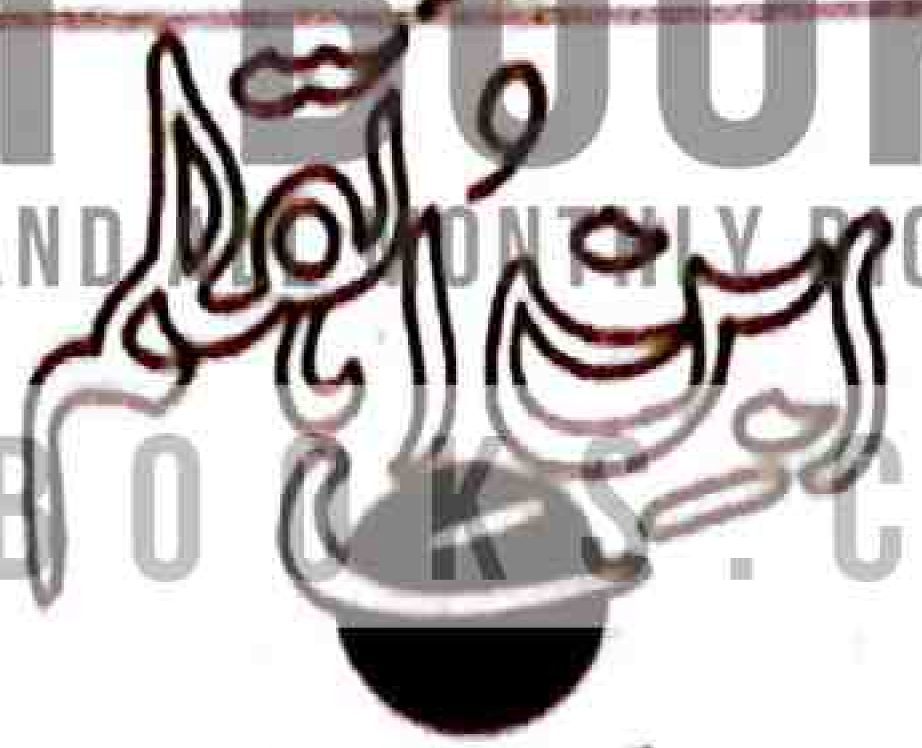
"ہاں تم دونوں گھر جانے کی تیاری کرو۔ عدنان سے میں کہتی ہوں وہ حرم کو گھر لے آئے اور انعم کو لینے میں خود جاؤں گی۔" وہ فیصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

آئمہ کے لبوں پہ اب مسکراہٹ تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ حرم اور انعم کی طرح اچھی بہو بننے کی پوری کوشش کرے گی کیونکہ عذرا بیگم نے اب کی بار اچھی ساس بننے کی تیاری شروع کر دی تھی۔



معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں ۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

سمیرا حمید



ابن عزیز کی آنکھوں میں بینائی اب اتنی ہی باقی بچی تھی کہ وہ قلم کو دوات میں بھگو کر، سر کو ورق پر پورا جھکا کر لکھ لیتے تھے۔ چراغ رحل کے عین سامنے رکھا ہوتا تھا۔ ابن عزیز جن کی بینائی بچپن سے ہی کم زور تھی، ان کے لیے تین چار گز سے آگے سب دھندلا ہونے لگتا، اور اس سے آگے اندھیرا بڑھنے لگتا۔ قرآن پاک کو آنکھوں کے عین سامنے رکھ کر پڑھتے۔ زندگی کے چالیس سال سفر کرتے ہوئے ایسے گزرے تھے کہ شام ڈھلتے ہی ہر صورت انہیں اپنا سفر روکنا پڑتا تھا۔ بے شک خلیفۂ وقت اور امیر شہر کی مہربانی سے وہ کسی نہ کسی خاص قافلے کے ساتھ ہوتے تھے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دونوں تنہا ہی اپنا سفر جاری رکھتے۔

ان کا چھوٹا سا گھر تھا، جس کے دروازوں سے جھک کر نکلنا پڑتا تھا، اور جس کے دو کمروں میں سے ایک کمرے کی کھڑکی، پچھواڑے کے تالاب کی طرف کھلتی تھی۔ اسی کھڑکی کے نیچے قالین پر ایک اور غالیچہ بچھائے، اونچی لکھنے کی رحل کے ساتھ چراغ رکھے ابن عزیز سورج کی پہلی کرن سے اس کی آخری کرن تک اپنی کتاب لکھا کرتے۔ زینب کلثوم سیاہی بناتی، دوات میں انڈیلتی، قلم تراشتی، چراغوں میں تیل ڈالتی اور نہیں تو ابن عزیز کے پاس بیٹھے لفظوں کی بناوٹ دیکھتی رہتی۔

زینب کلثوم ایک سادہ دل، معصوم صورت عورت تھی۔ زینب کلثوم دو بار ماں بنی اور دونوں ہی بچے یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ پھر وہ کبھی ماں نہیں بن سکی۔ وہ سفر میں ابن عزیز کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے نہیں ایک وفادار غلام کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں ابن عزیز کی آنکھوں کی رعایت بنی رہی تھیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ اس نے سفر کی صعوبتیں اس مقصد کے لیے جھیلی تھیں جس کے حصول کے لیے اس کا شوہر سفر کی صعوبتیں سہہ رہا تھا۔ اللہ کی رضا کے بعد اسے اپنے شوہر کی رضا مطلوب تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے ابن عزیز سے پہلے اپنی پیاس بجھائی ہو، یا ان سے پہلے نوالہ توڑا ہو۔

ابن عزیز غصے کے تھوڑے تیز تھے۔ زینب کلثوم کو ایک لمحے میں اجنبی بنا دیا کرتے تھے۔ زینب ابن عزیز کے غصے کو کسی بچے کے غصے سے زیادہ نہیں سمجھتی تھی۔ دونوں میں محبت بھی مثالی تھی۔

بابا عزیز آنکھ کھولتے ہی کہتے "زینب کلثوم! کہاں ہو... آواز دو۔"

زینب ہنس دیتی۔ "السلام علیکم یا ابن عزیز! صبح بخیر۔"

اسے اپنے شوہر کی محبت پر پیار آتا تھا۔ ابن عزیز اس کی آنکھوں کا نور، کہ اگر وہ انہیں نہ دیکھے تو اس کی بینائی جاتی رہے۔

"یا ابن عزیز... یہ ص کے حوض کی گہرائی ذرا اور گہری کریں۔" ابن عزیز کے ساتھ بیٹھے، ایک ایک لفظ کو دیکھتے کبھی کبھی زینب کہہ دیتی۔

"ان لفظوں کی بناوٹ کو نہ دیکھو زینب کلثوم، ان کی تزئین کوئی بھی خطاط کر دے گا، لیکن جو میں لکھ رہا ہوں وہ کوئی نہیں لکھ سکتا۔"

زینب نے اپنی زندگی میں کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی جبکہ ابن عزیز نے ساری زندگی کتابیں ہی اکٹھی کی تھیں۔ ان کے گھر میں کوئی خاص مال و اسباب نہیں تھا۔ بس ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ابن عزیز جہاں جہاں گئے، وہاں سے کتابیں ہی اکٹھی کر کے لائے تھے۔ ابن عزیز کی قسمت اچھی تھی کہ ان کی بینائی کے بارے میں جان کر سب انہیں عزت دیتے تھے۔ ان کے لیے وظیفے مقرر تھے۔ وہ جس خطے، جس

شہر میں جاتے' امیر شہر ان کے سفر اور ان کے رہنے کا بندوبست کردیتے تھے۔ ہر ملک و شہر کے لوگ ان کی خاص خدمت کرتے تھے۔ ایک نابینا اپنی بیوی کے سہارے علم و دانش کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ بات خلقت کے لیے بڑی باعث عقیدت تھی۔ اکثر لوگوں نے شہر کی فصیلوں کے باہر ان کا استقبال کیا۔

زینب یہ سب دیکھتی تو آبدیدہ ہوجاتی۔

"یا ابن عزیز! علم و دانش کی تلاش کیسا بڑا رتبہ ہے۔ آپ اللہ کی تلاش میں نکلے ہیں اور لوگ آپ کے احترام میں۔ جو اللہ سے محبت کرتا ہے پھر اللہ اسے کیا کچھ عطا کرتا ہے۔"

ابن عزیز خوشی سے مسکرادیتے۔

"دمشق میں محترم بزرگ نے مجھے کیا نصیحت کی تھی' کچھ یاد ہے زینب؟" ابن عزیز نے کچھ یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

"انہوں نے کہا تھا کہ اگر آزمائش مال واسباب کی آجائے تو شکر ادا کرنا' جان عزیز پر آئے تو شکر گزار ہونا۔"

"جان عزیز پر آزمائش آئے گی تو شکر گزار کیسے ہوں گا زینب۔ اگر تیری جان پر کوئی آزمائش آئے گی تو میں شکر ادا کروں گا۔"

زینب کلثوم کی باتیں انہیں جھنجلا دیتی تھیں۔ سر جھٹک کر ابن عزیز کتاب لکھنے لگے۔ ان کے کپکپاتے ہاتھ ان کے بڑھاپے کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ ستّر سال کے ہونے والے تھے۔ ایک جوان جہاں عورت کو لیے سفر کرنے پر انہیں شروع میں بہت لعن طعن کا سامنا کرنا پڑا لیکن پھر خصوصاً" زینب کلثوم کی معصومیت نے ان دونوں کو حاجیوں کی سی صورت دلادی۔ گو ابن عزیز بھی ایک عام آدمی رہے تھے لیکن اتنا سفر کرچکنے کے بعد ان کی حکمت میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ داناؤں جیسی باتیں کرنے لگے۔ وہ جہاں جاتے' کسی درویش کی طرح ان کی دھاک بیٹھ جاتی۔ گو وہ اپنی زبان سے یہ کہتے رہتے تھے کہ وہ عام انسان ہیں لیکن جو واقعی میں عام انسان تھے وہ انہیں



"خاص" ہی سمجھتے۔

کبھی کبھی ابن عزیز سوچتے کہ ان کی وجہ سے کچھ عزّت زینب کو بھی میسّر ہے کہ زینب جیسی عورت اگر کسی اور کی بیوی ہوتی تو اسے حاصل ہی کیا ہوتا۔ ایک گھر اور چار دیواری۔ کم سے کم ان کی معیت میں اس نے ساری دنیا گھوم دیکھ لی۔ کیسے کیسے داناؤں سے ملی۔ کیسی کیسی حکمت کی باتیں سنیں' مقدس جگہیں دیکھیں' طرح طرح کی نعمتیں' میوے' چکھے جن سے انہیں ایسی قوت ملتی رہی کہ وہ دونوں تند و تیز طوفانوں

میں بھی سفر جاری رکھنے کے قابل رہے۔ کیا ایسی عام عورت کے بس میں یہ تھا کہ وہ گھر سے باہر قدم بھی نکال سکتی۔

ایسی عورت تو اس وقت بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑی بس موت کا ہی انتظار کر رہی ہوتی۔

جب بھی زینب کلثوم غور و فکر کرتی تو بس اللہ کا شکر ادا کرتی کہ جس نے اسے ابن عزیز جیسا شوہر دیا تھا۔ جس نے اپنی ساری عمر علم کی کھوج میں لگادی۔ جس نے اللہ کے بنائے جہاں اور انسانوں سے ملنے کو عبادت جانا۔ زینب کلثوم جب دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھتی تھی تو کتنی بار شکر کرتی تھی کہ اللہ نے اس کے نصیب میں ایک ایسا شوہر لکھا جس نے بڑھاپے تک اللہ کی راہ میں سفر اختیار کیا۔ انہوں نے کوئی عالم، خطیب، معلم، طالب، فقیر، درویش، مجذوب نہیں چھوڑا تھا جسے روک کر اس کی تعظیم کے بعد اس سے علم و دانش کے لیے سوال نہ کیا ہو۔

ابن عزیز کو ان کے سب سوالوں کے جواب ملے تھے جنہیں اب وہ قلمبند کر رہے تھے۔ وہ گھر میں قید تھے، تقریباً" اندھے تھے۔ چراغ کی روشنی میں بمشکل سیاہی، قلم اور لفظ پر نظر ٹکپاتے تھے اور اسی سبب سے ان کی شہرت چہار عالم میں تھی۔ ان کی کتاب کا انتظار بہت بے صبری سے کیا جا رہا تھا۔ ان کی خاموشی کو حکمت، گوشہ نشینی کو درویشی اور اندھے پن کو آزمائش سے منسوب کیا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس رات جیسے ہی چراغ گل ہوئے اور ابن عزیز سوئے، تہجد کے وقت اٹھنے والی زینب کلثوم تہجد سے پہلے ہی اٹھ بیٹھی۔ اسے لگا کہ کسی نے اسے اٹھا دیا ہے۔ وہ جلدی سے ابن عزیز کی طرف لپکی لیکن وہ تو کسی معصوم بچے کی طرح گھٹنوں کو ٹھوڑی سے جوڑے گہری نیند سو رہے تھے۔ زینب ان کے سونے کے انداز پر مسکرادی۔ لیکن اس کا دل بے چین تھا، کوئی ان ہونی ہوئی تھی۔

چراغ ہاتھ میں لیے لیے وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ یہاں گھر کا کچھ سامان رکھا تھا۔ ایک بڑا صندوق تھا جس میں کچھ کام کی چیزیں، کپڑے، قلم، دوات، تحائف اور ظروف رکھے تھے۔ صندوق کے عین اوپر طاق پر ابن عزیز کی کتاب کے نسخے لکڑی کے چھوٹے سے صندوق میں بند رکھے ہوتے تھے۔ ابن عزیز اپنی آدھی کتاب لکھ چکے تھے اس صندوق میں وہ آدھی کتاب ہی رکھی تھی۔

جیسے ہی چراغ کو زینب کلثوم نے طاق کی طرف کیا اس کا دل پھڑک کر رہ گیا۔ صندوق وہاں موجود نہیں تھا۔ چراغ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے نیچے والے صندوق کا ڈھکن اٹھایا، وہ بھی خالی تھا۔ زینب زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ ان کے گھر میں کوئی ایک بھی چیز ایسی نہیں تھی جو ان کے لیے قیمتی ہوتی۔ قیمتی تھا تو وہ صندوق جس میں ابن عزیز کی کتاب کے نسخے رکھے تھے۔ یہ صندوق زینب نے ہی بنوایا تھا تاکہ ان کی کتاب محفوظ رہے۔ عزیز دن بھر جتنا لکھ لیتے، زینب اسے اٹھا کر اس صندوق میں رکھ دیتی۔

زینب کا دل چاہا، وہ واویلا کرے، شور مچائے۔ وہ ابن عزیز کے پاس آئی کہ انہیں جگائے لیکن اسے خیال آیا کہ عزیز کے دل کو رنج پہنچے گا۔ وہ یکدم کتنا دکھی ہو جائیں گے۔

تہجد پڑھنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک دعا میں گڑگڑاتی رہی کہ اللہ کوئی معجزہ کردے اور صندوق واپس طاق پر آجائے۔ اس کی بینائی جاتی رہے لیکن ابن عزیز کا مسودہ واپس آجائے۔ تہجد پڑھ کر جب وہ اندر کمرے میں گئی تو طاق خالی تھا۔ روتے روتے اس نے فجر پڑھی، پھر سے معجزے کی دعا کی لیکن صندوق واپس طاق پر نہیں آیا۔ فجر پڑھ کر ابن عزیز جب کتاب لکھنے لگے تو وہ عزیز کے پاس بیٹھ نہیں سکی۔ عزیز نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"محبت میں صبر شرط ہے زینب۔ اتنی محبت بھی نہیں کرتیں تم اللہ سے کہ اس کتاب کے لیے کچھ مشقت کر سکو۔ مجھے دیکھو میں نے چالیس سال اللہ کی

محبت میں سفر کیا ہے۔ اتنی جلدی تمہارا دل اس کتاب سے بھر گیا؟"

زینب نے اپنی آبدیدہ آنکھوں کو ابن عزیز سے چھپانا چاہا۔ "میں بازار جا کر کچھ سودا سلف لانا چاہتی ہوں۔"

ابن عزیز کو غصہ آیا۔ "جاؤ' جو چاہے کرو۔ علم و دانش کی باتوں سے تمہیں کیا سروکار زینب۔ رائی برابر غور و فکر بھی تمہارے لیے پہاڑ ہے۔"

وہ ابن عزیز کے ایک دوست کے ہاں گئی تاکہ انہیں یہ مشکل بتا سکے۔ لیکن وہ شہر سے باہر تھے۔ اس نے بازار سے ضروری سامان لیا اور نڈھال سی بازار کے ایک تنہا گوشے میں بیٹھ گئی۔ ابی داؤد کا گزر وہاں سے ہوا تو وہ زینب کلثوم کو ایسے بیٹھے دیکھ کر رک گئے۔ ابی داؤد پورے شہر میں وہ واحد انسان تھے جنہیں ابن عزیز اور اس کی کتاب سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ لوگوں سے کم ہی واسطہ رکھتے تھے۔ زینب اتنی پریشان تھی کہ ابی داؤد سے ہی سب بیان کرنے لگی۔

"اگر میں امیر شہر کے پاس جاؤں گی تو وہ ابن عزیز کو اپنے پاس بلا کر نسخے کی چوری کی تصدیق چاہیں گے۔ ابن عزیز صابر ہیں لیکن مجھے ان کی تکلیف گوارا نہیں۔"

"مجھ سے کیا چاہتی ہو زینب کلثوم!" ابی داؤد نے سختی سے کہا۔ یہ سختی ہی ان کا خاصہ تھی' اس لیے لوگ ان سے دور بھاگتے تھے۔

زینب کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ بہت ہی زیادہ دکھی نظر آنے لگی۔ "ابن عزیز کے دل کو لگنے والی چوٹ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے تو کتاب چاہیے ابی داؤد! لوگ کہتے ہیں' آپ اس سے کہیں زیادہ جانتے ہیں جتنا آپ ظاہر کرتے ہیں۔"

ابی داؤد غصے میں نظر آنے لگے۔ "چور نے تمہارا کچھ نہیں چرایا زینب کلثوم! نقل کو اصل کے لیے اٹھا لیا گیا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں ابی داؤد۔"

"جو کتاب چور لے گیا ہے وہ تم خود لکھ لو۔" ابی داؤد نے تحمل سے کہا۔

"میں؟ میں کیسے لکھ سکتی ہوں جناب ابی داؤد۔"

"تم نے بھی تو ابن عزیز کے ساتھ سفر کیا ہے۔"

"پر میں عقلمند و دانا تو نہیں۔۔۔ میں کتاب کیسے لکھ سکتی ہوں؟"

"پھر جا کر ابن عزیز کو سب بتا دو یا قلم کو سیاہی میں ڈبو دو۔"

زینب نم آنکھیں لیے گھر لوٹ آئی۔ ابن عزیز کا چراغ بجھ چکا تھا اور وہ غصے میں تھے۔

"کہاں تھیں تم زینب؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا شوہر کتنا اہم کام کر رہا ہے۔ امیر شہر نے ساری دنیا میں اس کتاب کا ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے۔ سب اس کتاب کے انتظار میں ہیں۔ تم اپنے شوہر کی تھوڑی سی مدد نہیں کر سکتیں۔ چراغ کو روشن کرنے' قلم کو تراشنے سے زیادہ آسان کام اس روئے زمین پر اور کیا ہو گا۔ مجھے دیکھو' میں اپنی بچی کھچی بینائی کو بے نور کر رہا ہوں' اس کتاب کو اپنا نور دے رہا ہوں۔ دوات میں سیاہی ختم ہو گئی تھی' میں سیاہی لینے اٹھا تو دوات ہی کہیں رکھ کر بھول گیا۔ اس وقت سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہوں۔"

زینب خاموشی سے سنتی رہی اور ابن عزیز کے لیے کھانا بنا کر لے آئی۔

رات ہو چکی تھی۔ ابن عزیز غصے سے بستر پر لیٹ گئے اور جلد ہی سو گئے۔ زینب اٹھی اور ابن عزیز کے آج کے لکھے کلام کو دیکھنے لگی۔ وہ اسے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ وہ کتاب کیسے لکھ سکتی تھی؟ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ اس نے ابن عزیز کو دیکھا۔ وہ دنیا کا معصوم ترین انسان تھا۔ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ اس جان عزیز کو نیند سے جگا کر کیسے یہ بتاتی کہ تمہاری متاع چوری ہو چکی ہے۔

اس نے اٹھ کر وضو کیا اور پھر اس وقت تک نفل پڑھتی رہی جب تک اس میں سکت رہی۔ آخری سجدے کے بعد اس نے اللہ سے دعا کی کہ وہ اس کی مدد

کرے۔ چور‘ جو کل اس گھر میں آیا تھا۔ آج پھر واپس آجائے بھلا کتاب اس چور کے کس کام کی‘ وہ آئے اور خاموشی سے کتاب رکھ جائے۔ دعا مانگنے کے بعد وہ سو گئی تاکہ چور کو گھر میں داخل ہونے میں آسانی رہے۔

تہجد کے وقت وہ اٹھی کہ چور صندوق واپس چھوڑ گیا ہوگا۔ وہ اسی یقین کے ساتھ چراغ لے کر کمرے میں گئی اور طاق کی طرف رخ کیا۔ طاق خالی تھا۔ صندوق کی جگہ ”سیاہی کی دوات“ رکھی تھی۔ ابن عزیز یہیں طاق پر دوات رکھ کر بھول گئے تھے۔ اپنے ہاتھ میں دوات لے کر زینب کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔

”تو صندوق کی جگہ یہ سیاہی آئی ہے۔“ زینب نے زیر لب کہا۔ تین دن اور راتیں وہ چور کا انتظار کرتی رہی اور پھر چوتھے دن زینب نے دوات اور قلم کو اپنے سامنے رکھ لیا۔ اس نے ایک لمبی دعا کی کہ اگر اللہ اسی پر راضی ہے تو وہ بھی اس پر راضی ہے۔ دعا مانگنے کے بعد وہ سو گئی۔ نیند میں رات ایسے گزری جیسے وہ اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوئی ہو۔ اگلی رات اس نے اپنے ”پہلے سفر“ سے کتاب کو لکھنا شروع کر دیا۔

اب ابن عزیز دن میں کتاب لکھتے اور زینب کلثوم رات کو۔ جس دن ابن عزیز نے اپنی کتاب مکمل کی اسی رات زینب کلثوم نے بھی کتاب مکمل کرلی۔ ابن عزیز نے وہ صندوق منگوایا‘ جس میں زینب کتاب رکھتی رہی تھی اور پھر اس صندوق میں کتاب کے کل اوراق گن کر انہیں رکھ دیا۔ زینب کو یقین تھا کہ ابن عزیز اس کتاب پر نظر ثانی کریں گے لیکن ابن عزیز نے کتاب پر نظر ثانی نہیں کی۔ شاید انہیں اپنے لکھے پر اتنا یقین تھا کہ انہوں نے نظر ثانی کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ زینب نے سوچ لیا تھا کہ وہ کوئی مناسب وقت دیکھ کر ابن عزیز کو ساری بات سچ سچ بتا دے گی۔

کتاب امیر شہر کو بھجوا دی گئی۔

زینب نے اس کتاب کو اس ذات کے سہارے لکھا جو الہام کی صورت‘ خیال کی صورت‘ خواب کی صورت‘ اپنے بندے کو پیغامات بھیجتا ہے۔ پہلے لفظ سے آخری لفظ تک زینب نے خود کو تو حقیر ہی سمجھا لیکن وہ ان الہاموں پر فدا ہو گئی جو اس کے دل پر نازل ہوتے رہے۔ اس نے جانا کہ ایک وہ سفر تھا جو اس نے چالیس سال کیا اور ایک یہ سفر ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ جو رہ گیا تھا وہ اب اس پر آشکار کیا جا رہا ہے۔ جو پہلے مبہم تھا‘ وہ اب صاف صاف ظاہر ہو رہا ہے۔

رات کی تاریکی‘ گوشہ نشینی‘ قلم اور الہام‘ زینب نے خود کو اللہ کے روبرو پایا۔



ابن عزیز کا زیادہ تر وقت تسبیح پڑھنے اور اپنے سفر کی باتیں کرتے گزرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بے چین ہو جاتے کہ کتاب کی جلد بندی میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ کتاب پر دانشوروں اور علماء کی جو جماعت نظر ثانی کر رہی ہے‘ وہ کتاب میں زیادہ کانٹ چھانٹ تو نہیں کر رہی؟ خطاط قلم کو سیاہی میں ڈبونے سے پہلے وضو تو کر لیتے ہوں گے۔ ایک دن ابن عزیز کچھ جذباتی ہو گئے اور زینب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگے۔

”موت کا کوئی وقت مقرر نہیں زینب‘ اب تو میں ویسے بھی بوڑھا ہو چکا ہوں‘ اگر تمہیں مجھ سے کوئی شکوہ شکایت ہے تو کہو تاکہ میں معافی مانگ سکوں۔“

زینب بس مسکرا دی۔

”میں نے تمہارے ساتھ کبھی خیانت نہیں کی اور تم نے بھی میری عزت کی حفاظت کی۔ میں خوش ہوں کہ تم نے میرے اندھے پن کو دھوکا نہیں دیا۔“

زینب اب مسکرا نہیں سکی۔ وہ یک ٹک عزیز کی شکل دیکھ رہی تھی۔

ابن عزیز کی ایسی معصومانہ باتوں پر اس کا دل بھر آیا۔ خیانت وہ کر چکی تھی۔ زینب سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ رونے لگی۔ ابن عزیز نے چونک کر زینب کو دیکھا۔ اس کے رونے نے انہیں سہما دیا۔ بات خیانت کی ہو رہی تھی اس لیے یکدم ان کا دل شکوک سے بھر گیا۔

"زینب کلثوم ــ اے عورت ــ کیا تُو نے ــ؟"

ابن عزیز کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ زینب نے ابن عزیز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"مجھے عہد دیں ابن عزیز کہ میری بات سن کر آپ رنجیدہ نہیں ہوں گے۔ آپ کی تکلیف کے خیال نے مجھے اس بات کو راز میں رکھنے پر مجبور رکھا۔"

ابن عزیز کا شک یقین میں بدلنے لگا کہ ضرور زینب نے خیانت کی ہے۔ غصے سے وہ کانپنے لگے لیکن زینب پر ظاہر نہیں کیا۔

"میں تمہیں عہد دیتا ہوں ــ" جبکہ ابن عزیز دل میں یہ عہد کر چکے تھے کہ وہ ایسی رذیل عورت کو گھر سے نکال دیں گے۔ چالیس سال یہ عورت ان کے ساتھ سفر میں رہی تھی۔ ہاں ایسی ہی عورت تو رذیل ہو سکتی ہے۔

زینب نے ابن عزیز کے عہد کو سن کر کتاب کی ساری بات سنا دی۔ وہ دم بخود زینب کی شکل دیکھ رہے تھے۔ زینب پر ابن عزیز کی خاموشی گراں گزر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ابن عزیز کچھ تو کہیں ــ

"آپ نے مجھے معاف کر دیا ابن عزیز؟"

ابن عزیز نے دانت پیسے۔ "اس سے اچھا ہوتا کہ تُو حرافہ نکل آتی۔ جاہل عورت! تُو نے میری کتاب لکھ دی۔ میری زندگی بھر کی کمائی کو تُو نے یوں برباد کر دیا۔"

زینب ابن عزیز جیسے درویش صفت انسان کے منہ ایسے الفاظ اور لب و لہجہ سن کر سکتے میں آ گئی۔

"جو اپنے دل میں اللہ کی محبت کی گرہ باندھ لیتا ہے' اس کی زبان پر لغو باتوں کی گرہ نہیں لگتی ابن عزیز ــ میں نے تو صرف آپ کے لیے ــ"

"اے کم نصیب! میرے لیے یا خود اپنے لیے؟ تُو چاہتی تھی کہ مجھ جیسے درویش کی ایسی نادر و نایاب کتاب' جو صدیوں زندہ رہے گی' جسے ہر آنکھ پڑھے گی' ہر زبان بیان کرے گی' میں تو بھی زندہ رہے۔ تو سمجھتی تھی کہ میں نے تجھے اپنا ہم سفر بنایا ہے تو تجھے اپنا ہم قلم بھی بناؤں گا۔ اگر میری آنکھیں بے نور نہ ہوتیں تو میں تجھ جیسی جاہل عورت کو اپنے ساتھ سفر پر نہ رکھتا۔ تُو نے کیا سوچ کر اس عظیم قلمی شاہکار میں اپنی جاہلیت دکھائی؟ علم و دانش' حکمت و دانائی کو تُو نے کیونکر برباد کر دیا؟"

زینب سسکنے لگی۔ "مجھے معاف کر دیں ابن عزیز۔"

"میرا نسخہ کہاں ہے؟ جھوٹ مت بول' کوئی چور نہیں آیا اس گھر میں' کچھ چوری نہیں ہوا۔"

"چور آیا تھا ابن عزیز ــ وہ مال اسباب اور صندوق لے گیا۔"

"تُو نے میرا نسخہ جلا دیا ہے۔ تیرے حسد نے تجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ بتا تو نے اپنی کتاب کیسے لکھی؟ کیا لکھا ہے تو نے۔ اتنے مہینے ہونے والے ہیں کتاب جلد بند ہو کر نہیں آئی۔ امیر شہر' خلیفہ وقت نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ وہ سب تو مل کر میری کتاب پر ہنس رہے ہوں گے۔ پھر انہوں نے آگ جلائی ہو گی اور اس میں وہ نسخہ جھونک دیا ہو گا۔ جاہل عورت! تو نے میرے موتیوں کے ساتھ اپنے سنگ بھیجے۔ کیا لکھا تو نے بول' اب سارے عالم میں میری جگ ہنسائی ہو گی۔ میری عزت کو خاک کرتے شرم نہیں آئی۔"

"میں نے اس میں وہی سب لکھا جو ہمیں سفر میں در پیش رہا۔ مصر کی طرف جاتے ہمیں جو محترم بزرگوار ملے تھے' انہوں نے کہا تھا۔ "حرام ام الخبائث ہے اور جاہلیت ام المصائب۔" میں نے اس میں لکھا کہ کوفہ کے بازار میں ایک ایسا شخص تھا جو شکلیں بدلتا تھا' وہ جس انسان کے سامنے جاتا اس کے اعمال کی شکل اختیار کر لیتا۔ اللہ اس مجذوب سے سخت ناراض ہوا۔ پھر وہ شخص بازار میں یہ اعلان کرتا پھرتا تھا۔ "پہچان لو اپنے رب کو' جو تمہارے عیبوں کو بے نقاب کرنے کے گناہ پر مجھ سے ناراض ہوا ہے۔ اور تم اسی عظیم رب کی حکم عدولی میں مبتلا ہو۔"

میں نے ایران کے اس شہر کی بابت لکھا جہاں ایک دانا بیٹھتا تھا' وہ پتھروں کے بدلے میں دانائی دیتا تھا۔ میں نے اس درخت کا ذکر کیا جو شہر والوں کی بے حسی دیکھ کر

راکھ ہو گیا تھا اور اس پہاڑ کا جس کی کھوہ میں چھپ کر ایک گناہ گار راتوں کو جاکر توبہ کرتا تھا۔ جب زمین والوں نے اس گناہ گار کو قبر کی جگہ دینے سے انکار کر دیا اور اس کی لاش کو گلنے سڑنے کے لیے ویرانے میں پھینک دیا تو پہاڑ نے اپنے پتھر لڑھکا دیے اور اس کی لاش کو قبر کی طرح ڈھانپ دیا۔ سیلاب نے زمین والوں کو، قبروں کو، گھروں کو، بستی کو برباد کر دیا اور پہاڑ کے دامن میں بس وہ ایک قبر ہی باقی رہ گئی۔

ہمارا کام اللہ کے ہر حکم کی اطاعت کرنا ہے نہ کہ حاکم بن کر حکم صادر کرنا۔

میں نے اس شفا کے بارے میں لکھا ہے، جو ہر دعا میں ہے، اس ___ شکر کے بارے میں، جو ہر نعمت کی پہچان میں ہے، اس سجدے کے بارے میں، جو روح کے قیام میں ہے۔

میں نے قبر کے اس کتبے کے بارے میں لکھا جس پر درج تھا۔ "ہدایت تمہارا خزانہ ہے، اور بندگی اس کی محافظ۔" میں نے موت کی حقیقت کو پرکھا اور یہ جانا کہ موت تو بس نقاب کشا ہے، وہ زندگی کا نقاب اتار کر ہمیں حقیقی روپ میں اللہ کے روبرو کھڑا کر دے گی۔ میں نے غور کیا ابن عزیز! اور یہ جانا کہ انسان اگر انکساری نہیں رکھتا تو وہ اپنی روح میں اندھیرا شگاف رکھتا ہے، یہ اندھیرا اس کی ساری روشنی پر غالب آجائے گا۔

میں نے تو سب وہی لکھا، ابن عزیز جو آپ نے لکھا ہوگا۔"

"تو کیا جانے یہ شریعت اور دانش کی باتیں۔ کہاں کی علم یافتہ ہے تو زینب؟ تجھے کیا پتا دانائی کسے کہتے ہیں؟"

"کیا بابا ادریس نے کہا نہیں تھا کہ دانائی صرف انکساری ہے، معصومیت ہے، شفافیت ہے۔ جس کی انا زندہ ہے وہ معلم نہیں۔ جس کا غرور سربلند ہے وہ طالب نہیں۔ جو اپنی بڑائی میں مبتلا رہتا ہے وہ بارگاہ الٰہی میں مطلوب نہیں رہتا۔"

عزیز دنگ زینب کی شکل دیکھ رہے تھے "جو تو نے دیکھا اور سنا اس سے تو دانا ہو گئی؟ دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔ چالیس سال میں نے حکمت کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھائیں، حتیٰ کہ میری کمر خمیدہ ہو گئی۔ چالیس سال۔۔۔ اور تو اپنی چند راتوں کو میرے چالیس سالوں کے برابر لا رہی ہے۔"

"سفر تو اسی سال کا بھی بے کار ہے ابن عزیز! اگر قلم اور سیاہی کے لیے کیا۔"

"تو مجھے ایسی باتوں سے بہلا نہیں سکتی زینب۔ میں تجھے بددعا دیتا ہوں۔ تو نے میرے چالیس سال برباد کیے ہیں۔ تو نے بڑی خیانت کی۔"

زینب نے بے یقینی سے ابن عزیز کو دیکھا۔

"چالیس سال برباد کیسے ہو سکتے ہیں، وہ تو اللہ کے پاس کئی درجوں میں محفوظ ہیں، ایک ایک لمحہ، ایک ایک عمل۔"

ابن عزیز نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ "میرے لفظ میرے اعمال کا ثبوت تھے کہ میں نے اللہ کے لیے سفر اختیار کیا۔"

"اللہ کو تو ثبوت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ابن عزیز۔۔۔"

"اللہ کے بندوں کو ہوتی ہے زینب۔۔۔"

زینب کلثوم سکتے میں آ گئی۔ "تم اس کتاب کے ذریعے اپنی بزرگی ثابت کرنا چاہتے ہو؟ جب دل روشن ہو گیا تو باقی چیزوں کی روشنی سے کیا تعلق رہا۔ جب نور سینے میں سمٹ آیا تو آنکھوں کی بے نوری کا رونا کیونکر رہا۔ ابن عزیز! کیا اس کتاب کی صورت تمہیں زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ لیکن کیا تم جانتے نہیں کہ انسان چاہ کر بھی زندہ نہیں رہ سکتا جیسے وہ خود سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو صرف اللہ کے چاہنے سے ہوتا ہے۔ تم اللہ کی چاہت سے پہلے اپنی چاہت کیوں چاہنے لگے۔

کیا تم بغداد کی مسجد کے امام کا خطبہ بھول گئے کہ "دنیا کی کوئی چیز اتنی شفاف نہیں جتنا شفاف وہ دل ہے جس پر اللہ کی محبت قابض ہے۔"

ابن عزیز! ایسے شفاف دل میں، دنیا اور ہمیشگی کی چاہ


اگر چاہیئے نُور تو لگایئے نُور!
نُور
ہربل
بیوٹی کریم
بیوٹی سوپ
Avocado and Aloe Vera
Noor
HERBAL BEAUTY CREAM
7 Day Chalange
Noor
HERBAL
FACE
WASH
Noor
ایواکاڈو اور
ایلوویرا
کے ساتھ
فلمسٹار نور
A PRODUCT OF
BLACK ROSE
White Rose
COSMETICS

کیسے آگئی؟ اللہ کی محبت قابض ہو گئی تو اپنے نام کی سربلندی کی خواہش نے کیسے جگہ بنالی۔ میں نے اس کتاب پر تمہاری عزت کے لیے کام کیا، تم نے اپنے رتبے کے لیے اللہ کی محبت کو استعمال کیوں کیا؟

جب نقل ڈھل جاتی ہے تو اصل نکل آتا ہے۔ سمجھو کہ کتاب بہروپ تھی، اب اصل یہ ہے کہ کتاب کا نہ ہونا۔" ابن عزیز کیا بھول گئے حکمت کی وہ بات کہ آزمائش تو بس ایک دروازہ ہے، جس کے اس پار ہمارے ظرف کا آئینہ ہے۔ اللہ تو بس ظرف ہی دیکھ رہا ہوتا ہے اور پھر وہ اس آئینے کو ہمارے سامنے کر دے گا۔ کہ دیکھو یہ ہو تم آؤ ابن عزیز! مل کر اللہ سے معافی مانگیں، اسے یہ بتائیں کہ ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں۔ ہماری چاہ اس کی بندگی ہے۔ ہماری طلب صرف اس کی محبت ہے۔ ہمارا ظرف تو ہمیشہ کمتر رہے گا، لیکن اس کا رحم بلند تر رہے گا۔ آؤ مل کر اللہ سے معافی مانگیں۔"

"تو نے خوب باتیں کرنی سیکھ لی ہیں زینب۔ عجب بات ہے کہ میں تجھے پہچان نہیں سکا۔ تو میرے علم و دانش کدے پر نقب لگاتی رہی۔"

ابن عزیز کے ایسے ہتک آمیز انداز نے زینب کے دل کو مسل کر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو سمٹ آئے البتہ اس کے سینے کی فراخی بڑھنے لگی۔ زینب نے محسوس کیا کہ جیسے اس کی آنکھوں کی بینائی بڑھتی جارہی ہے۔ جو چھپا ہوا تھا اس پر سب عیاں ہوتا جارہا ہے۔

اس نے دیکھا کہ چٹیل میدانوں، لق و دق صحراؤں میں، وہ اکیلی سفر کر رہی ہے۔ مسجدوں کے حجروں کے باہر پردے میں بیٹھی وہ برگزیدہ کلام سن رہی ہے۔ کلام پاک اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ تفسیر پر انگلی رکھ رہی ہے۔ اسے اپنے آس پاس ابن عزیز کہیں نظر نہیں آئے۔ بس اسی وقت اس نے جانا کہ وہ جتنے ساتھ ساتھ تھے اتنے ہی الگ اور تنہا تھے۔

✡ ✡ ✡

اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ زینب کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں پردے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ مولانا التمش صلاح جن کی سرپرستی میں کتاب دی گئی تھی، چند دوسرے مفکرین و دانشوروں کے جلو میں کمرے میں آئے اور ابن عزیز کے سامنے قالین پر دو زانو بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ باقی کی جماعت بھی دائرہ بنا کر بیٹھ گئی۔

"محترم صادق ابن عزیز کتاب کی جلد بندی میں یقیناً" بہت وقت لگا۔ تزئین و آرائش کے بہت سے خاکے تو صرف مشق کے لیے بنوائے گئے تھے تاکہ بہترین خاکے کو جو کتاب کے قلب سے ہم پلّہ ہو منتخب کر لیا جائے۔"

ابن عزیز لب بھینچے، سر جھکائے سن رہے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ کیسے یہ لوگ بصورت جماعت ان کا مذاق اڑانے آئے ہیں۔ مولانا التمش صلاح نے رحل پر ابن عزیز کے سامنے ان کی کتاب کا نسخہ احترام سے رکھ دیا۔ کتاب کی جلد بندی نے ابن عزیز کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔

"یہ میری کتاب ہے؟" ابن عزیز کی آواز خدشات سے کپکپا رہی تھی۔ وہ ان سب کے متوقع قہقہوں سے خوف زدہ تھے۔

مولانا نے ایک نسخہ جس کی جلد بندی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی آگے کیا۔ شرمندگی سے ابن عزیز کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔

"ہاں! یہ ایک جاہل کا کارنامہ ہے۔ اچھا کیا جو اسے الگ کر دیا۔ اس جاہل کو یہ لگا کہ یہ اتنا ہی آسان ہے کہ قلم دوات لے کر کچھ بھی لکھ دیا جائے اور آپ جیسے عالم فاضل اسے قبول بھی کر لیں۔" جو بات مولانا ڈرتے ڈرتے کرنے ہی والے تھے اسے ابن عزیز کے منہ سے سن کر ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔

"واقعی یہ تو کسی جاہل اور بھٹکے ہوئے کا کام ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی دیوانہ اوٹ پٹانگ باتیں لکھتا رہا ہے۔ ہم آپ سے بات کرنے کے لیے آنا چاہتے تھے پھر یہی مناسب لگا کہ آپ کو کم سے کم زحمت دی جائے

اور کتاب کے ساتھ جو مناسب ہے وہ کیا جائے۔ باہمی مشاورت سے ہم نے یہ بے کار اوراق کتاب سے الگ کر دیے ہیں۔ یہ کتاب آج شام ہی دنیا بھر کے کتب خانوں میں بھیج دی جائے گی۔ اس کتاب پر آپ کے نام کی تصدیق چاہیے۔ آپ اس پر مصدق ابن عزیز لکھوانا چاہتے ہیں یا جیسا کہ آپ نے اس کتاب کے اندر لکھا ہے کہ "انسان کا نام اس کی آخری عمر میں طے ہونا چاہیے جب وہ اپنے عمر بھر کے اعمال کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح دیکھ سکے۔ تو آپ نے اپنا کوئی نام طے کیا ہے؟"

ابن عزیز اس بات پر ٹھٹکے۔ رحل کے کنارے رکھے چراغ کی روشنی میں وہ خوب صورت جلد کی کتاب پر پورے کے پورے جھک گئے۔ انہوں نے کتاب کو کھول کر دیکھا۔ پہلا ورق ان کے سامنے تھا۔

"جو اللہ کی کھوج کا ارادہ باندھتا ہے وہ تو پہلے ہی اللہ کو پا چکا ہوتا ہے۔"

ابن عزیز کی سانس ان کے حلق میں آکر اٹک گئی، ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ چند اوراق الٹے.....

"جو اللہ کی محبت پالیتا ہے، وہ اپنی ذات کو مٹا ڈالنا چاہتا ہے۔ لیکن جو پھر بھی اپنی ذات کو بلند رکھنا چاہے وہ اللہ کی چاہت کھو دیتا ہے۔"

ابن عزیز کو لگا کہ وہ کتنے اندھے ہیں، آج ان پر ظاہر ہو رہا ہے۔ کتاب کے اوراق سے ان کی پیشانی چھونے لگی۔ اور پھر کتنی ہی دیر بعد انہوں نے اپنا سر اٹھایا اور دوسرا نسخہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ اس ناکارہ نسخے پر بھی پورے کے پورے جھک گئے۔ جلدی جلدی ورق الٹنے لگے۔ جیسے جیسے وہ الٹتے گئے ویسے ویسے آنکھوں کا نور کم ہونے لگا۔ البتہ دل کی ایک آنکھ کھل گئی اور ابن عزیز نے اپنے ہاتھ سے لکھے ایک ایک لفظ کو ناکارہ، فضول اور گھٹیا پایا۔ ابن عزیز نے خود پر لفظ "حقیقی" کو آشکار ہوتے پایا۔

"اس کتاب پر کیا نام لکھوائیں گے محترم؟"

ابن عزیز کے ہونٹ کپکپا گئے۔ انہیں یاد آیا جب وہ اپنے آخری سفر سے واپس آرہے تھے تو ایک بزرگ انہیں ملے تھے۔ بزرگ نے گردن کو ذرا سا پیچھے موڑ کر دیکھا اور پوچھا۔

"یہ خاتون؟"

"یہ میری بیوی ہے۔ بس سمجھیں میری لاٹھی۔"

"وہ تمہاری لاٹھی ہے یا تم اس کی لاٹھی ہو؟ اس کا گھوڑا پیچھے ہے لیکن وہ تم سے آگے ہے۔ جب وہ تمہیں نصیحت کرے تو اس کی نصیحت پر عمل کرنا۔"

"اس پر کیا نام لکھیں عزیز محترم؟"

ابن عزیز نے اپنے لکھے اوراق کو ہاتھ میں لیا اور انہیں سب کے سامنے کیا۔ "یہ بے کار قلمی نسخہ میری حقیقت ہے اور یہ سند یافتہ کتاب میری بیوی کی حقیقی محبت۔

چالیس سال میں نے سفر کیا اور چالیس سال اس نے اللہ سے دوری کا فاصلہ کم کیا۔ میں نے اس سفر سے تکبر، بڑائی، رتبہ پایا اور اس نے حقیقت، انکسار، رضا اور اللہ کو پایا۔ دو مسافروں نے ایک ہی راستے پر ایک ساتھ سفر کیا، ایک موتی اٹھا لایا اور ایک پتھر لادلایا۔

ابن عزیز کو اپنی بزرگی کی سند چاہیے تھی اور زینب کو صرف اللہ کی رضا۔ ابن عزیز کتاب کے لیے لفظ، اشعار، تراکیب، مثالیں، قصے، اقوال، اور نام اکٹھے کر رہا تھا اور زینب! ہدایت، فکر، حقیقت، محبت حاصل کر رہی تھی۔

میرا تکبر مجھے لے ڈوبا اور زینب کلثوم کی محبت اسے اللہ کے نزدیک لے گئی۔

میں نے جو ستر سال میں کمایا وہ ایک رات میں چور لے گیا۔ بس اتنی ہی وقعت تھی اس حاصل کی۔"

ابن عزیز زینب کی کتاب کو آنکھوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

"اس کتاب پر زینب کلثوم لکھ دو، اور اللہ سے محبت کرنے والوں کا نام لکھ دو اور لکھ دو.....

جب لوگ اللہ کی محبت پر عہد باندھتے ہیں تو اللہ ان پر خاص توجہ دیتا ہے اور پھر اللہ دیکھتا ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں کس درجے کے مسافر ہیں۔ وہ راستے کو موتی اور سنگ سے بھر دیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کا بندہ کیا اٹھا رہا ہے۔"



مکمل ناول

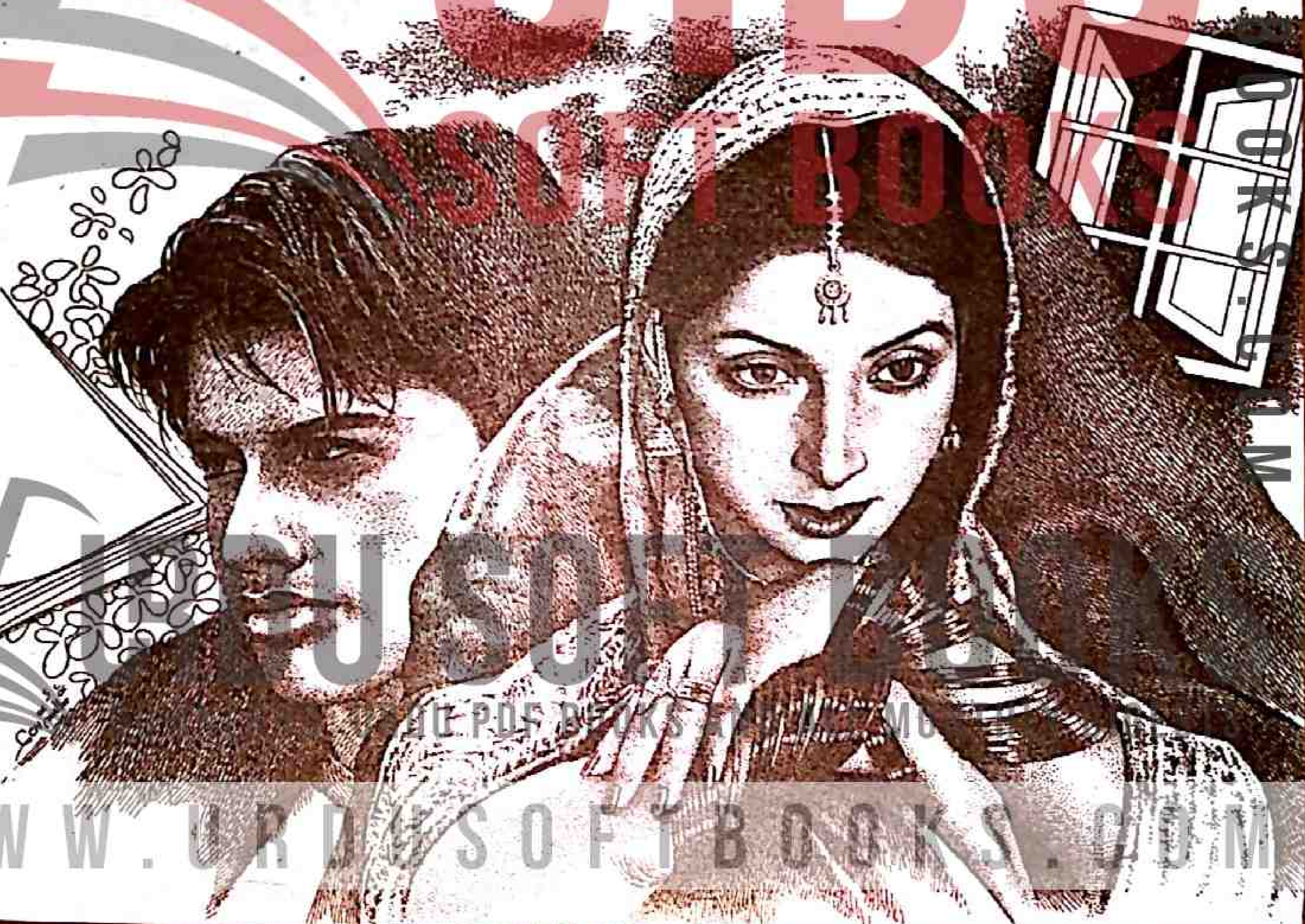
ان چاروں کے جوتوں کی چاپ سے لکڑی کا فرش چرچرانے لگا تھا۔ کشیدہ کاری کے فریم میں جڑے چار سوتی کے میز پوش پر کاسنی دھاگے سے پھول کاڑھتی صالحہ کو ان چاروں کی آمد کا احساس ہوا تو انہوں نے مسکرا کر ہاتھ میں پکڑا فریم گول میز پر رکھ دیا۔ وہ چاروں حسب معمول کسی بات پر بحث میں مگن تھے اور سیڑھیاں چڑھ کر چھوٹے سے ڈائننگ روم کی کرسیوں پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ کھانے کے کمرے سے متصل نشست گاہ سے اٹھ کر صالحہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں تو اس روز کے پرچے پر ان چاروں کی بحث زور و شور سے جاری تھی۔

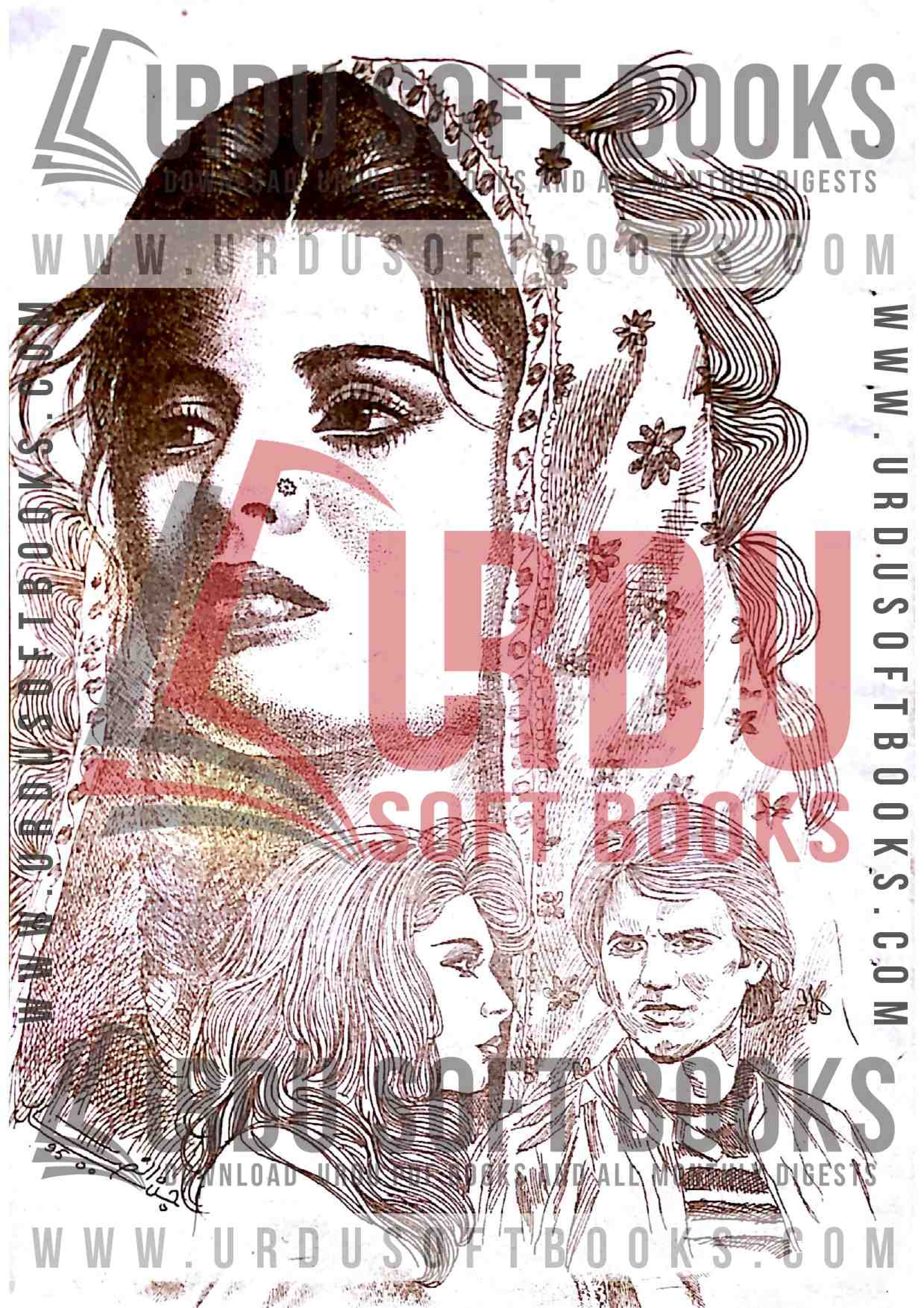
"میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس 'چواین لائی' نے اوریجنل سوال نامہ اپنے پاس رکھ لیا ہوگا' یہ پرچہ کسی طور بھی بورڈ آف ڈائریکٹرز کے کسی ممبر کا بنایا ہوا نہیں تھا۔" وہ معاذ تھا جو میز پر ہاتھ مار کر بلند آواز میں دعوا کر رہا تھا۔

"چواین لائی کی راتیں تو چوہے اور مینڈک بھونتے گزر جاتی ہوں گی' پرچہ بدلنے کی فرصت اسے کہاں ملی ہوگی۔" رائنہ میز پر بازو ٹکائے اس پر سر رکھے مایوسی کے عالم میں بول رہی تھی۔ "یقیناً" اس کا پرچہ خاصا

عنیزہ سیّد

محبت خواب جزیرہ





خراب ہوا تھا۔

"کمینہ اپنی نالائقیوں کا بدلہ ہم غریب اسٹوڈنٹس سے لیتا ہے۔" ظفر پانی کے گھونٹ کے ساتھ پیپر کی خرابی کی تلخی بھی حلق سے اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"مگر اس ساری بحث میں ایک پوائنٹ پر تو تم لوگوں نے غور ہی نہیں کیا۔" ڈائننگ ٹیبل پر رکھی شیشے کی سبز رنگ کی بوتل میں لگے منی پلانٹ کے پتوں کی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایبک کھوئے کھوئے انداز میں بولا تھا۔

صالحہ بازو سینے پر باندھتے ہوئے ایبک کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اب یہ کون سا الزام اس غریب پروفیسر شمیم پر لگانے والا تھا جسے اس کی چپٹی ناک کی وجہ سے ان سب نے چواین لائی کا خطاب دے رکھا تھا۔

"پیپر میں کوئی ایک سوال بھی سلیبس سے باہر نہیں تھا۔ کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو پڑھایا نہ گیا ہو۔" ایبک ارشاد فرما رہا تھا۔

"لیکن اس انداز میں تو نہیں پڑھایا گیا تھا نا جس طرح سوال پوچھے گئے۔" ظفر جو اس انتظار میں تھا کہ ایبک جانے کیا انکشاف کرنے والا تھا جھلا کر بولا۔

"چواین لائی نے اگر کچھ بدلا ہے تو سوالوں کا انداز بدلا ہے۔ ورنہ پیپر یقیناً" فاروق جمال نے بنایا ہے ہمیں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔"

"ووو۔۔۔" باقی تینوں نے حلق سے عجیب سی آوازیں نکالتے ہوئے ایبک کو تمسخر اڑانے والے انداز میں دیکھا۔

"میں سمجھا ـــــ نہیں کون سا انکشاف کرنے والا ہے صاحبزادہ۔" معاذ نے سر جھٹکا۔

"وزڈم کی تیرے ہاں ذرا سی بھی کمی نہیں ہے ایبک خان!" اس نے سراہنے کے انداز میں ایبک کو دیکھا۔ "تیرے وزڈم کو سلیوٹ کرتا ہوں۔" وہ دایاں ہاتھ ماتھے تک لے گیا۔

"کبھی غرور نہیں کیا۔۔۔" جواب میں ایبک فیس کے شانے سے نادیدہ گرد جھاڑتے ہوئے شان بے نیازی سے بولا تھا۔

"اپنی وزڈم کو اپنے تک ہی رکھا کرو۔" میز سے سر اٹھاتے ہوئے رائنہ نے اکتائے ہوئے انداز میں ایبک کی طرف دیکھا۔ "یہاں پاسنگ مارکس کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور یہ ہے کہ چواین لائی اور فاروق جمال کے سر سے الزامات کا بوجھ اتارنے کے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"کیا یار۔۔۔" ظفر کے لہجے میں دکھ ابھرا۔ "کیسی فضول زندگی ہے۔ پڑھ پڑھ کر کھپ کھپ کر مر جاؤ۔۔۔ آخر میں پیپر کیسا ہوا۔۔۔؟ وہی نارمل۔۔۔ اونہہ۔" اس نے سر جھٹکا۔

"آ گئے تم لوگ۔" چاروں کو اس قدر دکھی اور مایوس دیکھ کر صالحہ گلا کھنکھارتے ہوئے آگے بڑھیں۔

"السلام علیکم آنٹی!" صالحہ کو دیکھ کر ظفر، معاذ اور رائنہ سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"السلام علیکم ماما!" ایبک نے آگے بڑھ کر ان کی پیشانی چومی۔

"وعلیکم السلام!" وہ مسکرا کر بولیں اور میز پر رکھی سب کی کتابیں سمیٹنے لگیں۔

"کیسا ہوا پرچا؟" مصروف انداز میں پوچھتے ہوئے انہوں نے کن انکھیوں سے چاروں پر نظر ڈالی، اگرچہ وہ پرچے کا احوال سن چکی تھیں، لیکن ان سب سے اپنے سوال کا جواب چاہتی تھیں۔

"میں تو پکا فیل۔۔۔" معاذ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اعتراف کیا۔

"میں (edge) کنارے پر پاس ہو جاؤں شاید۔۔۔" ظفر نے خوش امید بننے کی کوشش کی۔

"میرا تو سمجھیں، پورا سیمسٹر ہی گیا۔" رائنہ نے کھڑے ہو کر اپنا سویٹر نیچے کھینچا اور یوں ہاتھ جھاڑے جیسے فیل ہونے کے بعد پڑھائی کا قصہ ہی ختم کرنے کا ارادہ ہو۔

"اوہ! افسوس ہوا سن کر۔" باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھتے ہوئے ہونٹ سکیڑ کر ہمدردی ظاہر کی۔

"اور تم؟" اب ان کی نظر اپنے ہونہار سپوت پر تھی۔

"پاس ہو جاؤں گا۔" وہ میز پر رکھی پھل کی ٹوکری میں سے سیب نکال کر اچھالتے ہوئے بولا۔ "اگر۔"

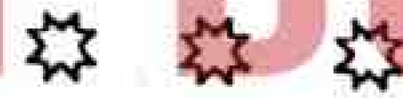
پھر اس نے رک کر ان کی طرف دیکھا۔ "چواین لائی نے ریلٹو مارکنگ کی تو۔"

"ریلٹو مارکنگ۔" معاذ نے زیر لب دہرایا۔ "وہ تو وہ کرے گا نہیں، تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ پاوے لڑا کر پاس ہو ہی جاؤ گے۔" وہ ایبک کی طرف بپھرے ہوئے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

"اچھا چلو چھوڑو۔" صالحہ نے تسلی دینے کی غرض سے کہا۔ "جو ہوا' اسے بھول جاؤ اب اگلے پیپر کی طرف دھیان دو اور ہاں ابھی تو ایسا کرو' کھانا کھاؤ' میں نے چکن فرائیڈ رائس بنائے ہیں' کھاؤ گے نا؟"

اور کھانے کا نام سن کر ان چاروں کو واقعی پرچے کا غم بھول گیا تھا۔

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔" رائنہ سویٹر کے بازو چڑھا کر ان کے پیچھے کچن میں چلی آئی اور باقی تینوں ٹیبل پر رکھی فالتو چیزیں اٹھانے میں مصروف ہو گئے۔



"خیر چواین لائی اتنا بھی راکھشش نہیں جتنا ہم اسے سمجھتے ہیں۔" گرم چاولوں کا چمچہ بھر کر منہ میں ڈالتے ہوئے معاذ نے کہا۔

"دھمکیاں دیتا ہے صرف' آخر میں اس نے سب کو ہی پاس کر دینا ہے۔" ظفر نے بھی معاذ کی تائید کرنے کی کوشش کی۔

"ایبک ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' برے پیپر دیکھے گا تو ریلٹو مارکنگ پر مجبور ہو جائے گا۔" رائنہ نے چاولوں پر دہی پودینے کی چٹنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"اوپر والوں کو اچھا رزلٹ نہیں دے گا تو خود بھی تو نوکری سے جائے گا نا۔" یہ شدید بھوک میں گرما گرم لذیذ کھانا مل جانے کا اثر تھا یا واقعی وہ پرچے کے فوراً بعد والے صدمے سے نکل آئے تھے' ان کی گفتگو مثبت ہونے لگی تھی۔

صالحہ نے ان چاروں کو ہنستے مسکراتے' کھانا کھاتے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھا اور انہیں ان چاروں پر بے حد پیار آیا۔ وہ چاروں بچپن کے دوست تھے۔ صالحہ کی نظروں کے سامنے پلے بڑھے تھے۔ بچپن کی دوستی گزرتے وقت کے ساتھ ترقی کرتے ہوئے جوان ہو چکی تھی' لیکن اتفاق کی بات تھی کہ وہ چاروں اب تک ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ اس چھوٹے سے پہاڑی علاقے کو چائے کے باغات اگانے کی ایک کمپنی کے ملازمین نے بسا رکھا تھا۔ مقامی باشندوں کی بستی سے ہٹ کر ان ٹی پلانٹرز کی بستی تھی جس کے زیادہ تر رہائشی کمپنی کے ملازم تھے۔

صالحہ کے سسر اس کمپنی کے بانیوں میں سے ایک

تھے۔ انہیں دوران ملازمت یہ گھر رہائش کے لیے ملا تھا۔ کمپنی کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اسی علاقے میں مستقل رہائش کا فیصلہ کرتے ہوئے اس گھر کی ملکیت کمپنی سے خریدلی تھی۔ سرک ٹین کی ترچھی چھتوں سے ڈھکے اس گھر کے کمروں کے فرش لکڑی کے بنے تھے اور کہیں کہیں دیواروں پر بھی لکڑی کا کام تھا۔ ساس سسر اور شوہر کی وفات کے بعد صالحہ اپنے دونوں بیٹوں اورنگ زیب اور ایبک کے ساتھ گھر کی بالائی منزل پر رہ رہی تھیں۔ ان کے شوہر نے بھی کمپنی کی ملازمت کے دوران ہی وفات پائی تھی۔

کمپنی کے مالکان صالحہ کو اسی وجہ سے خصوصی عزت و احترام سے نوازتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد اورنگ زیب کو کمپنی میں ملازمت بھی اسی احترام کی وجہ سے مل گئی تھی۔ سسر کے چھوڑے بینک بیلنس، شوہر کی وفات کے بعد ملنے والے فنڈز اور اورنگ زیب کی تنخواہ کے باعث صالحہ کا شمار اس بستی کے معززین میں ہوتا تھا اور "معزز" ہونے کا یہ اعزاز سب سے زیادہ ایبک کے کام آتا تھا۔ جس وقت صالحہ عبدالرحمن کی دلہن بن کر اس بستی میں آئی تھیں تب یہ علاقہ کم آباد تھا اور سہولتیں ناکافی تھیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اب یہاں ایک اچھا میڈیکل سینٹر، اسکول اور کالجز بھی بن چکے تھے۔ قریبی علاقے میں پاکستانی فوج کی چھاؤنی بن جانے کی وجہ سے یہاں سہولتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔

ایبک، صالحہ کے دونوں بیٹوں میں دوسرے نمبر پر تھا۔ زندہ دل، خوش مزاج، خوش شکل۔ ایبک کو بچپن سے ہی پڑھنے اور ہر میدان میں آگے رہنے کا شوق تھا۔ اسکول اور کالج میں بھی پڑھائی میں اول رہنے کے ساتھ ساتھ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی سب سے آگے رہتا تھا۔ اس کی یہ عادت اب تک قائم تھی تب ہی جو پرچہ اس کے باقی تینوں دوستوں کے خیال میں مایوس کن ہوا تھا۔ وہ اس میں اچھے نمبر لینے کے لیے پُرامید تھا۔

ظفر، رائنہ اور معاذ صالحہ کے گھر یوں آتے جاتے تھے جیسے یہ ان کا اپنا ہی گھر ہو۔ یہاں انہیں اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے کی وہی آزادی ملتی تھی جو انہیں اپنے گھروں میں میسر تھی بلکہ ظفر کے بقول یہاں انہیں اپنے گھر سے بھی زیادہ آزادی حاصل تھی۔ صالحہ کو ان تینوں بچوں کا یہاں آنا بہت پسند تھا۔ ان کے آنے سے ان کے اس پہاڑی کاٹیج نما گھر میں رونق اتر آتی تھی۔

اس روز بھی وہ تینوں کھانا کھانے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کے بجائے شام دیر تک ادھر ہی بیٹھے رہے تھے۔ رائنہ نے کھانے کے بعد برتن سمیٹنے اور دھونے میں صالحہ کی پوری مدد کی تھی۔ اسی دوران معاذ سب کے لیے گرم کافی بنا لایا تھا جب کہ چھوٹی سی نشست گاہ میں بیٹھے ظفر اور ایبک میں پرچے پر بحث جاری تھی۔

"میرا خیال ہے کہ کالج کے فزکس ڈپارٹمنٹ میں صرف چواین لائی کی بطور استاد موجودگی ہم سب کے اعصاب پر سوار ہو چکی ہے۔" ایبک نے کافی کا کپ ہاتھ میں پکڑ کر کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

"مطلب تم کہنا چاہتے ہو، ہم چواین لائی کی شکل دیکھتے دیکھتے بوریت کا شکار ہو چکے ہیں۔" رائنہ نے اسی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ دیکھو تمہاری کزن ابھی تک کتاب ہاتھ میں لیے رٹے مارنے میں مشغول ہے۔" اس کی نظر گھر کے نچلے پورشن کے پچھلے صحن میں بیٹھی سطوت پر پڑی۔

"ہوں!" ایبک نے بھی کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ "رٹے پر بڑا زور ہے اس کا تب ہی ایک کلاس میں دو دو سال لگاتی ہے۔"

"ارے اس کا مطلب یہ تو بہت کم عمر ہے ابھی، ہے نا۔" رائنہ اونچی آواز میں ہنسی۔

"ظاہر ہے یہ اس کلاس سے تقریباً" چار درجے پیچھے ہے جس میں اسے ہونا چاہیے اس لحاظ سے تو اس کی ظاہری عمر کچھ بھی نہ ہوئی۔۔۔ ہے نا؟"

اس نے تمسخر اڑاتے انداز میں ایک بار پھر نیچے بیٹھی سطوت کی طرف دیکھا اور پھر قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ایبک نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے ایک نظر نیچے ڈالی' سطوت رٹے لگانا چھوڑ کر اوپر دیکھ رہی تھی۔ یقیناً" رائنہ کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی نظروں میں شکوہ تھا اور وہ زخمی تھیں۔ ایبک نظر چرا گیا۔ اچانک اس کے دل میں اس تکلیف کا احساس ہوا جو اپنے بارے میں ایبک اور رائنہ کی گفتگو سن کر سطوت کے دل میں اٹھی ہوگی۔ اسے افسوس ہونے لگا' کسی کے بارے میں فضول اور بے مقصد خیالات کا اظہار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ وہ خود سے ناراض ہوتا کھڑکی کے قریب سے ہٹ گیا۔

"ایبک! ظفر اور معاذ اپنا اپنا راستہ کہاں بدلتے رہیں گے' رائنہ کو تم گھر چھوڑ آؤ۔" صالحہ نے ظفر اور معاذ کو واپس جانے کے لیے اٹھتے ہوئے دیکھ کر ایبک سے کہا۔

"یہ ہی خود چلی جائے' میں کہاں اسے ڈھوتا پھروں گا۔" اس نے کافی کا خالی کپ ٹیبل پر رکھا۔

"اوہ ایبک! تم جانتے بھی ہو' وہ اکیلی نہیں جاسکتی' جاؤ شاباش چھوڑ آؤ۔" صالحہ نے نرمی سے کہا۔

"جن لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنے اور ان کے ساتھ گھومنے پھرنے کا شوق ہوتا ہے' انہیں چاہیے کہ ایسے موقعوں پر لڑکی نہ بن جایا کریں۔" ایبک نے رائنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بے چاری اکیلی نہیں جاسکتی....." وہ منہ بنا کر باریک آواز نکالتے ہوئے بولا۔

"ویسے بھی تمہاری یہ جینز اور سویٹر دیکھ کر تمہیں کوئی لڑکی سمجھے گا ہی نہیں' ایسا کرو ایبک کا ہیلمٹ پہنو اس کی بائیک پکڑو اور چلی جاؤ گھر' فکر نہ کرو' تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔" معاذ نے ایبک کا ساتھ دیا۔

"تم تینوں کا مسئلہ یہ ہے کہ تم تینوں جی بھر کے کمینے ہو۔" رائنہ نے باری باری تینوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں زیر لب مسکرا رہے تھے۔ "جب پیپر سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا تھا میں گھر جارہی ہوں تو کیوں تم تینوں مجھے زبردستی یہاں گھسیٹ لائے تھے۔"

"زبردستی؟ توبہ توبہ۔" ظفر نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "خود ہی آنسوؤں کے ساتھ رو رہی تھیں پیپر خراب ہونے پر' ہم نے تو از راہ ہمدردی کہا تھا ہمارے ساتھ ایبک کے گھر چلو' تم نے کیوں اپنی تشریف کا ٹوکرا فوراً تیار کر لیا تھا' نہ کرتیں۔"

"آنٹی! آپ سن رہی ہیں نا!" رائنہ نے صالحہ کی طرف دیکھا۔

"بک بک بند کرو تم تینوں۔" صالحہ نے تینوں کو گھرکا۔ رائنہ نے تینوں کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے چڑایا۔ "ایبک! شرافت سے بائیک کی چابی پکڑو اور اسے گھر چھوڑ کر آؤ' اندھیرا بڑھنے لگا ہے۔" صالحہ نے ایبک کی طرف دیکھا۔

"جارہا ہوں ماما۔" ایبک نے مصنوعی بے زاری سے کہا اور بائیک کی چابی اور ہیلمٹ اٹھالیا۔ "چلو اٹھو مرو..... آگے لگو۔" اس نے نیچی مگر سخت آواز میں دانت پیستے ہوئے رائنہ سے کہا۔

"تو یہ محترمہ اس وقت بالٹیوں میں پانی بھر رہی ہیں۔" جس وقت وہ رائنہ کو بائیک پر پیچھے بٹھائے بائیک کمپاؤنڈ سے باہر نکال رہا تھا' رائنہ کی نظر باؤنڈری وال سے اندر آتے کمیٹی کے سپلائی پائپ سے بالٹیوں میں پانی بھرتی سطوت پر پڑی۔ "یہ ہر کام دیر سے کیوں کرتی ہے۔ لگتا ہے' بہت کاہل ہے۔"

"اس کا کام ہے' جب مرضی کرے ہمیں کیا۔" ایبک نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

اور جب وہ رائنہ کو گھر چھوڑ کر واپس آیا تھا تو وہ پانی کی آخری بھاری بالٹی اپنے گھر لے جارہی تھی۔ ایبک نے بائیک سیڑھیوں کے نیچے کھڑی کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے سرخ شال اوڑھ رکھی تھی اور اس کا چہرہ بھی سردی کی وجہ سے سرخ ہی ہو رہا تھا اور یقیناً" وہ سردی کی شدت کی وجہ سے کانپ بھی رہی تھی۔ وہ اپنا اونی مفلر ٹھیک کرتا ہوا اوپر جاتی لکڑی کی

سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"آخری دونوں پیپر واقعی ٹف ہیں، بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔" اگلے روز ناشتا کرتے ہوئے اس نے صالحہ کو بتایا۔

"پہلے والے آسان تھے کیا؟" اورنگ زیب نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے پوچھا۔ "ماما بتا رہی تھیں کل تم لوگ خاصے پریشان تھے پرچے کے بعد۔"

"کل والا پرچا۔" وہ مسکرایا۔ "تو بچہ تھا آخری دو کے مقابلے میں۔"

"یار! خوش قسمت ہو تم لوگ، پڑھ رہے ہو، زندگی کا کوئی مقصد سوچ بیٹھے ہو۔" اورنگ زیب نے کہا۔ "جب میں پڑھ رہا تھا تو یہاں یہ سب سہولتیں میسر نہیں تھیں۔"

"ابھی بھی تو اتنی دور جانا پڑتا ہے۔ بائیک چلاتے چلاتے ٹانگیں اور ہاتھ شل ہونے لگتے ہیں۔" ایبک نے منہ بنایا۔

"شکر کرو یار پھر بھی، بائیک پر ہی سہی، پہنچ تو جاتے ہو۔ میری دفعہ تو آگے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی سوائے اس کے کہ اسلام آباد جاکر پڑھا جائے اور میں ماما اور تمہیں اکیلا چھوڑ نہیں سکتا تھا۔"

"آپ نے تو سیکری فائس کرلیا، لیکن میں ایسا نہیں کرنے والا۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "میں آگے پڑھنے کے لیے اسلام آباد نہیں ملک سے ہی باہر چلا جاؤں گا۔"

"تو تمہیں روک کون رہا ہے۔ جاؤ یار، ضرور جاؤ۔ دنیا ایکسپلور کرو۔" اورنگ زیب مسکرا کر بولا تھا۔

"اچھا... وہ بات تو درمیان ہی میں رہ گئی جس کے لیے ساری تمہید باندھی تھی۔" ایبک نے صالحہ کی طرف دیکھا۔ "معاذ اور ظفر ادھر ہی رہیں گے آخری پرچے تک۔ کمبائن اسٹڈیز کا ارادہ ہے۔ آپ سیڑھیوں والا کمرہ صاف کروا دیجئے گا۔"

"اچھا تو وہ بے چاری رائنہ کیا کرے گی، اپنے گھر میں اکیلی پڑھے گی۔" صالحہ کو خیال آیا۔

"کیا کیا جاسکتا ہے، مجبوری ہے۔" ایبک نے شانے اچکائے۔

"ویسے رائنہ کے پیرنٹس جتنے لبرل ہیں انہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہونا چاہیے اس کے بھی یہاں کمبائن اسٹڈیز کے لیے ٹھہرنے پر۔" اورنگ زیب شرارت بھرے انداز میں مسکرایا۔

"ارے بیٹا، خدا کا خوف کرو، دنیا والوں کو باتیں بنانے کا موقع کون دیتا ہے۔" صالحہ ہول کر بولیں۔

"جی نہیں، یہ بھی آپ کی خوش فہمی ہے۔ انہیں دنیا والوں کی باتوں واتوں سے بھی ڈر، ور نہیں لگتا۔" ایبک نے کہا۔ "لیکن یہ بات ذاتی طور پر مجھے خود پسند نہیں کہ رائنہ یہاں ٹھہرے۔"

"گویا اسکینڈل سے بچتے ہو۔" اورنگ زیب نے آنکھ مارتے ہوئے اسے چڑایا۔

"اسکینڈل بننا ہوتا تو اب تک بن چکا ہوتا۔ روزانہ میرے ہی پیچھے بیٹھ کر کالج تک جاتی ہے، بچہ بچہ واقف ہے یہاں کا اس بات سے۔" ایبک نے ذرا بھی اثر نہ لیتے ہوئے کہا۔

"پھر شکر کرو کہ یہاں کا بچہ بچہ بھی بڑا ہی لبرل ہے۔" اورنگ زیب خوش دلی سے بولا۔

"خیر، یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ رائنہ رات تک تم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ لے، پھر اسے گھر چھوڑ آنا۔" صالحہ نے اٹھ کر برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

"اللہ کا واسطہ ہے، یہ تجویز اسے دینے نہ بیٹھ جایئے گا۔" ایبک نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "کون رات گئے اتنی سردی میں اسے اس کے گھر چھوڑتا پھرے گا۔"

"میں... میں چھوڑ آیا کروں گا۔ میری ڈبل کیبن زندہ باد۔" اورنگ زیب نے کھلے دل سے آفر دیتے ہوئے کہا اور نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ اسے آفس جانا تھا۔ صالحہ اور ایبک کو خدا حافظ کہہ کر وہ چلا گیا۔

"کتنی بری بات ہے ایبک، تم لوگوں کا رویہ رائنہ

کے ساتھ خاصا مخاصمانہ ہے۔ جب کہ وہ تم تینوں کے فائدے کے لیے کتنے پاپڑ بیلتی ہے۔" صالحہ نے ایبک کو گھورا۔

"او پلیز ماما۔ اس کے پاپڑوں کا ذکر نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ اکثر تو پاپڑوں کا آٹا خراب نکلتا ہے یا پھر پاپڑ فرائی ہوتے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔" ایبک ہنسا۔ صالحہ برتن اٹھا کر کچن کی طرف چل دیں۔

"مخاصمانہ رویہ۔۔۔" صالحہ کے جانے کے بعد ایبک نے ان کے کہے الفاظ دل میں دہرائے۔

"مخاصمانہ رویہ تو شاید وہ ہے، جو ہم نے نچلے پورشن میں رہنے والی چچی اور ان کی بیٹی سے روا رکھا ہوا ہے۔"

دادا کی زندگی میں ہی چچا کا انتقال ہو گیا تھا اور اسے یاد تھا کہ چچا کے بعد چچی کا رویہ گستاخانہ ہونے لگا تھا۔ وہ دادا کی جائیداد میں سے اپنی بیٹی کے لیے حصہ مانگتیں اور ایسا کرتے ہوئے دادا کو ہزار ہا طعنے بھی دیا کرتیں۔ ان کے خیال میں چچا کی بے وقت موت کا سبب دادا کا وہ رویہ تھا جو انہوں نے چچا کے ساتھ اپنی مرضی کی شادی کر لینے کے بعد روا رکھا تھا۔

"آپ نے مجھے اپنے گھر میں اور اپنے بیٹے کی زندگی میں ایک دن کے لیے بھی قبول نہیں کیا۔ اسی بات کا غم سجاد کو کھا گیا اور وہ مجھ جوان بیوی کو بیوہ اور میری چھوٹی سی بچی کو یتیم کر گیا۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں دادا سے کہتیں۔

جواب میں دادا اکثر انہیں مشورہ دیتے کہ وہ ان کی جائیداد میں سے اپنی بیٹی کے حق کا شرعی حکم کا جائزہ لینے کے بعد ان سے بات کریں۔ اس مشورے پر چچی مزید بھڑکتیں۔ ان کا خیال تھا کہ دادا، انہیں اور ان کی بیٹی کو ہر حق سے، ہر چیز سے محروم کر دینا چاہتے تھے جبکہ چچا کے اپنے چھوڑے چند لاکھ روپوں اور تھوڑی سی زرعی زمین سے بھی۔

"آپ تو شرع سے وہ حکم بھی سامنے لے آئیں گے جس میں اولاد نرینہ نہ ہونے کے سبب سجاد کی جائیداد میں آپ کا اور بھائی صاحب کا حق بھی بنتا ہو گا۔" وہ تلملا کر کہتیں۔ "آپ کا بس چلے تو مجھے اور میری بچی کو تین کپڑوں میں ہی دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیں۔" وہ چلا چلا کر کہتیں۔

"شریعت اور احکامات کی کہانیاں سنا کر آپ کوئی مذہبی فرض پورا نہیں کر رہے، بس مذہب کو اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ خدا کی مار پڑے آپ کے لالچ پر اور آپ کے اس بڑے بیٹے اور بہو پر بھی۔"

وہ نفرت بھری نظروں سے بابا اور ماما کو دیکھتیں۔

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کو یہ ساری پٹی آپ کی اس بڑی بہو نے پڑھائی ہے، یہ ہی چاہتی ہے کہ میں اپنی بچی سمیت یہاں سے نکل جاؤں اور یہ بلا شرکت غیرے ہر چیز کی مالک بن جائے۔"

ان کے لہجے میں ماما کے لیے نفرت جھلکتی تھی۔

اب یہ شاید ان کے ان طعنوں، کوسنوں اور بددعاؤں کا ہی اثر تھا کہ دادا جو محض ان کے گستاخانہ رویے کی وجہ سے انہیں حقیقت سے روشناس کرانا چاہتے تھے مگر خود پکا ارادہ رکھتے تھے کہ وہ اپنی پوتی کو اس کا حق دیں گے، ایک رات سوتے میں ہی دنیا سے چلے گئے۔

دادا کے بعد چچی، بابا کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ بپھر چکی تھیں۔ بابا نے ان کے ان ہی تیوروں سے ڈر کر گھر کا نصف حصہ سطوت کے نام کر دیا اور چچا کی زمین کی ملکیت بھی اسی کے نام کروا دی۔ سطوت نابالغ تھی، اس کے بالغ ہونے تک چچی اس کی سرپرست تھیں۔

سطوت کے بڑے ہونے سے پہلے ہی چچی زمین فروخت کر کے اس سے ملنے والی رقم اپنے اللوں تللوں میں خرچ کر چکی تھیں۔ اس کے بعد وہ اپنا گزارا کیسے کرتی تھیں، نہ کبھی کسی نے ان سے پوچھا، نہ ہی انہوں نے بتایا اور پوچھنا بتانا ہوتا بھی کیسے۔ بابا نے اپنی زندگی ہی میں ماما کے سمجھانے پر چچی اور سطوت سے تعلق اور بول چال ختم کر دی تھی۔ اس طرح ایک ہی گھر کے دو پورشنز میں رہتے ہوئے بھی دونوں خاندانوں کو ایک دوسرے کی کچھ خبر نہیں تھی۔

بابا دنیا سے چلے گئے۔ چچی اور سطوت، ماما کے رونے

کی آوازیں سنتی تھیں۔ تعزیت کے لیے آنے جانے والوں کو دیکھتی تھیں 'لیکن وہ لفظ ہمدردی کے بولنے کے لیے سیڑھیاں نہ چڑھ سکیں۔ اس بے گانگی پر ماما کا دل بھی سخت ہو چکا تھا۔ انہوں نے نیچے جھانک کر کبھی یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ دونوں ماں بیٹی کی بظاہر مصروفیت کیا رہتی تھی۔ انہیں کبھی کہیں جانا بھی ہوتا تو پہلے پتا کرواتیں کہ دونوں میں سے کوئی سیڑھیوں کے آس پاس تو نہیں 'مبادا آتے جاتے کسی پر نظر پڑجائے۔

خود ایبک اور اورنگ زیب 'چچی کی دادا اور بابا سے گستاخیاں اور نفرت دیکھتے ہوئے بڑے ہوئے تھے۔ اپنے گھر پر طاری مجموعی سائیکی کا بھی شکار تھے 'اسی لیے ان دونوں نے بھی کبھی چچی اور سطوت کے بارے میں کچھ جاننے کا تجسس نہیں کیا تھا۔ البتہ ایبک کو سطوت کی نصابی سرگرمیوں کے بارے میں یوں پتا چلتا رہتا تھا کہ پہلے وہ ایک ہی اسکول کی ایک کلاس کے دو مختلف سیکشنز میں پڑھا کرتے تھے۔

پھر نجانے کیا ہوا کہ سال کے سال سطوت پیچھے رہتی چلی گئی اور وہ آگے بڑھتا گیا اور اب جب کہ وہ بی ایس سی میں پہلے سال کا طالب علم تھا 'سطوت ابھی اسکول میں میٹرک ہی کر رہی تھی۔ سطوت کی اس کمزوری کا رائنہ سے ذکر کرتے کرتے ' وہ اس روز ہنس تو دیا تھا جس کا بعد میں اسے نجانے کیوں افسوس ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

وادی پہ دسمبر کی خنکی اپنی پوری شدت سے طاری تھی۔ گزشتہ شام موسم کی پہلی برف باری ہوئی تھی جو رات گئے تک جاری رہی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں برف کی بھاری تہہ کے نیچے دب گئی تھیں اور وادی کے سب راستے 'مکانوں کی چھتیں اور درختوں کے پتے برف کی ہلکی چادر اوڑھے سفید ہو رہے تھے۔

''کیا ہوتا جو برف پڑنے سے پہلے یہ دو پرچے بھی ختم ہو جاتے۔'' ظفر نے نوٹس پڑھتے پڑھتے بور ہو کے کہا۔ سیڑھیوں والا کمرہ آتش دان میں جلنے والی آگ کی وجہ سے گرم تھا۔ کمرے کا ماحول نرم گرم اور باہر کی سردی کی شدت سے محفوظ تھا۔ وہ تینوں اون کے موٹے نمدوں پر بستر بچھائے 'لحاف اوڑھے سنجیدگی سے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔

''یار! اسکینز بھی بالکل غائب ہو گئے۔ میں نے رائنہ سے وعدہ کیا تھا کہ آخری تین سلائیڈز اسے فارورڈ کردوں گا' اب وہ بے چاری کیا کرے گی۔'' معاذ نے کمپیوٹر کی اسکرین کو مایوسی سے دیکھتے ہوئے سرہلایا۔

''اور سامنے دیکھو آگ بھی بجھ رہی ہے جب کہ مجھے تو ابھی دو چیپٹرز ریوائز کرنے ہیں۔'' ظفر کی نظر آتش دان پر جمی تھی۔

''ادھر ادھر دیکھ کر وقت ضائع نہ کیا ہوتا اب تک تمہارے چیپٹرز ریوائز بھی ہو چکے ہوتے۔'' ایبک نے نوٹس پر سے نظر اٹھا کر ظفر کو گھورا۔

''یار! آتش دان میں آگ بجھ رہی ہے۔ اب دھیان ادھر سے ہٹے گا تو پڑھ پاؤں گا نا' ایسے تو سردی کا احساس خواہ مخواہ ہی ہوتا رہے گا۔'' ظفر نے عذر پیش کیا۔

''چلو' میں کرتا ہوں تمہارے دھیان کا بندوبست۔''

ایبک اپنے بستر سے باہر نکلا۔ سر پر ٹوپی پہن کر گرم سوتی چادر اوڑھتے ہوئے اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا جو منہ اٹھائے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''دیکھ کیا رہے ہو' لکڑیاں لینے جا رہا ہوں نیچے۔ تمہاری آگ کا بندوبست کرنے۔'' اس نے دانت پیسے۔

''اچھا' اچھا۔'' معاذ نے سرہلایا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔ ''ایسا کرنا' آتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل سے ڈرائی فروٹ والی ٹرے بھی اٹھا لانا' منہ چلتا رہے گا نیند بھی نہیں آئے گی۔''

''سب کچھ اپنے اردگرد جمع کرکے بھی تم نہیں پڑھ سکو گے' آئی ایم شیور۔'' ایبک جھنجلا کر بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ خشک لکڑی کا ذخیرہ سیڑھیوں کے نیچے

والے کمرے میں جمع تھا اس نے لکڑی کے دروازے کا سبز کواڑ کھولا اور اوپر تلے سلیقے سے جمی لکڑیوں میں سے چند کھینچ کر باہر نکالنے لگا۔

"ہائے سردی ۔۔۔ میں سردی کے مارے مرجاؤں گی کم بخت تو کھڑی کھڑی میرا منہ دیکھتی رہنا۔" دروازہ بند کرتے ہوئے اس کے کانوں سے چچی کی آواز ٹکرائی جو اس اندھیرے اور رات کے سناٹے میں خاصی واضح ہو رہی تھی۔

"تو کیا کروں میں آپ کے لیے، میری سمجھ میں کچھ آئے تو کچھ کروں نا۔" یہ سطوت کی آواز تھی۔

"میرے گیلے کپڑے ہی بدلوا دے کمبخت، کچھ اور نہیں کر سکتی تو۔" چچی کی آواز ابھری۔

"آپ کے سب کپڑے گیلے ہی پڑے ہیں، استری کام نہیں کر رہی۔ گھر میں آگ جلانے کے لیے کوئلے کا ایک ٹکڑا تک نہیں ہے۔ میں آپ کو پہناؤں کیا۔"

سطوت کی آواز سردی کے مارے ٹھٹھر رہی تھی، جواب میں چچی کے چلانے اور کھانسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک کے پلے چچی کی کوئی بات نہیں پڑی تھی کیوں کہ کھانسی کا دورانیہ طویل اور شدید ہو رہا تھا۔ وہ لکڑیاں اٹھائے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا آیا۔ اسے دائیں مڑتی سیڑھیوں کے تین قدم اور اوپر چڑھ کر ڈائننگ روم سے ڈرائی فروٹ کی ٹرے اٹھانی تھی۔ لکڑیوں کو سیڑھیوں والے کمرے کے دروازے کے آگے رکھ کر وہ اوپر ڈائننگ روم میں چلا آیا۔ ڈرائی فروٹ کی ٹرے اٹھانے کے بجائے اس کے قدم خود بخود استری اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے۔ اس پر دھری استری ہاتھ میں اٹھا کر اس نے چند سیکنڈز کے لیے سوچا کہ وہ کیا کرنے جا رہا تھا، لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اس کو یہ سوچنا بھی نہیں ہے کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ اگلے لمحے وہ واپس مڑا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا آیا۔

استری چچی کے گھر کی دہلیز پر رکھ کر اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ غالباً وہ دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اس نے دستک دینے والے سے کچھ پوچھے بغیر ہی دروازہ کھول دیا تھا۔

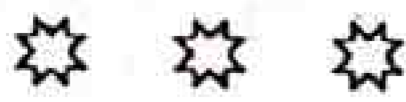
ایک نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کے بجائے استری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں "استری ہے۔ اٹھا لو۔" کے الفاظ ادا کیے اور مڑ گیا۔ وہ ادھ کھلے دروازے کے کواڑ پر ہاتھ رکھے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اور ہاں!" وہ جاتے جاتے واپس مڑا۔ "سیڑھیوں کے نیچے والے کمرے میں لکڑیاں رکھی رہتی ہیں جتنی چاہئیں لے لینا۔ دروازہ کھول کر جا رہا ہوں۔"

وہ اپنی بات کہہ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا چکا تھا جب کہ سطوت کی حیرت تھی جو ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ "انتہائی مشکل وقت میں خدا اپنے بندوں کی مدد کے لیے فرشتے بھیجا کرتا ہے۔" یہ بات اس نے کہانیوں میں پڑھ رکھی تھی۔

"وہ فرشتہ بن کر نیکی کرنے آیا تھا یا انسان بن کر احسان کرنے۔"

فوری طور پر سوچنے اور کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر دہلیز پر رکھی استری کو اٹھایا۔ استری کو لکڑی کے بکس پر پڑے کھیس پر رکھ کر اس کا پلگ ساکٹ میں لگا کر اسے آن کرنے کے بعد وہ دوبارہ دروازے کی طرف گئی۔ دروازے سے باہر نکل کر اس کا رخ سیڑھیوں کے نیچے بنے لکڑی کے کمرے ۔۔۔ کی طرف تھا۔ رات کا باقی حصہ ای کے گیلے کپڑے سکھانے اور آتش دان میں آگ جلاتے گزر گیا تھا۔ گھر میں آگ کی حدت پھیلی تھی۔ کئی دنوں سے سکڑے ٹھٹھرتے جسموں کو حدت پہنچی تھی اور سطوت کا منجمد ہوتا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہونے لگا تھا۔



اگلی صبح گھر میں استری کی ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی۔ صالحہ حیران تھیں کہ سالہا سال سے ایک ہی جگہ پر رکھی استری راتوں رات اپنی جگہ سے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب کے کپڑوں پہ استری کرنی تھی۔ اسے آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ صالحہ گھر کے

تینوں کمروں میں بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھیں۔ ظفر، معاذ اور ایبک کو استری سے کوئی کام نہیں تھا اسی لیے وہ ناشتے کی میز پر بیٹھے آملیٹ اور پراٹھوں کا ناشتا کرتے ہوئے پرچے سے کچھ دیر قبل والی آخری پڑھائی میں مشغول تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ام صالحہ کی بوکھلاہٹ اور اورنگ زیب کی بڑبڑاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اورنگ زیب کا خیال تھا کہ صالحہ کا حافظہ کمزور ہو رہا ہے۔ ضرور انہوں نے پیروں پر تیل کا مساج کرنے کے بعد ان پر پٹی لپیٹنے سے قبل پٹی کو گرم کرنے کے لیے استری اٹھائی ہوگی اور پھر کہیں رکھ کر بھول گئی ہیں۔ صالحہ وقفے وقفے سے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ ان کا حافظہ ابھی اتنا بھی کمزور نہیں ہوا تھا اور یہ کہ ان کے پیروں پر لپیٹنے کی پٹی تو ویسے ہی گرم کپڑے کی بنی تھی، اسے مزید گرم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بوکھلاہٹ اور بڑبڑاہٹ رائنہ کی آمد تک جاری تھی اور مزید جاری رہتی اگر گھر میں داخل ہوتی رائنہ کے ہاتھ میں صالحہ کی استری نہ ہوتی۔

"ہائیں! یہ تمہارے پاس کہاں سے آگئی؟" رائنہ پر نظر پڑتے ہی صالحہ کے منہ سے بے اختیار نکلا اور ایبک کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ "میرا مطلب تمہیں کہاں سے ملی؟" صالحہ نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

"مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی استری سیڑھی پر کون رکھ گیا۔ مجھے تو اوپر آتے ہوئے ملی اور میں اٹھا لائی۔" رائنہ، صالحہ سے زیادہ حیران تھی۔ ایبک کا رکا ہوا سانس بحال ہونے لگا کہ

میں نے سنا تھا کہ اس وادی پر جنوں اور پریوں کا راج ہے، لگتا ہے اب جنات اور پریاں لوگوں کے گھروں میں گھس کر شرارتیں کرنے لگے ہیں۔" ظفر کو سسپنس بھری باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔

"خیر اس بات کا تو میں پتا لگا کر ہی رہوں گی کہ استری کون لے گیا اور کس نے سیڑھیوں پر رکھ دی۔" صالحہ نے غصے سے کہا۔ "پھر وہ چاہے کوئی جن نکلے یا پری، اسے سزا دے کر ہی چھوڑوں گی۔"

وہ اٹھ کر اورنگ زیب کے کپڑے استری کرنے چل دیں۔

"ہم تینوں رات بھر جاگتے رہے ہو تم ہی میں سے کسی کا کارنامہ لگتا ہے۔" رائنہ نے ان تینوں کو گھورا۔

"ہاں! ہم سیڑھیوں پر بیٹھ کر "بوٹیاں" استری کرتے رہے رات بھر اور آج ہمارا پیپر خراب ہو جائے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ایبک اٹھتے ہوئے بولا۔

"چلو اب اٹھ جاؤ، لیٹ ہو رہے ہیں۔" اس نے باقی تینوں کو بھی اٹھایا۔

☆ ☆ ☆

دن گزرتے گئے۔ پرچے ختم ہوئے، کالج کی معمول کی سرگرمیاں دوبارہ شروع ہو گئیں اور صالحہ بھی استری والی بات بھول گئیں، لیکن اس رات کے اس غیر معمولی واقعے نے ایبک کو چچی اور سطوت کے بارے میں پر تجسس کر دیا تھا۔ وہ گھر میں آتے جاتے، سیڑھیاں چڑھتے اترتے، نچلے پورشن میں ہونے والی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس گھر کی چوڑائی کم لمبائی زیادہ تھی۔ داخلی دروازے سے اندر داخل ہو تو ایک لمبی راہداری سے گزر کر چھوٹا سا صحن اور صحن کے ساتھ بنے دو کمرے تھے۔ جن میں سے ایک باورچی خانہ اور دوسرا بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ طویل راہداری میں سے گزرتے ہوئے آنے والا گھر کے "تقریباً" سارے سامان سے متعارف ہو جاتا تھا۔ دو ٹوٹے ہوئے مونڈھے جن پر گھسا ہوا کپڑا چڑھا کر ان کو مزید شکست و ریخت سے بچانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ اسی راہداری میں رکھے تھے۔ کپڑے دھونے کے ٹب، بالٹی، سرف، سوڈا اسی راہداری میں پائے جاتے تھے۔ یہیں پر ایک الگنی بندھی تھی جس پر ہمہ وقت گیلے کپڑے لٹکے نظر آتے تھے۔ کوئلے دہکانے کی انگیٹھی،

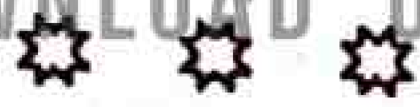
چمٹا اور کوئلے کی بالٹی بھی یہیں پڑی رہتی تھی۔ جس کے اردگرد اکثر راکھ بکھری ملتی۔

راہداری سے آگے صحن میں پالتو مرغیوں اور چوزوں کا دڑبہ رکھا تھا جس کے اردگرد مرغی کو ڈالا جانے والا دانہ اور ان کی خشک ہوئی بیٹ کا ڈھیر بکھرا نظر آتا۔ کچن میں داخل ہو تو سیمنٹ کی سلیب پر رکھا ایک برنر کا چولہا اور چند برتن رکھے نظر آتے۔ کچن چوڑائی میں بس اتنا تھا کہ ایک آدمی بہ مشکل کھڑا ہو کر وہاں کوئی کام کر لے۔ کچن کے ساتھ بیڈ روم تھا جو گھر کے مکینوں کے بیڈ روم' لاؤنج' کھانے کے کمرے اور اسٹڈی روم کا کام بیک وقت سرانجام دیتا تھا۔ اس کمرے میں موجود لکڑی کے پرانے ڈبل بیڈ پر اکثر کپڑے' کتابیں' کھانے کے برتن اور دواؤں کے ڈبے بکھرے ملتے۔

بیڈ کی ایک سائیڈ پر سرخ اور نیلے پرنٹ کی جرسی کا لحاف اوڑھے سطوت کی امی پڑی رہتی تھیں۔ دیکھنے میں بیمار' کمزور اور لاغر نظر آتیں' کھانسی کا دورہ پڑ جاتا تو رکنے میں نہیں آتا تھا۔ زیادہ بولنے کی کوشش کرتیں تو کھانسی کے مارے ہانپ جاتیں اسی لیے دو چار لفظوں میں اپنی بات کہہ دینے کی عادی ہو چکی تھیں۔ کوئی پرانا شناسا انہیں اس حال میں دیکھ لیتا تو یقین نہ کر پاتا کہ یہ وہ قمر آرا۔ ہیں جن کے طمطراق کے قصے کسی زمانے میں مشہور تھے۔ زمانہ حال میں تو وہ شکستگی اور بے بسی کی تصویر نظر آتی تھیں۔ خود تو اکثر آنکھیں بند کیے پڑی رہتیں اور گھر کی ویرانی اور بدحالی کو خالی نظروں سے دیکھنے کے لیے سطوت اکیلی رہ جاتی۔

''ارے بیٹی' جوان جہان ہو' ہمت والی ہو' گھر کو صاف ستھرا اور قرینے سلیقے سے رکھا کرو۔ لڑکیاں تو اپنے سگھڑاپے ہی سے پہچانی جاتی ہیں۔''

گھر میں آنے والی واحد مہمان محمدی خالہ جو اس کی امی کی دیرینہ دوست تھیں اپنی آمد پر اس سے کہتیں' لیکن اس نے ان کی کبھی ایک نہ مانی تھی۔ وہ گھر کی اس بدحالی اور ویرانی کی عادی ہو چکی تھی۔ اس نے زندگی میں گنتی کے چند ہی اچھے دن دیکھے تھے اور اب تو اسے ان اچھے دنوں کے منظر بھی یاد نہیں آتے تھے۔ وہ اسی حال میں مست اور گم تھی۔ بیماریاں اور سخت مالی پریشانی کا شکار سطوت کو اب کوئی اچھی بات سوجھتی تھی ہی نہیں' نہ ہی سمجھ میں آتی تھی۔



اس روز وہ بہت دنوں بعد گھر سے باہر نکلی تھی۔ وادی میں کئی دنوں کی مسلسل برف باری کے بعد سورج نے بادلوں کے پیچھے سے سر نکالنے کی کمزور سی کوشش کی تھی۔ برف باری سے ٹھٹھرے جسموں کے لیے سورج کی یہ ہلکی سی کرن بھی حیات بخش معلوم ہو رہی تھی۔ خود سطوت کو بھی اپنے گھر کے نیم تاریک سیلن زدہ ماحول سے باہر نکل کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کئی طویل دن کسی قبر میں گزارنے کے بعد باہر نکلی ہے۔ سڑک پر رونق تھی اور راستوں پر کھڑے لوگ سورج کی تمازت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ امی نے اسے تاج خان کے اسٹور سے سودا سلف لانے کے لیے بھیجا تھا۔

''تاج خان سے کہہ دینا' رقم قمر آرا کے کھاتے میں درج کر لے اور سودا دے دے' بعد میں ادا کر دیں گے۔'' امی نے لحاف سے منہ باہر نکال کر کہا تھا۔

''بعد میں' بعد میں'' امی کے یہ الفاظ پورے راستے اس کے کانوں میں گونجتے رہے تھے۔

''کون سا بعد' کتنی دیر بعد' کیسا بعد۔'' وہ سوچتی رہی تھی۔ ''اللہ جانے اس بعد کو کب آنا تھا' آنا بھی تھا یا نہیں۔'' ہاتھ میں پکڑے اس بٹوے کو سختی سے پیٹ کے ساتھ لگائے وہ آہستہ قدموں سے چل رہی تھی۔ اس بٹوے میں گھر کے داخلی دروازے کی چابی اور چند سکوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا' لیکن ہاتھ میں اس کا موجود ہونا اسے عجیب سے تحفظ کا احساس دے رہا تھا۔

''انڈے ایک سو پچیس روپے درجن ہیں' اب بتاؤ لینے ہیں یا نہیں۔'' انڈوں کا بھاؤ سن کر تو اسے جیسے چکر آ گیا تھا۔

"ایک سو پچیس روپے درجن۔" اس نے دل میں دہرایا۔ "اور امی کا کہنا تھا کہ وہ انڈے لیے بغیر گھر میں نہ گھسے۔"

"فائن آٹا کتنا چاہیے اور دالیں کتنی کتنی تولوں۔"

تاج دین اسے گم صم دیکھ کر جھنجلانے لگا تھا۔ "مجھے اور گاہکوں کو بھی دیکھنا ہے۔ باجی قمر آرا سے کہنا تھا ناکہ خود آتی سودا لینے، بچی کو بھیج دیا جس بے چاری نے آج تک کبھی سودا خریدا ہی نہیں اسے کیا معلوم کیا اور کتنا لینا ہے۔" تاج دین بڑبڑاتا ہوا آٹا' چاول' دالوں اور نمک' چینی سے بھری بوریوں کی طرف چلا گیا جو اس کے اسٹور کے سامنے رکھی تھیں۔

"اوہو' چاچا تاج دین' خود سے باتیں کرنے کے مرض نے تمہیں بھی آلیا کیا۔" کوئی نیا گاہک اسٹور کے باہر موٹر سائیکل روک کر تاج دین سے پوچھ رہا تھا۔

"خود سے نہیں ایک نئی اور ناتجربہ کار گاہک سے بات کر رہا ہوں۔ بے چاری کو کچھ پتا نہیں کہ وہ کیا لینے آئی ہے۔" تاج دین نے آنے والے کو مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"اپنی باجی قمر آرا نہیں۔" اس نے نئے گاہک کو بتایا تھا اور اس بستی میں کتنے لوگ تھے جو قمر آرا کو نہیں جانتے تھے' یقیناً" یہ نیا گاہک بھی جانتا ہوگا۔"

اسٹور کے اندر کھڑی سطوت کو ایسا لگا جیسے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔

"ہاں ہاں۔۔۔ پھر۔" نئے گاہک کی آواز سنائی دی۔

"اسی کی بیٹی ہے جو سودا لینے آئی ہے۔ بے چاری بچی کب سے گم صم کھڑی ہے۔ اسے پتا ہی نہیں کیا خریدنا ہے اور کتنا خریدنا ہے۔" تاج دین نے بتایا۔

"جی رزاق صاحب' کتنے چاول تولوں۔" اب غالباً" وہ کسی اور گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

سطوت کو اسٹور کے اندر اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔

"امی کدھر ہیں تمہاری جو تم سامان خریدنے چلی آئیں' وہ بھی اکیلے۔" کوئی غالباً" اس سے ہی پوچھ رہا تھا' اس نے گردن گھما کر دیکھا اس کے سامنے ایک کھڑا تھا۔

"ہونہہ" اس کو کیا کہ ہمارے گھر سے کون سامان خریدنے آتا ہے۔ یہ ہوتا کون ہے پوچھنے والا۔" سطوت فوراً" ہی تنگ آگئی تھی' لیکن عجیب سی بات تھی کہ کچھ کرنے کے بجائے اس کے حلق سے منمناتی سی آواز نکلی تھی۔

"امی ٹھیک نہیں ہیں۔ چل نہیں سکتیں۔" اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔

"اچھا! اب یہاں تک آ ہی گئی ہو تو تاج دین کو بتاتیں کیوں نہیں کہ تمہیں کیا خریدنا ہے۔" وہ کولہوں پر ہاتھ رکھے ہوئے بولا تھا۔

"کیوں کیا تمہیں خود بھی نہیں پتا کہ کیا لینے آئی ہو۔ امی نے کچھ بتا کر نہیں بھیجا تھا۔" سطوت کی خاموشی پر وہ رعب سے بولا تھا۔

"امی نے بتایا تھا۔" سطوت کی آواز آنسوؤں کے گولے میں پھنس کر رہ گئی تھی اسے عجیب سی بے بسی محسوس ہو رہی تھی۔

"تو پھر؟" وہ ابرو چڑھا کر بولا۔ "خریدتی کیوں نہیں۔"

"سب چیزوں کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں' اتنی نہیں ہیں جتنی امی نے بتائی تھیں۔" وہ ایک مرتبہ پھر منمنائی۔

"اوہ!" وہ جیسے اس کے مسئلے کو سمجھتے ہوئے بولا تھا۔ "پیسے کم پڑ گئے ہیں کیا؟"

"پیسے؟" سطوت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو اس کے سگے تایا کا بیٹا تھا مگر کوئی ناشناسا بھی اتنا اجنبی نہ ہوگا جتنا وہ اجنبی تھا۔

"پیسے تو نہیں ہیں میرے پاس۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے خالی بٹوے کو مٹھی میں رول کر کے چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ماشاء اللہ!" جواب میں اس نے بے اختیار کہا تھا۔ "بغیر پیسوں کے ہی گھر سے سودا لینے نکل آئی

تھیں۔"

"امی نے کہا تھا کہ دکان والے سے کہنا، قمر آرا کے کھاتے میں رقم لکھ لے، بعد میں دے دیں گے پیسے۔" وہ بہت زیادہ سمجھ دار تھی نہ ہی اسے انا اور انا پرستی جیسے لفظوں کے معنی کا علم تھا لیکن نجانے کیوں یہ بات ایک کے سامنے دہراتے ہوئے اس کا دل بے اختیار زار زار رونے کو چاہنے لگا تھا۔

"ہوں!" جواب میں اس نے یوں ہی کولہوں پر ہاتھ دھرے دھرے سطوت کو عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ "سب سامان ختم ہے یا کچھ بچا ہوا بھی ہے۔" وہ پوچھ رہا تھا۔ جواب میں سطوت کی نظروں نے اسے لمحہ بھر میں صورت حال سمجھا دی تھی۔ وہ مڑ کر تاج دین کی طرف چلا گیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد سطوت، تاج دین کے اسٹور سے باہر نکلی تھی۔ اس کا وہ تایا زاد جو کسی اجنبی سے بڑھ کر اجنبی تھا اس کے گھر کے سودا سلف کے لفافے اپنے موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر رکھے گھر کی طرف رواں تھا اور وہ خود ان ہی آہستہ قدموں سے پیدل چلتی پیچھے آرہی تھی جن آہستہ قدموں سے چلتی یہاں تک آئی تھی۔ اس روز تاج دین کے اسٹور پر جہاں آرا کے کھاتے میں سامان کی قیمت ادھار کی مد میں لکھے جانے کے بجائے نقد داموں لکھی گئی تھی اور سطوت کے گھر پہنچنے سے پہلے اس کے گھر کی دہلیز پر سامان اسی طرح رکھا تھا جیسے چند ہفتوں پہلے نصف رات کے قریب وہ استری وہاں رکھ گیا تھا۔ سطوت نے سیڑھیوں کے پاس رک کر سامنے دیکھا تھا۔ اس کی بائیک سیڑھیوں کے نیچے کھڑی تھی اور خود وہ غالباً "اوپر جا چکا تھا۔

اس بار بھی وہ فرشتہ بن کر نیکی کرنے آیا تھا یا انسان بن کر احسان کرنے، سطوت اس بار بھی سمجھ نہ پائی البتہ اس بار اس نے ایک کے اس عمل کے بارے میں سوچا ضرور تھا۔



"رضوان بتا رہا تھا چچی بیمار ہیں، خون تھوکنے لگی ہیں۔ گلے سے پس بھی نکلتی ہے۔" یہ محض اتفاق تھا کہ اسی رات اورنگ زیب نے صالحہ کو اطلاع دی تھی۔

"کوئی نیا ڈراما ہو گا۔" صالحہ بالکل بھی متاثر نہ ہوئیں کہا۔ "خون تھوکنے کے زمانے تو زمانہ ہوا لد گئے اب کون خون تھوکتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ماما! لیکن رضوان بتا رہا تھا کہ کوئی عجیب سی بیماری لگ گئی ہے انہیں، کتنے ہی ٹیسٹ ہو چکے ہیں، بیماری پکڑی نہیں جاسکی۔" اورنگ زیب نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی۔

"کوئی بیماری ہو گی تو پکڑی جاسکے گی نا۔" صالحہ نے ہاتھ اٹھا کر بے پروائی سے کہا۔ "تم اس عورت کی مکاریوں کو نہیں جانتے۔ ضرورت پڑنے پر حلق میں انگلیاں ڈال کر خون اچھالنے کا ڈراما بھی کر سکتی ہے وہ۔" اورنگ زیب نے نظر اٹھا کر ایک کی طرف دیکھا جو کھانا کھانے میں یوں مگن تھا جیسے اس نے اس کی اور ماما کی باتیں سنی نہ ہوں۔

"ایک بار ابا جی کے سامنے خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے حلق میں انگلیاں ڈال کر الٹیاں کرنے کا ڈراما کیا تھا اس نے، بتانا چاہتی تھی کہ سجاد کے انتقال کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ سجاد کے دوسرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ سب جھوٹ ثابت ہوا بعد میں۔" صالحہ نے سر جھٹکا۔

"خیر یہ تو جب کی باتیں ہیں نا جب وہ جوان تھیں، ان میں ہمت تھی اب تو کمزور اور بے دست و پا ہو چکیں وہ، اب کیا ڈراما کریں گی اور کس کے ساتھ۔" نجانے کیوں اورنگ زیب، رضوان کی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"جو بھی ہے، تم اتنا زور کیوں لگا رہے ہو ایک اڑتی اڑتی خبر سن کر اسے سچ ثابت کرنے کے لیے۔" چپاتی والی ٹوکری کی طرف بڑھتا ہاتھ روک کر انہوں نے اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔

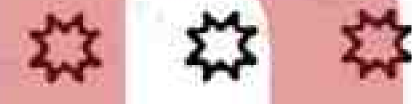
"زور تو نہیں لگا رہا۔" اورنگ زیب سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تو یہ بتا رہا ہوں وہ بیمار ہیں۔"

"ہوتی رہے ' ہماری بلا سے۔" صالحہ نے ایک بار پھر بے نیاز بنتے ہوئے کہا۔ "اس بستی میں کئی ایسے لوگ ہیں جن سے بہت دوستی یاری ہے اس کی سنبھال لیں گے وہ سب اس کی بیماری بھی جیسے پہلے اس کی تندرستی میں اس کے کام آیا کرتے تھے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ!" اورنگ زیب نے شانے اچکائے اور ایک بار پھر ایبک کی طرف دیکھا جو کھانے کے بعد گڑ کی ڈلی منہ میں ڈال رہا تھا۔ گڑ کی ڈلی چوستے ہوئے ایبک کی نظریں اورنگ زیب کی نظروں سے چار ہوئیں۔

"تم جانتے بھی ہو بھائی! کہ ماما' چچی کے معاملے میں کیسے ری ایکٹ کریں گی' پھر کیوں اتنی لمبی بات کی تم نے؟" ایبک کی نظریں کہہ رہی تھیں۔

"بس یوں ہی۔" اورنگ زیب کی نظروں نے جواب دیا تھا۔



امی نے ماموں کی طرف سے ملنے والی رقم کا ایک ایک نوٹ گننے کے بعد دو نیلے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ "لو ابھی جا کر تاج خان کا حساب چکتا کر آؤ۔" یعنی بالآخر وہ بعد آپہنچا تھا جس میں تاج خان کو رقم کی ادائیگی کی جانی تھی۔

"ان پیسوں میں سے کچھ بچ جائیں شاید' آپ کہیں تو کالج سے داخلہ فارم اور پراسپیکٹس خرید لاؤں۔" اس روز احساس ہوا تھا کہ اسے سیدھی طرح بات کرنے کے بجائے منمنانے کی عادت پڑتی جا رہی ہے۔ شاید اسے اپنے سامنے موجود ہر شخص سے خوف آنے لگا تھا۔

"بہت شوق ہے تمہیں کالج میں پڑھنے کا۔" امی نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا تھا۔ "رو رو کر میٹرک کرنے والی لڑکیوں کو کالج میں داخلہ مل جاتا ہے؟"

"رزلٹ برا نہیں ہے میرا' سیکنڈ ڈویژن پر داخلہ آسانی سے مل جائے گا۔" وہ ایک بار پھر منمنائی۔

"ایک کالج ہے پوری وادی میں اور وہاں بھی لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں۔" امی کا یہ عذر پرانا تھا۔

"تو کیا ہوا' تم اسکول میں بھی تو ایسا ہی سسٹم تھا۔" اب کے اس کا لہجہ قدرے مضبوط ہوا۔

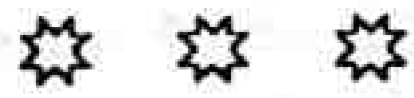
"چلو مان لیا' ان میں سے جو پیسے بچیں گے ان سے داخلہ فارم اور پراسپیکٹس آجائے گا لیکن اس کے بعد داخلے کی فیس' سیکیورٹی اور دسیوں اخراجات۔" انہوں نے ابرو چڑھاتے ہوئے پوچھا تھا۔ "وہ کون بھرے گا۔"

"وہ میں عظمیٰ سے لے لوں گی۔" اس نے دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا۔ "بعد میں واپس کر دیں گے اسے۔" یہ بات کہہ کر اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"بعد میں کوئی ہن برسا جائے گا کیا ہماری اس کال کوٹھڑی پر۔" امی کو بعد میں والی بات ہی سب سے بری لگی تھی۔ "بعد میں واپس کر دیں گے۔" وہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولیں۔

ہاں اس کی ماں کا یہ وہ انداز اور موڈ تھا جس کے سامنے وہ پہلے بھی کبھی نہیں بولی تھی اور اس روز بھی خاموش ہی رہی تھی۔

"چلو۔" چند منٹ کے وقفے کے بعد وہ خود ہی بولیں۔ "داخلہ فارم لے آنا' داخلے کے بارے میں پھر سوچیں گے۔" انہوں نے ایک انتہائی غیر متوقع بات کی۔



کالج تو بہت بڑا تھا لیکن اس میں پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ مقامی لڑکوں میں تو پڑھنے کا رجحان بہت ہی کم تھا اور لڑکیوں کو اگر پڑھنے کا شوق تھا بھی تو وہ میٹرک کر لینے کو ہی غنیمت سمجھتی تھیں۔ اسی لیے داخلہ آفس سے فارم خرید کر باہر گراؤنڈ میں نکلتے ہی اس کی نظروں نے ایبک اور اس کے تینوں دوستوں کو دیکھ لیا تھا۔ گراؤنڈ کے ایک کونے میں وہ چاروں بیٹھے چائے کے ساتھ سموسے کھا رہے تھے اور کسی بات پر

ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ بھی ہو رہے تھے۔
"کیسی مزے کی زندگی ہے ان کی' ہر وقت ہنستے' کھلکھلاتے' قہقہے لگاتے رہتے ہیں۔" اس کے کان ان چاروں کی ہنسی کی آواز سے مانوس تھے۔ وہ چاروں اکثر ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ہوئے ہی ان سیڑھیوں پر چڑھا اور اترا کرتے تھے جن کے نیچے سطوت رہتی تھی۔
"یہ چاروں ہی بہت لائق فائق ہیں۔" عظمیٰ کی نظر بھی ان چاروں پر پڑ چکی تھی۔
"میرے داجی بتا رہے تھے کہ یہ جو لڑکا ظفر ہے نا' اس کے گھر کے گیراج میں بیٹھ کر یہ چاروں کسی گاڑی کا ماڈل بناتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ دعوا کرتے ہیں کہ وہ گاڑی شمسی توانائی سے چلا کرے گی۔"
"ہاں میں جانتی ہوں' یہ چاروں اتنے لائق ہی ہیں کہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" سطوت کے لہجے میں بے وجہ ہی تلخی گھل گئی۔ اس کی نظریں ایک پر جمی تھیں جو کسی بات پر ہنستے ہوئے رائنہ کے ہاتھ پر ہاتھ مار رہا تھا۔
اسی لمحے ہنستی ہوئی رائنہ کی نظر بھی خود سے فاصلے پر کھڑی خود کو دیکھتی سطوت پر پڑی تھی اور اس کا ہاتھ ہوا میں ہی کہیں رکا رہ گیا تھا۔
"ارے ایک ۔۔۔۔ تمہاری کزن۔" اس نے سطوت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "لگتا ہے دو سالوں میں ایک ایک کلاس پڑھتی ۔۔۔ یہ بالآخر کالج تک پہنچ ہی گئی۔" وہ چاروں اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"ڈرنا نہیں سطوت ڈرنا نہیں! اگر جو داخلہ ہو گیا تو پھر تو یہ چاروں روزانہ ہی نظر آیا کریں گے' ان سے ڈر گئیں تو سمجھو مر گئیں۔" سطوت خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی' اور ابھی وہ اس کوشش میں تھی کہ دائیں طرف مڑتے گھاس کے قطعے پر مڑ جائے کہ اس نے دیکھا' ایک باقی تینوں کو پیچھے چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔
"چلو عظمیٰ' اب ہم یہاں کیوں کھڑے ہیں۔" اس نے گھبرا کر عظمیٰ سے کہا تھا۔
"تو بھول بھی گئیں ہم فائزہ کا انتظار کر رہے ہیں' وہ داخلہ فارم لینے والوں کی قطار میں پھنس گئی ہے۔" عظمیٰ حیرت سے بولی تھی۔ "اچھا تم ٹھہرو۔ میں اسے دیکھ کر آتی ہوں۔" وہ اسے مزید بولنے کا موقع دیے بغیر واپس داخلہ آفس کی طرف مڑ گئی تھی۔ اتنی سی دیر میں ایک اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔
"ہلاؤ۔۔۔" سلام دعا کا تکلف کیے بغیر اس نے سطوت کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سطوت نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔
"داخلہ فارم مانگ رہا ہوں۔۔۔ بھرنا تو آتا نہیں ہو گا تمہیں۔" اس نے پراعتماد انداز میں کہا تھا۔
"میں تو یوں ہی آگئی یہاں۔ پتا نہیں مجھے داخلہ لینا بھی ہے یا نہیں۔" سطوت نے لاشعوری طور پر فارم والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔
"کیوں؟" وہ تیوری چڑھا کر بولا۔ "کیوں نہیں لینا داخلہ؟"
"ابھی فیصلہ نہیں ہوا نا' اس لیے۔" وہ سادگی سے بولی تھی۔
"تم فارم مجھے دو' فیصلہ بعد میں کرتی رہنا۔" ایک نے ایک بار پھر ہاتھ بڑھایا تھا۔ "ڈاکومنٹس کی فوٹو کاپیاں ہیں تمہارے پاس؟"
"ہاں ہیں' لیکن ان کا کوئی فائدہ نہیں' ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔"
"کہا نا فیصلہ بعد میں کرتی رہنا' ڈاکومنٹس کی کاپیز بھی لاؤ ادھر۔" وہ بڑھے ہوئے ہاتھ کی انگلیاں نچاتے ہوئے بولا۔
"امی بتائیں گی کہ میں داخلہ لے سکتی ہوں یا نہیں' وہ بتائیں گی کہ وہ فیس بھر سکتی ہیں یا نہیں' داخلے کا فیصلہ اس کے بعد ہو گا۔" ایک کی ہٹ دھرمی دیکھ کر وہ آگے کو جانے لگی۔
"تو پھر آج کیا کالج کی عمارت کا نظارہ کرنے آئی تھیں؟" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔
"نہیں۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش

محسوس ہونے لگی۔ "نہیں بس قسمت کے کاغذ کی طرف ہاتھ بڑھانے آئی تھی بعد میں یہ دکھ تو نہ ہوگا کہ کوشش ہی نہیں کی تھی۔"

"پرابلم کیا ہے آخر۔" وہ اس کے لہجے میں نمی محسوس کرچکا تھا۔

"بیماری، مفلسی، رقم، اخراجات۔" اس نے رک کر براہ راست ایبک کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ "یہ پرابلم ہے بس۔"

وہ جواب دینے کے بجائے کچھ دیر دم بخود کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔ اور اس کے بعد اس نے ایک بار پھر ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"فارم اور ڈاکومنٹس کی کاپیز۔"

سطوت نے رک کر اسے دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا ڈاکومنٹس فولڈر اس کی طرف بڑھادیا۔ وہ اس پر اعتبار کررہی تھی۔ جو خود، جس کے ماں باپ اور دادا سب اس کی امی کے مطابق ناقابل اعتبار تھے اور جن کے سائے سے بھی اسے دور رہنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ محض ایک استری ہی تو تھی۔ جو اعتبار کی شاہراہ کے آغاز پر رکھی گئی تھی، اس رات کے بعد تعلق اور رشتے کی چادر پر سے بے اعتباری کی سلوٹیں اچانک سے ہی مٹنے لگی تھیں۔ سطوت جو محسوس کررہی تھی کیا وہ سچ تھا، اس نے ایبک کو فولڈر پکڑا کر ٹھیک کیا تھا، اس کے دل میں جو خیال آرہا تھا کیا اسے درست ماننا چاہیے تھا یا نہیں۔

اس نے یہ باتیں سوچنے میں ایک پل بھی ضائع نہیں کیا تھا اور فولڈر ایبک کے ہاتھ میں دے کر خود کالج کے مین گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی اس کالج میں داخلہ مل جانا اور یہاں پڑھنا اس کا مقدر بن چکا تھا۔ کالج سے واپسی پر وہ صرف یہی ایک سوچ لے کر گھر واپس آئی تھی۔



"ہر دوسرے مضمون میں تینتیس نمبر لے کر پاس ہونے والی لڑکی کو ایف اے کرنا چاہیے یا ایف ایس سی۔" سطوت کے ڈاکومنٹس پر نظر ڈالتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے داخلہ فارم کو کس مضمون کے ساتھ بھرنا مناسب ہوگا۔

"اتنی تیز طرار، حاضر دماغ ماں کی بیٹی اتنی کند ذہن۔" اس کا ذہن الجھنے لگا۔

"خدا جانے ایسے رزلٹ اور گریڈ کے ساتھ اسے کسی بھی ڈسپلن میں داخلہ ملے گا بھی یا نہیں۔" نجانے کیوں اس کا دل اس خیال پر بری طرح دکھا تھا۔ "پھر بھی قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے، کوئی مسئلہ ہوا تو چواین لائی سے علیحدگی میں مل کر سفارش کی جاسکتی ہے، چواین لائی کے کل تیرہ اسٹوڈنٹس میں ہمیشہ ٹاپ پر رہنے والا اسٹوڈنٹ اگر ایک چھوٹی سی داخلہ پرچی اس سے بنوانے جائے تو وہ انکار تو نہیں کرے گا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"چلو تو پھر طے ہے لڑکی کہ تم کو کالج جوائن کرنا ہی کرنا ہے۔" اس نے سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے سوچا تھا۔ کاش تمہارے نمبرز تھوڑے سے ہی سہی مگر بہتر ہوتے۔ ان حالات میں تو عربی، فارسی جیسی کوئی زبان پڑھنے کے ساتھ ساتھ سوکس اور اسلامیات جیسے مضامین کا کامبینیشن ہی پڑھ سکوگی۔" اس نے پوائنٹر اٹھا کر داخلہ فارم بھرنا شروع کیا۔ نام سطوت آرا، والد کا نام سجاد احمد، اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔



مارچ کا مہینہ شروع ہوچکا تھا۔ موسم کی شدت میں کمی آنے لگی تھی۔ صالحہ نے دریچے کے آگے بنی منڈیر پر رکھے گملوں کو آنکھوں پر چشمہ لگا کر غور سے دیکھا۔ پھولوں کی پنیری موسم کی شدت کے مارے سر نہوڑائے پڑی تھی۔ انگلی کی پور سے ایک سر گرائے ڈنڈی کو اٹھاتے ہوئے ان کی نظر نیچے صحن میں پڑ گئی۔

مارچ کی ہلکی دھوپ کی کرنیں صحن میں بکھر رہی تھیں۔ اور وہاں بچھی ایک چارپائی پر جہاں آرا بیٹھی تھیں۔ ملگجی سی اونی شال شانوں پر پڑی تھی اور بال

خُلا سے نکل کر بکھر رہے تھے۔ وہ لمحہ بھر کو چونک گئیں۔ عین اپنے فرش کے نیچے رہنے والی قمر آرا کو وہ کتنے عرصے کے بعد دیکھ رہی تھیں‘ یہ انہیں یاد نہ تھا لیکن اس ایک لمحے میں انہیں محسوس ہوا جیسے جتنا وقت ایک دوسرے کو دیکھے بنا درمیان میں سے آیا تھا وہ گزرتے ہوئے اپنے سارے نقوش اس کے چہرے پر چھوڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے‘ بکھرے ہوئے نصف سفید نصف سیاہ بال‘ چہرے پر پڑتی جھریاں‘ جہاں آرا غالباً ”اپنا ہی سایہ بنی ان کی نظروں کے سامنے بیٹھی یوں سانس لے رہی تھیں جیسے سانس لینے میں دقت محسوس کر رہی ہوں۔

”تو اورنگ زیب ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔“ نامعلوم وجہ کی بنا پر طبیعت مکدر ہو جانے پر وہ پنیری کا جائزہ لینے کا ارادہ ملتوی کرتی صوفے پر آکر بیٹھ گئیں۔

”ایسی بھی کیا بیماری کہ اتنے کم عرصے میں ڈھل ہی گئی یہ۔“ انہیں خیال آیا تھا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے نا!“ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد انہوں نے خیالات کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی۔

”سجاد کے بعد جس طرح کھل کے یہ اپنے داؤ پیچ کھیلتی رہی ہے‘ اس میں تیزی ہی اتنی تھی کہ وقت بھی سٹ پٹا کر اس پر سے دوڑ گیا ہوگا۔ اس وادی کا کون سا ایسا مرد ہوگا جسے اس نے اپنی اداؤں سے لبھاتے ہوئے اس سے ذاتی فائدے نہ اٹھائے ہوں گے۔“ ان کا حلق کڑوا ہونے لگا۔

”سنا ہے‘ ہر روز صبح بن سنور کر سُرخی اور پاؤڈر تھوپ کر گھر سے نکل جایا کرتی تھی۔ اس سے لفٹ لینا‘ اس سے ادھار‘ کسی تیسرے سے قرض لینا‘ چوتھے سے تحائف لینا معمول بن گیا تھا اس کا‘ گھر میں ادھار کی سبزی گوشت‘ سودا سلف آتا تھا۔

انہوں نے پہلو بدلتے ہوئے سر جھٹکا۔

”توبہ توبہ میری تو اپنی نظروں کا روزہ بھی ٹوٹ گیا صبح صبح اس پر نظر پڑنے سے‘ ہم تو بھائی۔“ انہوں نے تیزی سے اٹھ کر کھڑکی کے پردے برابر کردیے۔ ”اتنے برس اپنی نظروں کا بصارت کا پردہ کرتے رہے کہ کہیں بھولے سے بھی نظر پڑ جائے اور دل کے زخم ہرے ہو جائیں۔ جیسی اذیت قمر آرا نے اپنے مرحوم سسر اور جیٹھ کو پہنچائی‘ جس طرح جائز ناجائز جیسے بورے اس زیادتی کی فصل تو بھیا ایک دن کاٹنی ہی پڑتی ہے۔“

انہوں نے ایک بار پھر سر جھٹکا۔

”اچھا بھئی‘ ہمیں کیا۔ جس کا فعل وہ ہی بھگتے۔ ہم بیٹھے سوچ کر کیوں اپنا اعمال نامہ بھاری کریں۔“

گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے انہوں نے یہ آخری بات سوچی تھی۔

کہنے کو تو وہ قمر آرا سے متعلق ہر سوچ ذہن سے جھٹک کر وہاں سے اٹھی تھیں لیکن دن بھر کے کام کاج کے دوران وہ چہرہ وقت جس پر وقت اپنے نشان چھوڑ کر کے گزر چکا تھا ان کے لاشعور میں بیٹھا تھا۔



”لگتا ہے کالج میں تم چاروں آپس میں ہی مگن رہتے ہو‘ ارد گرد کیا ہو رہا ہے تمہیں کوئی خاص خبر نہیں ہوتی۔“

اورنگ زیب کو ایبک سے بات کرنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ اکثر اس کی واپسی رات گئے ہوتی۔ کھانا کھا کر وہ جلدی ہی سونے کے لیے لیٹ جاتا اور ویک اینڈ پر ایبک کہیں نہ کہیں مصروف ہوتا تھا۔ اس لیے دونوں آپس میں بہت کم بات کر پاتے تھے۔ لیکن اس شام یہ سوال اس نے خاص طور پر اس کے کمرے میں آکر پوچھا تھا۔

”کالج میں غیر معمولی واقعات ہوتے ہی کتنے ہیں جو ہم سے چھپے رہ سکتے ہیں۔ ویسے بھی وہاں کی آبادی اتنی کم ہے کہ ارد گرد کی خبریں پوشیدہ رہ ہی نہیں سکتیں‘ آپ بتائیے کیا خبر ہاتھ لگ گئی آپ کے۔“ اس نے بال پوائنٹ کو کتاب کے صفحے میں پھنسا کر کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ۔“ اورنگ زیب نے بات کرنے سے پہلے گلا کھنکھارتے ہوئے دائیں بائیں یوں دیکھا جیسے کسی کے سننے کا خطرہ محسوس کر رہا ہو۔ ”نیچے والی چچی کی جو

لڑکی ہے، سنا ہے کالج پہنچ گئی پڑھنے۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"ہوں۔" ایبک کی سمجھ پر رازداری برتنے کا انداز اب عیاں ہوا تھا۔ "آپ کو کس نے بتایا؟" اس نے اس جاسوس کا سراغ لگانا چاہا تھا جو اورنگ زیب بھائی کو نچلی منزل والوں کی خبریں سنا جاتا تھا۔

"رضوان بتا رہا تھا۔" اورنگ زیب نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"ایسی سب خبریں رضوان آپ کو خاص طور سے بتاتا ہے یا پھر آپ خود کریدتے ہیں اسے۔" ایبک زیرِ لب مسکرایا تھا۔

"میں کیوں پوچھوں گا بھلا اس سے۔" اورنگ زیب کا لہجہ بدلا۔ "خود ہی بتا جاتا ہے۔"

"اچھا!" ایبک نے یوں ہونٹ سکیڑے جیسے اورنگ زیب کے تجاہل عارفانہ پر یقین نہ آیا ہو۔ "اسے منع کردیں آپ کو ایسی خبریں نہ سنایا کرے یا پھر سننی پڑ ہی جائیں تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا کریں۔"

"تو میں کون سا کان میں ڈالے بیٹھا ہوں۔" اورنگ زیب خفا ہوگیا۔ "ایک بات سنی تھی، تم سے اس لیے پوچھ لیا کہ اسی کالج میں پڑھتے ہو، تم نے ذکر تک نہیں کیا۔"

"اس لیے ذکر نہیں کیا کہ میں ایسی خبریں ایک آنکھ سے دیکھ کر دوسری سے اڑا دیا کرتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"مطلب تم نے دیکھا ہے اسے وہاں۔" اورنگ زیب اپنے مطلب کی بات پر اٹک گیا۔

"ہاں دیکھا تو ہے۔"

"یعنی یہ خبر صحیح ہے۔" اورنگ زیب نے سر جھکا کر غور کیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ایبک کی طرف دیکھا۔ "ویسے وہ پہنچ کیسے گئی کالج...... میرا مطلب ہے، سنا تھا بہت ہی نالائق اور کوڑھ مغز اسٹوڈنٹ ہے۔ مشکل سے میٹرک پاس کیا ہے اس نے۔"

"کمال ہے، رضوان کو تو بڑی خبر ہوتی ہے ہر بات کی۔" ایبک نے بے ساختہ کہا "مطلب یہ بھی اسی نے بتایا ہوگا۔" "ہے نا۔" اورنگ زیب کے گھورنے پر اس نے بات کی وضاحت کی۔

"رضوان کو کیا پتا ہوتا ہے کیا نہیں، اسے چھوڑو، مجھے تو صرف یہ پتا ہے کہ تمہاری نظر اور کان صرف اپنے من پیاروں کو دیکھتے اور ان ہی کی سنتے ہیں۔ اس لیے تم سے کوئی دوسری بات کرنا ہی فضول ہے۔"

اورنگ زیب اس کے بے نیازانہ رویے پر تلملا کر کھڑا ہوگیا۔ "بڑی ہی محدود دنیا ہے تمہاری۔ نہیں پوچھوں گا تم سے کچھ اور اب اور ہاں! جاتے جاتے اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ "اب ماما کو مت بتانے بیٹھ جانا کہ میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔"

"میری بات تو سنیں، بیٹھیں تو۔" ایبک نے اٹھ کر اسے روکنا چاہا تھا لیکن وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

"کیا مسئلہ ہے یار؟" اس کے جانے کے بعد واپس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے سر جھٹکا۔ ماما اور اورنگ زیب بھائی کا مزاج بالکل ایک جیسا ہے، پل میں تولہ پل میں ماشہ، اب کوئی پوچھے کہ ان کو نچلے پورشن والی چچی کی لڑکی کے معاملات میں کب سے دلچسپی ہوگئی اور کیوں ہوگئی۔"

"اورنگ زیب کو ادھر ادھر کی باتیں سننے کا چسکا ہے۔" اسے مریم کی بات یاد آئی، مریم جوان دونوں کی خالہ زاد تھی اور غالب تھا کہ اورنگ زیب کی شادی مریم سے ہوگی۔

"اورنگ زیب بس دوسروں کے متعلق کن سوئیاں لیتا رہتا ہے اور اکیلا بیٹھا ان خبروں کے چسکے لیتا ہے۔ کسی کا کیا بن رہا کیا بگڑ رہا ہے، اس میں اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ بے ضرر انسان ہے، اسی لیے تو میں بھی اس کو خاندان بھر کی خبریں نمک مرچ لگا کر سنایا کرتی ہوں۔"

مریم کی یاد آجانے پر وہ بے ساختہ مسکرادیا۔ مریم اور سارا ننھیال کراچی میں رہتا تھا۔ ان لوگوں میں سے شاید ہی کبھی کوئی ان سے ملنے ادھر آیا ہو۔ بچپن میں موسم

سرما کی چھٹیوں میں ماما اورنگ زیب اور اسے ساتھ لے کر بڑے اہتمام کے ساتھ کراچی جایا کرتی تھیں اور وہ چھٹیاں بہت ہی اچھی گزر رہی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ آنا جانا کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا اور اب تو اکثر فون پر رابطے کے سوا کوئی رابطہ نہ رہا تھا۔ مریم ایم ایس سی کر رہی تھی اور قوی امکان تھا کہ اس کی تعلیم ختم ہوتے ہی ایک بارات اس وادی سے کراچی جانے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسلامیات کی کتاب میں قرآنی سورتیں بمعہ ترجمہ کے شامل تھیں جنہیں یاد کرنے میں اسے دقت محسوس ہوتی تھی۔ کاش وہ عربی زبان اور گرائمر سے واقف ہوتی، پھر یہ کام کتنا آسان لگتا۔ کالج سے واپس آکر بکھرے ہوئے گھر کو سمیٹنے کے دوران وہ سوچتی۔ میڈم صدیقہ کا نام صدیقہ کے بجائے عزرائیل ہونا چاہیے' زیر زبر کی ذرا سی غلطی پر بھی پکڑ کر کلاس سے باہر نکال دیتی ہیں اور قسمت اتنی خراب تھی کہ آرٹس بلاک کے جس کمرے میں اسلامیات کی کلاس ہوتی' اس کے ساتھ کا برآمدہ سائنس بلاک کے بالکل سامنے تھا۔ سزا کے طور پر کلاس سے باہر نکالے جانے والے بچوں کو' سائنس بلاک کی بالائی منزل پر موجود کلاس رومز میں کھڑکیوں کے قریب بیٹھے لڑکے لڑکیوں کے مذاق کا نشانہ بننا پڑتا۔

اسلامیات کی کلاس میں دس لڑکیاں اور صرف ایک لڑکا پڑھتے تھے۔ دس میں سے لڑکے سمیت چھ سات طالب علم تو مضمون میں ویسے ہی بہت اچھے تھے۔ دو لڑکیاں اکثر غیر حاضر رہتیں' اور باقی بچ جانے والی دو لڑکیوں میں سے ایک سطوت سجاد تھی جو ہر دوسرے دن کلاس سے باہر نکالی گئی ہوتی تھی۔ اسے اور اس کے ساتھ کھڑی کسی اور لڑکی کو دیکھ کر کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھے لڑکے لڑکیاں دانت نکالے ہنسے جا رہے ہوتے' شومئی قسمت اگر کوئی پیریڈ خالی جا رہا ہوتا تو استاد کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے باقی لوگ بھی اٹھ کر کھڑکیوں کے قریب آکر جھانکنے لگتے۔

"ارے اگر سبق یاد نہیں ہوتا تو گھر بیٹھ کر کشیدہ کاری کیوں نہیں سیکھ لیتیں۔"

"ارے ارے دیکھو' پھر باہر کھڑی ہیں اسلامیات کی ماسٹرز!"

"کتنے شرم کی بات ہے' دین مذہب کی چار باتیں ہیں ان کو وہ بھی یاد نہیں ہوتیں۔"

سائنس کے اسٹوڈنٹس کی بلند آواز میں کی گئی یہ گفتگو اور فقرے نیچے کھڑی سزا کا گھنٹہ کاٹتی لڑکیوں کے کانوں تک صاف پہنچتی تھیں۔ وہ ایسے فقرے اور آوازوں سے کٹ کٹ جاتی تھی' لیکن جتنی ایسی باتیں سنتی' اتنا ہی جیسے اس کا ذہن کمزور ہوتا چلا جاتا تھا۔ خود پر سے رہا سہا اعتماد بھی اٹھنے لگتا۔

"نہیں میں کبھی بھی پورا سبق یاد کر کے نہیں سنا سکوں گی۔" اسے یقین ہونے لگتا۔ عربی دنیا کی مشکل ترین زبان لگنے لگتی' جبکہ یہ تو اختیاری مضمون تھا' اس کا حال انگریزی لازمی میں اس سے بھی بدتر تھا۔ شکر تھا کہ انگریزی کلاس بالکل مخالف سمت واقع کمروں میں سے ایک میں ہوتی تھی۔ ورنہ سائنس بلاک والے تو اس کا پورے کالج میں جلوس نکال چکے ہوتے۔

"خیر اب تو مجھے عادی ہو جانا چاہیے۔" چولہے سے چائے کی دیگچی اتارتے ہوئے اس نے اس کے نیچے جمی کالک دیکھتے ہوئے سوچا۔ اسکول میں بھی تو یہ ہی کچھ ہوتا تھا۔ جب ہی تو ایک ایک جماعت پاس کرنے میں دو' دو سال لگا دیے میں نے۔"

عادی تو خیر ہو جاؤں گی۔" دیگچی کی کالک زیادہ تھی اور اس دن اس کو دھویا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اگلے روز اردو لازمی کا ٹیسٹ تھا جس کے الفاظ مترادف یاد کرنے ہی میں کئی گھنٹے لگنے والے تھے۔ اس لیے اس نے دیگچی اس نل کے نیچے رکھ دی جہاں پہلے ہی دھونے والے برتنوں کا ڈھیر جمع تھا۔

"بلکہ ابھی تک مجھے عادی ہو جانا چاہیے تھا۔" پیڑھی سے اٹھتے ہوئے اسے خیال آیا۔ "اگر ہر روز

باقی فقروں کی طرح ایک یہ جملہ میری طرف نہ اچھالا جاتا۔

"ٹھیک ہے امی! جلدی سے ادھر آکر دیکھو تمہاری رنگ باز کزن آج بھی سزا کے طور پر کلاس سے باہر کھڑی ہے۔" اس کی سماعت سے وہ جملہ بازگشت کی طرح ٹکراتا تھا۔

"یہ لڑکی رائنہ اور اس کے وہ تینوں دوست۔" اس نے دانت پیسے۔ خدا کی مار ان پر، خدا جانے کب یہ لوگ کالج سے فارغ ہو کر یہاں سے دفعان ہوں گے۔ ویسے ہی جیسے اسکول سے دفعان ہو گئے تھے کم بخت۔ ان کے اسکول سے جانے کے بعد ہی میں نے سکون سے پڑھنا شروع کیا تھا اب یہاں سے نکلتے نکلتے انہیں کتنا وقت لگے گا۔ اس وقت تک تو سمجھو میں روزانہ رات کو روتے روتے ہی سویا کروں گی۔ اس کا دل اپنے دکھ پر دکھنے لگا۔ اب خدا جانے رائنہ کے بلانے پر وہ آکر کھڑکی سے نیچے جھانکتا بھی تھا یا نہیں، لیکن سطوت پر تو گھڑوں پانی پڑ جاتا تھا نا۔ اس کا دل چاہتا پورے ٹائم ٹیبل میں سے اسلامیات کا گھنٹہ نکل جائے یا پھر میڈم صدیقہ کی ٹانگ ٹوٹ جائے اور وہ سال چھ مہینے کے لیے بستر پر پڑ جائیں۔ نہ ان کی کلاس ہوگی نہ ہی سزا ملے گی۔ لیکن اس دل کے چاہنے کا کیا ہے یہ تو بہت سی ناممکن باتیں چاہتا ہے۔



اسلامیات کے گھنٹہ میں اسے سزا ملے تو اسے دیکھتا تھا یا نہیں لیکن اس روز ڈاک خانے سے واپس آتے ہوئے اس نے اسے ضرور پکڑ لیا تھا۔ کالج سے واپسی پر اس نے ڈاک خانے جانے کے لیے وہ راستہ اختیار کیا تھا جو اسے امی نے بتایا تھا۔ امی کا کہنا تھا کہ اس راستے پر زیادہ لوگوں کا آنا جانا نہیں ہوتا تھا اس لیے اسے گھبراہٹ نہیں ہوگی۔ بستی کا سالوں پرانا ڈاکیہ پاکستان خان، اس مہینے امی کا منی آرڈر نہیں دے کر گیا تھا۔ اور ایک بار پھر گھر کے خرچے میں تنگی نے آگھیرا تھا۔

امی کی ٹانگیں دن بہ دن پہلے سے زیادہ کمزور ہو رہی تھیں اور وہ چارپائی سے باتھ روم تک فاصلہ بھی بمشکل طے کر پاتی تھیں، اسی لیے گھر سے باہر کے انتہائی ضروری کام سطوت کے سر ہی آپڑے تھے۔ پاکستان خان، ہر ماہ باقاعدگی سے سات تاریخ تک منی آرڈر پہنچا جاتا تھا لیکن اس ماہ کی پچیس تاریخ تک انتظار کے باوجود اس کے نہ آنے کے سبب اسے امی کے کہنے پر ڈاک خانے تک جانا پڑ رہا تھا۔ وہ راستہ واقعی سنسان اور طویل تھا۔ وہ اپنے دھیان میں چلتی، فاصلہ طے کرنے میں مگن تھی، جب ایک کی موٹر بائیک اس کے قریب آرکی تھی۔

"کدھر؟" کسی سلام دعا کے بغیر اس نے سطوت کے چونک کر رک جانے پر انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ اور اگر وہ امی کے بتائے ہوئے راستے کے بجائے دوسرے راستے کی طرف چلی جاتی۔ جس کا چند لمحوں پہلے وہ سوچ رہی تھی تو یقیناً" اس کے قریب رکنے والا ایک نہیں بھیڑیا ہوتا جو اسے چیر پھاڑ کر کھا جاتا۔ اسے خیال آیا تھا۔

"ڈاک خانے!" اس کے جواب پر ایک نے حیرت سے دیکھا تھا۔ "وہ کس لیے؟"

"ڈاک خانہ کیوں جاتے ہیں؟" اس نے الٹا سوال پوچھا۔

"وہ نہیں۔" اس نے یوں سر ہلایا جیسے اسے سطوت کی دماغی حالت پر واقعی شک ہو۔ "آج کل لوگ نہ تو چٹھیاں لکھتے ہیں، نہ بھیجتے ہیں۔ غلط کہہ رہی ہو تم، بتاؤ! کہاں جا رہی تھیں۔"

وہ یقیناً" کوئی نہیں ہوتا تھا اس پر شک و سوال کرنے والا، لیکن سطوت کے ذہن پر استری، تاج چاچا کے اسٹور کا سامان اور کالج میں داخلہ کا قرض سوار تھا۔ اس نے اسے منی آرڈر کے متعلق بتایا۔

"کتنے پیسے بھیجتے ہیں تمہارے ماموں منی آرڈر سے۔" اس نے کوئی اور سوال کرنے کے بجائے رقم کی بابت کیوں پوچھا تھا، یہ سطوت نے نہیں سوچا اور اسے رقم بتا دی۔

"ہوں!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "تم یہیں رکو' میں پانچ منٹ میں پتا کر کے آتا ہوں تمہارے منی آرڈر کا۔" اس نے بائیک کو کک مارتے ہوئے کہا اور وہ وہیں سڑک کنارے پڑے اونچے پتھر پر بیٹھ گئی۔ اچھا ہی ہوا تھا' جو اس کے بجائے ایک ڈاک خانے تک چلا گیا تھا۔ پتھر پر بیٹھنے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ تو چلتے چلتے تھک چکی تھی۔ کینوس کے بوٹوں میں بند اس کے پیر دکھ رہے تھے۔ وہ پانچ کے بجائے دس منٹ بعد واپس آیا تھا۔ اس کے پاس سطوت کے لیے کچھ اچھی خبر نہیں تھی۔ ماموں نے اس مہینے منی آرڈر نہیں بھیجا تھا۔

"پاکستان خان بھی چھٹی پر ہے ورنہ تمہیں بتا جاتا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"پاکستان خان کہاں گیا؟" منی آرڈر نہ آنے کے صدمے سے بے حال ہوتے ہوئے اس نے خوامخواہ ہی ایک سوال پوچھا۔

"چھٹی پر ہے' بتایا تو ہے۔"

"چھٹی پر کہاں گیا؟" وہ گھر کے خرچے کی تنگی کو چند منٹوں کے لیے بھلا دینا چاہتی تھی' شاید اسی لیے بے تکے سوال پوچھ رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے ہندوستان گیا ہو یا پھر افغانستان یا ایران یا عربستان۔" "غالباً" وہ اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا' تب ہی اس نے اسے ہنسانے کی احمقانہ کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اس کا دل رکھنے کے لیے بھی ہنس نہ سکی تھی۔ اسے رہ رہ کر امی کی دوائیں اور کھانے کا سامان یاد آرہا تھا۔ اس کا ذہن اعداد و شمار میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اگلے ماہ اگر سات تاریخ تک انتظار کرنا پڑا تو معاملات کیسے چلیں گے۔ نظر کے سامنے کھڑے اونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھتی ہوئی وہ یہی سوچ رہی تھی۔ اس دوران قریب ہی اپنی بائیک سے کمر ٹکائے' بازو سینے پر باندھے کھڑا وہ اسے دیکھتا رہا تھا۔

"جوس پیو گی' چپس کھاؤ گی؟" اس نے ماحول کا سکوت توڑتے ہوئے بائیک کے ہینڈل سے لٹکے شاپر سے جوس کا ٹن اور چپس کا پیکٹ نکالتے ہوئے پوچھا تھا۔ اور سطوت نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

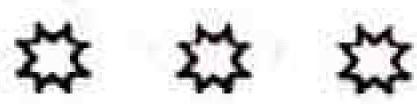
اس روز اسے واپسی میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ جس وقت وہ گھر واپس پہنچی مغرب کی اذان میں تھوڑا ہی وقت باقی تھا۔ گھروں کی بتیاں جل چکی تھیں اور وادی میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

"چاہے تم مر جاتی' اکیلی یہاں پڑے پڑے ہی۔" امی نے اسے دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا تھا۔

"کس نے کہا تھا کہ سیدھے کے بجائے الٹا لمبا اور سنسان راستہ بتائیں۔ ایسے راستوں پر بھیڑیے بھی بیٹھے ہوتے ہیں' پتا ہے نا۔" اس نے ان کے کپڑے بدلواتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں ہاں' اس پوری وادی میں ایک تو ہی تو ریڈ رائیڈنگ ہڈ ہے' جس کا راستہ بھیڑیے نے روکنا تھا۔" امی اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولی تھیں۔ جوڑوں کے درد کی دوا کے ری ایکشن سے ان کی جلد خشک ہو رہی تھی جس میں ہر وقت خارش اور جلن ہوتی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' میں ریڈ رائیڈنگ ہڈ نہیں ہوں' اور میرے راستے میں بھیڑیا بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو فرشتہ ہے شاید جو اپنی چھڑی گھما کر میرے مسئلے ایک پل میں حل کر دینے کے لیے متعین کر دیا گیا ہے۔" اس نے امی کا بستر ٹھیک کرتے ہوئے سوچا تھا۔



یہ لڑکی تو واقعی کوڑھ مغز اور احمق نکلی۔ "رات کو ایبک نے سونے سے پہلے بستر پر لیٹے لیٹے سوچا۔ شاید اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں اسے بچپن ہی سے ایسے حالات ملے کہ اس کی ذہنی نشوونما ہی نہ ہو سکی۔" اسے' اس ہی سہ پہر میں سطوت کی سنائی باتیں یاد آرہی تھیں۔ سڑک کے کنارے بڑے سے پتھر پر بیٹھی' پیر پر پیر رکھے جوس پینے اور چپس کھانے کے دوران اس نے کیسے ایبک کے سامنے اپنا دل کھولا تھا۔

اپنے گھر کے عین نیچے والے گھر کے اندر کے حالات سے وہ کبھی واقف نہ تھا۔ اسے تو اس حصے کا نقشہ بھی یاد نہ تھا۔ لہٰذا جو نقشہ سطوت کھینچ رہی تھی، اس کے مطابق تو اس گھر میں رہنے کی جگہ بہت کم تھی۔ دادا نے یقیناً گھر بناتے ہوئے نچلے حصے پر توجہ کم ہی دی ہوگی۔ لیکن اس حصے میں رہنے کا فیصلہ خود چچی سر اراے نے ہی کیا ہوگا اور پھر جو ترکہ زبردستی لینے پر مصر ہوئی تھیں اس اصرار میں بھی تو اس نچلے حصے میں رہائش کی ترجیح شامل تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ ایبک کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، لیکن وہ اتنا ضرور جان گیا تھا کہ اس سرنگ نما لمبائی اور کم چوڑائی کے پورشن کی رہائش ہی وہ کنٹوپ تھی جو سطوت کے ذہن کو کمزور کرتا رہا۔

"اسکول، کالج سے نکلنے اور گھر واپس آنے کے بعد سارا دن میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے کہ میں دھیان سے سبق سمجھ سکوں اور یاد بھی کرلوں۔" سطوت نے اسے بتایا تھا۔ اور پھر گھر میں کوئی پڑھانے والا بھی نہیں ہے۔"

"اور وہ تمہاری امی، وہ تمہیں نہیں پڑھایا کرتی تھیں کیا، جب تم اسکول میں تھیں۔" ایبک نے چپس کھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"امی!" اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"تمہاری امی تو تمہیں پڑھایا کرتی تھیں نا۔" اس نے ایبک کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے سوال پوچھ لیا۔ "مجھے ان کی وہ آوازیں یاد ہیں جو وہ تمہیں پڑھانے کے دوران ڈانٹتے ہوئے بولتی تھیں۔" وہ ایبک کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرا رہی تھی اور اس کی ہلکی بھوری آنکھیں ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کی روشنی میں چمک سی رہی تھیں۔

ایبک نے دلچسپی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جو صاف اور بے ریا نظر آرہا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں پر سنہری پلکوں کا سایہ تھا اور اس کی بھویں بھی سنہری ہی تھیں۔ بڑی سی چادر کے نیچے چھپے اس کے بال بھی یقیناً "سنہری رنگ کے ہوں گے" بالکل یوں جیسے گندم کی سنہری بالیاں سورج کی کرنوں سے منعکس ہونے کے بعد نظر آتی ہیں۔

وہ ایک پٹھان ماں کی بیٹی تھی اور اس کے چہرے پر اپنے پنجابی باپ کے گندمی نقوش کا ذرا سا بھی اثر نہ تھا۔

"ہاں، میری ماما مجھے پڑھایا کرتی تھیں اور پڑھاتے ہوئے صرف ڈانٹتی ہی نہیں تھیں، ضرورت پڑنے پر مار بھی لیا کرتی تھیں۔" ایبک نے اسی دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "اچھی خاصی پٹائی ہوتی تھی میری تو۔"

"مجھے پتا ہے۔" اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا اور ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی تھی۔ "تمہاری امی کو گھر سے باہر کے کام خود نہیں کرنے پڑتے تھے نا اس لیے۔"

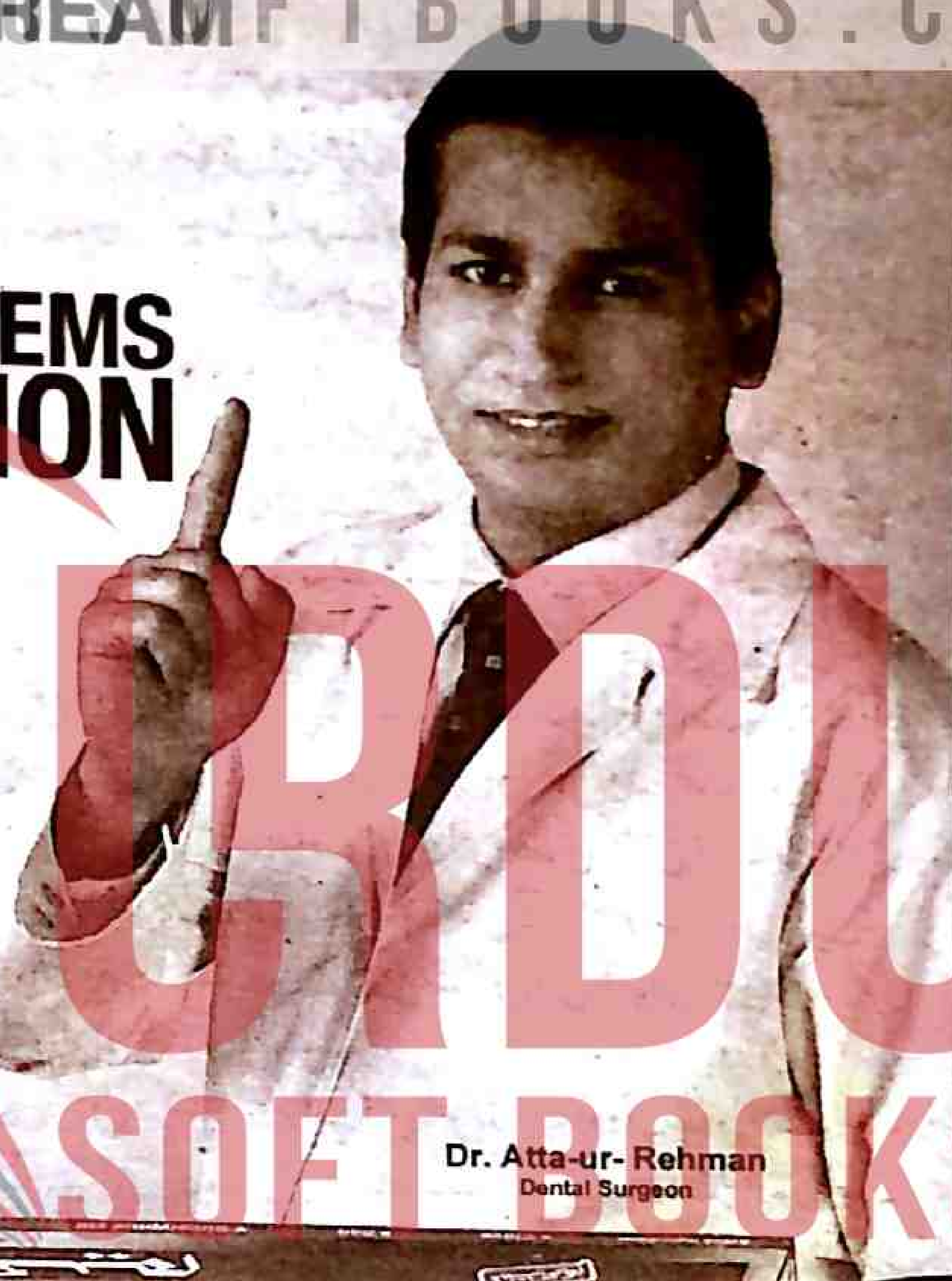
"تو تمہاری امی گھر کے باہر کیا کرتی رہتی تھیں؟ کچھ اندازہ ہے تمہیں؟" وہ روانی میں بول گیا تھا اور اپنی اس بات پر اسے پچھتاوا بھی ہوا تھا۔ جواب میں وہ کچھ نہ بولی بس اس کے صاف بے ریا چہرے پر ایک عجیب سا تاریک سایہ چھا گیا۔

"آئی ایم سوری۔ تمہیں میری بات بری لگی ہوگی۔" اس کے چہرے کے تاثر پر وہ مزید پچھتایا۔

"ہمیں کیا کہ کس کی امی کیا کرتی تھیں۔" جواب میں وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ "ہمیں تو بس اتنا پتا ہے کہ ہم اتنے نالائق ہیں کہ اسلامیات کا سبق یاد نہیں ہوتا۔ اور روزانہ سزا ملتی ہے ہمیں۔"

اس نے ایک ہی جملے میں موقع تلاش کرکے اپنی ہفتوں کی خفت کو جھٹکنے کی کوشش کی تھی جو اسے "ایبک! جلدی سے ادھر آکر دیکھو، تمہاری رٹا مار کزن آج بھی سزا کے طور پر کلاس کے باہر کھڑی ہے۔" والے جملے کے ردعمل میں دل میں محسوس ہوتی تھی۔

"تم ایسا کرو کالج سے چھٹی کے بعد اسی راستے سے واپس گھر جایا کرو کل سے۔" ایبک نے اس کی بات سن کر یوں تاثر دیتے ہوئے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو، ایک بالکل ہی مختلف اور عجیب سی بات کہی۔





Dentist's 1st Recommendation

"نہیں!!" جواب میں وہ سٹ پٹا گئی تھی۔ "مجھے پتا ہے کہ میں بہت بے وقوف ہوں لیکن اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں کہ اس لمبے راستے سے چل کر گھر جایا کروں۔" اس نے لفظ لمبا کو کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"سوچ لو..." ایبک نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ "میری بات مان لینے میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

"کیا فائدہ، کیسا فائدہ..." وہ پلکیں جھپکتے ہوئے بولی۔

"لمبے راستوں پر چلنے سے ذہن کو جلا ملتی ہے۔ وہ فریش ہو جاتا ہے اور اس کی استطاعت بڑھ جاتی ہے۔" ایبک کی منطق یقیناً اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی جب ہی اس کا سوال بنا چہرہ اس کی طرف اٹھا ہی رہ گیا تھا۔

"چلو تم ایسا کرو، دو تین دن ٹرائل کے طور پر اس راستے سے واپس جا کر دیکھو، میری بات سمجھ میں نہ آئے تو پھر بے شک پرانے راستے سے ہی چلی جایا کرنا۔" وہ نرمی سے بولا تھا۔ اب اس کا اٹھا چہرہ دوبارہ اثبات میں ہلا تھا اور پھر اس نے کوئی دوسری بات شروع کر دی تھی۔ اب کے ایبک نے اسے بغیر وقفے کے بولنے دیا تھا۔ اس کی اسی گفتگو کے دوران ایبک پر سطوت کی کند ذہنی اور بے چارگی کھلتی چلی گئی تھی۔ ساتھ ساتھ کند ذہنی اور بے چارگی کے درمیان تعلق بھی۔

✡ ✡ ✡

عظمٰی اکنامکس اور ہسٹری پڑھ رہی تھی۔ اس کی چھٹی سطوت سے ایک گھنٹہ پہلے ہو جاتی تھی اور یہ بھی اچھا ہی تھا کہ اسے واپسی پر گھر اکیلے آنا پڑتا تھا ورنہ چھوٹے اور آسان راستے کے بجائے لمبا اور مشکل راستہ اپنانے کے لیے تاویلیں کون گھڑتا۔ وہ پہلے دن کا آزمائشی سفر کر رہی تھی۔ عین اس پتھر کے قریب جس پر کل وہ بیٹھی تھی ایبک اپنی بائیک سمیت کھڑا ملا۔ سطوت کا سانس پھول رہا تھا، اس راستے کے نشیب و فراز اتنے تھے کہ وہ گنتے گنتے گنتی بھی بھول گئی تھی۔

"کیسی رہی یہ واک..." وہ خوشگوار موڈ میں پوچھ رہا تھا۔

سطوت کا دل چاہا وہ جواب میں اسے وہ سب گالیاں سنا دے جو اس کی امی پشتو میں اس کو دیتی تھیں اور جن کا مطلب اسے نہیں آتا تھا، لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا اور پتھر پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"لو سیب کھاؤ۔" اس نے بائیک کے ہینڈل کے ساتھ لٹکے شاپر سے سرخ سیب نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے سیب پسند نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"ارے کیوں پسند نہیں، جانتی ہو سیب طاقت کا کتنا بڑا خزانہ ہے۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "اینٹی آکسیڈینٹ ہوتا ہے سیب اور اینٹی آکسیڈینٹ غذائیں انسانی صحت کے لیے انتہائی مفید ہوتی ہیں۔"

"اینٹی بایوٹک کا تو سنا تھا یہ اینٹی آکسیڈینٹ کیا ہوتا ہے۔" وہ ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے پوچھ رہی تھی۔ جواب میں وہ اس لفظ کی تشریح کرنے لگا۔ اس نے اسے کون سی قابل قدر معلومات سنائی تھیں۔ سطوت نے نہیں سنا، بس اس کا دیا لال سیب کچر کچر کھاتی رہی۔

"چلو اب اپنی بکس نکالو۔" وہ قریب ہی پڑے ایک نسبتاً چھوٹے پتھر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ سطوت نے کچھ نہ سمجھ میں آنے کے انداز میں اسے دیکھا اور بیگ سے کتابیں نکال کر اسے پکڑا ئیں۔

"ہوں!" وہ ایک نظر سب کتابوں پر ڈالنے کے بعد بولا۔ "اپنا رجسٹر نکالو اب۔" سطوت نے رجسٹر نکالا اور اس کے بعد دنیا کی سب سے عجیب اور انوکھی ٹیوشن کا آغاز ہو گیا۔ ایسی ٹیوشن جو سرِ راہ پڑھائی جا رہی تھی اور جس کے اصول و ضوابط کسی نے طے نہیں کیے تھے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ ان کتابوں میں لکھی بیشتر باتیں جو ابھی تک سطوت کے پلے نہیں پڑی تھیں، آسانی سے سمجھ میں آنے لگیں۔

"ایب! دیکھو تو آج کی انوکھی بات، تمہاری رٹا مار

"کرن سزا کے طور پر کلاس سے باہر کھڑی لڑکیوں میں شامل نہیں ہے آج' خدانخواستہ نصیب دشمناں طبیعت تو خراب نہیں ہے آج اس کی؟ یقیناً" چھٹی پر ہوگی' ہے نا۔" اس سے اگلے ہی روز اسلامیات کے پیریڈ میں رائنہ ایبک سے کہہ رہی تھی۔

"چھٹی پر تو نہیں ہے' آج صبح میں نے خود اسے کالج کے گیٹ سے اندر آتے دیکھا تھا۔" ظفر نے جواب دیا تھا۔

"ہائیں!" رائنہ کے چہرے پر حیرت تھی اور ایبک اپنے کام میں یوں مگن تھا جیسے کچھ سنا نہ ہو۔

☆ ☆ ☆

"طلحہ نے کورٹ میرج کرلی' سنا ہے ماموں سخت ناراض ہیں سب گھر والوں سے۔" اورنگ زیب ناشتا بناتی صالحہ سے مخاطب تھا۔

"یہ بھی رضوان نے بتایا ہے آپ کو۔۔۔" کچن میں داخل ہو کر ایبک نے ماما کی مدد کی خاطر بریڈ سلائسز ٹوسٹر میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم سے تو میں بات ہی نہیں کر رہا۔" اورنگ زیب ابھی تک اس سے ناراض تھا۔

"کیوں' تم کیوں بات نہیں کر رہے بھائی سے۔۔۔" صالحہ نے فرائی انڈا پلیٹ میں نکالتے ہوئے پوچھا۔

"ان سے رضوان نے کہا ہے کہ اپنے بھائی سے کبھی کبھی ناراض ہو جایا کرو' صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔" ایبک مسکرایا۔

"ماما! یہ چاروں پوری بستی میں موٹر سائیکلیں دوڑاتے پھرتے ہیں' سارا دن۔ کالج والج کا بہانا ہے آج کل بس۔" اورنگ زیب نے تلملا کر جوابی وار کیا تھا۔

"ہاں سنا ہے رائنہ کو بھی موٹر سائیکل لے دی ہے اس کے ڈیڈی نے۔" صالحہ کو یاد آگیا۔

"صرف ایک دن ہوا ہے اسے موٹر سائیکل لیے ہوئے' اورنگ زیب بھائی اور رضوان نے آپ کو یہ بھی بتا دیا۔" ایبک ایک دفعہ پھر مسکرایا۔

"تو تم بتا دو۔۔۔ کیا کل تم چاروں کالج ٹائم میں موٹر سائیکل دوڑاتے نہیں پھر رہے تھے' گلیوں اور بازاروں میں۔"

"وہ تو ٹرائل ہو رہا تھا۔ رائنہ کی بائیک کا اور کالج ٹائم میں اس لیے کہ پڑھائی سے فری ہو چکے ہیں' ہم فائنل امتحان تک۔" وہ ناشتے کی پلیٹیں اٹھا کر ڈائننگ روم میں جاتے ہوئے بولا۔

"ویسے یہ جو رضوان ہے' اس کا گھر ڈاک خانے کی طرف جانے والے راستے کے دائیں بائیں تو نہیں ہے کہیں۔" ناشتہ کرتے ہوئے کوئی خیال آنے پر اس نے اچانک پوچھا۔

"اس راستے پر کسی کا گھر کبھی نظر آیا ہے تمہیں۔" اورنگ زیب اس جملے کو بھی رضوان پر طنز سمجھ کر ناراض ہوا۔

"ہے تو نہیں' لیکن وہ تو رضوان ہے نا' وہ تو کچھ بھی غیر معمولی کر سکتا ہے۔"

"ارے وہ پوسٹ آفس والا راستہ۔" صالحہ نے ناشتا کرتے کہا۔ "وہ تو سدا سے ویران ہے' جب ہم لوگ یہاں آئے تھے تو خچروں پر ڈاک لائی اور لے جائی جاتی تھی۔ شکر ہے اب تو ان خطوں' پوسٹ کارڈوں سے جان چھوٹی' یہ چھوٹا سا کمپیوٹر ہی ڈاک خانہ بن گیا ورنہ یقین مانو کبھی ادھر جانا پڑ جاتا تھا تو وہاں کے تصور سے ہی جان ہوا ہوئی جاتی تھی' میں تو اکثر پاکستان خان کو بخشش کا لالچ دے کر ادھر سے ہی ڈاک اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا کرتی تھی یا کمپنی کا نائب قاصد' کیا نام تھا اس کا بھلا سا۔ وہ لے جایا کرتا تھا اماں ابا کے نام لکھے خط۔۔۔"

"گھما دینے والا راستہ ہے' اتار اور چڑھاؤ سے بھرا ہوا' میں تو مر کر بھی ادھر جانا پسند نہ کروں' شکر ہے قبرستان بستی کے اندر ہی ہے۔" اورنگ زیب نے ناک چڑھا کر سر ہلایا۔

"بہت اچھا کیا محکمہ ڈاک نے جو اپنا ڈاک خانہ ادھر بنا لیا' نہ وہاں کوئی جاتا ہے نہ وہاں سے آتا ہے۔ فارغ بیٹھ کر تنخواہ کھانے کا اچھا موقع مل جاتا ہے انہیں۔"

ایک کا دل اس ساری گفتگو کے اختتام پر بہت خوش اور مطمئن تھا۔ نجانے کیوں۔

☆ ☆ ☆

جب استاد ذہین اور شاگرد کا ذہن دنیا کی ہر دوسری چیز سے ہٹا کر صرف پڑھائی پر لگا دینے والا ہو تو کمزور سے کمزور شاگرد بھی کچھ نہ کچھ پڑھ ہی جاتا ہے ایسا ہی سطوت سجاد کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ دیر سے گھر واپس آنے پر امی سے سو صلواتیں سنتی' کالج چھڑوا کر گھر بٹھا لینے کی دھمکیاں جھیلتی' طویل راستے سے گھر واپس آنے کی مشقت جھیلتی۔

ان کتابوں میں لکھی وہ باتیں سمجھ اور یاد کر رہی تھی جو اس سے پہلے دسیوں بار پڑھنے اور یاد کرنے پر بھی پلے نہیں پڑتی تھیں۔ وہ یہ سب کیوں کر رہا تھا۔ اس کے دل میں سطوت کے لیے ترحم تھا' وہ اس پر اتنا بڑا احسان کر رہا تھا۔

اسے سطوت کے ساتھ اپنے باپ کے تعلق کا لحاظ تھا یا وہ خود ہی بہت نیک دل تھا۔ سطوت اتنی لمبی چوڑی سوچوں میں زندگی بھر نہیں پڑی تھی۔ جو اسے سمجھ اور نظر آ رہی تھی وہ ایک ہی بات تھی' دن بہ دن اس کو مختلف کلاسوں میں ملنے والی سزائیں کم ہونے لگی تھیں اور وہ سر اٹھا کر ٹیچرز کو سبق سنانے اور لکھ کر دیے ٹیسٹ دکھانے لگی تھی۔ وہ دنیا جس میں آپ کو سر اٹھا کر جینے کا موقع مل جائے' چاہے کتنی مختصر اور محدود کیوں نہ ہو' آپ کا دل اسی میں لگنے لگتا ہے۔

سطوت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ اس کا دل ایک عجیب سی خوشی سے سرشار اور مطمئن رہنے لگا تھا۔ اسے کبھی یہ سوچنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اس کی خوشی اور اطمینان کی اصل وجہ کیا تھی۔ اس کے نزدیک کلاس کی چار دیواری کے اندر اٹھا ہوا اس کا اپنا وہ سر ہی تھا جو اسے ناقابل تسخیر قلعے فتح کر لینے کی سی خوشی دیتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس خوشی کے پس پردہ وہ احساس کس قدر خوش کن تھا کہ کوئی دوسرا تھا جسے اس کی فکر تھی جو اس کے مسائل پر توجہ دیتا تھا جو اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ دوسراہٹ کے کسی بھی احساس سے وہ اتنی ناآشنا تھی کہ اس کا دھیان اس بات کی طرف بھی گیا ہی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک کی برسوں سے چلتی ایک ہی روٹین میں ایک نامحسوس سی تبدیلی آ رہی تھی اور... یہ تبدیلی ظفر اور معاذ سے زیادہ رائنہ کو محسوس ہو رہی تھی۔

"آخر وہ روزانہ کالج سے آف ہو کر کہاں نکل جاتا ہے۔" اس روز ظفر کے گھر کے گیراج میں لوہے کے ایک ٹکڑے پر رنگ پھیرتے ہوئے اس نے اپنی الجھن کو الفاظ دے ہی دیے تھے۔

"وہ جوائن لائی کے ساتھ اپنا تعلق بڑھانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔" ظفر نے کسی پرانی گاڑی کے ہینڈل کی ساخت کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ یہ ہینڈل اس گاڑی کے دروازے کے لیے ناموزوں تھا جسے وہ آزمائشی طور پر شمسی توانائی کی طاقت سے چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

"اکیلے ہی اکیلے۔" رائنہ نے روغن کیا لوہے کا ٹکڑا گیراج سے باہر لے جا کر کھلی ہوا میں سوکھنے کے لیے رکھا۔ "ہم کیوں نہیں ہوتے اس کے ساتھ' جوائن لائی سے تعلقات بڑھانے کے وقت۔۔۔"

"اس لیے کہ ہم میں سے کسی کو بھی فارن کوالیفائیڈ کہلانے کا شوق نہیں۔" ظفر پرسکون لہجے میں بولا' یوں جیسے اسے ایک کی بدلی ہوئی روٹین سے کوئی سروکار نہ ہو۔

"چانس مل رہا ہو تو... لے لینے میں کیا حرج ہے' ہم بھی تو جا سکتے ہیں باہر پڑھنے کے لیے۔" رائنہ نے برا سا منہ بنایا۔ "وہ ہمیں اپنی اس کوشش سے الگ کیوں رکھتا ہے۔"

"پیر پھیلانے سے پہلے اپنی چادر ضرور دیکھنی چاہیے کتنی چوڑی اور کتنی لمبی ہے۔" معاذ گاڑی کے رنگ لگے ڈھانچے سے باہر نکل کر بولا۔ "ایک محنتی اور لائق فائق ٹائر ہے' اس کے لیے بنتا ہے

اونچے خواب دیکھنا اور ہم۔۔۔" اس نے سر جھٹکا۔
"پاس ہو جانا ہی غنیمت ہے۔"
"وہ بھی ایک کے بنائے نوٹس کے بل پر۔" ظفر نے منہ میں دبا چپس نکال کر کہا۔
"یعنی ابھی سے ایک سولو فلائٹ لینے لگا ہے۔"

رائنہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔ اس کے لیے یہ حقیقت تسلیم کرنا مشکل تھا کہ وہ چاروں جو ایک دوسرے کو اپنے اپنے مشغلوں سے ناواقف نہیں رکھتے، ایک انہیں اپنے مستقبل کے منصوبوں سے بے خبر رکھ رہا تھا۔

"کیوں سر کھپا رہی ہو رائنہ؟" معاذ نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اور وہ بھی ایک فضول اور بے کار سی بات پر۔ جلد یا بدیر ہم تینوں کو بھی اپنی اپنی سولو فلائٹس پکڑنی ہی ہیں۔ ہم میں سے کسی کا بھی انٹرسٹ وہ نہیں ہے جو ایک کرنا چاہتا ہے۔ تمہارا اپنا بھی نہیں پھر اس میں برا ماننے والی کیا بات ہے۔"

"بالکل۔" ظفر نے گیراج کے ساتھ لگی پانی کی ٹونٹی کھول کر ہاتھ دھوتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "فائنل پیپرز کے فوراً بعد میں اسلام آباد جانے والا ہوں۔ چچا کے پاس ٹھہر کر انٹری ٹیسٹ کی تیاری کروں گا۔ اب تم اس پر بھی برا مان جاؤ گی، ہے نا؟" وہ مسکرایا۔ "کیونکہ تم انٹری ٹیسٹ میں جانے کا ارادہ نہیں رکھتیں، لیکن کہو گی کہ ظفر اکیلا کیوں چلا گیا اسلام آباد۔۔۔۔"

رائنہ کچھ دیر وہیں کھڑے کھڑے ظفر کو یوں دیکھتی رہی جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر سر جھکا کر چلتی گیراج سے باہر کھڑی اپنی بائیک کی طرف مڑ گئی۔ ظفر اور معاذ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھٹک کر مسکرا دیے۔

"نہیں۔" بائیک اسٹارٹ کر کے ظفر کے گھر سے باہر لاتے ہوئے رائنہ نے سوچا تھا۔ "اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ظفر اور معاذ آگے چل کر کیا کرنے والے تھے۔ اس کے ذہن میں خود اپنے بارے میں بھی کوئی ایسا منصوبہ نہیں تھا کہ اسے بی ایس سی کے بعد کیا کرنا تھا، لیکن پھر بھی اسے اس بات سے بہت فرق پڑتا تھا کہ ایک اپنے لیے کیا منصوبہ بنا رہا تھا اور اس کے لیے وہ کیا کر رہا تھا۔ اگر ایک چوا ین لائی سے مدد لینے کے لیے کالج کے بعد ان کے گھر پر ان سے ملنے جاتا تھا تو باقی تینوں کو بھی اس کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ ظفر اور معاذ کو اگر ایسی ملاقاتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی تو بھی رائنہ کو ایک کے ساتھ ضرور ہونا چاہیے تھا اور اگر ایسا نہیں تھا تو اس کا مطلب تھا کہ ایک رائنہ کو نظرانداز کر رہا تھا۔

اس کے دل میں تپش سی اٹھنے لگی تھی۔ اسے خود بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ اس کی بائیک کس سمت جا رہی ہے، لیکن ٹھیک پندرہ منٹ بعد اس نے خود کو ایک کے گھر کے نیچے کھڑے پایا تھا۔ بائیک کھڑی کر کے، سر پر پہنا ہیلمٹ اتار کر ہاتھ میں پکڑے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے ایک کی چچی قمر آرا کے گھر کے کھلے دروازے سے باہر نکل کر پھیلتی جہاں آرا کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"معذور اور بے بس ماں، گیلے کپڑوں میں پڑی ٹھٹھرتی رہے، یہاں پروا کس کو ہے۔" اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے یہ الفاظ سنے اور اس کے بعد پشتو زبان میں دی جانے والی گالیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ اس آواز اور ان الفاظ کو نظرانداز کر کے باقی کی سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی آئی تھی۔

"کیا حال ہے بہادر اور قابل فخر لڑکی۔" حسب معمول صالحہ آنٹی نے اس کا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ وہ اس کے اپنی بائیک لے لینے اور بلا خوف اسے اڑاتے پھرنے پر بہت خوش تھیں۔

"اچھا ہے نا اب موقع بے موقع تمہیں ایک کی منتیں تو نہیں کرنی پڑتی ہوں گی نا کہ تمہیں وقت پر گھر پہنچا دے۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

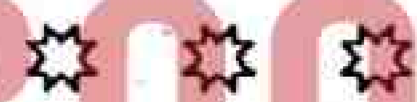
"اس میری ذمہ داری سے تو وہ آزاد ہو گیا ہے۔" رائنہ نے منہ بسور کر کہنا چاہا تھا۔ "جب ہی اپنی مرضی کے راستوں پر اڑنے لگا ہے۔" لیکن وہ یہ بات ان سے کہہ نہ پائی تھی۔ کیا خبر ان کو برا لگ جاتا۔ ان کا بیٹا

آخر اس کا ڈرائیور تو تھا نہیں جو وہ اس کی شکایت کرتی۔ پھر بھی وہ دبے لفظوں میں ان سے ایبک کی بدلی ہوئی روٹین کا ذکر کرنے سے باز نہ رہ سکی۔

"اچھا!" وہ چونکے بنا بولی تھیں۔ "وہ چوائن لائی سے دوستی بڑھانا چاہتا ہے۔" انہیں قدرے تعجب ہوا تھا، لیکن اگلے لمحے وہ مسکرادی تھیں۔ "میں نے ایبک کے پلانز میں دخل اندازی کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں کیونکہ وہ میرا ایسا بیٹا ہے جس نے ابھی تک اپنا راستہ خود بنایا ہے اور آگے وہ کیا کرنے والا ہے، کہاں جانے والا ہے، یہ بھی وہی بہتر جانتا ہے۔ مجھے اس کی وزڈم (سمجھ داری) پر کوئی شک نہیں۔"

"اچھا!" رائنہ کے دل کی تپش صالحہ سے اتنی سی بات کرکے پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ "بھلے وہ کہیں دور، پردیس ہی کیوں نہ چلا جائے پڑھنے کے لیے۔"

"ہاں تو چلا جائے۔" وہ بالکل بھی جذباتی نہیں ہوئی تھیں۔ "اس کی صلاحیتیں اپنا راستہ خود بنالیں گی۔ دیس میں بھی اور پردیس میں بھی۔" رائنہ نے ان کی طرف یوں دیکھا تھا جیسے انہوں نے بہت غیر متوقع بات کہہ دی ہو، لیکن وہ ان کے ساتھ بحث نہیں کرسکتی تھی کیونکہ بحث کرنے کے لیے کسی وجہ کی، کسی منطق کی ضرورت تھی اور رائنہ کو فی الحال کوئی وجہ اور منطق سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔



تاج چاچا کے رجسٹر میں امی کے کھاتے میں ادھار کے نام پر کوئی بھی رقم باقی نہیں تھی۔ سطوت نے کھاتے کی تفصیل چار بار چیک کی اور پھر بھی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کے اپنے حساب سے دو، ڈھائی ہزار کی رقم ہونی چاہیے تھی جب کہ وہاں کھاتہ صاف تھا۔

"میرا دماغ اور حساب کمزور ہے۔" اس نے تیسری بار سوچنے کے بعد فیصلہ کیا۔ "بھول جاتی ہوں، پرانا حساب دماغ میں باقی رہ گیا، یہ یاد نہیں رہا کہ وہ تو چکا دیا تھا۔" وہ خود پر مسکرائی۔ کب چکادیا تھا، یہ سوچنے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ خوش تھی کہ پچھلا کھاتہ صاف ہونے کی وجہ سے اب وہ اپنی مرضی سے دل کھول کر خریداری کرسکتی تھی اور اس نے دل کھول کر ہی خریداری کی تھی۔

وہ بڑے بڑے شاپرز اس کے گھر تک کیسے پہنچیں گے، ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ بوتل کے کسی جن کی طرح ایبک کی موٹر بائیک گھوں گھوں کرتی تاج چاچا کی دکان پر آرکی۔

"کیا الم غلم خرید ڈالا تم نے آج۔" وہ پردے کے پیچھے کھڑی سطوت کا عکس دکان کے شوکیس کے شیشے میں دیکھ کر بلا تکلف پردے کے پیچھے والے حصے میں چلا آیا تھا اور سطوت کے سامنے بڑے بڑے شاپرز رکھے دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

"کچھ نہیں، بس وہی مہینے بھر کا سودا۔" ایک عجیب سی فرحت اور سکون کی کیفیت کی سرشاری میں ڈوبی سطوت نے بے نیازی سے جواب دیا تھا۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔" وہ شاپرز کے اندر جھانکتا ہوا بولا۔ "اتنی فضول خرچی اور یہ بے کار کی چیزیں۔" وہ شاپرز میں ہاتھ ڈال کر چیزیں باہر نکالتے ہوئے بولا۔ سطوت کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نکالی ہوئی چیزیں تاج چاچا کے کاؤنٹر کے اوپر واپس جاچکی تھیں۔ اچار، چٹنیوں اور مربوں کے جار، کارن فلیکس، خشک دودھ کے ڈبے اور نجانے کیا کچھ۔

"یہ دالیں، گھی، چینی، صابن، سرف اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ بہت کافی ہیں۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا تھا۔ "چلو اٹھاؤ انہیں اور چلتی بنو۔" اس نے نیا بل بنوانے کے بعد چٹکی بجاتے ہوئے اسے وہاں سے اٹھ جانے کا اشارہ دیا تھا۔

سطوت کی پھیلی ہوئی آنکھیں کبھی ایبک کو اور کبھی اپنے شاپرز سے نکلی ہوئی چیزوں کو دیکھتی تھیں اور کبھی تھوڑے سے سامان کو اپنے اندر سموئے سکڑے سمٹے شاپرز پر جا ٹھہرتیں۔ کچھ ہی دیر پہلے یہ تھیلے کیسے پھولے پھولے اور بھاری نظر آرہے تھے۔ اس کا دل اداس ہونے لگا، لیکن یہ ہوتا کون تھا اس پر اپنی مرضی مسلط کرنے والا۔ لمحہ بھر کو اسے ایبک پر شدید غصہ آیا تھا اور اس نے اسی غصے میں کچھ بولنے کے لیے اس کی

طرف دیکھا بھی تھا۔

"دیکھ کیا رہی ہو؟ اٹھاؤ شاپنگ بیگ اور کھسکو یہاں سے۔" اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ ڈپٹ کر بولا تھا۔ "باہر اندھیرا پھیل رہا ہے، لگتا ہے، تمہیں تماشا بننے کا شوق ہو راشت میں ملا ہے۔"

اس نے سخت بات کہہ دی تھی، اتنی سخت کہ سطوت کا دل اس کی چبھن سے پل بھر میں خون و خون ہونے لگا تھا۔ لحہ بھر پہلے جو بپھر کر اس سے سوال کرنے والی تھی کہ وہ ہوتا کون تھا اس پر یوں رعب ڈالنے والا، لحہ بھر کے اندر ہی اس رعب کے زیر اثر منمناتی ہوئی کمزور لڑکی بن کر رہ گئی تھی۔ بے جان ہاتھوں سے شاپر اٹھا کر اس نے چادر سے جڑا نقاب چہرے پر ڈالا اور دکان سے باہر نکل گئی۔

"احمق گدھی۔" اس کے جانے کے بعد ایک نے بھنا کر سوچا۔ "یہ کیا جانے کہ اس کے اس سودا سلف کا بل چکانے کی خاطر کتنی بار میں اپنا جیب خرچ قربان کر چکا ہوں۔ نجانے کیوں یہ لڑکی سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت سے اس قدر محروم ہے۔" اس کی نظر سطوت کے سامان سے نکالے ہوئے ڈبوں اور جار پر جا رکی۔ "بے مقصد اور بے جا اخراجات۔" اس نے اس سامان کی مالیت کا اندازہ لگاتے ہوئے سوچا۔ اس کی امی نے بھی اسی اسراف کے ہاتھوں جائیداد، بینک بیلنس سب لٹا دیا۔" اس نے سر جھٹکا اور ان جار بوتلوں اور ڈبوں کے درمیان رکھے ایک کپ کیک اور اس کے ساتھ دھری نازک اور منی سی موم بتیوں کے پیکٹ کو تمسخرانہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ تو شکر ہے کہ میں بروقت پہنچ گیا ورنہ یہ تو مجھ پر نجانے کتنا ادھار چڑھا جاتی، احمق..... یہ بھی نہیں جانتی کہ اس کے ماموں اب باقاعدگی سے منی آرڈر نہیں بھیج سکیں گے۔ ڈاک خانے میں آئی ان کی چٹھی کے مطابق وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور اب باقاعدہ خرچ بھیجنے کی پوزیشن میں نہیں۔" اسے رہ رہ کر سطوت پر غصہ آ رہا تھا۔ "مگر یہ شاہ خرچی جو اسے اپنی ماں سے وراثت میں ملی ہے۔ اس کے ہاتھوں لگتا ہے بہت مجبور ہے پاگل۔"

کپ کیک اور موم بتی کے پیکٹ پر نظریں جمائے وہ کتنی دیر سوچتا رہا تھا۔

مگر وہ بات جو تاج چاچا کے اسٹور پر کھڑے، سطوت کی شاہ خرچ طبیعت پر کڑھنے کے دوران اس کے ذہن میں ایک بار بھی نہیں آئی تھی وہ اس رات بستر میں لیٹے ڈسکوری میگزین کے صفحے پلٹتے اچانک اس کے ذہن میں کرنٹ کی طرح دوڑ گئی تھی۔

"اوہ!" وہ میگزین چھوڑ کر تیزی سے اٹھا اور اپنی الماری کے دراز میں رکھے کاغذات الٹنے پلٹنے لگا۔ ان کاغذات میں دھری اسے اس ٹرانسپیرنٹ کور والی فائل کی تلاش تھی جس میں سطوت سجاد کے ڈاکومنٹس کی فوٹو کاپیاں بچی تھیں۔

"اچھا!" اس نے فائل ملنے پر اس کے کاغذات دیکھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ اس کے ذہن میں کرنٹ کی طرح دوڑ جانے والا خیال بالکل صحیح تھا۔ اکیس اپریل سطوت سجاد کا یوم پیدائش تھا اور وہ کپ کیک اور موم بتیاں اس کی نظروں کے سامنے تاج چاچا کے کاؤنٹر پر رکھی یہ دونوں چیزیں دوڑ گئیں۔

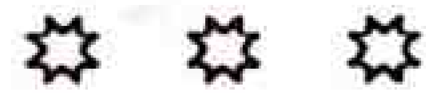
"وہ اپنی سالگرہ منانا چاہتی تھی، سیلیبریشن" بیڈ پر واپس بیٹھ کر وہ سوچ رہا تھا۔

"اپنی ماں کی الٹ ہے یہ بچی۔" اسے تاج چاچا کی کہی بات یاد آئی۔ "سیاجی قمر آرا، تو یوں منٹوں سیکنڈوں میں حساب کر لیتی تھی، جمع تفریق کی بڑی ماہر تھی۔ مگر یہ بچی، ذہن ہلکا ہے اس کا۔" تاج چاچا نے اپنی کنپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا تھا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنا کھاتہ دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ اس کی طرف تو لمبا حساب باقی تھا، میں نے کہا دیکھ لو کوئی حساب باقی نہیں، تو بغیر سوچے سمجھے بولی شاید اسے بھول گیا، وہ حساب چکا چکی تھی۔" تاج چاچا ہنس رہا تھا۔ "بتاؤ بھلا انسان کا حافظہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہے کہ اس نے کوئی کام مہینہ بھر پہلے کیا تھا یا نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی پوچھے گی کہ کس نے چکائے پیسے مگر وہ تو خوش ہو گئی کہ اس نے پیسے چکا دیے تھے اور اسے یاد ہی نہیں رہا۔

"وہ خوش تھی اور میں نے اس کی ساری خوشی

غارت کر دی۔" ایبک نے سر جھٹکا۔ لے دے کر وہ کپ کیک اور موم بتیاں یاد آرہی تھیں جنہیں برتھ ڈے کینڈلز کہا جاتا تھا۔ بچوں کی سی وہ خوشی اور خواہش نجانے وہ کتنے عرصے بعد پوری کرنے جارہی تھی۔ خدا جانے کبھی اس کی سالگرہ کسی نے منائی بھی تھی یا نہیں۔ اس سیلن زدہ گھر کے افسردہ ماحول میں برتھ ڈے کینڈلز جلا کر شاید اپنے لیے وہ زندگی کی حرارت پیدا کرنا چاہتی ہو اور میں نے۔" اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ "کیا تھا جو میں اس بار اسے وہ سارا سامان لے جانے دیتا اور آئندہ کے لیے منع کر دیتا' آرام سے' نرمی سے اور سہولت سے۔"

بے دلی سے اس نے ٹرانسپورٹ کوروالی فائل اٹھائی اور واپس دراز میں رکھ دی۔



وہ اس روز ایبک سے کہنا چاہتی تھی کہ موسم صاف اور دن چمک دار اور روشن ہے لہٰذا ان چاروں کو وادی میں اپنی اپنی بائیکس پر گھومنا پھرنا چاہیے۔ بہت دن ہو چلے تھے ایسی تفریح کیے' فائنل امتحان کا بوجھ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا رہا تھا۔ اور ان بوجھل دنوں کی یکسانیت توڑنے کے لیے یہ تفریح ضروری تھی۔ لیکن آخری کلاس ختم ہوتے ہی وہ سر صابر کے پیچھے تیزی سے باہر نکل گیا تھا بغیر ان تینوں سے بات کیے۔

رائنہ نے اپنے ڈیسک پر سے کتابیں اٹھا کر بیگ میں ڈالتے ہوئے معاذ اور ظفر کی طرف دیکھا' یقیناً اس کی نظروں میں ایبک کے لیے گلہ تھا۔

"کینٹین چلتے ہیں' تازہ سموسوں کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔" ظفر اس کی نظروں کے شکوے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے بیگ کا اسٹریپ کندھے پر چڑھاتے ہوئے بولا تھا۔

"وہ ضرورت سے زیادہ ہلکان ہو رہا ہے' حالانکہ وہ خود بھی جانتا ہے کہ اس کالج کی حد تک تو اسے کوئی چیلنج نہیں کر رہا۔" کینٹین میں بیٹھ کر سموسوں اور چائے کا انتظار کرتے ہوئے معاذ نے خیال ظاہر کیا تھا۔

"ہاں چوائن لائی کی حد تک تو چلو ٹھیک تھا۔" ظفر کینٹین میں بیٹھی فرسٹ اور سیکنڈ ایئر کی لڑکیوں کی جھینپی مسکراہٹیں تاڑ رہا تھا۔ "لیکن سر صابر!!" اس نے سر جھٹکا۔ "یہ ایک مضحکہ خیز آئیڈیا ہے۔ سر صابر سے گائیڈ لائن لینا جبکہ وہ دو سالوں میں کلاس کے اندر بھی ٹھیک سے پڑھانے میں ناکام رہے ہیں اور آج بھی وہ فائنل امتحان کے لیے خاص طور سے بلائی گئی کلاس کو ہدایات دیتے رہے' وہ بھی امتحانی پرچے میں درج اصول و ضوابط کی طرح رٹی رٹائی ہدایات۔ ہونہہ۔" معاذ نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

"یار! ہم بھی اتنے سال اس کالج میں ان ٹیچرز کے ساتھ ہاکی ہی کھیلتے رہے' پڑھنے وڑھنے کا تو نام ہی بدنام کیا۔"

"ولیکن وہ ہے کہاں' گیا اب تک سر صابر کے پاس اسٹاف روم میں بیٹھا ہے۔" رائنہ کی سوئی اسی پر اٹکی تھی۔

"صرف سر صابر ہی نہیں' باقی لوگوں سے بھی الوداعی ملاقاتیں کر رہا ہو گا۔ کالج میں الوداعی دن جو ہے اس کا۔" معاذ نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "تم سموسے کھاؤ اور چائے پیو گرما گرم' اس کی فکر چھوڑ دو آجائے گا۔ ابھی اپنی پی آر بڑھانے کے بعد۔" ظفر اور معاذ چائے کے ساتھ ساتھ گپیں لگانے میں مگن تھے مگر رائنہ کی پریشان نظریں کینٹین کے دروازے پر جمی رہیں۔ اس کے اندر کسی ان ہونی کے ہو جانے کا خوف سا اٹک گیا تھا۔ وہ اپنے سانس کے زیر و بم میں پھنسی اس خوف کی انی نکال پھینکنا چاہتی تھی مگر چاہنے کے باوجود ایسا کر نہیں پا رہی تھی۔

اس کے ساتھ معاذ اور ظفر بھی لاشعوری طور پر اس کے کینٹین میں چلے آنے کے منتظر تھے لیکن وہ رائنہ کی نظروں کے سامنے کینٹین کے کھلے دروازے میں سے نظر آتا' موٹر سائیکل اسٹینڈ سے اپنی بائیک نکال کر تیزی سے گزر گیا تھا۔ یہ سب چشم زدن میں ہوا تھا اور وہ معاذ اور ظفر کی توجہ اس کے نکل جانے کی طرف مبذول نہ کرا سکی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)




Now!
Available
80gm Tube


White Rose®
Hair Removal
with Skin Whitening Agent
& Aloe Vera
Extracts
جلد اتنی سوفٹ جیسے وائٹ روز!
White Rose
White Rose
White Rose
White Rose
Lotion
Hair Removal


QRS



نمرہ احمد

"آب زیدان" (ایکوریم)

زندگی کے اس سفر میں
ہر چیز کا دایاں اور بایاں "پر" ہے۔
محبت کے پنکھ کے لیے غصہ ہے
قسمت کے پنکھ کے لیے خوف ہے
درد کے پنکھ کے لیے شفا ہے
زخم دینے والے پنکھ کے لیے معافی ہے
غرور کے پنکھ کے لیے عاجزی ہے
آنسوؤں کے پنکھ کے لیے خوشی ہے
وقار کے پنکھ کے لیے ذلت ہے
چھوڑ دینے کے پنکھ کے لیے سنبھالے رکھنا ہے
ہم صرف دو پروں کے ساتھ اڑ سکتے ہیں

مکمل ناول

اور دونوں پر ہوا میں تب ہی ٹھہر سکیں گے
جب ان میں ہوگا توازن!
وہ خوب صورت پر ہی ہیں اصل کاملیت!
مگر
انسانوں کی ایک نسل ہے جو سمجھتی ہے کہ
کاملیت ان میں سے ایک پر کے
ہر وقت موجود ہونے کا نام ہے
لیکن مجھ سے پوچھو تو
ایک پنکھ والا پرندہ نامکمل ہے
ایک پر والا فرشتہ نامکمل ہے
ایک پر والی تتلی مردہ ہے
سو یہ لوگ، جو کاملیت کو پانے کے لیے
اپنے ایک پر کو کاٹ کر پھینک دینے میں لگے ہیں
انہوں نے بنا ڈالی ہے
ایک معذور نسل انسانی!

(سی جوائے بیل سی)

"اور میں آپ کو اس کیس کے بارے میں وہی کچھ کہوں گا جو میں نے پہلے دن عدالت میں کہا تھا۔ میں بے گناہ ہوں اور میں نے سعدی یوسف پہ حملہ نہیں کیا تھا۔ عدالت کیا فیصلہ کرے گی' یہ میں نہیں جانتا' لیکن میں نے یہاں آپ کو اس بات کے لیے نہیں بلایا۔"

ہاشم کاردار بالکل ٹھہر گیا۔ آنکھوں میں بے یقینی اور حیرت لیے وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ رپورٹرز دھڑا دھڑ لکھے جا رہے تھے۔ کلک کلک تصاویر اتاری جا رہی تھیں۔

"میں آج ـــ اعلانیہ اپنی کمپنی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہ کمپنی ہم نے اچھی نیت سے شروع کی تھی اور اس کو چائنہ میں رجسٹرڈ کروایا تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم ٹربائن بنا کر حکومت کو بیچیں تاکہ وہ ان کو تھر کول پاور پراجیکٹ میں کوئلے سے گیس بنانے کے عمل میں استعمال کر سکے۔ میری کمپنی آج اس

اٹھائیسویں قسط



آسامی کے لیے حکومت کی نظر میں ایک مضبوط امیدوار ہے اور ہو سکتا ہے کہ ہم یہ ٹینڈر لے بھی جائیں مگر۔"

ہاشم بالکل سُن سا کھڑا تھا۔ یک دم بجلی بند ہو گئی۔ ہال میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ شور سا بلند ہوا۔ ہا ہو کی آوازیں آئیں مگر ایونٹ آرگنائزر جلدی جلدی سب کو خاموش کرانے لگا۔ کیمروں کے فلیش آن کر لیے گئے۔ اندھیرے میں پھر سے سفید روشنی ہو گئی۔ صرف مائیک کا مسئلہ تھا مگر پوڈیم پہ کھڑے نوشیرواں کو پروا نہ تھی۔ وہ سر اٹھا کے بولے جا رہا تھا۔ مزید بلند آواز میں۔

"مگر میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری کمپنی جو ٹربائن بنا رہی ہے اور جس میں میرے خاندان نے کروڑوں روپیہ لگایا ہے، وہ ٹربائن ناقص ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے دیں کہ اس لوڈشیڈنگ سے لڑنے کے لیے۔" انگلی اٹھا کر اندھیرے ہال کی طرف اشارہ کیا۔ "اس اندھیرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تھر کے جس کوئلے کو زمین کے اندر ہی گیس بنایا جانا تھا، اس عمل کے لیے اگر کسی کمپنی کے ٹربائنز کارگر ہیں تو وہ شیل ہے۔ شیل کے علاوہ اس خطے کی تمام کمپنیز کی ٹربائنز ناکارہ ہیں اور وہ UCG یعنی زیر زمین کوئلے کو گیس بنانے کے عمل (یعنی کوئلے کو کھود کر نکالے بغیر اندر ہی گیس میں تبدیل کر دینے) کے لیے مکمل طور پہ ناکارہ ہیں۔ یہ پراجیکٹ اگر کسی کمپنی کو ملنا چاہیے تو وہ شیل ہے۔ شیل کے علاوہ حکومت اگر کسی اور کمپنی کو یہ کام سونپتی ہے تو وہ عوام کے ساتھ دھوکا کرے گی اور عوام کے ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کو غلط جگہ استعمال کرے گی۔"

پسینے پسینے ہوا نوشیرواں موبائلز اور فلیش لائٹس کی روشنی میں سارے ہال سے یکتا اور روشن نظر آ رہا تھا۔ آگے پیچھے ہر جگہ اندھیرا تھا۔ بس اس کا چہرہ روشن تھا۔ چمکتا ہوا۔ ساری مداخلت اور بدانتظامی کے باوجود اب سب خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔

"میں اس کمپنی کے سی ای او کی حیثیت سے آج ریزائن کر رہا ہوں۔ کیونکہ میں اتنے بڑے پراجیکٹ کا اہل نہیں ہوں۔ میرے خلاف چلنے والے ٹرائل سے میں نے یہ سیکھا ہے کہ میں ابھی تک کچھ نہیں سیکھ پایا۔ اس لیے میں باعزت طور پہ اپنی کمپنی سے الگ ہو کر ایک ملٹی نیشنل میں جاب کے لیے اپلائی کر رہا ہوں۔ جیسے میرے باپ اور بھائی نے محنت کر کے اپنا راستہ بنایا اس طرح میں بھی مشکل راستہ چن رہا ہوں۔ اگر میں لوڈشیڈنگ کو ختم نہیں کر سکتا تو کم از کم میں ان طریقوں کی حمایت بھی نہیں کروں گا۔ جو اس مسئلے کو بڑھاتے ہیں، گھٹاتے نہیں۔ اس لیے نہ صرف میں اپنی کمپنی سے مستعفی ہو رہا ہوں بلکہ اپنی پیرنٹ کمپنی جو کہ ایک IPP ہے، سے بھی ریزائن کر رہا ہوں اور آخر میں ایک اور بات۔"

بلند آواز میں کہتے ہوئے اس نے کاغذات کا ایک پلندہ ان کو دکھایا۔

"میں اس پیپر کو پبلش کر رہا ہوں اور اس کی ایک کاپی آپ سب کو دس منٹ پہلے ای میل کر دی گئی ہے۔ اس میں، میں نے آئی پی پی ز کے حکومت سے معاہدوں پہ روشنی ڈالی ہے، کیونکہ میں مزید اب اس نظام کا حصہ نہیں بننا چاہتا جس میں ہم آئی پی پی ز پورے پیسے لے کر آدھی بجلی بناتے رہیں۔ میں اس کو بدل نہیں سکتا، مگر اس کے خلاف آواز ضرور اٹھا سکتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ مجھے اب Whistleblower (مخبر) کہا جائے گا اور مجھے شاید کوئی کمپنی جاب نہ دے اور کوئی میرے ساتھ کاروبار نہ کرے، کیونکہ رات تک لوگ میری کمپنی سے پیسہ نکال کر اسے دیوالیہ کر دیں گے، لیکن میں اب مزید خاموش نہیں رہوں گا۔ میں اپنی تمام کمپنی کی پوزیشنز سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ شکریہ۔"

اب وہ پوڈیم سے اتر آیا تھا مگر ہاشم یک ٹک پتھر کا بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ رپورٹرز شہد کی مکھیوں کی طرح اس پہ سوالوں کے لیے جھپٹے تھے، مگر وہ خاموشی سے

آگے بڑھتا جارہا تھا۔ وہ زینے خود چڑھتا تھا اور وہ زینے خود اُتر رہا تھا۔ ہاشم کے ہاتھ برف ہو رہے تھے۔ وہ اندھیرے میں تنہا کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

مجھے سکون میسر نہیں تو کیا غم ہے
گلوں کی عمر تو کانٹوں کے درمیاں گزری

چھ دن بعد۔

مور چال پہ رات گہری ہو کر اُتر رہی تھی۔ سب سو چکے تھے مگر حنین لاؤنج میں موجود تھی' آستینیں اوپر چڑھائے' وہ اسٹول پہ کھڑی' دیوار پہ اسٹینسل لگا کر اس کو پینٹ کر رہی تھی (stencil پلاسٹک کا بڑا سا ٹکڑا جس میں ڈیزائن کی جگہ خالی ہوتی ہے جیسے عموماً" ہاتھ پہ مہندی لگانے کے لیے ہتھیلی پہ رکھ کر اوپر مہندی لگادی جاتی ہے اور جب پلاسٹک اٹھاؤ' تو نیچے نقش و نگار بن چکے ہوتے ہیں۔) اس کے اسٹینسل پہ بڑا سا درخت کٹا ہوا تھا اور وہ احتیاط سے اس پہ برش پھیر رہی تھی۔

اندر زمر اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی کام کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر گھڑی کو بھی دیکھ لیتی۔ گیارہ بجنے کو آئے تھے اور فارس نہیں آیا تھا۔ اور اسی پل اچانک اس کا فون بجا۔

فارس کالنگ دیکھ کر لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی' مگر جب موبائل کان سے لگایا تو لہجہ خشک بنالیا۔

"جی کہیے۔"

"اہم۔" وہ کھنکھارا تھا۔ "کدھر ہو؟"

"گھر پہ۔ اور کہاں ہو سکتی ہوں؟"

"ایک ایڈریس ٹیکسٹ کر رہا ہوں' اُدھر آجاؤ۔"

"اس وقت؟ مگر کیوں؟"

"ایک اہم گواہ سے ملوانا ہے۔ زیادہ سوال مت پوچھو' بس ایک گھنٹے کے اندر اندر پہنچو اور سنو' صرف تم آنا۔ ساتھ میں پورے گھر کو مت لے آنا۔"

زمر نے چونک کے گھڑی کو دیکھا۔ بارہ بجنے میں ایک گھنٹہ تھا۔ ایک بھرپور مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

"اور اگر میں نہ آؤں تو؟" لمحے بھر کے توقف سے وہ بولا۔

"پتا بھیج رہا ہوں۔ جلدی آؤ۔" اس کی توقع کے خلاف اس نے کوئی تپانے والا جملہ کہے بغیر فون بند کردیا۔ زمر نے مسکرا کر اسکرین کو دیکھا جہاں اس کا پیغام جگمگا رہا تھا۔ پتا پڑھ کر اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

حنین نے ابھی درخت کی پہلی شاخ مکمل کی تھی جب کھلتے دروازے کی آواز پہ وہ چونکی۔ زمر آہستہ سے کمرے سے باہر آکر دروازہ بند کر رہی تھی۔ سیاہ ڈیزائنر ویئر پہنے' ہلکا میک اپ' ایئر رنگز' کہنی پہ پرس لٹکا ہوا۔ حنین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ اس وقت کس کی شادی میں جارہی ہیں؟"

"اپنی شادی کی اینورسری میں جارہی ہوں۔" زمر نے بہت سکون سے تصحیح کی۔ حنین چونکی۔

"کل بیس مئی ہے؟ ایک سال ہوگیا؟"

"کل نہیں۔ ابھی بارہ بجے سے بیس مئی ہے اور فارس صاحب کو اتنے دن سے ڈنر ڈنر کرنے کے بعد بالآخر آج وقت مل ہی گیا مجھے ڈنر پہ بلانے کا۔"

حنہ کی آنکھیں چمکیں۔ "کہاں بلایا ہے؟"

"ہم دونوں کے لیے ایک یادگار جگہ ہے وہ۔ زیادہ سوال مت پوچھو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"ویسے ان کو چاہیے تھا آپ کی مرضی کی جگہ پہ لے کر جاتے آپ کو۔ ٹیبل ریزرو کر کے بتا رہے ہیں اب۔"

"وہ تو گواہ کو ملوانے کا بہانہ کر کے بلا رہا ہے' مگر اکیلے آنے کا کہنا اور وہ بھی بیس مئی کی رات۔۔۔ ظاہر ہے وہ مجھے سرپرائز دینا چاہتا ہے۔ او کے' اللہ حافظ۔"

وہ مسکرا کر اس کو الوداع کہتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ خواہ مخواہ حنین کے دل نے تمنا کی کہ وہ آج پھر چابیاں بھول جائے اور واپس آئے' مگر وہ عجلت میں تھی۔ خیر' حنہ سر جھٹک کر کام کرنے لگی۔

وہ درخت کی اوپری چار شاخیں بہت محنت اور احتیاط سے پینٹ کر چکی تھی، جب بیرونی دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی۔ پھر اندر آنے کی آہٹ۔ حنہ چونک کر پلٹی۔ فارس چابیاں دروازے کے قریب ٹوکری میں ڈالتا اب ادھر آ رہا تھا۔ حنین نے فوراً گھڑی میں دیکھا۔ بارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ اسے شدید غصہ آیا۔

"یعنی آپ تو واقعی گواہ سے ملوانا تھا اور وہ اتنی خوش کہ آپ ان کو ڈنر پہ بلا رہے ہیں۔ ویسے کون سا گواہ تھا یہ؟"

اندر آتے فارس نے رک کر اسے دیکھا جو اسٹول پہ کھڑی تھی اور ہاتھ میں اسٹینسل، برش اور پینٹ کی پلیٹ تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ٹشو تھا۔

"وعلیکم السلام حنین۔" وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"تاریخ بھول گئی تھی کیا؟ ڈنر پہ کیوں نہیں گئے؟"

"کیا شروع ہو گئی ہو گھر آتے ہی؟" وہ نا سمجھی اور اکتاہٹ سے بولا۔ حنین نے ٹھہر کے پہلے اسے دیکھا۔ پھر اس کے کندھے کے پیچھے۔

"زمر آپ کے ساتھ نہیں آئیں؟" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"وہ میری ساتھ تو نہیں تھی۔ میں تو ابھی آ رہا ہوں۔" وہ حیران ہوا تھا۔ حنین کے قدموں سے زمین سرکنے لگی۔

"آپ نے ابھی ابھی ان کو کال کی تھی اور کہا تھا کہ آپ کو ان کو کسی گواہ سے ملوانا ہے..... ہے نا.....؟" وہ ہکلائی۔ چند لمحے لگے فارس کو اس کی بات سمجھنے میں اور ایک دم اس کا پورا دماغ سنسنا اٹھا۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آیا۔

"حنہ! میں نے اسے کوئی کال نہیں کی۔ کہاں ہے وہ؟"

حنین کے ہاتھ سے پینٹ، برش سب پھسل گیا۔

"آپ نے ان سے کہا کہ اکیلی آنا۔ وہ اکیلی چلی گئیں۔ وہ خوش تھیں۔ بہت زیادہ۔" اس کا گلا رندھا۔ وہ دم بخود کھڑی تھی۔

"کدھر۔ کدھر گئی ہے وہ؟" وہ حواس باختہ سا پوچھ رہا تھا۔ شل سی حنین نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ نہیں بتایا۔" فارس بے اختیار پیچھے کو بھاگا۔ ٹوکری سے چابی اٹھائی اور موبائل پہ نمبر ڈائل کرتے اس نے دروازہ کھولا۔

زمر کا فون آف جا رہا تھا۔

اس کی سماعت میں ایک فقرہ گونج رہا تھا۔

He cannot protect his women!

(وہ اپنی عورت کی حفاظت نہیں کر سکتا)

"اوہ خدایا!! وہ اتنے دنوں سے غلط عورت کی حفاظت کر رہا تھا؟ اوہ خدایا....."

☼ ☼ ☼

قتل سے چھ دن قبل

قصر کاردار کی ساری بتیاں رات کے اس پہر بھی روشن تھیں۔ اندر داخل ہوتے نوشیرواں نے گہری سانس لی اور پھر قدم اٹھانے لگا۔ جیسے جیسے وہ چلتا آیا، لاؤنج قریب آتا گیا اور بالآخر وہ بڑے صوفے کے بالکل سامنے آ ٹھہرا جہاں ہاشم بیٹھا تھا۔ اس نے کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔ شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں اور ٹائی ڈھیلی تھی۔ آہٹ پہ اس نے صرف آنکھیں اٹھائیں جو بے تاثر سی لگتی تھیں۔ مردہ سی۔ پریس کانفرنس کے چند گھنٹے بعد اب ان دونوں کی ملاقات ہو رہی تھی۔

"ویلکم ہوم!" وہ شیرو پہ نظریں گاڑے بولا تو آواز ایسی سرد تھی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

"آپ کو جو بھی کہنا ہے میری پریس کانفرنس کے بارے میں بھائی، وہ آپ....." وہ ہاتھ اٹھا کے کہنے لگا مگر ہاشم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ ایکوریم دیکھ رہے ہو اپنے پیچھے؟" وہ ٹھنڈے

سے انداز میں شیرو پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔
نوشیرواں نے گردن موڑ کر دیکھا۔
لاؤنج کی ایک دیوار کے ساتھ نصب وہ ایک خوب صورت سا ایکوریم تھا جو برسوں سے اس گھر کا حصہ رہا تھا۔ اس کی شیشے کی مستطیل دیواروں میں ڈھیروں پانی جمع تھا' مصنوعی پودے اور پتھر اندرونی فرش پہ بچھے تھے اور چند مچھلیاں دائیں سے بائیں تیر رہی تھیں۔ روشنیاں کچھ اس طرح لگی تھیں کہ اندرونی ماحول کو منور کیے ہوئے تھیں۔

"تمہیں یاد ہے یہ ایکوریم کون لایا تھا؟ نہیں۔۔۔" اس نے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ "تمہیں کہاں یاد ہوگا' مگر بیٹھو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

اسے اشارہ کرکے وہ خود اٹھا اور قدم قدم چلتا ایکوریم کے قریب آرکا۔ وہ نوشیرواں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی اداس آنکھیں شیشے کے مچھلی گھر پہ جمی تھیں۔ شیرو نہیں بیٹھا۔ اسی طرح کھڑا رہا۔ متذبذب' خفا سا۔

"تم سترہ سال کے تھے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ایک ایگزیکٹو میٹنگ میں لے گیا تھا' تھری پیس میں ڈریس اپ کروا کے۔ تم اپنی عمر سے بڑے اور اچھے لگ رہے تھے۔ ڈیڈ کو بھی خوشی ہوئی تھی تمہارے آنے سے' مگر حسب عادت وہ ظاہر نہیں کررہے تھے۔ تم البتہ بے نیاز سے تھے۔ ہمارے ساتھ جاکر بیٹھ گئے تھے اور ہماری باتیں سننے لگ گئے تھے۔ ہم ایک ڈیل کرنے جارہے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ دوسرا فریق بعد میں تھوڑے بہت ہیر پھیر سے کام لے گا' مگر یہ بات ہمیں ان کے منہ پہ نہیں کہنی تھی۔ ہمیں سمجھوتا کرنا تھا' صرف نظر سے کام لینا تھا۔" وہ اب ہولے ہولے شیشے کی دیوار پہ دستک دے رہا تھا۔ اندر تیرتی مچھلیاں مزید تیزی سے بل کھاتی ادھر ادھر چکر کاٹنے لگی تھیں۔

"مگر۔۔۔ جب تمہیں اس دوران اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بعد میں چیزوں کو manipulate (گڑبڑ) کرسکتے ہیں' تو تم نے ایک دم بڑھ چڑھ کے بولنا شروع کردیا۔ ہمارے جی ایم نے تمہیں آنکھیں دکھائیں' ڈیڈ کھنکھارے' مگر تم نے اپنی بات مکمل کرکے دم لیا۔ وہ لوگ تحفظات کا شکار ہوگئے اور انہوں نے ہم سے معذرت کرلی۔ ڈیڈ تم پہ بہت غصہ تھے اور مجھ پہ بھی کہ میں تمہیں لایا ہی کیوں' مگر مجھے اطمینان تھا۔ دو باتوں کا اطمینان۔ ایک تو یہ کہ تم میں اتنی سمجھ ہے کہ غلط اور صحیح کا فرق کرسکو۔ بے شک "عقل" نہیں ہے کہ کس وقت بولنا ہے کس وقت نہیں' مگر چلو' سمجھ تو ہے۔ اور دوسرا یہ کہ تم "درست فیصلہ" کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ اس دن میں تمہارے لیے یہ ایکوریم لایا تھا اور اس کو ہمارے لاؤنج میں رکھوایا تاکہ تم گزرتے ہوئے اس کو دیکھتے رہو اور تمہیں اپنا بزنس میں دلچسپی لینا بھول نہ جائے۔"

وہ اب بولتے ہوئے آپ نیلن کی کانچ کی دیوار کے کنارے پہ انگلی پھیر رہا تھا گویا کوئی لکیر کھینچ رہا ہو۔ شیرو کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے اور وہ خاموشی سے کھڑا تھا۔

"مگر تم بھول گئے۔ بزنس میں دلچسپی لینا' اپنی سمجھ بوجھ' درست فیصلے کرنے کی طاقت' تم سب بھول گئے۔ میں نہیں بھولا۔ میں اس کی مچھلیاں بدلواتا رہا۔ جب کوئی مرجاتی تو اس سے ملتی جلتی مچھلی اندر ڈلوا دیتا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب اس کی مچھلیوں کی خوراک کا میں نے ملازموں سے پوچھا نہ ہو۔ میں تمہیں اکثر بزنس میٹنگز میں جانے سے پہلے یہ ایکوریم یاد کرواتا تھا تاکہ تم سمجھ سکو کہ کاروبار کے سمندر میں تم ڈوب نہیں سکو گے اگر تیرنا سیکھ لو۔ میں نے اپنی امید نہیں کھوئی۔ تم نے سعدی کو گولی ماری' تم نے علیشا کو واپس بلایا' اس کو کمپنی میں سے حصہ دیا' ملک سے بھاگنے کے بجائے ٹرائل کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا' میں اس کی مچھلیوں کی حفاظت کرتا رہا۔ تم مجھ سے دور ہوتے گئے' زمر سے قریب ہوتے گئے' ممی سے بدتمیزی کرتے رہے' میں نے اپنی امید نہیں کھوئی' مگر

آج شام۔"

اب کے وہ پورا گھوما تو نوشیرواں نے اس کا چہرہ دیکھا' اس کی کلر پہ جمی ملال بھری آنکھیں دیکھیں اور اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"آج جب تم نے پریس کانفرنس کرکے اپنی کمپنی کو دیوالیہ کردیا' ہماری پیرنٹ کمپنی کو نقصان پہنچایا' تم نے اپنے ہی خاندان کے کاروبار کے خلاف whistleblowing کی' تم نے ہمارے کانٹریکٹس پہ تنقیدی پیپر لکھ کے پبلش کردیا' آج تم نے میری کمر میں خنجر گھونپا تو شیرو! میں نے تم سے آخری امید بھی کھودی۔ تم نوشیرواں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں تو اچھے فیصلے کرسکتے ہو' مگر کاروبار میں تم ہمیشہ فیل رہو گے اور اسی لیے اب سے تم صرف میرے بھائی ہو۔ کل آفس آکر اپنی چیزیں لے جانا اور دوبارہ اس بلڈنگ میں قدم نہ رکھنا۔"

"کیا آپ اب بھی میرا کیس لڑیں گے؟" اس سوال پہ ہاشم تلخی سے مسکرایا۔

"نہیں اب تمہارا کیس پہلے سے زیادہ جانفشانی سے لڑوں گا شیرو! کیونکہ تم میرے بھائی ہو اور اپنی عقل سمجھ سب کھوچکے ہو۔ میرے لیے تمہیں بچانا اب زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔ مگر ہاں' تم نے مجھے آج بہت بڑا دکھ دیا ہے۔ میں نے کیا نہیں کیا اس سارے خاندان کے لیے اور تم سب نے مجھے ہر طرف سے نقصان پہنچایا۔ کیا اپنے بھائی کے ساتھ ایسے کیا جاتا ہے شیرو؟"

نوشیرواں نے سر جھکا دیا۔ "آئی ایم سوری آپ کو ہرٹ کرنے کے لیے' مگر میں اپنے فیصلوں پہ نادم نہیں ہوں۔ میں نے وہ کیا جو مجھے ٹھیک لگا۔"

"اور میں اب وہ کروں گا جو مجھے ٹھیک لگے گا۔ بہت ہوگیا میرا نقصان' اب جوابی حملہ کرنے کا وقت ہے۔"

شیرو نے چونک کے اسے دیکھا۔ "آپ کیا کریں گے؟"

"تم جاکر سوجاؤ۔" اس نے ہاتھ جھلا کے ذرا نرمی سے اس کو جانے کا اشارہ کیا۔ شیرو بھی نہیں رکا۔ خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی جواہرات اس کے جاتے ساتھ ہی بولی تھی۔

"جب تم اپنے خاندان کو خود سے دور کردو گے تو کیا ہوگا ہاشم!"

ہاشم نے گردن موڑ کے ایک سرسری نظر اس پہ ڈالی۔ "میں ابھی تک کچہری میں وکیلوں کے سامنے اپنی بے عزتی بھولا نہیں ہوں۔ مجھے کچھ وقت لگے گا۔ ممی! تب تک میرے سامنے نہ آئیں تو اچھا ہے۔ میری! اینجیو۔" آخر میں وہ اتنی بلند آواز میں دھاڑا تھا کہ جواہرات کا جسم تھرا اٹھا۔

"یس سر!" میری دوڑتی آئی۔

"اس ایکوریم کو میرے آفس میں منتقل کروا دو۔ اب اس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے اور میں پانی میں سانس لیتی مچھلیوں کو بے گھر نہیں کرنا چاہتا۔" وہ اب مدھم آواز میں ہدایت دے رہا تھا اور جواہرات بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اجنبی ہوتا جارہا تھا۔

☆ ☆ ☆

تمام عمر جلاتے رہے چراغ امید
تمام عمر امیدوں کے درمیاں گزری

اگلی شام میں وہ دوبارہ اسپتال آیا تاکہ اس لاپاج لڑکے کی خیریت اور طبیعت دریافت کرسکے۔ آج اس کو ڈسچارج کیا جانا تھا اور سعدی اس سے پہلے ایک دفعہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اسپتال کی راہداریوں میں وہ خاموشی سے آگے بڑھتا گیا۔ دواؤں اور اسپرٹ کی بو اور عجیب سی ویرانی' درودیوار سے ٹپکتی تھی۔ ابھی اسے چند طویل راہداریاں عبور کرکے مطلوبہ وارڈ تک پہنچنا تھا۔ راستہ طویل تھا اور دل پہ بوجھ ڈالنے والا بھی تھا۔ اس نے رفتار سست کردی۔ کبھی دائیں اور کبھی

بائیں دیکھتا ہولے ہولے قدم اٹھانے لگا۔

اسپتال بھی عجیب جگہ ہے۔ یہاں آکر احساسات عجیب سے ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی آوازیں، شور، پکاریں اور ساتھ میں خاموشی۔۔۔ اس نے ہینڈز فری کانوں میں ٹھونس لی اور موبائل کی اسکرین کو سرجھکا کے دیکھتا، مطلوبہ آیات کو چھوتا آگے بڑھتا گیا۔

دل کو، مریض کی عیادت بھی نرم کرتی ہے اور قرآن کی تلاوت بھی۔ وہ ان دونوں کو ملانے لگا، شاید کہ اثر بڑھ جائے۔

"میں پناہ چاہتا ہوں اللہ کی، دھتکارے ہوئے شیطان سے۔"

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

اب وہ پھر سے اطراف میں دیکھنے لگا تھا۔ قطار در قطار بیڈ۔۔۔ کھلے دروازوں سے جھانکتے بے حال، زرد چہروں والے لوگ۔۔۔ وحشت سی وحشت تھی۔

"اور بے شک آپ کا رب تو لوگوں پر فضل کرتا ہے۔

لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔" (النمل ۷۳)

"شکر کیا ہے اللہ تعالیٰ؟"

وہ بول نہیں رہا تھا، سوچ رہا تھا اور اسی طرح قدم بڑھا رہا تھا۔

"آخر یہ شکر کہتے کس کو ہیں؟ جب کچھ پاس نہ ہو تو وہ آنکھ رکھنا جو "وہ" دیکھ لے جو کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا، لیکن کچھ نہ کچھ تو ہر پل پاس ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آپ لوگوں پہ فضل کرتے ہیں۔ فضل "زائد" دینے کو کہتے ہیں۔ حق سے، اوقات سے بڑھ کر دینے کو۔ جیسے آپ ہمیں نعمتیں دیتے ہیں، ویسے ہی آپ ہمیں "مواقع" بھی دیتے ہیں۔ صرف مادی چیزوں دولت، اولاد، کامیابی پہ شکر کرتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمیں "مواقعوں" پہ بھی شکر کرنا ہے۔

چانسز پر۔ ہم میں سے جن کے ماں باپ گزر چکے ہیں اور وہ ان کی خدمت نہیں کرسکے۔۔۔ وہ برسوں پچھتاووں اور ملال میں گھرے رہتے ہیں کہ کیا تھا اگر اللہ ان کو زندہ رکھتا اور وہ ان کی خدمت کرپاتے؟ مگر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ ہمیں دوبارہ موقع ضرور دیتا ہے، کسی بوڑھے کو ہمارے قریب لا بٹھاتا ہے، چاہے ساس سسر ہوں، کوئی لاچار بزرگ ہمسایہ ہو یا کوئی بوڑھا ملازم، کوئی ہوتا ہے ہمارے گرد جس کی خدمت کی جاسکتی ہے، مگر اپنے پچھتاووں میں ہم مواقع ضائع کردیتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے ماں باپ کی طرح نہیں سمجھ سکتے، اور سارا مسئلہ یہی ہے کہ ان کو والدین نہیں سمجھنا۔ نہ ان سے والدین کی طرح محبت کرنی ہے۔ صرف ان کی عزت اور خدمت کرنی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکیاں چھوٹے بہن بھائیوں کو بہت جھڑکتی ہیں، بعد میں پچھتاتی ہیں، مگر صرف پچھتانے کا کیا فائدہ جب اپنے اردگرد ویسے ہی چھوٹے بچے دیکھنے اور ان سے نرمی کرنے والی بصیرت ہی نہ رکھے انسان۔ ہم مسلسل رونا روتے ہیں کہ ہمیں کوئی بری لت پڑی ہوئی ہے، کوئی ایسا گناہ جو ہم چھوڑ نہیں پارہے، بار بار اس کو کر بیٹھتے ہیں۔ بڑے وعدے کیے اللہ سے، بڑی معافی مانگی، مگر پھر سے کردیا۔ کمزور پڑگئے۔ نفس کے آگے ہار گئے۔ اب روتے ہیں کہ سارا وقت مایوسی۔۔۔ ڈپریشن۔۔۔ میں تو کسی اچھائی کے قابل نہیں رہا۔ یہ نہیں دیکھیں گے کہ گناہ کے بعد احساس ہونا اور خود کو ٹھیک کرنے کا اور توبہ کرنے کا موقع دیا ہے اللہ نے۔ یہ ہے اللہ کا فضل جس کو اپنے پچھتاووں میں ہم ضائع کردیتے ہیں۔ پچھتاوا ہونا چاہیے، مگر پچھتاوے کا روگ لے کر مایوس ہوجانا ان مواقعوں کی ناقدری ہے اور ہم یہ ناقدری روز کرتے ہیں۔ آخر کب ہم اپنے اردگرد وہ تمام "مواقع" دیکھنے کی آنکھ پیدا کریں گے خود میں جو اللہ نے ہمارے پچھتاووں کے بدلے میں اس کا نعم البدل بنا کے ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ آخر کب؟"

وہ سفید فرش پہ قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ چہرے پہ ملال سا تھا۔ ارد گرد چھائی دہشت ویسی ہی تھی اور طبیعت کو مکدر کر رہی تھی۔ پھر مریضوں کی آوازیں، اسپتال کے عملے کا شور سب بڑھتا گیا تو اس نے ہینڈز فری کانوں سے نکال لی۔ مطلوبہ راہداری قریب آچکی تھی۔

اس لڑکے کا نام شہزاد تھا اور وہ بستر پہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔ سعدی مسکراتا ہوا اس کے سامنے بستر کی پائنتی پہ آبیٹھا۔ وارڈ میں آگے پیچھے لوگوں کا شور اور رش ہر پل بڑھ رہا تھا، ایسے میں جب وہ لڑکا اٹک اٹک کے رک رک کے اس سے مخاطب ہوا تو اس کی بات سننے کے لیے سعدی کو آگے جھکنا پڑا۔ اس کی ماں دوائیاں لینے گئی ہے اور وہ جلد ڈسچارج کر دیا جائے گا، یہ بات وہ بدقت سمجھ پایا تھا۔

"وہ لڑکے کون تھے، تمہیں کیوں مار رہے تھے؟"

"وہ اسٹور سے چیزیں چرا رہے تھے... میں نے... میں نے شاپ کیپر کو بتا دیا تو باہر نکل کے وہ مجھے مارنے لگے..." وہ ٹیڑھے ہونٹوں کے ساتھ زور لگا لگا کر بولتا تھا۔ سعدی مسکرا کے سنتا رہا۔ لڑکا بے چینی سے پھر سے گویا ہوا۔

"آپ... ٹی وی والے ہونا... سا... سعدی یوسف؟" سعدی نے اسی اداس مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ وہ جانتا تھا، اب وہ لڑکا اس کا شکریہ ادا کرے گا، کہ اس نے کمزور کی مدد کی، طاقت ور کے مقابلے میں اور...

"آپ لوگ... آپ سب... بہت... بے وقوف ہو۔" وہ ہکلا کے بولا تو سعدی کی مسکراہٹ سمٹی۔ پھر یک دم وہ دل کھول کے ہنس دیا اور غور سے اس کم عمر لڑکے کو دیکھا۔ سانولی رنگت اور سیاہ آنکھوں والا شہزاد کافی مضطرب اور بے چین نظر آتا تھا۔

"اچھا... کیوں ہوں میں بے وقوف؟" وہ جواباً زور لگا کے کچھ بولنے لگا تھا، مگر سعدی کی بات جاری تھی۔ "کیونکہ میں امیر اور طاقت ور لوگوں کے خلاف کھڑا ہوا ہوں؟" لڑکے نے نفی میں سر ہلایا۔

"یا میں اس ملک کے گلے سڑے عدالتی نظام سے انصاف کی امید وابستہ کیے ہوئے ہوں؟"

"نن... نہیں..."

"یا میں چپ کر کے ان سے پیسے لینے والوں میں سے نہیں ہوں یا میں ان کے ڈر سے دبک کر بیٹھ نہیں گیا؟ کیوں شہزاد، تم جیسے نوجوان کو سعدی یوسف بے وقوف کیوں لگتا ہے؟"

"نہیں..." مگر وہ اس کو نہیں سن رہا تھا۔

"کیا میں اس لیے بے وقوف ہوں کیونکہ میں ایک بے سود کوشش کر رہا ہوں؟ قید میں اپنے پراجیکٹ کے رازان کے حوالے کر دیتا، تیس کروڑ لے لیتا اور نئی زندگی شروع کر دیتا تو عقل مند ہوتا؟ قصاص مانگ رہا ہوں میں۔ اتنا وقت اور پیسہ برباد کر رہا ہوں۔ اس لیے بے وقوف لگتا ہوں نا میں سب کو..." اس کے لہجے میں جذباتی سا دکھ ابھر آیا تھا۔

لڑکا جو بار بار بے چینی سے نفی میں سر ہلاتا تھا، اب کے پورا زور لگا کے بولا۔

"تم لوگوں نے آپریٹر سے پوچھ گچھ نہیں کی۔" پورا فقرہ بول کے وہ ٹھہرے ٹھہرے سانس لینے لگا۔ سعدی یوسف بالکل ٹھہر گیا۔

"کیا؟"

"ایئرپورٹ... کنٹرول روم آپریٹر... میری امی ایئرپورٹ پہ کام کرتی ہے... آپریٹر نے بولا تھا کہ اس نے امیر لڑکے کی فوٹیج ڈیلیٹ کر دی ہے..."

"کون نوشیرواں؟" وہ تیزی سے بولا، مگر آواز دھیمی کر لی۔ "مگر ہم نے ایئرپورٹ کی ساری فوٹیجز چیک کی تھیں، اکیس مئی کی اور اگلے ایک ہفتے کی... نوشیرواں کہیں نہیں تھا۔"

"مگر آپریٹر نے خود بولا کسی کو کہ اس نے فوٹیج مٹائی ہے... فوٹیج میں وہ تمہارے گم ہو جانے کے "بعد" ملک سے جاتا نظر آ رہا تھا۔ ایئرپورٹ پہ سب کو پتا ہے یہ بات۔ تم بہت مشہور ہو، مگر تم نے کسی سے پوچھا نہیں۔ خاموشی سے چلے گئے۔"

ٹھنڈی برف کی آبشار تھی جو سعدی یوسف پہ اوپر

سے آگری تھی۔ وہ بے یقینی سے اس کے قریب آیا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ ثبوت نہیں ہے، مگر اس ثبوت کو دیکھنے والا گواہ موجود ہے!"

لڑکے نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔ بالآخر وہ اپنی بات سمجھا پایا تھا۔

"اور تمہاری ماں کو یقین ہے کہ اس نے اس آپیٹر کو یہ سب کہتے سنا ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میری امی جھوٹ نہیں بولتیں۔"

سعدی چند لمحے بس اسے دیکھے گیا۔ اندر بہت سے طوفان برپا تھے۔

☆ ☆ ☆

ہر آبلے پہ درج ہے تفصیل زندگی
مجھ سے نہ پوچھ میرے سفر کی اذیتیں

وارث کی موت کے بعد اس کی آنکھوں پہ چھائی سرخ دھند ابھی ویسی ہی تھی۔ اس روز اس نے زمر کو اپنی واحد گواہ سے ملوانے کے لیے اس کے ہوٹل بلایا تھا جو گواہی دے سکے کہ فارس غازی قتل کے وقت اس کے ساتھ تھا۔ حنین بھی ان کے ہمراہ تھی اور وہ زمر کو وقت اور جگہ بتا کر اب ہوٹل روم میں بیٹھے اس کے منتظر تھے۔ فارس خاموش تھا۔ علیشا خاموش تھی۔ حنین خاموش تھی۔ وہ ایسی خاموشی تھی جس میں ہر شخص اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سب کو خود کو بچانے کی فکر تھی۔ خود غرضی نہیں تھی یہ، بے بس سا سیلف ڈیفنس تھا۔

حنین اپنی جگہ شرمندہ دکھائی دیتی تھی۔ اسے فارس کو اس دن سب سے دور علیشاہ کے پاس لے جانے میں اپنی غلطی نظر آرہی تھی۔ امی جب سے غم سے ذرا نکلی تھیں، اٹھتے بیٹھتے اسے انٹرنیٹ فرینڈز کے نقصان گنوا رہی تھیں۔ زمر اس سے مل لے تو سارا مسئلہ ختم ہو جائے اور سب اس قصے کو بھول بھال جائیں۔

علیشاہ کو اپنی فکر تھی۔ وہ یہاں ہاشم اور اپنے باپ کے دانتوں سے چند نوالے کھینچ لائی تھی۔ اسے اپنا جائز حصہ چاہیے تھا، مگر ایسے میں وہ ایک قتل کیس کے مشتبہ شخص کی ایلی بائی بن چکی تھی جو اس کے باپ کا رشتے دار تھا۔ وہ جلد سے جلد اس مشکل سے نکلنا چاہتی تھی۔

فارس الگ پریشان تھا۔ زمر پہ غصہ ابھی تک ویسا ہی تھا۔ وہ اپنا کام تیزی سے کیوں نہیں کر رہی؟ وہ وارث کے پاس سے ملنے کب جائے گی؟ وہ وکلا اور پراسیکیوشن آفس کی انتہائی سست رفتاری سے واقف تھا، مگر اس وقت کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ہر چیز غصے، فرسٹریشن اور پریشانی میں مبہم دکھائی دیتی تھی۔

جب وہ کافی دیر تک نہیں آئی تو فارس اسے فون کرنے لگا۔ کال بار بار منقطع ہو جاتی۔

"رابطہ ممکن نہیں۔" "اس نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا۔"

اسے اب زمر پہ افسوس ہونے لگا تھا۔ غصے بھرا افسوس۔ وہ کتنی دیر اس کمرے میں دائیں سے بائیں چکر کاٹتا رہا۔ حنین درمیان میں ایک دو بار نیچے شاپس سے پھر بھی آئی (وہ اب بور ہونے لگی تھی۔) مگر زمر نہیں آئی۔

زرتاشہ نے موبائل اٹھایا اور فارس کو کال ملائی۔ ایک گھنٹی بجی، پھر دوسری۔ اس نے فون اٹھالیا۔

"ہاں زرتاشہ! بولو؟"

"آپ کہاں ہیں؟" قدرے ہچکچاہٹ سے اس نے پوچھا۔ ساتھ میں اسے خود پر افسوس ہونے لگا، وہ کیسے کسی اجنبی کی کال پہ اعتبار کر سکتی تھی؟

"میں کام سے آیا ہوا ہوں باہر۔ کوئی کام ہے؟"

"نہیں۔ بس میں آپ کا پتا کرنا چاہ رہی تھی۔ آج آپ کو پراسیکیوٹر سے ملوانا تھا اس لڑکی کو، وہ سب ہو گیا خیر سے؟"

"ہاں مگر میڈم ابھی تک نہیں آئیں۔ میں اور حنین علیشاہ کے کمرے میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"ہوٹل میں یعنی کہ...؟" اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فارس نے "بائے" کہہ کر فون بند

کردیا۔ وہ ایک دم کلس کر رہ گئی۔ پھر موبائل رکھ کر ایک نئے ارادے سے اٹھی۔

غصہ افسوس میں بدلا اور افسوس مایوسی میں۔ سہ پہر طویل ہوتی گئی اور امید چھوٹی ہوتی گئی۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ بس اب وہ پراسیکیوشن آفس کے چکر نہیں لگائے گی۔ ساری عدالتیں گئیں جہنم میں۔ اب جو کرنا ہے وہ خود کرے گی۔ اس نے حنین سے چلنے کو کہا۔ وہ اس وقت اتنے تنے ہوئے تاثر لیے ہوئے تھی کہ حنہ چوں چراں کیے بغیر اس کے ساتھ آگئی۔

علیشا کی جان چھوٹی تو اس نے ان دونوں کے جانے پہ گویا سکھ کا سانس لیا تھا۔

اس نے حنین کو ابھی گھر ڈراپ کیا ہی تھا کہ موبائل پہ کال آنے لگی۔ نمبر غیر شناسا سا تھا۔ فارس نے کال وصول کی۔

دوسری طرف جانے کون تھا' اس نے کبھی رک کے نہیں سوچا۔ پیشہ ورانہ انداز میں اطلاع دی گئی تھی' جسے سن کر اس کا سارا جسم کانپ اٹھا تھا۔ وہ ششدر رہ گیا تھا۔ ساری آوازیں' ساری آہٹیں دم توڑ گئی تھیں۔ وہ کچھ کہہ بھی نہ سکا' بس کار کا رخ موڑ دیا۔ وہ تیز ڈرائیو کررہا تھا' مگر ہر شے سلوموشن میں ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ اس کے اردگرد لوگ ہارن بجا بجا نہیں تھک رہے تھے' کار کی کھڑکی سے سر نکال کر اسے گالیاں دے رہے تھے' وہ روڈ کی غلط سمت میں تھا' اسے کچھ پتا نہ تھا۔ کوئی ہوش نہ تھا۔

اس کی بیوی اسپتال میں تھی۔ اس کی بیوی کو گولیاں لگی تھیں اور اس کے سیل فون میں "ہزبینڈ" کے نام محفوظ شدہ نمبر اسپتال والوں یا شاید پولیس والوں نے ڈائل کیا تھا۔ کوئی نام' کوئی رینک' کوئی اور حوالہ نہ تھا۔ صرف ہسبینڈ۔ ایسا رشتہ کہ جیسے سب کو پتا ہو' بس یہی بچانے آئے گا۔

وہ پارکنگ لاٹ میں زنجیریں پھلانگتا' گملے گراتا' بھاگم بھاگ دوڑ رہا تھا۔ اس کی رنگت سفید تھی اور سانس رک رک کے آتی تھی۔ زندگی ایک دفعہ پھر وارث کے ہاسٹل کے کمرے کے باہر جا پہنچی تھی' ایک دروازہ تھا جسے وہ ہاتھ پاؤں مار مار کے کھولنے توڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس دروازے کے پار ایک اور بے جان جسم منتظر تھا یا...؟ وہ نفی میں سر ہلاتا' راہداری میں آگے بھاگتا جارہا تھا۔ کسی سے کیا پوچھا' کون اس کو راستہ بتاتا رہا' وہ نہ سن رہا تھا' نہ دیکھ رہا تھا۔ بس اس سمت میں بھاگ رہا تھا۔

وہ کمرہ ٹھنڈا تھا۔ ایسے جیسے برف کی دیواریں ہوں' پانی کا فرش ہو اور گویا آنکھوں کے سامنے سفید دھند ہو۔ وہ اسے کچھ بتا رہے تھے۔ بہت سے لوگ تھے ادھر اور وہ بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ فارس کے قدم اب ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔ وہ اس اسٹریچر کے ساتھ کھڑا تھا جس پہ سفید چادر ڈالی گئی تھی۔ اس کی نظریں چادر پہ جمی تھیں' مگر ہاتھ اٹھا کر چادر ہٹانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کا تذبذب دیکھ کر سامنے کھڑی سفید کوٹ والی عورت نے چادر چہرے سے ہٹائی۔

کسی اپنے کا' مردہ چہرہ پہچاننا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایسا سفید' پیلا اور ٹھنڈا ہوتا ہے' ایسے تو وہ سوتے ہوئے بھی نہیں لگا کرتے۔ ایسے آنکھیں تو وہ مذاق میں بھی بند نہیں کرتے۔ ایسے پتھر تو وہ ناراضی میں بھی نہیں بنتے۔ وہ بھی ایسی ہی لگ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پہ سیاہ دھبہ تھا۔ سفید دھند کے باعث اسے وہ دھبہ ہی دکھا تھا۔ وہیں اسے گولی لگی تھی۔ اور ایک سینے میں۔ وہ اسپتال آنے سے پہلے ہی مرچکی تھی' پھر بھی (اسے بتایا جارہا تھا) کہ اس کو بچانے کی کوشش کی گئی مگر یہ انسانوں کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ تو کیا انسانوں کے ہاتھ میں صرف جان لینا ہوتا ہے؟ زندگیاں اجاڑنا ہوتا ہے؟ وہ تھکا ہارا زمین پہ بیٹھتا چلا گیا۔ پانی کا فرش ٹھنڈا یخ تھا مگر اس کا اپنا جسم بھی برف بن چکا تھا۔ سر نیہوڑائے' وہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ وارث کی موت پہ اسے غصہ محسوس ہوا تھا' زرتاشہ کی موت پہ خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایسا ڈر جو پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔

اس خوف سے رگوں کا خون سہم کے جم گیا تھا۔ کوئی اسے کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ دوسری لڑکی بھی

تھی جس کی شناخت پراسیکیوٹر زمر کے طور پہ ہوئی ہے اور اس کی سرجری ہو رہی ہے مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ کون زمر؟ کیسی زمر؟ اسے اب پروا نہیں رہی تھی۔ پیشانی پہ ہاتھ رکھے وہ سر جھکائے وہاں بیٹھا تھا اور گویا پانی کا فرش دھیرے دھیرے اسے نگل رہا تھا۔ وہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے یخ برف بنتا جا رہا تھا۔ سفید پڑ رہا تھا مگر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا

وہ رات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ آسمان تاریک ہو چکا تھا اور تاروں کا جہاں، ماحولیاتی آلودگی کی گہری تہ کی وجہ سے شہر کی سڑکوں سے نظر نہیں آتا تھا۔ ایسے میں ہارون عبید کی رہائش گاہ پہ وہ دونوں خاموشی سے ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ہارون عبید گاہے بگاہے اس پہ نظر ڈال لیتے جو کھانے کے ساتھ بار بار اپنے موبائل کی اسکرین کو دیکھتی تھی۔ ملازم کو جانے کا اشارہ کرکے ہارون اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آبی۔۔۔" اس نے نہیں سنا۔ سرخ رومال سر پہ اوڑھے ان کی خوب صورت بیٹی، رک کر موبائل اسکرین پہ انگلی پھیرنے لگ گئی تھی۔

"آبی۔" دوبارہ پکارنے پہ وہ چونکی۔ موبائل بجھا کے ان کی طرف سنبھل کے متوجہ ہوئی۔ "سنا ہے مسز کاردار اینٹی سوشل ہوتی جا رہی ہیں۔"

"مجھے نہیں خبر!" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"تو خبر رکھا کرو نا۔ مجھے وجہ جاننی ہے۔ تم یوں کرو، کل ہاشم سے ملنے چلی جاؤ۔ اس سے پوچھو کہ۔۔۔۔"

"بابا۔" وہ اکتا کر بولی تھی۔ "اگر آپ کو مسز کاردار کی حالت زار میں اتنی دلچسپی ہے تو خود چلے جائیں یا اپنے کسی جاسوس کو بھیج دیں۔ مجھ سے یہ کام نہ کروائیں۔"

"بیٹا! تمہیں صرف اتنا کرنا کہ ہاشم سے کہنا ہے تم اس کے پرپوزل پہ غور کر رہی ہو، لیکن تمہاری کچھ شرائط ہیں۔"

آبی نے چونک کے ان کو دیکھا۔ "کیسی شرائط؟"

"کچھ پیپرز ہیں، تمہیں ان پہ ہاشم کے دستخط لینے ہیں لیکن ایسے کہ اسے یقین ہو جائے کہ تم اس کے ساتھ مخلص ہو اور۔۔۔۔"

آب دار نے زور سے کانٹا پلیٹ میں پٹخا اور موبائل اٹھا کے کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ غصے اور توہین سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ان کو دیکھ کے وہ بس افسوس سے اتنا بولی تھی۔

"میں آپ کی بیٹی ہوں یا کٹھ پتلی، آپ ایک دفعہ بتا کیوں نہیں دیتے؟ اور میں مزید آپ کے ہاتھوں استعمال نہیں ہوں گی۔ مجھے ہاشم سے نہ شادی کرنی ہے نہ اسے کوئی امید دلانی ہے۔ آئندہ میں اس موضوع پہ کوئی بات نہیں سنوں گی۔" برہمی سے بولتی وہ نیپکن پرے پھینکتی ـــــــ نکل کے باہر چلی گئی۔

ہارون اثر لیے بنا اسی طرح سکون سے لقمہ چباتے رہے۔ ان کا ذہن اب اگلا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔

جس وقت وہ کمرے کی طرف جا رہی تھی، اس کا موبائل تھرتھرانے لگا تھا۔ اس نے رک کر اسکرین دیکھی تو چہرے پہ ہیجان سا نمودار ہوا، پھر ہچکچاتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

"ہاشم کاردار!" آج پورے نام سے پکارا۔

"ریڈ۔۔۔۔" وہ جیسے زخمی سا مسکرایا تھا۔ "مل سکتی ہو؟"

"کیوں؟ خیریت؟"

"مل کے بتاؤں گا۔" انداز میں عجیب سی دھونس تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ احتجاج کرتی، وہ لائن کاٹ چکا تھا۔ وہ متذبذب سی کھڑی رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

چلتی ہے اب تو سانس بھی اس احتیاط سے

جیسے گزر رہی ہو کسی پل صراط سے
مور جال پہ۔ رات کا اندھیرا پھیلا تھا۔ زمر کے کمرے میں آؤ تو وہ صوفے کے ایک کنارے پہ بیٹھی اپنے موبائل پہ مصروف تھی۔ فارس دوسرے کنارے پہ بیٹھا اپنے فون پر مصروف تھا۔ معروف سی خاموشی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ تب ہی دروازہ زور سے بجا تو دونوں چونکے۔ زمر تیزی سے اٹھی اور دروازہ کھولا۔ سامنے سعدی کھڑا تھا' ہانپتا کانپتا' جیسے بھاگ کے آیا ہو۔

"فوٹیج تھی۔ نوشیرواں کی فوٹیج۔"

"سعدی! آرام سے بیٹھو' پانی پیو۔" وہ اسے کہنی سے تھامے اندر لائی جس کا چہرہ اور بال پسینے سے تر تھے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" فارس اسے یوں آتے دیکھ کے حیرت سے اٹھا۔

"نوشیرواں کی فوٹیج ایئرپورٹ سیکورٹی فورس کے پاس تھی جس میں وہ 22 مئی کی صبح دبئی کے لیے بورڈنگ کرتا دکھائی دے رہا ہے۔" وہ بے چین سا صوفے کے کنارے بیٹھا۔

"ایسی کوئی فوٹیج نہیں ہے' ہم نے سب پتا کرایا تھا۔"

"فارس ٹھیک کہہ رہا ہے' ایسی کوئی فوٹیج نہیں ہے۔ ہوتی تو ہمیں مل جاتی۔"

"ایئرپورٹ پہ ملازم ایک خاتون سے بات ہوئی ہے میری۔ ان کا کہنا ہے کہ فوٹیج آپریٹر نے مٹادی تھی جب ٹرائل شروع ہوا تھا۔" وہ پھولی سانس کے دوران سب کچھ کہتا گیا۔

"مطلب تم پی ایم ڈی سی والے کلرک کے پیچھے نہیں گئے۔" فارس نے اسے برہمی سے دیکھا تو جواباً سعدی نے صرف سرخ آنکھوں سے اسے گھورا۔

"کتنا اچھا ہو کہ آپ اس بات پہ فوکس کریں کہ اب ہمیں وہ فوٹیج کیسے نکلوانی ہے۔"

"چوری کرواسکتا ہوں میں' مگر پھر....." زمر کو دیکھا تو اس نے جھٹ نفی میں سر ہلایا۔

"چوری کی فوٹیج کورٹ میں قابل قبول نہیں ہوگی فارس۔ صرف وہی فوٹیج قابل قبول ہوگی جو ایئرپورٹ سیکورٹی فورس خود ہمارے حوالے کرے۔ قانونی طور پہ۔ اور اگر وہ ڈیلیٹ کرچکا ہے تو نہیں ملے گی۔"

"تو اس آپریٹر کو گواہ کے طور پہ بلائیں۔" سعدی نے بے چینی سے بات کاٹی۔

"وہ تو ہوجائے گا' اور عدالت کہے گی اگلی پیشی پہ آپریٹر کو حاضر کرو۔ مگر ہاشم کو چند دن مل جائیں گے اور وہ گواہ کو غائب کرادے گا یا خاموش کرادے گا۔"

فارس ہلکا سا کھنکھارا۔ "جس شخص نے ہاشم سے پیسے کھا کے فوٹیج مٹائی ہے' وہ ہمارے حق میں گواہی دے گا ہی کیوں؟"

"تو اب ہم کیا کریں؟" وہ ان دونوں سے پوچھ رہی تھی اور جواباً وہ دونوں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

مجھ سے کسی کو کام کیا' میرا کہیں قیام کیا
میرا سفر ہے در وطن' میرا وطن ہے در سفر

قتل سے پانچ دن قبل

وہ صبح بارش سے نہائی ہوئی تھی۔ قصر کاردار کا سارا سبزہ میل کچیل سے پاک نکھرا اور دھلا دھلایا لگ رہا تھا۔ لاؤنج میں ملازم معمول کی صفائی کررہے تھے۔ فیونا جواہرات کے کمرے کے باہر کھڑی حکم چلا رہی تھی۔ اب وہ نہ میری سے الجھتی تھی' نہ برے موڈ میں رہتی تھی۔ بس مسکراتی رہتی تھی۔

جواہرات اپنے کمرے میں سست سی' آرام دہ کرسی پہ بیٹھی اپنا فون دیکھ رہی تھی۔ بال کیچر میں باندھ رکھے تھے' اور چہرے پہ بے زاری تھی۔ دفعتاً" دروازہ کھٹکھٹا کر فیونا نے اندر جھانکا۔ جواہرات نے اکتائی ہوئی نظر اٹھائی۔

"میری اجازت کا انتظار کیا کرو۔"

"سوری مسز کاردار! مگر مسز رفیع کا ملازم آیا ہے' آپ کا ڈریس لے کر۔ وہ آپ ہی کا ڈریس ہے نا؟"

احتیاطاً" پوچھا۔

جواہرات چونکی پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "اسے اندر بھیجو۔"

"گارڈز اس کو چیک کرلیں، پھر بھیجتے ہیں۔" ایک مسکراہٹ کے ساتھ فینونا غائب ہوگئی۔ وہ صبر کے گھونٹ بھر کے رہ گئی۔

چند لمحے بعد مسز رفیع کا ملازم ایک کھلا ہوا پیکٹ اس کے سامنے میز پہ رکھ رہا تھا۔ (پیکٹ گارڈز نے کھول کے چیک کیا تھا۔) البتہ اس وقت کمرے میں صرف فینونا تھی۔ ایسے میں جب مسز رفیع کے ملازم نے جھک کے پیکٹ میز پہ رکھا تو جواہرات نے دیکھا اس نے پیکٹ تلے کوئی شے بھی رکھ دی تھی۔ ایک گہری نظر اس پہ ڈال کے وہ سیدھا ہوا اور ادب سے باہر نکل گیا۔

فینونا کے جاتے ہی جواہرات نے کمرے کا دروازہ مقفل کیا اور پیکٹ ہٹایا۔ نیچے چھوٹا سا سیاہ پیکٹ رکھا تھا۔ اس نے وہ جلدی جلدی کھولا۔ اندر ایک موبائل تھا۔ اس نے اسکرین آن کی۔ اسی پل کال آنے لگی۔

"احمر۔۔۔۔ یہ کیا طریقہ تھا موبائل بھیجنے کا؟ اگر گارڈز چیک کرلیتے تو؟"

"تو میرا آدمی کہتا کہ یہ اس کا موبائل ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ کم از کم آپ سے رابطے کا کوئی ذریعہ تو ملا۔" وہ دوسری طرف اطمینان کی سانس بھر کے بولا تھا۔

"ٹھیک۔۔۔۔ یہ صحیح کیا تم نے۔ میں تو بالکل قید ہو کر رہ گئی ہوں۔" وہ واپس پرپیسار کے صوفے پہ بیٹھی اور تلخی سے فون میں بولے گئی۔ "میری ہر حرکت پہ نظر ہے ان دو ٹکے کے ملازموں کی۔"

"کیا کوئی ایک بھی ملازم آپ کا وفادار نہیں ہے۔"

"تم ہی ہو۔ باقی یہاں تو یوں لگتا ہے کہ سب مجھ سے کوئی پرانا انتقام لے رہے ہیں۔ خیر تم بتاؤ، میرے کام کا کیا بنا؟"

"ابھی تک نہیں ہو پایا۔" احمر مایوسی سے کہہ رہا تھا۔ "مگر آپ بے فکر رہیں' میں جلد کردوں گا۔"

جواہرات چونکی۔

"ابھی تک ہو جانا چاہیے تھا۔ کہیں تم میری ساری رقم لے کر فرار ہونے کا تو نہیں سوچ رہے۔"

"توبہ کریں مسز کاردار۔" وہ بُرا مان کے بولا تھا۔ "میں آپ کا وفادار ہوں۔ آپ نے مجھے نوکری دی، مجھے عزت دی، میرے لیے ایک مضبوط اور پُرعزم Mentor (سرپرست) کا کردار ادا کیا، مجھے اتنا کچھ سکھایا اور آپ کو لگتا ہے کہ میں اتنا احسان فراموش، گھٹیا اور کمینہ ہوں کہ آپ کی دولت اور زیورات لے کر بھاگ جاؤں گا؟" وہ اب افسوس سے کہہ رہا تھا۔ "مجھ پہ اعتبار کیا ہے تو پورا کریں۔ مجھے وقت دیں اور بے فکر ہو جائیں۔ آپ کی ساری چیزیں بحفاظت آپ تک پہنچ جائیں گی۔ وہ آپ کی امانت ہیں، اور ان کو آپ تک پہنچانے کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینی پڑی تو دے دوں گا، مگر اپنی کمٹمنٹ نہیں توڑوں گا۔"

آخر میں وہ جذباتی ہو گیا تھا۔ جواہرات کے ماتھے کی سلوٹیں ڈھیلی ہوتی گئیں۔ وہ نرمی سے مسکرائی۔

"مجھے تم پہ فخر ہے احمر کیونکہ تم میرا انتخاب تھے۔ اگر قسمت مجھے مہلت دیتی تو میں آنے والے برسوں میں تمہیں تراشتی، تمہیں سکھاتی اور تمہیں ایک بہترین سیکورٹی آفیسر بنا دیتی۔ خیر ایک دفعہ یہ ٹرائل گزر جائے تو میں تمہیں واپس لے آؤں گی۔"

اور اپنے اپارٹمنٹ کے لاؤنج میں بیٹھا احمر سہلاتا ہوا سن رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے فون کان پہ لگا رکھا تھا اور دوسرے سے وہ میز پہ رکھے زیورات اٹھا اٹھا کے دیکھ رہا تھا۔ پلاٹینم اور ہیروں سے جڑے زیورات کی چمک اس کی آنکھیں خیرہ کررہی تھی۔

"آپ بے فکر رہیں۔ میں بہت جلد آپ کے زیورات اور نقدی لے آؤں گا' اور آپ کی امانت آپ کے حوالے کرکے سرخرو ہو جاؤں گا۔"

فون بند کرکے وہ ایک دفعہ پھر سے ان کو ٹٹول کے دیکھنے لگا۔ پھر احتیاط سے میز پہ رکھے سیاہ بیگ میں بھرنے لگا۔ بیگ میں پہلے سے چند نوٹوں کی گڈیاں، چیک بکس، ٹریولز چیکس رکھے دکھائی دے رہے تھے۔ اور ان کے اوپر وہ پلاسٹک میں سیل کرکے زیور

ڈول رہا تھا۔

تب ہی گھنٹی بجی۔ وہ چونکا، پھر تیزی سے بیگ میں سارا سامان بھرنے لگا۔ دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ احمر کے ہاتھوں کی رفتار میں مزید تیزی آگئی۔ پھر لاک کھلنے کی آواز آئی۔ اب نے بیگ کی زپ بند کر کے جلدی سے اسے صوفے تلے دھکیلا اور فق چہرہ اٹھایا تو۔۔۔

سامنے دروازہ کھول کے فارس اندر آیا تھا۔ احمر کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔

"تم۔۔۔" پھر غصہ آنے لگا۔ "کسی مہذب آدمی کے گھر اس طرح تالا توڑ کے داخل نہیں ہوتے۔ کوئی شرم ہوتی ہے، کوئی حیا ہوتی ہے، مگر تمہیں کیا پتا کہ وہ کیا ہوتی ہے۔"

فارس حسب معمول ماتھے پہ بل لیے، گرے شرٹ میں ملبوس، آستینیں چڑھائے چلا آرہا تھا۔ اس کے سامنے آکر رکا اور سنہری آنکھیں سکیڑ کے اسے دیکھا۔

"رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟" پھر اندرونی کمرے کے دروازے کو دیکھا۔ "اندر کوئی ہے؟"

"نہیں یار۔ آؤ بیٹھو۔" اس نے جھلا کے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ خود دانستہ کھڑا رہا۔ جس صوفے کے آگے کھڑا تھا اسی کے نیچے سیاہ بیگ رکھا تھا۔

"اتنی صبح صبح کون سی آفت آن پڑی تھی؟" برے موڈ سے کہتے ہوئے اب خود بھی بیٹھا، کیونکہ فارس سامنے بیٹھ چکا تھا اور ٹانگ پہ ٹانگ جمالی تھی۔

"پی ایم ڈی سی کا ریکارڈ حاصل کرتا ہے، ایئرپورٹ پہ ایک گواہ ڈھونڈتا ہے، رات سے میسج کر رہا ہوں تمہیں۔ کہاں ہو تم؟" فارس خفگی سے کہتا بار بار مشکوک انداز میں اس کو سر سے پیر تک دیکھتا تھا۔

"میں نے سعدی کو موقع دیا تھا۔ اس نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ ہاتھ مسلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ فارس کچھ لمحے سوچتا رہا، پھر ایک دم جھک کے نیچے سے کچھ اٹھایا اور احمر کا سانس رک گیا۔ وہ ایک سبز پاسپورٹ تھا۔

"تم کہیں جا رہے ہو، سلطان بنگش؟" پاسپورٹ کھولتے ہوئے اس نے نام پڑھا، پھر ابرو سے احمر کے صوفے تلے جھلکتے بیگ کی طرف اشارہ کیا، جو اسے جانے کیسے نظر آگیا تھا۔ احمر نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "شہر سے باہر جا رہا ہوں، کچھ دن کے لیے۔"

"تو پاسپورٹ کس لیے؟"

"تم میری ماں ہو؟"

فارس نے پاسپورٹ میز پہ ڈال دیا اور سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو احمر شفیع کی شناخت کا یہ اختتام تھا؟ تم کوئی لمبا ہاتھ مار کے بھاگ رہے ہو، ہے نا؟" پھر وہ مسکرایا۔ "اس بیگ میں ہوگا کسی کا لوٹا ہوا مال، ہے نا؟"

"دیکھو، میں تم لوگوں کی جتنی مدد کر سکتا تھا میں نے کی۔ لیکن اب مزید یہاں ٹھہرنا میرے مفاد میں نہیں۔ مجھے اپنا بھی سوچنا ہوگا اور۔۔۔"

"اسٹیپنی! ہم جس دن دوست بنے تھے میں اسی دن سے جانتا تھا کہ تم ایک پیدائشی فراڈ ہو اور میں نے تمہیں تمہاری ان کوالٹیز کے ساتھ قبول کیا تھا، اسی لیے میرا خیال ہے تم درست فیصلہ کر رہے ہو۔" وہ سادگی سے کہہ رہا تھا۔ نہ کوئی ناراضی، نہ کوئی شکوہ۔ احمر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔

"تم نے اس شہر میں جتنے لوگوں کو مسز کاردار کی وجہ سے خفا کر لیا ہے، اس لحاظ سے تو تمہیں بہت پہلے یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔"

"سوری۔۔۔ میں مزید تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ ہلکے سے افسوس سے بولا۔ فارس اداسی سے مسکرایا۔

"آدمی تم انتہائی گھٹیا ہو، مگر دوست اچھے ہو۔ جاؤ معاف کیا۔" اور وہ دونوں ہنس پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

تم سے پہلے جو شخص یہاں تخت نشین تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پر اتنا ہی یقین تھا

فوڈلی ایور آفٹر کی چھت کے عین اوپر آسمان پہ

سورج سنہرے انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔ بارش کے پانی کو اس نے سکھا دیا تھا۔ بالائی منزل کے خالی ہال کے کونے میں زمر اپنی کرسی پہ بیٹھی ایک فائل کے مطالعے میں مصروف تھی۔ سامنے میز کے ساتھ لینڈ لائن کا ریسیور اٹھائے کھڑا جنید دوسری طرف جاتی گھنٹی سن رہا تھا۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"مس حلیمہ سیل نہیں اٹھا رہیں۔"

"گھر پہ فون کیا؟" زمر سر جھکائے فائل پہ کچھ لکھتے ہوئے بولی۔

"جی۔۔۔ انہوں نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ آفس فون کیا تو میری آواز سے آپ کا نام سن کے رکھ دیا۔ اب سیل ٹرائی کر رہا ہوں۔"

"اور جو خط میں نے اسے بھیجا تھا' اس کی وصولی کی رسید آ گئی؟"

"جی۔۔۔ آپ کی دراز میں رکھ دی تھی۔" جنید فون رکھ کے بتانے لگا۔

"تھینک یو جنید۔۔۔" پھر اس نے سر جھکائے کام کرتے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ "اس سے ٹرائی کریں۔"

جنید اب موبائل پہ نمبر ملانے لگا۔ جیسے ہی دوسری طرف سے ہیلو سنائی دیا' اس نے جلدی سے فون زمر کی طرف بڑھایا۔ زمر نے اسی مصروف انداز میں کان سے لگا لیا۔

"حلیمہ! میں زمر یوسف بات کر رہی ہوں' آپ چند لمحے کے لیے میری بات سن لیں گی؟" اب وہ بولتے ہوئے کاغذ پہ لکیر لگا رہی تھی۔

"میں آپ کے اسسٹنٹ کو بتا چکی ہوں کہ مجھے آپ لوگوں سے بات نہیں کرنی' میں اپنا بیان صرف عدالت میں دوں گی۔"

"حلیمہ! مجھے آپ کو ڈرانا دھمکانا نہیں ہے' نہ ہی آپ کو اپنا بیان بدلنے پہ مجبور کرنا ہے' مجھے صرف آپ سے 21 مئی کی دوپہر کے متعلق چند سوالات پوچھنے ہیں' تاکہ میں کیس کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکوں۔ کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکتی ہیں۔"

"نہیں' مجھے کوئی بات نہیں کرنی' آپ قانوناً مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔" وہ درشتی سے بولی اور فون رکھ دیا۔

زمر نے اسی مصروف انداز میں موبائل رکھ دیا اور اپنا کام کرنے لگی جیسے اس سے زیادہ اسے اس معاملے میں دلچسپی نہ ہو۔

چند میل دور واقع اس بلند عمارت کے ٹاپ فلور کے کارنر آفس میں حلیمہ' ہاشم کے سامنے بیٹھی تھی اور جھرجھری لے کر اپنا موبائل میز پہ رکھ رہی تھی اور ہاشم مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا۔

کونے میں ایک اونچی میز پہ وہ بڑا سا ایکوریم مصنوعی روشنیوں میں چمکتا دمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ خوب صورت رنگ برنگی مچھلیاں اندر تیر رہی تھیں۔ کھیل رہی تھیں۔ ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔

"سر۔ پھر اب؟"

"اب کچھ بھی نہیں۔ تمہیں اس سے بات نہیں کرنی اور اپنی تیاری مکمل رکھنی ہے۔ اب جو کہنا ہے عدالت میں کہنا ہے۔" وہ ٹیک لگا کے بیٹھا تھا اور کوٹ پیچھے اسٹینڈ پہ لٹکا رکھا تھا۔ بنے ہوئے بال' خوشبو میں بسا وجود' وہ مکمل تروتازہ اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ شیرو کی پریس کانفرنس سے ہونے والے مالی نقصان کا شائبہ تک چہرے پہ نہیں تھا۔

"تیاری تو آپ نے مجھے کرا دی ہے۔ 21 مئی کو سعدی یوسف ادھر نہیں آیا تھا اور اس سے پہلے جو میں نے اس کو کالز کی تھیں' وہ بھی ذاتی وجہ سے کی تھیں۔" وہ پراعتماد تھی۔

"میں نے تمہیں ایگزامینیشن ان چیف کی مشق کرائی ہے۔ اس کے بعد کراس (جرح) ہو گی۔ وہ کراس کے ذریعے تمہیں جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"اور پھر میں کیا کروں گی سر؟"

"بے وقوف وکیل وہ ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کراس کے دوران گواہ مخالف وکیل کو ہرا دے اور اسے خود کو جھوٹا ثابت کرنے ہی نہ دے مگر ایسا نہیں

ہوتا۔ ہرانے والی باتیں ڈائریکٹ ایگزامینیشن میں کتنی ہوتی ہیں۔ کراس میں صرف سروائیو کرنا ہوتا ہے۔ دفاع کرنا ہوتا ہے۔ کم سے کم نقصان کرنا ہوتا ہے اپنا۔"

"اور میں اس کے سوالوں کا مقابلہ کیسے کروں گی؟"

اس کی آواز میں فکر مندی در آئی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اور اچھا وکیل وہ ہوتا ہے جو اپنا کیس تو تیار کرے مگر ساتھ میں مخالف کا کیس بھی تیار کرے۔ کبھی کبھی میں اپنے مخالف کے لیے جتنے اچھے دلائل اور نقطے ڈھونڈ کر لکھتا ہوں، کورٹ روم میں وہ اتنے اچھے نقطے پیش نہیں کرتے۔ خیر۔ اب میں زمر کی طرف سے پوچھے جانے والے سوالات بتاتا ہوں تمہیں۔" وہ اب میز کے کونے پہ آبیٹھا تھا اور سامنے بیٹھی توجہ سے سنتی حلیمہ سے کہہ رہا تھا۔

"مس حلیمہ! کیا یہ درست نہیں کہ آپ نے اس تاریخ کو اس وقت سعدی یوسف کو کال کی تھی؟"

"کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ پچھلے کئی سال سے اس فرم میں ملازمت کر رہی ہیں اور ہمیشہ اپنے مالک کا ساتھ دیتی آئی ہیں اور اب بھی اس کے لیے جھوٹ بول رہی ہیں۔ ایسے سوالات پہ میں اعتراض کروں گا، تو وہ ٹون بدل کے یہی سوال مختلف انداز میں پوچھے گی۔ کیا یہ درست نہیں کہ آپ نے ہاشم کاردار کی کمپنی سے قرضہ لے رکھا ہے جو قسطوں میں ادا کرنا ہے اور آپ ان کے احسان تلے دبی ہوئی ہیں؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ رات دیر تک آفس میں کام کرتی ہیں اور آپ کی اپنے باس سے کافی فرینک نیس ہے؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ کے اپنے باس سے تعلقات ہیں؟"

"کیا وہ اس طرح کا الزام بھی لگا سکتی ہیں؟" اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"عدالت میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اسے تمہیں جھوٹا ثابت کرنا ہے، اس لیے وہ سخت سے سخت زبان استعمال کرے گی، تلخ انداز اپنائے گی، تیز تیز سوالوں کی بوچھاڑ کر کے تمہیں کنفیوز کر دے گی۔ اس لیے اب میں تمہیں ان سوالوں کے جوابات کی مشق کروانے لگا ہوں۔ اوکے!" وہ اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

"شیور سر!" حلیمہ ذرا ٹھہری پھر آنکھیں اٹھا کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "سر! ایک بات پوچھوں؟"

"یہی کہ میں نے اور شیرو نے یہ سب واقعی کیا ہے یا نہیں؟"

حلیمہ نے اثبات میں سرہلایا۔

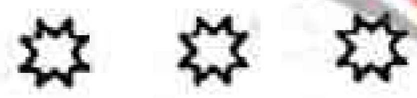
"ہاں۔ میں نے یہ کیا ہے اور مجھے دس بار موقع ملے تو میں دس بار یہ ہی کروں گا۔ اب ہم پریپ کرلیں؟"

حلیمہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ جھٹ اثبات میں سرہلا کے "یس سر!" بولی تھی۔ وہ اب کاغذ اٹھا کے سوالات پھر سے دہرانے لگا تھا۔ چہرہ سپاٹ اور مطمئن تھا۔

واپس فوڈلی ایور آفٹر کی بالائی منزل پہ آؤ تو زمر اسی انداز میں بیٹھی نوٹ پیڈ پہ سوالات لکھے جارہی تھی۔ سامنے کھڑے جنید نے بے چینی سے پوچھا۔

"ان کی سیکرٹری تو ملنے پہ راضی ہی نہیں ہوئی، اب آپ اس کا بیان اپنے حق میں کیسے کروائیں گی؟"

"مجھے جرح کے دوران گواہ کو سوالات سے مار دینے کا فن آتا ہے، جنید! آپ اپنا کام کیجیے۔" وہ اب بھی سر جھکائے لکھے جارہی تھی۔



ذرا سی دیر کا ہے یہ عروج مال و منال
ابھی سے ذہن میں سب زاویے زوال کے رکھ

قتل سے تین دن قبل

قصرِ کاردار کا سبزہ زار اس شام برقی قمقموں اور روشنیوں سے منور تھا۔ اونچے درختوں کے گرد قمقمے لپیٹ کر ان کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ مرکزی اسٹیج پہ فنڈ ریزنگ تقریب کے بعد اب گلوکار اپنے ساتھیوں سمیت نیچے بیٹھا غزل گا رہا تھا۔ ایسے میں جواہرات یہاں سے وہاں ٹہلتی، مسکرا مسکرا کے

مہمانوں سے چند پل ٹھہر کے گپ شپ کر رہی تھی۔

سیاہ جھلملاتی نگینوں سے مزین ساڑھی میں وہ بے حد تر و تازہ اور خوب صورت دکھائی دے رہی تھی اور اس اچھے موڈ کو برقرار رکھنے کے لیے وہ قریب ٹہلتے دونوں گارڈز کو دیکھنے سے خود کو باز رکھے ہوئے تھی۔

محفل موسیقی ابھی جاری و ساری تھی جب جواہرات برآمدے کے زینے عبور کر کے اندر جاتی دکھائی دی۔ جیسے کوئی بھولی چیز اٹھانے جا رہی ہو۔

لاؤنج کا دروازہ کھول کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹک گئی۔ وہاں چند ہی لوگ تھے جو یا تو موبائل پہ مصروف صوفوں پہ نیم دراز تھے، یا ٹی وی دیکھ رہے تھے، مگر دیوار کے سامنے کھڑی عورت کو دیکھ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ قدم ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے اس کو نہیں بلایا تھا تو پھر.....؟

وہ سفید چادر سر پہ جمائے اس کی طرف پشت کیے کھڑی، دیوار پہ نصب فوٹو فریمز دیکھ رہی تھی۔ فریمز ڈیجیٹل تھے، ان کے اندر تصاویر ہیری پوٹر کی دنیا کی طرح چل پھر رہی تھیں۔ چند سیکنڈز کے وڈیو کلپس اور پھر سلائیڈ شو۔ دس منٹ کھڑے ہو کر دیکھو تو ہاشم اور شیرو کی ساری زندگی کی تصویری کہانی سامنے آجاتی تھی۔ صاحب زادی صاحبہ بھی وہی دیکھ رہی تھیں۔

آہٹ پہ پلٹیں۔ گوری رنگت اور گہری آنکھیں۔ مسکرا کے جواہرات کو دیکھا۔

جواہرات سست روی سے قریب آئی۔

"خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔ اگر آنا چاہتی تھیں تو مجھ سے کہہ دیا ہوتا۔ میں دعوت نامہ بھیج دیتی۔" جبری مسکراہٹ کے ساتھ کہتی وہ اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔ چادر والی عورت ذرا سا مسکرائی۔ "لوگ اب مجھے خوشی سے دعوتوں میں نہیں بلاتے جواہرات! جب سے تمہارے اس پالتو نے میری زندگی کی چھوٹی کہانیاں زبان زدعام کی ہیں، لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔"

"میں سمجھی نہیں۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" جواہرات حیرت سے بولی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کے اس اسکینڈل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

عورت نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی، پھر ٹھنڈی سانس بھر کے مڑ گئی اور گردن ذرا اٹھا کے اوپر تک پھیلے فوٹو کو دیکھنے لگی۔

"تمہارے دونوں بیٹے کتنے خوب صورت ہیں، ماشاء اللہ..... ایک دنیا تم پہ رشک کرتی تھی، حسد کرتی تھی، مگر پھر اسی دنیا نے دیکھا تمہارے بیٹے نے تمہیں کاروبار سے بے دخل کر دیا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ تلملا کر بولی، مگر عورت بولے جا رہی تھی۔ "اور جب عدالت میں ایک چھوٹی سی لڑکی تمہاری عزت کا تماشا بنا کے چلی گئی تو مائیک تمہارے چہرے کے آگے کرتے رپورٹرز کے سامنے تمہارا کوئی ایک بیٹا بھی ڈھال بن کے نہیں آیا۔"

"بہت ہو گیا، آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔" وہ دبا دبا سا غرائی تھی۔

"ٹھہرنے آئی بھی نہیں تھی میں....." وہ اب پوری اس طرف گھومی اور جواہرات کی سلگتی آنکھوں میں جھانکا۔ "صرف یہ بتانے آئی تھی کہ مجھے اسی وقت کا انتظار تھا۔ کبھی لگتا تھا اس کو آنے میں برسوں لگیں گے، مگر یوسفز کا شکریہ، یہ تو بہت جلد آگیا۔"

"گیٹ آؤٹ!" وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے دروازے کی طرف بازو لمبا کر کے بولی۔

"جواہرات!" سفید چادر والی عورت دو قدم قریب آئی اور تاسف سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "آج کل تمہاری تباہی میں سب اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ تمہارے بیٹے، یوسفز، ہارون عبید، سب سیر ہو کر اپنا حصہ ڈال لیں، تب بھی میرا حصہ پورا نہیں ہوگا۔ تمہاری آنکھوں میں دیکھ کے بس اتنا کہنا تھا کہ آخری حصہ میں ڈالوں گی اور تم اسے یاد رکھو گی۔"

پھر وہ اس کے قریب سے گزرتی ہوئی باہر نکل کے چلی گئی اور جواہرات غصے اور بے بسی سے کانپتی

کھڑی کھڑی رہ گئی۔ باہر سے اونچے سروں میں بجتی موسیقی کی آوازیں ہنوز سنائی دے رہی تھیں۔

لاؤنج کے مہمانوں کو وہیں چھوڑ کے بغلی راہ داری میں آگے آؤ تو سامنے زینے تھے جو نیچے جاتے تھے۔ ان کو پھلانگ کر اترتے جاؤ گے تو آگے ایک طویل راہ داری تھی۔ دونوں اطراف میں کھلے دروازے تھے جو ملازموں کے کمروں میں کھلتے تھے۔ مزید آگے آؤ تو آخر میں کچن تھا۔ قصر کی پشت پہ سبزہ زار نشیب میں تھا' اس لیے کہ کچن بیسمنٹ میں بنا لگتا تھا' مگر اس کی پچھلی طرف سبزہ زار میں ہی کھلتی تھی۔

کچن کے کھلے دروازے سے اندر جھانکو تو وہاں ملازم ندارد تھے۔ صرف دو نفوس موجود تھے۔ ایک ہاشم جو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا اور بلینڈر کے جگ میں کٹے ہوئے پھل کین سے انڈیل رہا تھا۔ شرٹ کی آستینیں پیچھے کو موڑ رکھی تھیں اور کوٹ سامنے کرسی کی پشت پہ ڈال رکھا تھا اور دوسری آبدار جو کاؤنٹر کے اس طرف اونچے اسٹول پہ بیٹھی اسے سکون سے دیکھ رہی تھی۔ نہ کوئی ڈر تھا نہ کوئی خوف۔ عادتاً" وہ کان میں لٹکتے آویزے کو دو انگلیوں سے مسل بھی رہی تھی۔ آویزے سبز تھے' اس کے لباس اور آنکھوں کی طرح اور سرخ رومال ماتھے سے اوپر بندھا تھا۔ نظریں ہاشم کی پشت پہ جمی تھیں۔

"میں چاہتا تھا ہم ڈنر کریں' مگر تم اسی پارٹی میں ڈنر ایڈجسٹ کرنا چاہتی ہو تو میں یہی کر سکتا ہوں۔"

وہ اب بلینڈر کا ڈھکن بند کرکے' اس پہ ہاتھ رکھے بٹن آن کر رہا تھا۔ یک دم زوں کی آواز آئی تو آبدار کچھ کہتے کہتے رکی۔ پھر بلینڈر رکا تو وہ بولی۔

"مجھے نہیں پتا تھا' کہ بم ریپر اتنا ماہر بارٹینڈر بھی ہے۔"

ہاشم دھیرے سے ہنسا۔ زخمی سی ہنسی۔

"زیادہ نہیں' مگر تھوڑا بہت آتا ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ جو سیکھا تھا' وہ بھی بھول گیا۔" آواز میں آنچ تھی۔

"تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" آبی کی آواز ذرا مدھم ہوئی۔ نظریں سامنے کھڑے ہاشم پہ جمی تھیں۔ وہ چوکنی تھی' مگر خوف زدہ نہیں تھی۔

"جب میں چھوٹا تھا تو مجھے ایک بری عادت پڑ گئی تھی۔" وہ اب اوپر نے اسٹینڈ میں الٹے لٹکے گلاس اتار کے کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا۔ نظریں آبی کے بجائے اپنے کام پہ تھیں۔ "مجھے جب کوئی کھلونا پسند آتا' کوئی کتاب اچھی لگتی' میں اسے لینے کی ضد کرتا' روتا' جھگڑتا' بس کسی طرح وہ مجھے مل جائے۔ ڈیڈ کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔ کچھ عرصہ انہوں نے برداشت کیا' پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے میری ساری جمع کی ہوئی کوائن کلیکشن لے لی۔"

اب وہ گردن جھکائے جگ سے گلاسوں میں رس انڈیل رہا تھا۔

"اور کہا کہ محبوب شے کو چھین کر لینے' یا چرانے سے چیز تو مل جائے گی' مگر محبت ختم ہو جائے گی۔ جن سے محبت ہوتی ہے ان کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ ان کو جیتا جاتا ہے محبت سے لگن سے انہوں نے وہ البم کہیں چھپا دیا تھا' مجھے چند پہیلیاں بتائیں' یاد نہیں کیا تھیں' مگر میں نے پھر اس کو خود ڈھونڈا' شاید کسی دوست کو دے آئے تھے' میں نے اس آدمی کو کنوینس کیا کہ وہ مجھے وہ البم دے دے۔ شائستگی سے' نرمی سے' دلیل سے اور وہ مجھے مل گئی۔ شیرو میں ڈیڈ کبھی یہ عادت نہیں ڈال سکے۔ مجھ میں سے کبھی نکال نہیں سکے۔ اب مجھے فتح کو محنت کرکے حاصل کرنا اچھا لگتا ہے ریڈ! یہی وجہ ہے کہ چاہوں تو سعدی یوسف کے سارے خاندان کو ایک بم بلاسٹ میں ختم کر دوں' مگر نہیں' مجھے اپنے بھائی اور اپنے خاندان کے حق میں فیصلہ "حاصل" نہیں کرنا' بلکہ "جیت" کے آنا ہے۔"

آب دار کے چہرے کے کئی رنگ بدلے' بالی کو مسلتے ہاتھ میں تیزی آگئی۔ وہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "میرے اور تمہارے راستے الگ ہیں۔"

"اونہوں..... ابھی نہیں۔" اس نے ایک گلاس آبی کے سامنے رکھا اور دوسرا اپنے سامنے۔ پھر بیٹھا

نہیں۔ ہتھیلیاں کاؤنٹر پہ رکھے وہ اسے نرم سے زخمی پن سے دیکھے گیا۔ "ابھی تمہارے پاس چند دن ہیں۔ اس کے بعد تم جو بھی فیصلہ کرو گی، مجھے قبول ہوگا۔"

"تم نے جو اس روز مجھے ٹیکسٹ بھیجے تھے، ان کا کیا مطلب تھا؟" اس نے جی کڑا کر کے پوچھا۔ ہاشم اسی طرح اس کی آنکھوں میں جھانکے گیا۔

"مطلب تو صاف ظاہر تھا۔ میں نے تمہاری اور فارس کی ایک تصویر دکھا کے پوچھا تھا کہ یہ سچ ہے؟ تم نے جواب نہیں دیا تو میں نے دو تصویریں بھیج کر یہ بتایا تھا کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ وہ دو تصویریں زرتاشہ اور زمر کی تھیں۔"

"زمر کی کیوں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ (پرس میں رکھے اس کے فون کی اس چیٹ میں سے اس نے "کیا یہ سچ ہے" والا پیغام اور زرتاشہ اور زمر کی تصویر مٹا دی تھی، صرف "وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔" والا پیغام اور اپنی اور فارس کی تصویر رہنے دی تھی۔ اسی طرح اس نے وہ چیٹ فارس کو دکھائی تھی۔)

"تم جلد جان جاؤ گی،" میں نے کہا نا، مجھے ایسے کھیل پسند ہیں۔ کیا تم نے فارس کو بتایا؟" گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے مسکرا کے پوچھا۔

"یہی کہ تم نے زمر کو دھمکی دی ہے؟ ہاں بتایا تھا۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر اپنے گلاس سے گھونٹ بھرنے لگی۔ دل زور سے دھڑکا۔

"گڈ۔" ہاشم مسکرایا۔ زخم زخم مسکراہٹ۔

"وہ مشہور ہو چکے ہیں، تم ان میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے ہاشم!" وہ اسی بے نیازی سے بولی تھی۔

"میں ہمیشہ سے unpredictable (غیر متوقع) رہا ہوں۔" اس نے شانے اچکائے اور گلاس اٹھا لیا۔

"مجھے کیوں بلایا ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"یہ بتانے کے لیے کہ میں تمہیں حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ جیتنا چاہتا ہوں۔ اس کی اصلیت دکھانا چاہتا ہوں اور ..." ہتھیلیاں کاؤنٹر پہ رکھے اس کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اور تمہاری اصلیت سے بھی واقف ہوں۔"

آبدار کی رنگت سفید پڑنے لگی۔ ہاشم پہ جمی نظریں ساکت ہو گئیں۔ "تم نے میرے مقابلے میں فارس کا ساتھ دیا۔ سعدی کو زہریلی سرنج دی، اس کو فرار ہونے میں مدد دی۔ فارس کو اپنے ساتھ لے کر گئیں ... تم نے ہر قدم پہ مجھ سے جھوٹ بولا اور میں ہر قدم پہ تم پہ اعتبار کرتا رہا۔"

آبدار کی گردن میں تھوک نگلنے اور گلٹی ابھر کے معدوم ہوتی دکھائی دی۔

"کیوں کیا تم نے یہ آبی؟" وہ دکھ سے پوچھ رہا تھا۔ "اس کو مجھ سے اوپر کیوں رکھ دیا؟"

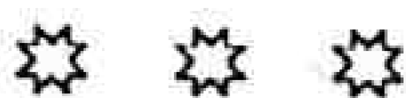
"نہیں ... صرف ایڈونچر چاہ رہی تھی۔" وہ ذرا سا ہکلائی۔

"تو پھر اب میرا ایڈونچر بھی دیکھنا۔"

"مجھے نقصان ... نقصان پہنچاؤ گے کیا؟"

"تمہیں؟ کبھی نہیں ... مگر اس سے کہنا کہ وہ ... اپنے خاندان کی ... عورتوں کی ... حفاظت نہیں ... کر سکتا!" چبا چبا کے ایک ایک لفظ ادا کیا، پھر سیدھا ہوا، کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا، کوٹ اٹھایا اور باہر چلا گیا۔ اس کا گلاس ان چھوا، بھرا ہوا میز پہ رکھا رہ گیا۔

آبدار ابھی تک ٹھنڈے گلاس کو پکڑے ہوئے بیٹھی تھی۔ مشروب کی ٹھنڈک نے اس کی ہڈیوں کو اندر تک جما دیا تھا۔



رات اس بلڈنگ پہ پر پھیلائے، اس کے سارے بھید ڈھانکے ہوئے تھی۔ اس کے ایک اپارٹمنٹ کے اندر نیم اندھیرا سا تھا۔ اوپن کچن کی بتی جل رہی تھی یا پھر احمر کے کمرے کا نائٹ بلب۔ وہ بیڈ پہ لمبا لیٹا، موبائل دونوں ہاتھوں میں لیے ٹھک ٹھک ٹائپ کیے جا رہا تھا۔ ساتھ میں جمائی روکنے کو منہ پہ ہاتھ بھی رکھتا۔ یہ تو طے تھا کہ نیند تب آتی تھی جب بیٹری ختم ہو جاتی، سو وہ بنا کسی فکر کے لگا ہوا تھا۔

فیس بک پہ مختلف لوگوں کی زندگیوں میں جھانکتا، وہ صفحہ نیچے کرتا جا رہا تھا جب باہر آہٹ سی محسوس ہوئی۔ پہلے وہ چونکا، پھر کسی خیال کے تحت گہری سانس بھری اور تیزی سے بستر سے نیچے اترا۔

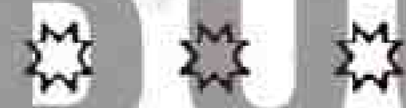
"شریف لوگوں میں کوئی تمیز تہذیب ہوتی ہے فارس غازی! چاہے آپ کا بیسٹ فرینڈ ہی ہو۔ اس کے گھر بھی یوں بنا پوچھے داخل نہیں ہو جاتے۔" سلیپر پہنتے ہوئے وہ زور سے چلایا تھا۔ پھر دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔

"میرے گھر کے باہر لگی گھنٹی شکل دیکھنے کے لیے نہیں لگی۔ اس پہ انگلی رکھ کے اسے بجایا جاتا ہے غازی! آخر کب سیکھیں گے آپ؟ کیا تیسری دفعہ جیل جانے کے بعد؟" غصے سے بولتا وہ لاؤنج میں آیا اور بتی جلائی۔

لاؤنج سنسان پڑا تھا۔ کچن کی بتی ہنوز جل رہی تھی۔ مرکزی دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ احمر قدرے چوکنا سا ہو کے آگے آیا۔ احتیاط سے دروازہ پورا کھولا۔ باہر لابی خالی تھی۔ سنسان، ویران، اسے نئے سرے سے غصہ آیا۔

"کیا تلاشی لینے آئے ہو غازی؟"

بے زاری سے زور سے دروازہ بند کر کے لاک کیا اور جیسے ہی واپس مڑا، کوئی نوکیلی سی شے اسے گردن میں گھستی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا۔ اثر تیز تھا۔ فوری تھا۔ بصارت دھندلائی گئی، مگر اتنا نظر آیا کہ سامنے دو ہٹے کٹے آدمی کھڑے تھے اور ان کے ہاتھوں میں بریٹا پستول تھے۔ احمر پوری قوت لگا کے مڑا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ دو قدم بعد اسے ٹھوکر لگی۔ اور وہ اوندھے منہ فرش پہ آن گرا۔۔۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا جسم سن ہوتا جا رہا تھا۔ بصارت دھندلی ہو رہی تھی اور ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔



ہم کو ہر دور کی گردش نے سلامی دی ہے
ہم وہ پتھر ہیں جو ہر دور میں بھاری نکلے

پارکنگ ایریا عمارت کی بیسمنٹ میں بنا تھا اور دوپہر کے باوجود وہاں اندھیرا پڑا تھا۔ گو کہ مدھم سفید بتیاں روشن تھیں مگر عجب ہولناکی سی چھائی تھی۔ ایسے میں ایک ادھیڑ عمر آدمی سامنے سے چل کر آتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جوتوں کی دھمک سناٹے کو چیر رہی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ قطار میں کھڑی گاڑیوں تک آیا اور جیب سے چابی نکالتے ہوئے ایک سفید کار کے قریب رکا۔

تب ہی اس کے پیچھے آہٹ سی ہوئی۔ قدموں کی چاپ۔ جیسے کوئی کسی ستون کی اوٹ سے نکلا ہو۔ ریموٹ کا بٹن دبا کر کار کو ان لاک کرتے اس نے مڑ کے یوں ہی دیکھا تو ٹھہر گیا۔

ستون کے ساتھ کھڑا نوجوان جیبوں میں ہاتھ ڈالے، فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مدھم اندھیرے اور روشنی کے ملے جلے ماحول کے باعث ادھیڑ عمر آدمی نے آنکھیں سکوڑ کے اسے دیکھا۔ وہ چہرہ شناسا سا لگتا تھا، مگر کون۔۔۔؟

"جب میں ٹین تھا تو میں نے ایک ریسرچ پڑھی تھی۔ اس کے مطابق بچہ اپنی پیدائش سے لے کر پہلے چھ ماہ تک بلیک اینڈ وائٹ دیکھتا ہے، اسے رنگ نظر نہیں آتے۔ بائی دا وے میں سعدی یوسف ہوں، اور آپ ایئرپورٹ سیکورٹی میں موجود وہ آپریٹر ہیں جن کو کل صبح عدالت سمن جاری کرے گی، تو میں کہہ رہا تھا کہ۔۔۔"

قصہ سناتے رک کے سینے پہ ہاتھ رکھے، اس نے اپنا تعارف کرایا اور بات جاری رکھی۔

"چند سائنس دانوں کی ایک تحقیق کے مطابق انسان پہلے چھ ماہ تک بلیک اینڈ وائٹ دیکھتا ہے۔ لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو ہم ایک عمر تک بلیک اینڈ وائٹ ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ بچپن میں اور پھر ٹین ایج میں ہر انسان بلیک یا وائٹ (نیک لوگ، گناہ گار لوگ) لگتا ہے۔ ہمیں ہم اگر کسی ایکٹر، اسکالر، یا سیاست دان سے محبت کرنے لگیں تو اس کو ایسا سفید مجسمہ بنا دیتے

ہیں کہ اس میں خامی نظر نہیں آتی، اور جب خامی دیکھ لیں تو اسے دیکھنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن مسعود صاحب، جب ہم میں سے اکثر لوگ میری عمر کو پہنچتے ہیں تو جان جاتے ہیں کہ یہاں نہ کوئی سفید ہے نہ سیاہ۔ سب سرمئی ہیں۔ کوئی گہرا سرمئی۔ کوئی ہلکا سرمئی۔ کوئی مٹیالا، کوئی کم گدلا۔ مگر بے داغ کوئی نہیں ہے۔“

مسعود ادھیڑ عمر میں گم ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ چابی ہاتھ میں تھی اور نظریں اس پہ ٹکی تھیں۔ سعدی بولتے بولتے قریب آنے لگا۔ قدموں کی چاپ نے پھر سے خاموشی کو چیرا۔

”لوگ کہتے ہیں ہماری چوائسز ہمیں ڈیفائن کرتی ہیں۔ وہ انتخاب جو ہم کرتے ہیں، وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم کون ہیں۔ ہم ہلکے سرمئی ہیں یا گہرے سرمئی، اس کا فیصلہ وہ کام کرتے ہیں جو ہم نے کیے ہوتے ہیں، مگر نہیں۔۔۔“ وہ اب اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا تھا اور نفی میں سر ہلا کے اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہہ رہا تھا۔

”میں نے دو انسانوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔ میرے مد مقابل جو شخص ہے، اس نے میرے خاندان کے دو انسانوں کو قتل کروایا ہے۔ یہ وہ انتخاب ہے جو ہم دونوں نے کیا۔ کیا یہ ہمیں ڈیفائن کر سکتے ہیں؟ ہمیں ڈسکرائب کر سکتے ہیں؟“ سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کے وہ بولتا رہا۔

”نہیں۔۔۔ کیونکہ میرا خیال ہے ہمارے اچھے یا برے ہونے کا تعین ہمارے چنے گئے راستے نہیں کرتے، بلکہ وہ راستے کرتے ہیں جو ہم نے نہیں چنے ہوتے۔ وہ فیصلے، وہ انتخاب کرتے ہیں جو ہم نے میسر ہونے کے باوجود نہیں کیے ہوتے۔ ہاشم کاردار نے دو انسانوں کو قتل کرنے کا ”انتخاب“ کیا، مگر اس کے پاس دوسرے راستے بھی تھے۔ نیب میں کیس لڑتا اور خود کو بری کروالیتا، یا پھر اگر فیصلہ اس کے خلاف آتا تو پلی بارگین کرلیتا۔ پیسے واپس کرتا اور رہائی مل جاتی۔ یا پھر وارث غازی پہ چند الزامات لگوا کے اس کو جاب سے نکلوا دیتا۔ یا پھر دہشت گردوں کے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جاتا اور اس کو فوج خود پروٹیکشن دیتی، یہ وہ راستے تھے جو اس نے نہیں چنے۔ اس نے قتل کا راستہ چنا۔ مگر جب میں نے دو قتل کیے تو میرے پاس دوسرا راستہ یہی تھا کہ خود کو مرنے دوں۔ میں نے اپنی جان بچائی۔ سروائیول کو چنا۔ ان دونوں آدمیوں کو قتل کروانے کو چنا، سوائے ہلاکت کے دوسرے راستے کے۔ آپ مجھے اور ہاشم کو ایک ہی ترازو میں نہیں تول سکتے۔ کیونکہ اس کے پاس آپشنز تھے، میرے پاس نہیں تھے۔ اسی لیے میں یہاں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں۔“

آدمی نے شانے اچکائے، جیسے نا سمجھی سے پوچھا ہو کہ ”کیا؟“ اس کی چابی ابھی تک ہاتھ میں تھی۔

”عین ممکن ہے کہ اگلی پیشی پہ آپ کو پیش ہونا ہو۔ درمیان میں جتنے دن آئیں گے، ان میں ہاشم کاردار آپ کو اپروچ کر کے آپ کو خریدنا چاہے گا۔ وہ آپ کو بہت سے راستے دکھائے گا۔ چناؤ کے لیے بہت سے انتخاب۔ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے۔ وہ ساری زندگی کے لیے آپ کے کردار کا تعین کرے گا۔ آپ کیسا انسان بننا چاہتے ہیں، آپ کیسے مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور آپ کیسے پاکستانی بن کر دکھانا چاہتے ہیں، اس سب کا فیصلہ آپ کا وہ انتخاب کرے گا جو آپ منتخب کریں۔ ساری زندگی مسعود صاحب وہ آپ کو haunt (ہانٹ) کرے گا۔ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کورٹ میں آئیے گا تو سچ بولیے گا۔ اگر آج جھوٹ بول دیا، تو ساری زندگی آپ خود بھی اپنے کسی سچ پہ اعتبار نہیں کر سکیں گے۔ جھوٹے لوگوں کی ایک بہت بڑی سزا یہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنی باتوں اور دعووں پہ خود بھی یقین نہیں آتا کہہ کے بھول جاتے ہیں اور بھول کے کہہ جاتے ہیں۔“

پھر وہ خاموش ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس آدمی نے سر جھٹکا اور اپنی کار کی طرف مڑ گیا۔ دروازے کو ہینڈل سے باہر کھینچتے اس نے پھر سے مڑ کے دیکھا۔ پارکنگ ایریا سنسان پڑا تھا۔ ستون دھند لے سے نظر آرہے تھے۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

ہیں کہ اس میں خامی نظر نہیں آتی، اور جب خامی دیکھ لیں تو اسے دیکھنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن مسعود صاحب، جب ہم میں سے اکثر لوگ میری عمر کو پہنچتے ہیں تو جان جاتے ہیں کہ یہاں نہ کوئی سفید ہے نہ سیاہ۔ سب سرمئی ہیں۔ کوئی گہرا سرمئی۔ کوئی ہلکا سرمئی۔ کوئی میلا، کوئی کم گدلا۔ مگر بے داغ کوئی نہیں ہے۔

مسعود دم بخود سا کھڑا ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ چابی ہاتھ میں تھی اور نظریں اس پہ ٹکی تھیں۔ سعدی بولتے بولتے قریب آنے لگا۔ قدموں کی چاپ نے پھر سے خاموشی کو چیرا۔

"لوگ کہتے ہیں ہماری چوائسز ہمیں ڈیفائن کرتی ہیں۔ وہ انتخاب جو ہم کرتے ہیں، وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم کون ہیں۔ ہم ہلکے سرمئی ہیں یا گہرے سرمئی، اس کا فیصلہ وہ کام کرتے ہیں جو ہم نے کیے ہوتے ہیں، مگر نہیں..." وہ اب اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا تھا اور نفی میں سر ہلا کے اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہہ رہا تھا۔

"میں نے دو انسانوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔ میرے مدمقابل جو شخص ہے، اس نے میرے خاندان کے دو انسانوں کو قتل کروایا ہے۔ یہ وہ انتخاب ہے جو ہم دونوں نے کیا۔ کیا یہ ہمیں ڈیفائن کر سکتے ہیں؟ ہمیں ڈسکرائب کر سکتے ہیں؟" سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کے وہ بولتا رہا۔

"نہیں... کیونکہ میرا خیال ہے ہمارے اچھے یا برے ہونے کا تعین ہمارے چنے گئے راستے نہیں کرتے، بلکہ وہ راستے کرتے ہیں جو ہم نے نہیں چنے ہوتے۔ وہ فیصلے، وہ انتخاب کرتے ہیں جو ہم نے میسر ہونے کے باوجود نہیں کیے ہوتے۔ ہاشم کاردار نے دو انسانوں کو قتل کرنے کا "انتخاب" کیا، مگر اس کے پاس دوسرے راستے بھی تھے۔ نیب میں کیس لڑتا اور خود کو بری کروا لیتا، یا پھر اگر فیصلہ اس کے خلاف آتا تو پلی بارگین کر لیتا۔ پیسے واپس کرتا اور رہائی مل جاتی۔ یا پھر وارث غازی پہ چند الزامات لگوا کے اس کو جاب سے نکلوا دیتا۔ یا پھر دہشت گردوں کے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جاتا اور اس کو فوج خود پروٹیکشن دیتی، یہ وہ راستے تھے جو اس نے نہیں چنے۔ اس نے قتل کا راستہ چنا۔ مگر جب میں نے دو قتل کیے تو میرے پاس دوسرا راستہ یہی تھا کہ خود کو مرنے دوں۔ میں نے اپنی جان بچائی۔ سروائیول کو چنا۔ ان دونوں آدمیوں کو قتل کروا دینے کو چنا، سوائے ہلاکت کے دوسرے راستے کے۔ آپ مجھے اور ہاشم کو ایک ہی ترازو میں نہیں تول سکتے۔ کیونکہ اس کے پاس آپشنز تھے، میرے پاس نہیں تھے۔ اسی لیے میں یہاں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں۔"

آدمی نے شانے اچکائے، جیسے ناسمجھی سے پوچھا ہو کہ "کیا؟" اس کی چابی ابھی تک ہاتھ میں تھی۔

"عین ممکن ہے کہ اگلی پیشی پہ آپ کو پیش ہونا ہو۔ درمیان میں جتنے دن آئیں گے، ان میں ہاشم کاردار آپ کو اپروچ کر کے آپ کو خریدنا چاہے گا۔ وہ آپ کو بہت سے راستے دکھائے گا۔ چناؤ کے لیے بہت سے انتخاب۔ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے۔ وہ ساری زندگی کے لیے آپ کے کردار کا تعین کرے گا۔ آپ کیسا انسان بننا چاہتے ہیں، آپ کیسے مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور آپ کیسے پاکستانی بن کر دکھانا چاہتے ہیں، اس سب کا فیصلہ آپ کا وہ انتخاب کرے گا جو آپ منتخب کریں۔ ساری زندگی مسعود صاحب وہ آپ کو haunt (ہانٹ) کرے گا۔ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کورٹ میں آئیے گا تو سچ بولیے گا۔ اگر آج جھوٹ بول دیا نا، تو ساری زندگی آپ خود بھی اپنے کسی سچ پہ اعتبار نہیں کر سکیں گے۔ جھوٹے لوگوں کی ایک بہت بڑی سزا یہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنی باتوں اور دعووں پہ خود بھی یقین نہیں آتا، کہہ کے بھول جاتے ہیں اور بھول کے کہہ جاتے ہیں۔"

پھر وہ خاموش ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس آدمی نے سر جھٹکا اور اپنی کار کی طرف مڑ گیا۔ دروازے کو ہینڈل سے باہر کھینچتے اس نے پھر سے مڑ کے دیکھا۔

پارکنگ ایریا سنسان پڑا تھا۔ ستون دھندلے سے نظر آرہے تھے۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

کبھی منظر بدلنے پر بھی قصہ چل نہیں پاتا
کہانی ختم ہوتی ہے کبھی انجام سے پہلے
کچہری کی راہداری میں وہی دانتے کی جہنم جیسا رش، شور اور افراتفری کا عالم تھا۔ ایسے میں کمرہ عدالت کے دروازے کے باہر کھڑا سعدی شہزاد کو سمجھانے کے لیے قدرے اونچی آواز میں بول رہا تھا۔
"مجھے بہت خوشی ہے کہ تم نے اپنی امی کو سپورٹ کیا ہے اور وہ گواہی دے رہی ہیں۔" انداز میں تشکر تھا۔ بیساکھی تھامے کھڑا لڑکا سر کو بار بار ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "صحیح۔ صحیح۔"
"اب اندر چلتے ہیں۔" سعدی نے اس کو اشارہ کیا اور پھر یکے بعد دیگرے وہ دونوں آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئے۔
وہاں کسی کلاس روم کی طرح کی خاموشی چھائی تھی۔ جج صاحب خاموشی سے کٹہرے میں کھڑی خاتون کو دیکھ رہے تھے، جس نے سر پہ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا اور وہ سامنے کھڑی زمر کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ اس کے نقوش اپاہج لڑکے کی مانند بنگالی تھے، اور رنگت گہری سانولی۔ سعدی اس کو لیے پچھلی کرسی پہ آبیٹھا۔ آج فارس نہیں آیا تھا، البتہ..... سعدی نے گردن موڑ کے دیکھا۔ قریب میں چشمے والا آدمی خاموشی سے بیٹھا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر عجیب سی الجھن ہوتی تھی۔
"مسز عصمت۔ آپ کو پورا یقین ہے کہ آپ نے آپریٹر مسعود عالم کو یہ کہتے سنا تھا؟" زمر پوچھ رہی تھی۔
"جی، مجھے پورا یقین ہے کہ میں نے یہی الفاظ سنے تھے جو میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ جب آپ لوگ سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھنے آئے تھے تو آپ کے جانے کے بعد وہ اپنے ایک کولیگ سے کہہ رہے تھے کہ فکر کی کوئی بات نہیں، انہوں نے کاردار ز کے لڑکے کی فوٹیج ہینڈل کرلی تھی پہلے ہی۔"
"اور ہینڈل کرنے سے ان کی مراد ڈیلیٹ کرنا تھا؟"
"آب جیکشن۔ گواہ سے رائے مانگی جارہی ہے۔" وہ پیچھے سے اکتا کے بولا تھا۔ زمر امپریشن بنا چکی تھی سو "میں سوال واپس لیتی ہوں۔" کہہ کر واپس مڑ گئی۔
ہاشم فوراً "اپنے" تاثرات بدل کے، مسکراتا ہوا اٹھا۔ کوٹ کا بٹن بند کیا اور کٹہرے کے سامنے آیا۔
"مسز عصمت!" اس نے مسکرا کے اس کو مخاطب کیا۔ "کیا آپ نے مسعود عالم صاحب کو مجھ سے یا میرے خاندان کے کسی فرد سے بات کرتے سنا؟"
"نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔
"کیا آپ نے ان کو نوشیرواں کاردار کا نام لیتے سنا؟"
"نہیں مگر انہوں نے کاردار ز کا لڑکا کہا تھا اور......"
ہاشم نے جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکالا اور اس کے سامنے کیا۔
"اس پہ گورنر اسٹیٹ بینک شاہد کاردار کے دستخط موجود ہیں۔ کیا آپ کو کبھی یہ خیال آیا کہ ہم اس ملک کے واحد کاردار نہیں ہیں۔"
"مجھے معلوم ہے لیکن انہوں نے یہ بات اس کے (زمر کی طرف اشارہ کیا) جانے کے بعد کی تھی۔"
"اور اس بات کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟" نوٹ واپس جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔
"تین ماہ شاید۔"
"اور ان تین ماہ میں آپ نے کبھی مسعود صاحب کی شکایت اوپر کی؟"
"میں نے کی تھی، لیکن کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔"
"آف کورس آپ نے کی تھی۔" وہ مڑا اور اپنی میز سے چند کاغذ اٹھائے اور جب واپس عصمت بی بی کی طرف گھوما تو لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ "اور اس سے پہلے آپ ڈپارٹمنٹ میں تین مختلف لوگوں کی شکایت کرچکی ہیں۔ اور ان میں سے ایک کے خلاف کارروائی کی گئی تھی، نام یاد ہے آپ کو ان کا؟"
"آب جیکشن یور آنر! مسز عصمت کے ریکارڈ کا گواہی سے کیا تعلق ہے؟"

"ور رولڈ۔ جواب دیجیے۔" جج صاحب نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

"طارق محمود۔" عصمت کی آواز پست تھی۔

"جی بالکل۔ طارق محمود صاحب جن کے خلاف آپ نے ہراس منٹ ایٹ ورک پلیس کی شکایت کی تھی اور ان کو معطل کروایا گیا تھا' اور۔۔۔ اور وائے۔۔۔ اور ان کی سیٹ کا چارج آپ سنبھالتی ہیں نا' آج کل۔"

"آب جیکشن یور آنر۔" زمر بے زاری سے کھڑی ہوئی۔ "کاردار صاحب گواہ کی کردار کشی کر رہے ہیں۔"

"اوور رولڈ مسز زمر۔ عدالت کو ان کا جواب سننے دیجیے' جی بولیے۔" جج صاحب نے خشک لہجے میں خاتون گواہ کو اشارہ کیا۔

"جی۔ ان کا چارج میں سنبھالتی ہوں' مگر انہوں نے واقعی ہراس منٹ کی تھی اور دوسری کولیگز گواہ ہیں۔"

مگر ہاشم اس کے ساتھ ہی جج صاحب کی طرف رُخ کر کے کہنے لگا۔ "یور آنر' یہ صرف ایک heresay (سنی سنائی بات) ہے' ایک ایسی خاتون جن کا کام ہی دوسرے کولیگز کی ٹانگ کھینچنا ہے' ان کے بیان پہ عدالت ایئرپورٹ سیکورٹی کے کنٹرول روم آپریٹر کو سمن نہیں کر سکتی۔ خاتون ان کی جگہ لینے کے لیے جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"یور آنر' اگر یہ Heresay ہے تو اس کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں اس آفیسر کو کورٹ میں پیش کرنا پڑے گا۔ ورنہ کاردار صاحب کا یہ الزام ہم کیسے رد کر سکیں گے؟"

"بس بس!" ان دونوں کے ایک ساتھ بول اٹھنے کے باعث جج صاحب نے ہاتھ اٹھا کے ان کو خاموش رہنے کا کہا پھر ہاشم کو دیکھا۔

"بات تو ان کی سننی پڑے گی' اگر انہوں نے فوٹیج کے ساتھ ٹیمپرنگ نہیں کی تو ان کو کورٹ میں آکر اپنی صفائی دینی پڑے گی۔ اس لیے اگلی پیشی پہ۔۔۔" وہ اب حکم جاری کر رہے تھے۔ کٹہرے میں کھڑی عورت مغموم نظر آتی تھی' اور اس کا اپاہج بیٹا حیران پریشان سا سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

"ہم۔۔۔ میری امی جھوٹ نہیں بولتیں کبھی۔ وہ کسی جاب لینے کے لیے تو ایسا نن۔۔۔ نہیں کر رہیں۔"

"سب کو پتا ہے۔" سعدی نے اداسی سے اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

"مگر یہ زیادتی ہے۔"

"یہ انصاف کی عدالتیں نہیں ہیں میرے دوست۔ یہ قانون کی عدالتیں ہیں۔" سر جھٹک کے وہ قریب بیٹھے چشمے والے آدمی کو دیکھنے لگا' جو اسے ہی دیکھ رہا تھا' مگر فوراً" اپنا رخ پھیر گیا اور سر جھکا کے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھنے لگا۔

سعدی نے گھڑی دیکھی اور سوچا کہ اگر فارس یہاں ہوتا تو کیا کہتا' مگر وہ تھا کہاں؟



میں اپنی جفاؤں پہ نادم نہیں ہوتا
میں اپنی وفاؤں کی تجارت نہیں کرتا

ہارون عبید کی رہائش گاہ کا آہنی اونچا گیٹ اس کی کار کے نزدیک آتے ہی میکانکی انداز میں سلائیڈ ہو کے کھلنے لگا۔ اسٹیئرنگ پہ ہاتھ رکھے فارس چند لمحے انتظار کرتا رہا۔ اس کے چہرے پہ معمولی سی فکرمندی تھی اور ماتھے پہ بل۔ آنکھیں پُرسوچ انداز میں سکڑی ہوئی تھیں۔ گیٹ پورا کھل گیا تو اس نے کار آگے بڑھادی۔

چند منٹ بعد وہ لان عبور کر کے آبدار کے کلینک کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ جینز پہ سرمئی وی گلے کی شرٹ پہنے' آستینیں ذرا موڑ رکھی تھیں۔

کلینک کے اندر وہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی جب دروازہ کھلا۔ آبی فوراً" گھومی۔ آنکھوں میں چمک در آئی۔ "شکر آپ آگئے۔"

"کیا ہوا ہے؟ آپ نے اتنی ایمرجنسی میں بلایا۔ میں کورٹ جا رہا تھا۔" وہ حیرت بھری فکرمندی سے

کہتا آگے آیا اور اس کی میز کے سامنے والی کرسی کھینچی۔ ساتھ ہی اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بدقت مقابل کاؤچ پہ آ گئی۔ دونوں کے درمیان چند فٹ کا خلا تھا۔

"اب بتایئے ' کیوں پریشان ہیں؟" وہ نرمی اور ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔ ابدار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں بہت خوف زدہ ہوں۔"

"مسز کاردار نے کچھ کہا ہے؟"

آبی نے نفی میں گردن ہلائی۔

"پھر؟"

"ہاشم ملا تھا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ میری اور آپ کی تصویر بھیج کر اس نے ساتھ یہ کیوں لکھا کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا؟"

فارس ذرا چوکنا ہو کے بیٹھا۔ "پھر؟"

"پھر اس نے کہا کہ...... کہ فارس تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا اور یہ کہ...... وہ مجھے آپ کی عورتوں میں شمار کرتا ہے۔" وہ روانی سے جھوٹ بول رہی تھی۔

"اور کیا کہا اس نے؟ حنین 'یا زمر کا ذکر کیا؟" وہ بے چین ہو گیا تھا۔

"نہیں ' ان کا نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "آپ کے خاندان والے اتنے مشہور ہو چکے ہیں ' ان کو وہ نقصان پہنچائے گا تو پہلا شک اسی پہ جائے گا ' اسی لیے وہ ایسا نہیں کرے گا۔ مگر میں......" اس کا گلا رندھا۔

فارس نے گہری سانس لی اور پیچھے کو ہوا۔ "وہ کچھ نہیں کرے گا۔"

"ارے واہ۔" آبی کی بھیگی آنکھوں میں شکوہ در آیا۔ "آپ نے اپنی عورتوں کی خیریت جان لی تو کیسے ریلیکس ہو گئے۔ اور میرا کیا ' جسے آپ نے اس سب میں دھکیل دیا۔ یاد رکھیے ' اس سب میں ' میں آپ کی وجہ سے آئی ہوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس کے چہرے پہ معذرت خواہانہ سا تاثر ابھرا۔ "میں اتنے دن سے آپ کی حفاظت کر رہا ہوں نا ' آگے بھی کرتا رہوں گا۔ آپ کے گارڈز کے ساتھ ان ٹچ ہوں ' دن میں کئی دفعہ ان سے آپ کی خیریت پوچھتا ہوں ' ہر دو گھنٹے بعد آپ کو فون کرتا ہوں ' آپ کی کالونی کے سی سی ٹی وی کی لائیو فیڈ چیک کرتا رہتا ہوں۔ آپ سے کئی کلو میٹر کے فاصلے پہ رہتا ہوں ' اتنی دور سے جتنا کر سکتا ہوں وہ کر رہا ہوں نا۔"

"اگر آپ دور نہ ہوتے تو یہ زیادہ آسان ہوتا۔ ہے نا؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی تھی۔ وہ ہلکا سا چونکا۔

"سوری؟"

"ضروری تو نہیں ہے کہ آپ دور رہیں۔ آپ قریب بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا ' پھر موبائل پہ وقت دیکھا۔ "مجھے چلنا چاہیے۔" لہجہ خشک تھا مگر وہ اسی بے خودی کے عالم میں اسے تکتے ہوئے بولی تھی۔

"اگر آپ مجھ سے شادی کر لیں تو وہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

کمرے میں ایک دم عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ فارس غازی کی پیشانی کی رگیں ابھر آئیں ' آنکھوں میں برہمی در آئی ' اور ایک گہری سانس لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے چلنا چاہیے۔"

وہ تیزی سے اٹھی۔ "اصلی والی شادی نہیں ' صرف پیپر میرج۔ صرف اس ٹرائل تک۔ تاکہ وہ مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ جب اسے پتا چلے گا کہ میں آپ کی بیوی ہوں تو وہ مجھے کبھی کچھ نہیں کہہ سکے گا۔ وہ آپ سے ڈرتا ہے۔ آپ...... آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ سچ میں۔ ورنہ وہ اور اس کی ماں مجھے مار دیں گے۔"

فارس نے آنکھیں میچیں ' انگلی اور انگوٹھے سے بند آنکھوں کو مسلا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ پھر آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ "چار سال کی جیل ' ایک سال سے مد مقابل مسائل...... اور مجھے لگتا تھا ابدار صاحبہ کہ میں بہت تھک ہو چکا ہوں ' اب کسی کی باتوں میں نہیں آ سکتا۔ مگر آپ نے ثابت کر دیا کہ میں بھی ایک

انسان ہی ہوں۔" نفی میں افسوس سے سر ہلاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے جس عورت سے محبت ہے اور جو میری بیوی ہے، وہ ٹھیک کہتی تھی۔ آپ نہیں بدلیں، آپ نے صرف اپنی تکنیک بدلی ہے۔"

"کیا میری حفاظت کے لیے آپ مجھ سے ایک پیپر کانٹریکٹ بھی نہیں کر سکتے؟ میں یہ صرف اپنی حفاظت کے لیے کہہ رہی ہوں۔" آنسو آبی کی آنکھوں سے ٹوٹ کر گرنے لگے۔

"نہیں، میں نہیں کر سکتا، اور میرا نہیں خیال کہ آپ کو کسی حفاظت کی ضرورت ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ آپ کو بلانے کے طریقے آتے ہیں مگر اب میں نہیں آؤں گا۔ بہت ہو گیا۔" برہمی سے کہتا وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

"اور مجھے جس دلدل میں آپ نے دھکیل دیا، اس کا کیا؟"

"آپ نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا تھا۔" وہ خشک لہجے میں کہہ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ آنکھوں میں بے زاری اور برہمی تھی۔ وہ تیز تیز اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ شاید رو بھی رہی تھی۔

"میرے احسان ہیں آپ کے اوپر۔"

"اور میں کب سے انکی قیمت چکا رہا ہوں۔ زمر سے میرا ریلیشن بار بار بدظنی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے کیونکہ میں ان احسانوں کی قیمت اتار رہا ہوں مگر اب بہت ہو چکا۔" گردن موڑ کے غصے سے اس کو دیکھا۔ "اب میں مزید آپ کے اس گیم کا حصہ نہیں بن سکتا۔"

"میں نے ایسا کیا کہا ہے جو آپ غصہ ہو رہے ہیں؟ صرف اتنا ہی تو کہا ہے کہ مجھے سہارا دیں، مجھ سے شادی کریں، صرف میں حفاظت......"

وہ جو اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا، ایک دم دھاڑ سے دروازہ بند کیا اور غصے سے اس کی طرف گھوما۔

"کیا آپ میں تھوڑی بھی عزتِ نفس ہے؟ ذرا سی بھی گریس؟ معمولی سی سیلف اسٹیم؟ کیا اپنی خواہشات کے پیچھے خود کو اتنا گرانا ٹھیک ہوتا ہے؟ نو نو واٹ، مجھے فخر ہے اس بات پہ کہ جو عورت میری زندگی میں ہے، وہ عزت اور وقار کا پیکر ہے۔ کبھی کسی کے سامنے، حتیٰ کہ میرے سامنے بھی خود کو نہیں گرائے گی۔ اور آج مجھے اس پہ زیادہ فخر ہو رہا ہے۔" اس نے غصے سے کہہ کر دروازہ کھولا۔

"اور اگر وہ نہ رہے؟" وہ جو اندر بیٹھ رہا تھا، اس کے الفاظ پہ لمحے بھر کو ٹھہرا، پھر سر جھٹک کے اگنیشن میں چابی گھسانے لگا۔ دروازہ بند نہیں کر سکتا تھا، اس پہ آبی کے ہاتھ تھے۔ وہ آنکھوں میں دکھ، غصہ، نفرت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اگر وہ مر جائے، کیا تب آپ دیکھ پائیں گے کسی دوسرے کی طرف؟ کیا تب احساس کر سکیں گے کہ کون آپ کے لیے خود کو کتنا گرا چکا ہے؟"

فارس نے نظرانداز کرتے ہوئے کار اسٹارٹ کی، اور دروازہ زور سے کھینچ کے بند کیا۔ "اب مجھے کال مت کیجئے گا۔" درشتی سے تنبیہہ کر کے کار ریورس کرنے لگا۔

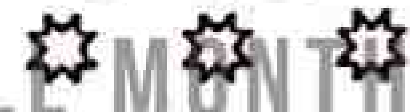
"آپ نے میرا دل توڑا ہے فارس غازی! میں آپ کے لیے اتنا گری، اتنا جھکی اور آپ اتنے سنگ دل ہیں۔ ٹوٹے دل کی بددعا سے آپ کو ڈر نہیں لگتا تو پھر ٹھیک ہے۔" اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔ اور دکھ سے اسے کار پیچھے کرتے دیکھا۔

"اللہ کرے وہ مر جائے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے مر جائے۔ اللہ کرے آپ اسے مرتے ہوئے، ٹوٹتے بکھرتے ہوئے دیکھیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے۔ پھر آپ کو میرے دل کے کرب کا اندازہ ہو گا۔"

اسے دور جاتے دیکھ کے وہ چلا چلا کے کہہ رہی تھی۔ اور وہ جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا، وہ کار وہاں سے نکال رہا تھا۔ اس کی چیخوں کی آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ جس لمحے کار باہر سڑک پہ آئی، اس نے ایکسیلیٹر کو پوری قوت سے دبایا اور کار کو سڑک پہ

بھگاتا آگے لے گیا۔

عرصے بعد اسے لگا تھا کہ وہ آبدار کے احسانوں کی زنجیر سے آزاد ہو گیا تھا، ہلکا اور آزاد۔



خزانہ زر و گوہر پہ خاک ڈال کے رکھ
ہم اہل مہر و محبت ہیں دل نکال کے رکھ

مور چال میں اس رات دس بجے کے ڈرامے کا وقت ختم اور اسامہ کی کلاس کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ لاؤنج ویران تھا۔ بتیاں بجھی ہوئی تھیں، مگر ندرت کا کمرہ روشن تھا۔ اندر وہ بیڈ پہ بیٹھیں خفگی سے اسامہ کو لتاڑ رہی تھیں، جو برہمی سے بمشکل ضبط کیے سن رہا تھا۔ حنین تماشائی کی طرح باری باری دونوں کے چہرے دیکھتی تھی۔

"اس عمر میں سعدی کبھی مغرب کے بعد گھر سے باہر نہیں رہا، عشاء پہ نماز پڑھنے جاتا اور سیدھا گھر آتا۔ پھر بھی میں ڈانٹتی، مجال ہے جو اس نے برا منایا ہو۔ ہمیشہ سر جھکایا، اور اس شہزادے کو کچھ کہہ دو تو موڈ آف ہو جاتا ہے۔"

"امی آپ مجھ پہ ہر وقت شک کیوں کرتی رہتی ہیں؟" وہ بگڑ کے بولا۔ "شاہ زیب کا گھر ساتھ والی اسٹریٹ میں ہے، میں اس سے نوٹس لینے ہی گیا تھا نماز کے بعد۔"

"مجھ سے پوچھتے ہوئے منہ ٹوٹ جاتا تھا؟ ہاں؟ مجھ سے کیوں نہیں پوچھا؟"

"نہیں نہیں، آپ کو لگتا ہے میں نشہ کرنے لگ گیا ہوں یا شاید سڑک پہ کھڑے ہو کر لڑکیاں تاڑتا ہوں، یا لوگوں سے موبائل چھینتا ہوں۔"

"دیکھو دیکھو اس کی زبان۔ ماں کے آگے بڑا بولنا آ گیا ہے۔ سب جانتی ہوں میں، یہ جو اس کے دوست ہیں نا، یہی سکھاتے ہیں اس کو۔"

"ہر وقت میرے دوستوں کے پیچھے پڑی رہا کریں آپ بس۔" وہ سرخ چہرہ اور آنکھوں میں آنسو لیے تیزی سے باہر نکلا اور دروازہ ٹھاہ مارا۔

"امی! آپ اس کے دوستوں پہ مت آیا کریں۔" حنین نے سمجھانے کی کوشش کی۔

ندرت نے اتنی ہی اکتاہٹ سے اسے دیکھا۔ "زیادہ بک بک نہ کرو۔ مجھے پتا ہے تم بے غیرتوں کو کیسے پالنا ہے۔ اب جاؤ، سر نہ کھاؤ میرا۔ باپ ہوتا نا تم پہ تو میں دیکھتی کیسی زبانیں چلتی ہیں تم لوگوں کی۔ ماں کو دیکھ کر شیر ہو جاتے ہو۔"

"چلیں جی، ہو گیا ایموشنل ڈراما شروع۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اوپر آئی تو سیم کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اور وہ منہ پہ تکیہ رکھ کے لیٹا ہوا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر اندر آئی اور اس کے سر پہ آن کھڑی ہوئی۔

"امی تم پہ شک نہیں کرتیں۔"

"جاؤ موٹی، مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔" وہ رندھی آواز میں تکیے کے نیچے سے بولا تھا۔

"امی صرف تمہاری حفاظت چاہتی ہیں۔ سب مائیں چاہتی ہیں۔ اگر ماں باپ بچوں کے آنے جانے کے اوقات پر سختی کرتے ہیں، پوچھ گچھ کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ ان پر شک کرتے ہیں، یا ان کو ان کے دوستوں سے کوئی خطرہ ہے۔ وہ صرف ایکسیڈنٹ، دہشت گردی، چوری چکاری کی وارداتوں سے ڈرتے ہیں، جسمانی نقصان سے ڈرتے ہیں۔ اگر شک کرتے ہوتے تو پوچھ گچھ نہ کرتے، خاموش ہو جاتے یا دوسری انتہا یعنی مار پیٹ پہ جاتے۔ یہ پوچھ گچھ نہ ہوں تو ہماری مائیں، مائیں نہ لگیں، نوکرانیاں لگیں۔ کھانا، کپڑے، آرام، وہ سب تو نوکرانی بھی دیتی ہے۔ تم ٹین ایجرز کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ تم ماں کو نوکرانی کی جگہ دینا چاہتے ہو یا ماں کی!"

سیم نے تکیہ ہٹا کے گلابی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "ہاں تمہیں جیسے بڑا پتا ہے، تمہارے کون سے دس بچے ہیں جو تمہیں پتا ہو۔ اور......" وہ رکا اور پھر تنک کے بولا۔ "تمہارا تو کوئی ہیرو بھی نہیں ہے۔"

"اسامہ یوسف!" وہ کمر پہ دونوں ہاتھ رکھ کے شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھ کے بولی۔ "میں خود کسی

ہیرو سے کم ہوں کیا؟"

اسامہ نے کچھ بڑبڑا کے تکیہ منہ پر رکھ لیا اور کروٹ بدل لی۔ حنہ آگے بڑھی' الماری دھیرے سے کھولی' اندر سے کچھ نکال کے کمر کے پیچھے چھپایا اور اونچا سا بولی۔ "مجھے ویسے بھی بہت کچھ بننا ہے۔ زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے۔" پیچھے ہٹتی گئی اور دروازے تک پہنچ کے رکی۔ "اور چاکلیٹ بھی۔"

دروازہ کھولا' اور چاکلیٹ کا پیکٹ پکڑے' جھپاک سے باہر غائب ہو گئی۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا' سیم کا جوگر ٹھاہ سے آکر اس پہ آکے لگا تھا۔

حنہ اب ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ جہاں کھلی لیپ ٹاپ اسکرین ڈھیروں اسٹینسلز کے آئیڈیاز لیے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ہوم ڈیکور' نشہ اور چیز تھی' مگر اچھی چیز تھی۔

نچلی منزل پہ آؤ تو زمر کے کمرے کی بتی جلی تھی۔ وہ ٹیبل پہ تہہ شدہ جاء نماز رکھ کر اب دوپٹا کھول رہی تھی۔ پھر ایک نظر صوفے پہ لمبے لیٹے فارس کو دیکھا جو مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دن کیسا گزرا؟" زمر نے پوچھا تو اس کے چہرے پہ مزید طمانیت بکھر گئی۔ آزادی اور اطمینان۔

"بس آج تمہاری یاد آتی رہی۔ تمہاری قدر ہوتی رہی۔ تم سے محبت بڑھتی رہی۔"

"پیسے چاہئیں؟" زمر نے مڑ کے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ مگر اس کا موڈ نہیں بدلا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو آج۔"

"شکریہ۔" وہ اب آئینے کے سامنے کھڑی بال جوڑے میں لپیٹ رہی تھی۔

"تم کتنے دن سے ڈنر کا کہہ رہی تھیں نا' اگر آج چاہو تو... بلکہ نہیں..." فارس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم بتاؤ' تمہیں کیا چاہیے۔"

"ہیں؟" زمر نے پونی میں بال مقید کر کے حیرت سے آئینے کو دیکھا جس میں اس کا عکس نظر آ رہا تھا۔ "طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

وہ صوفے سے اٹھا اور اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ پھر بہت اپنائیت سے اسے دیکھ کے بولا۔ "کوئی خواہش کرو' کچھ مانگو' کوئی ڈیمانڈ سامنے رکھو۔ جو کہو گی پورا کروں گا۔ ڈائمنڈز' ڈنر' گفٹ' کیا چاہیے تمہیں؟ عادتاً" ڈریسر کے کنارے بیٹھا اور محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ زمر نے پہلے اسے دیکھا' پھر اپنے ہاتھوں کو' پھر دوبارہ اس کے چہرے کو دیکھا۔

"ایسے پوچھ رہے ہو جیسے مرنے والے سے آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔"

"اونہوں' وقت ضائع نہ کرو۔ کچھ مانگو۔"

"اچھا! جو کہوں گی' کرو گے کیا؟" وہ مسکرا کے بولی۔

فارس نے اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہوں!"

"تو پھر..." وہ مسکرا کے گویا ہوئی۔ "میں یہ چاہتی ہوں کہ... میرا شوہر... میرے لیے میرے ساتھ مل کر... برتن دھوئے۔"

وہ چند لمحے تو سمجھ نہ پایا۔ "سوری؟"

"صداقت اور حسینہ گاؤں گئے ہیں چھٹی پہ۔" اس نے ہاتھ چھڑائے اور آستینیں اوپر چڑھانے لگی۔ "اور حنین کو کوئی نیا ہوم ڈیکور آئیڈیا مل گیا ہے اور اس کو کچن کی فکر نہیں ہے' سو میں سوچ رہی تھی کچن صاف کر لوں تاکہ بھابھی کو نہ کرنا پڑے' مگر بھابھی کا بھائی چونکہ تعاون کرنے والا اور ہمدرد ہے' تو میرا آدھا بوجھ تو کم ہوا۔"

اور بھابھی کے ہمدرد بھائی نے بھنویں اکٹھی کر کے خفگی سے اسے گھورا۔ "تمہارے خیال میں' میں اتنا زن مرید اور بے وقار' بے غیرت مرد ہوں جو تمہارے کہنے پہ تمہارے ساتھ... اوہ خدایا... کچن میں برتن دھلواؤں گا؟"

"ہاں!" اس نے سادگی سے اسے دیکھتے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

قریباً" پانچ سات منٹ بعد وہ کچن سنک کے آگے کھڑا تھا' آستینیں چڑھائے' نل کھلا تھا' اور وہ جھاگ بھرے اسفنج کو ایک پلیٹ پہ رگڑ رہا تھا۔

"ویسے اتنا برا کام نہیں ہے یہ۔" نارمل سے انداز

میں ساتھ کھڑی سلیب صاف کرتی زمر سے بولا تو اس نے پلٹ کے اسے دیکھا۔

"جیسے کہ تم نے تو کبھی ہاسٹلز اور بیچلر فلیٹس میں برتن دھوئے ہی نہیں ہوں گے۔"

"کبھی نہیں۔ مجھے ہمیشہ خوب صورت نوکرانیاں مل جاتی تھیں۔" فارس نے سر جھکائے پلیٹ پہ پانی گراتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

ٹھک سے زمر نے پلیٹوں کا انبار اس کے سامنے دھرا۔ فارس نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا تو وہ آنکھوں میں خفگی لیے اسے گھور رہی تھی۔ وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، تمہارے مزاج میں اتنی سختی نہ ہوتی، تم واقعی کنٹرولڈ، ٹھنڈے اور شائستہ مزاج کی ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"میں کہاں سخت ہوں؟" حسب توقع وہ برا مان گئی۔ اب وہ بھی اس کے ساتھ کھڑی اپنا اسفنج بھگو رہی تھی۔

"ہر وقت غصہ کرتی رہتی ہو۔ ہر وقت کام کرتی رہتی ہو۔ بے چارے شوہر کا تو خیال ہی نہیں تمہیں۔ اب اس وقت بھی تم مجھ سے ہیرے جواہرات مانگ سکتی تھیں، پھول یا ڈنر وغیرہ بھی، مگر نہیں، کام ختم کرنے کی پڑی ہوتی ہے تمہیں۔"

"ہیرے جواہرات کے لیے ساری عمر پڑی ہے، کیونکہ تھینکس ٹو ہاشم، میں مرنے نہیں لگی، اس لیے ابھی خاموشی سے برتن دھوؤ۔"

فارس نے مسکراہٹ دبا کے اسے دیکھا۔ وہ چہرہ جھکائے، آستینیں چڑھائے، مگن سی ایک ڈونگے کو صاف کرنے میں لگی تھی۔ بال جوڑے میں مقید تھے اور دو گھنگھریالی لٹیں چہرے کو چھو رہی تھیں۔ اس کے مسلسل دیکھنے پہ زمر نے پلکیں اٹھا کر بھوری آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہی کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں، جو تم میری زندگی میں ہو۔"

"نشہ تو نہیں کرنے لگ گئے؟" اسے اب واقعی فکر ہونے لگی تھی۔ وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"یوں ہی بس۔ پتا ہے جب میں جیل سے آیا تھا تو ساری دنیا سے بے زار تھا۔ بس یہی مقصد تھا زندگی میں کہ ان سب گناہ گاروں کو تڑپا تڑپا کے ماروں، اپنا انتقام لوں، اور پھر پھر جو بھی ہو۔ جیل جاؤں، مر جاؤں، کوئی فکر نہیں۔" اس کی آواز میں کرب در آیا۔ "مگر پھر۔۔۔ تم نے مجھ سے شادی کرنے کی ہامی بھری۔ تم مجھے اذیت دینا چاہتی تھیں، اور میں تمہیں۔ تب لگتا تھا ہمارے درمیان کبھی کچھ ٹھیک نہیں ہو گا، مگر تم نے میرے مردہ دل کو زندہ کر دیا۔ اب میں خوش ہوں اور خوش رہنا چاہتا ہوں مگر۔۔۔" اس نے کھلے نل تلے ڈش کی تو پانی کی دھار نے سارے جھاگ کو بہا دیا۔

"مگر اب مجھے مکافات عمل سے ڈر بھی لگتا ہے۔ میرا کارما۔ میرے اعمال کے نتائج۔"

"فارس!" اس نے تحیر سے اسے پکارا۔ "ایسے مت کہو۔"

"نہ کہنے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔" وہ اداسی سے مسکرایا تھا۔ "میں نے بھی غلط کام کیے ہیں۔ غلط لوگوں سے انتقام لینے کے لیے۔ ان لوگوں کی زندگیاں تباہ کی ہیں۔ کسی کی زندگی کی ساری جمع پونجی جلائی، تو کسی کو ایکسپوز کر دیا، کسی کو غائب کرا دیا، ان کی بھی تو اولادیں تھیں اور میں اب بھی وہی کر رہا ہوں، میری مجبوری ہے۔ میں اپنے ہر کام کو جسٹی فائی کر سکتا ہوں مگر اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے بھی اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔"

"اتنا مت سوچا کرو۔ تم قصوروار نہیں ہو۔ تم برابر کا، بلکہ ان کے اعمال سے بہت کم کا بدلہ لے رہے تھے۔" اس نے نرمی سے اس کے کندھے کو چھوا۔

"انتقام کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ میں دو قبریں کھود کے نکلا تھا، بس میں نہیں چاہتا کہ میرے نام کی قبر میں میری وجہ سے کسی اور کو جانا پڑے۔" اس نے جھرجھری لی۔

"میں نا اب تمہاری چیزوں کی تلاشی لوں گی اگر

مجھے ذرا سی بھی کوکین یا سگریٹ مل گئی تو اچھا نہیں ہو گا۔" وہ غصے سے بولی تھی۔ وہ پھر ہنس دیا۔

"اب فضول باتیں مت کرو' اور کام کرو۔" دھونس سے کہتی وہ اس کے سامنے مزید برتن سرکانے لگی۔ "اور پھر تم نے مجھے اینور سری پہ ڈنر بھی کرانا ہے۔"

"اب کوئی ڈنر نہیں ہوگا۔ آپ نے ان برتنوں کی خاطر موقع مس کر دیا۔ سوری!" وہ واپس اپنی جون میں آکے بولا تھا۔

"ڈنر تو تم مجھے کرواؤ گے' وہ بھی اینور سری والی رات۔ یاد رکھنا۔" نل بند کرتے ہوئے وہ دھمکاتے ہوئے بولی تھی۔ اسے پتا تھا وہ بھی یونہی کہہ رہا ہے' مگر بعد میں ضرور ڈنر پہ لے جائے گا۔

وہ اس رات کو یادگار بنانا چاہتی تھی۔ بہت خوب صورت اور یادگار۔

☆ ☆ ☆

جیتے جی مارتی ہے بے چینی
وہ سکوں ہو عطا کہ مر جائیں

قتل سے دو دن قبل:

سورج کی تپتی گرم شعاعیں اس بلند عمارت کو دہکا رہی تھیں۔ ہاشم اپنے آفس میں تیار سا کھڑا موبائل پہ بات کر رہا تھا۔ سامنے رئیس بیٹھا لیپ ٹاپ پہ لگا تھا۔ بات کر کے ہاشم اس کی طرف آیا۔

"کام صحیح ہو رہا ہے؟"

"جی سر۔ میں ان کے فونز بگ کر رہا ہوں' ریکارڈنگ سن رہا ہوں۔ فارس کی بہت سی آڈیو نکال لی ہے۔ اور Voice modulation کے ذریعے میں اس کو......"

"کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟" اس نے بے زاری سے بات کاٹی۔

"یس سر۔ وہ دونوں فون پہ' فارس اور زمر۔ آج صبح مسلسل ڈنر کا ذکر کرتے رہے تھے۔ وہ کئی دن سے اسے کہہ رہی ہے کہ وہ اسے اینور سری پہ ڈنر پہ لے کر جائے اور وہ بات ٹال دیتا ہے۔"

"گڈ۔ ہم اس کو استعمال کر سکتے ہیں۔" ہاشم نے اس کا شانہ تھپکا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ راہداری پار کی اور لفٹ میں داخل ہو گیا۔

جس وقت وہ لفٹ سے نیچے لابی میں اترا' سامنے سے آفس بلڈنگ کے استقبالیے کے قریب۔ زمر یوسف آتی دکھائی دی۔ وہ مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے رک گیا۔

"میں کورٹ آرہا تھا' آپ کیا مجھے لینے آگئیں؟"

"نہیں' میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ کہیں آپ ملک سے فرار تو نہیں ہو گئے۔" وہ اسی طرح مسکرا کے بولی۔ اور لفٹ کے اندر چلی گئی۔ دروازے آپس میں مل گئے تو ہاشم نے موبائل نکال کے نمبر ملایا۔

"حلیمہ...... وہ تمہیں سمن دینے آرہی ہے۔ سعدی کی وکیل۔ تم وہی کرو جو میں نے کہا تھا۔ اوکے گڈ......"

زمر بالائی منزل پہ اتری' اور آگے بڑھتی گئی۔ گھنگھریالے بالوں کو پونی میں باندھے' سیاہ کوٹ پہنے' وہ کورٹ کے لیے مکمل تیار تھی۔ بس حلیمہ کو سمن کی کاپی دینے آئی تھی اور توقع کے مطابق حلیمہ اپنی ڈیسک پہ نہیں تھی۔ اس نے سمن اس کے ایک کولیگ کے حوالے کیا' دستخط لیے' ساتھ میں اپنا کارڈ اور ایک نوٹ بھی دیا' اور لفٹ کی طرف واپس آئی۔ جیسے ہی دروازے کھلے اور وہ اندر داخل ہوئی' کوئی عجلت میں چلتا آیا اور دروازے کے بند ہونے سے قبل اندر آگھسا۔ اس کے ہاتھ میں ایک باکس تھا جس میں چند فائلز' فوٹو فریم اور ایک ننھا سا پودا رکھا تھا۔ کہنی سے اس نے گراؤنڈ فلور پریس کیا اور دروازے آپس میں ملنے لگے۔ تب زمر نے دیکھا' وہ نوشیرواں تھا۔ وہ بھی اسی پل مڑا تو اس کا چہرہ دیکھا۔ زمر رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی۔ سنجیدہ اور سپاٹ۔ وہ بھی ایک دم ہچکچا سا گیا۔ لفٹ نیچے اترنے لگی۔

"آپ مجھے ہمیشہ اپنے لیے اسٹینڈ لینے کو کہتی تھیں۔" وہ اسے دیکھ کے آزردگی سے بولا تھا۔

"نوشیرواں! اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں آپ کو

مجھ سے بات نہیں کرنی چاہیے۔" وہ بے زاری سے چہرہ پھیرے بولی تھی۔

"مجھے اپنی فیملی کے خلاف آپ نے کھڑا کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا آپ مختلف ہیں' شاید آپ کو میرا خیال ہے' مگر آپ بھی ان سب کی طرح ہی نکلیں۔"

"اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ سعدی کو تین گولیاں آپ نے ماری تھیں۔" وہ اس کو دیکھ کے تیزی سے بولی تھی۔

"اور اب میں اپنی غلطیوں کو فکس کر رہا ہوں تو آپ مجھے کورٹ میں پراسیکیوٹ کر کے مجھ سے میرے تمام چانسز چھیننا چاہتی ہیں۔"

"اعمال کے نتائج ہوتے ہیں اور وہ بھگتنے پڑتے ہیں۔ اگر میں سونیا کو تین گولیاں مارتی' تب آپ مجھے کورٹ میں گھسیٹتے یا مجھے مواقع فراہم کرتے؟ کبھی فرصت ملے تو سوچیے گا۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ لفٹ نیچے اتر آئی تھی۔ دروازے کھل گئے تھے۔ زمر باہر جانے لگی۔

"مگر میں سب کچھ فکس کرنے کی کوشش کر تو رہا ہوں۔" وہ کرب سے بولا تھا۔

زمر اس کی طرف گھومی۔ اور سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیسے؟ استعفیٰ دے کر؟ اپنی کمپنی کی سیاہ کاریاں بتا کر؟ وہ آپ کے دوسرے گناہ ہیں جن سے ہمارا تعلق نہیں ہے۔ سعدی کے لیے کیا کیا آپ نے؟ کورٹ میں اعترافِ جرم کر سکتے ہیں؟ نہیں نا۔ ساری دنیا کے سامنے معافی مانگ سکتے ہیں؟ اپنے بھائی کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں؟ نہیں نا۔ پھر میں کیسے مانوں کہ آپ کو موقع ملنا چاہیے؟"

سر جھٹک کے وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ باکس اٹھائے باہر آیا اور افسوس سے اسے دیکھا۔

"میں سمجھتا تھا آپ کو میری پرواہ ہے۔ صرف آپ کی عزت کرتا تھا میں آپ کے سارے خاندان میں۔ مگر آپ کو میری کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

وہ ان سنا کر کے آگے بڑھ گئی۔ لابی میں گزرتے چند لوگوں نے مڑ مڑ کے دیکھا تھا' مگر نوشیرواں کو کوئی فکر نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

گردشِ وقت مجھے خاک ڈرا پائے گی
تجربے جتنے بڑھیں اتنا ہی ڈر جاتا ہے

وہ سرے کے پاس جو کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ تین افراد وہاں موجود تھے۔ کوئی بیٹھا تھا' کوئی ٹہل رہا تھا۔ ایک ارد گرد کی چیزوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ سامان بکھرا ہوا سا تھا۔ تکیے' گدا' کھلے دراز۔۔۔ ہر شے الٹ پلٹ کر دی گئی تھی۔ سامنے ایک بیگ کھلا پڑا تھا جس میں سے زیورات' احمر کے پاسپورٹ اور نوٹوں کی گڈیاں جھانک رہی تھیں۔

اور اسی کمرے کے ایک کونے میں بیڈ کی پائنتی کے ساتھ وہ بندھا ہوا دو زانو پڑا تھا۔ شدید تشدد کے باعث اس کی شرٹ پھٹی ہوئی تھی۔ سر سے خون رس رس کر گردن اور کان پہ جم گیا تھا۔ گردن نیچے ڈھلکا کے وہ نقاہت زدہ سا بیٹھا تھا۔ دفعتاً اس نے چہرہ اٹھایا تو اتنا نظر آتا تھا کہ چہرے پہ کوئی زخم وغیرہ نہ تھا۔ پھر اس نے پھٹی ہوئی آواز میں ـــــ ان کو مخاطب کیا۔ "سب کچھ تو لے لیا ہے تم لوگوں نے۔ اب جان چھوڑ دو میری۔"

سامنے کھڑا آدمی اس کی طرف جھکا اور زور کا جھانپڑ اس کے منہ پہ رسید کیا۔

"مزید مال چاہیے۔ بتاؤ کہاں رکھا ہے' ورنہ آج میں تمہیں دفن کر کے سوؤں گا۔" احمر کا چہرہ تھپڑ کے باعث دوسری جانب لڑھک گیا۔ منہ سے کراہ نکلی۔ پھر چہرہ اٹھا کے صوفے پہ بیٹھے آدمی کی طرف دیکھا جو مسلسل فون پہ کسی اجنبی علاقائی زبان میں بات کر رہا تھا۔

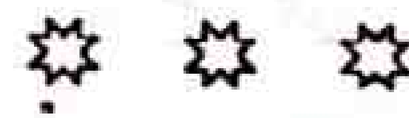
"تم مجھے مار نہیں سکتے۔۔۔" گہری گہری سانس لیتے اپنے اندر کے خوف پہ قابو پاتے اس نے بمشکل کہنا چاہا۔ "کیونکہ تم یہ زیور تقسیم نہیں کر رہے۔ جب بھی فیصلے کا وقت آتا ہے۔۔۔ مجھے کیا کھانے کو دینا ہے

مجھے کدھر باندھنا ہے' مجھ سے کیا چاہیے۔ تم تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہو۔ تم میں کوئی لیڈر نہیں ہے۔ تم میں سے کوئی ان چارج نہیں ہے۔ اس لیے میری بات اس سے کرواؤ جو تمہارا ان چارج ہے۔"

بروقت کہہ کے وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

ان تینوں نے پھر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اب کی بار کوئی اسے مارنے کو نہیں جھکا۔ بس وہ خاموش رہے۔ پھر موبائل والا اٹھا اور باہر نکل گیا۔ احمر گردن جھکا کے پھر سے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

میز پہ زیورات ابھی تک کھلے پڑے تھے۔ نیم اندھیرے میں بھی وہ جگر جگر چمک رہے تھے۔



اجل خود زندگی سے کانپتی ہے
اجل کی زندگی پہ دسترس کیا

کمرہ عدالت کی اونچی کھڑکیاں تیز دھوپ کے لیے بانہیں کھولے کھڑی تھیں۔ سارا ہال سنہرا روشن نظر آ رہا تھا۔ فارس غازی حسب معمول آخری نشست پہ بیٹھا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' وہ عادتاً کان کی لو مسلتے ہوئے کن اکھیوں سے قریب بیٹھے چشمے والے آدمی کو دیکھ رہا تھا' جو سفاری سوٹ میں ملبوس تھا' اور نسوانی انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھا تھا۔ فارس نے سر جھٹک کے توجہ سامنے مبذول کرنی چاہی' جہاں وہ ادھیڑ عمر ایئرپورٹ سیکیورٹی کنٹرول روم کا آفیسر کٹہرے میں کھڑا تھا۔ زمر اس کے سامنے' چند قدم نیچے کھڑی تھی۔ فارس کی طرف اس کی پشت تھی اور وہ ہاتھ میں کاغذ پکڑے' سنجیدگی سے سوال پوچھ رہی تھی۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ ۲۲ مئی کی صبح ایئرپورٹ کنٹرول ٹاور میں موجود تھے؟"

"جی ہاں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ پہلی رو میں بیٹھا سعدی آگے کو جھکا' غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک ایک لفظ پہ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

"اور کیا آپ نے نوشیرواں کاردار کو ۲۲ مئی کی صبح اسکرین پہ دیکھا تھا؟ یعنی ۲۲ مئی کو کیا وہ ایئرپورٹ پہ موجود تھے؟"

"ایئرپورٹ پہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں' مجھے ہر ایک کی شکل یاد نہیں رہتی۔"

"پلیز اپنے جوابات کو ہاں یا ناں تک محدود رکھیں۔ کیا آپ نے نوشیرواں کو دیکھا تھا یا نہیں؟"

"جی نہیں۔" سعدی نے تھک کر سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔ پھر ذرا سا چہرہ موڑ کے دیکھا تو ہاشم مسکرا کے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سعدی کے دیکھنے پہ اس نے اپنی فائل کا ایک صفحہ یوں ترچھا کیا کہ سعدی کو اس پہ بڑے بڑے لکھے الفاظ صاف نظر آئے۔

"Money Talks" (پیسہ بولتا ہے) سعدی نے بے زاری سے رخ پھیر لیا۔

"آپ کو یہ شخص نوشیرواں کاردار اس فوٹیج میں بالکل یاد نہیں؟" زمر سپاٹ سا پوچھ رہی تھی۔ اشارہ سامنے بیٹھے شیرو کی طرف تھا۔

"جی نہیں۔" آپریٹر نے شانے جھٹکے۔

"اور کیا آپ نے اپنے دوست کو کہا تھا کہ کاردارز کے لڑکے کی فوٹیج آپ نے غائب کر دی ہے؟"

"جی نہیں۔ میں ان لوگوں کو جانتا تک نہیں ہوں۔"

"مسعود عالم صاحب۔" زمر نے ایک کاغذ سامنے کیا۔ "یہ تصویر میں نے آپ کے فیس بک سے لی ہے' اس میں کیا یہ آپ ہی ہیں؟"

مسعود نے جھک کے تصویر دیکھی۔ "جی۔"

"اور ساتھ میں کون ہے؟"

"یہ حمزہ علی عباسی ہیں۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" ہاشم نے بیٹھے بیٹھے پکارا۔ "فین فوٹوز کا اس اہم گواہی کے درمیان ذکر کرنا؟"

"اوور رولڈ' مگر مسز زمر آپ کنکشن جلد واضح کریں' ورنہ عدالت کا وقت ضائع نہ کریں۔" جج

صاحب نے اسے تنبیہہ کی۔ زمر نے سر کو خم دیا اور چند مزید تصاویر سامنے کیں۔ "یہ آپ کے ساتھ چند دوسری مشہور شخصیات کی تصاویر ہیں۔ یہ قمر الزمان کائرہ ہیں، یہ راحت فتح علی خان ہیں اور یہ۔۔۔؟"

"مصباح الحق۔" مسعود عالم نے بتایا۔ زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو آپ جب بھی کنٹرول روم میں بیٹھے اسکرین پہ ایئرپورٹ پہ کسی شناسا سا چہرے کو دیکھتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ تصویر لے لیں۔"

"جی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ اسکرین کو غور سے دیکھتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی چہرہ Unnoticed نہ رہے۔"

"جی ہاں، یہ میرا فرض ہے۔"

"مگر آپ کو نوشیرواں کاردار نہیں یاد؟ نہ ۲۲ مئی کو، نہ ۲۱ مئی کو۔"

"جی نہیں۔"

"کیونکہ ان سیلبریٹیز کو آپ پہچانتے تھے مگر نوشیرواں کو نہیں۔"

"جی بالکل۔" وہ اعتماد سے بولا۔

"اور آپ نے کبھی اس سے پہلے نوشیرواں کو نہیں دیکھا تھا؟"

"جی نہیں۔"

"اور آپ ان کے نام تک سے واقف نہیں تھے؟"

"جی نہیں۔ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"مسعود صاحب، کیا یہ درست نہیں ہے کہ آج سے ڈھائی سال پہلے ایک رات نوشیرواں کاردار کی تصویر اور پاسپورٹ کی کاپی ہاشم کاردار نے ایئرپورٹ کے عملے کو بھیجی تھی۔" اس کے سوال پہ فارس قدرے دلچسپی سے آگے ہوا۔

"آبجیکشن یور آنر۔" ہاشم تیزی سے اٹھا مگر جج صاحب نے اسے واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بات جاری رکھیں۔" زمر نے تشکر سے سر کو خم دیا اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ اس ای میل کی کاپی ہے جو تین مختلف آفیسرز نے ہمیں فراہم کی ہے۔ یہ وہ رات ہے جب مبینہ طور پہ نوشیرواں اغوا ہوا تھا کوریا میں، اور ہاشم نے یہ تصویر اور پاسپورٹ کی کاپی بہت سے آفیسرز کو بھیجی تھی تاکہ جیسے ہی یہ شخص واپس پاکستان آئے، اسے فوراً اطلاع کی جائے۔ اس ای میل کے ہیڈر میں بہت سے پتے لکھے ہیں۔ یہ آپ کی ای میل کا پتا ہے نا؟" اس نے کاغذ اس کے سامنے کیا۔

"جی مگر۔۔۔"

"اور یہ آپ کا جواب ہے جو آپ نے ریپلائی آل کلک کر کے دیا تھا جس میں لکھا ہے 'Sir' it On" یوں یہ جواب سب کو چلا گیا تھا۔"

"مجھے۔۔۔ یاد نہیں۔" اس نے پست آواز میں کہا۔

"آپ کے ای میل ریکارڈ کو سب ذرہ ذرہ یاد ہے۔ اس کا مطلب ہے، آپ نے وہ ای میل کھولی تھی، اور آپ نے نوشیرواں کا نام بھی سنا تھا اور شکل بھی دیکھی تھی۔"

"دیکھیں، اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ مجھے یاد نہیں تھا۔" وہ سنبھل کر بولا۔

"کیا آپ اس شوٹنگ کلب کے ممبر ہیں؟" اس نے ایک کارڈ کی کاپی اس کے سامنے رکھی۔

"جی۔"

"اور آپ تقریباً ہر ہفتے وہاں جاتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ تقریباً۔"

"تو کیا آپ نے اس کی لابی میں سال کے بہترین شوٹرز کی تصاویر اور نام نہیں دیکھے؟ پچھلے دو سال سے نوشیرواں کاردار دوسرے نمبر پہ آرہے ہیں، ان کی تصویر وہاں نمایاں لگی ہے، جسے آپ ہر ہفتے دیکھتے ہیں۔ تو پھر مجھے صرف اتنا بتائیے کہ آپ نے نوشیرواں کو اسکرین پہ مس کر دیا، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر آپ کا حلف کے تحت یہ کہنا کہ آپ نے اسے کبھی دیکھا نہیں ہے، یہ ناقابل فہم ہے۔ مجھے مزید کوئی سوال نہیں

پوچھنا۔" وہ سختی سے کہہ کر پلٹ آئی۔

ہاشم نے جھک کر ساتھ بیٹھے نوجوان وکیل سے سرگوشی کی۔ "ویڈیو بنائی؟"

"جی سر۔ اب حلیمہ کو بھیج رہا ہوں۔ اسے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کیسی وکیل ہے اور اسے کیسی تیاری کرنی ہے۔" ہاشم سر کو خم دے کر اٹھا۔

"مسعود صاحب آپ روز کتنے لوگوں کو سی سی ٹی وی فیڈ کی اسکرینز پہ دیکھتے ہیں؟"

"سینکڑوں۔"

"اور کیا صرف ایک اسکرین کو دیکھنا ہوتا ہے آپ کو؟"

"نہیں، سر بہت سے مانیٹرز ہوتے ہیں۔"

"اور ایگزٹ کنٹرول لسٹ کے لیے وزارت داخلہ سے اور اس کے علاوہ پولیس اور دیگر ایجنسیز کی طرف سے ریڈ الرٹ کے طور پہ ایک ماہ میں کتنی تصاویر آپ کو بھیجی جاتی ہیں؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"کم سے کم بھی ہو تو دو سو سے اوپر۔"

"جب میں نے وہ تصویر ایئرپورٹ بھیجی، صرف اس لیے کہ میرے بھائی کو آنے میں تاخیر ہو گئی تھی، نہ کہ وہ اغوا وغیرہ ہوا تھا، تو اس واقعے کو آج کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟"

"ڈھائی سال۔"

"اور سعدی یوسف کے اغوا کے وقت اس بات کو قریباً ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔"

"ایسا ہی ہے۔"

"اور اس ڈیڑھ سال کے دوران آپ نے دو ہزار تصاویر بطور الرٹ دیکھی ہوں گی۔"

"اس سے بھی زیادہ۔" آپریٹر اعتماد سے مسکرایا تھا۔

"تو کیا اسی لیے آپ کے لیے دیکھے ہوئے چہرے کو بھی یاد رکھنا مشکل ہے۔"

"آب جیکشن یور آنر۔ گواہ سے رائے بھی مانگ رہے ہیں کاردار صاحب اور ان کو لیڈ بھی کر رہے ہیں۔" وہ بے زاری سے بولی تھی۔

"Sustained" جج صاحب کی رولنگ کے بعد ہاشم سر جھٹک کے اب سوالات کا رخ موڑ کر عصمت بی بی کی طرف لے آیا۔ ذاتی عناد، پروفیشنل جیلسی وغیرہ وغیرہ اور مسعود صاحب اب اعتماد سے بتا رہے تھے کہ یہ خاتون پہلے کتنے لوگوں کے ساتھ ایسا کر چکی ہے۔

سماعت کے بعد زمر باہر آئی تو فارس دروازے کے ساتھ اس کا منتظر کھڑا تھا۔ چہرے پہ حیرانی اور قدرے اچنبھا سا تھا۔ وہ فائلز سینے سے لگائے آگے بڑھنے لگی تو وہ جلدی سے اس کے پیچھے لپکا۔

"تمہیں اس کی ای میلز کا کیسے پتا چلا؟ اور تم نے ایئرپورٹ کے اتنے سارے لوگوں سے ان کے ایفی ڈیوٹ اور ای میلز کیسے لیں؟" وہ واقعی متحیر تھا۔

"اسے oppo research کہتے ہیں اور چونکہ میں وکیل ہوں تو مجھے وہ کرنی آتی ہے۔" وہ مسکراہٹ دبائے چلتی جا رہی تھی۔

"مگر تمہیں کیسے پتا کہ وہ بھی اسی کلب کا ممبر ہے جہاں نوشیرواں بھی جاتا ہے؟"

"کیونکہ میں ایک اچھی وکیل ہوں۔ تم کیا مجھ سے متاثر ہو رہے ہو؟"

اس کے ساتھ چلتے فارس کے چہرے کے زاویے بگڑے۔ لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔"

زمر نے چہرہ موڑ کے مسکرا کے اسے دیکھا۔ "میری زندگی میں وہ وقت پتا نہیں آئے گا بھی یا نہیں۔"

"مجھے تو آثار نظر نہیں آ رہے۔" وہ بھی مسکراہٹ دبا کے بولا تھا۔

"ماموں!" سعدی پیچھے سے پکارتا ہوا آ رہا تھا۔

فارس نے پلٹ کے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا؟ پریشان لگ رہے ہو؟"

"یہ احمر شفیع کہاں ہے؟ فون آف ہے اس کا اتنے دن سے۔" وہ جھنجلایا ہوا بھی تھا۔ فارس کی نظروں کے سامنے وہ بیگ، زیور، پاسپورٹ گھوم گئے۔ اس

نے گہری سانس لی۔

"وہ کہیں شہر سے باہر گیا ہوا لمبے عرصے کے لیے۔ اس کو تنگ مت کرو۔"

"ایسے کیسے چلا گیا؟ میرے ساتھ اتنے کام کرنے تھے اس کو۔"

"اس کے پیچھے مت پڑو' اس کو اپنی مرضی سے جانے دو۔" زمر نے بھی نرمی سے کہا تھا۔

سعدی شش و پنج میں مبتلا کھڑا رہ گیا' اور وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ پتا نہیں کیوں' وہ مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ احمر کچھ بھی کر سکتا تھا' مگر جتنا سوشل وہ تھا' وہ اپنا فون اور واٹس ایپ یوں بند نہیں کر دیتا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟

✡ ✡ ✡

یہ مری عمر کا صحرا مرے دجلوں کا سراب
سرِ مژگاں نہ رہے گا تو کدھر جائے گا

وہ ایک گرم صبح تھی۔ حبس آلود' گھٹن زدہ۔ فضا میں ان دیکھی سی نمی تھی۔ جیسے کوئی خاموش آسیب ناک میں بیٹھتا ہے اور دلوں کی دھڑکن سنتا رہتا ہے۔

مورچال کے پورچ میں اندر سے اڑ اڑ کے آتی ناشتے کی اشتہا انگیز خوشبوئیں محسوس ہو رہی تھیں۔ زمر اپنی کار کا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ کوٹ پہنے' پرس کاندھے پہ ڈالے' تیار اور مصروف سی اور بس آخری منٹ میں گویا فارس کو ہدایات دے رہی تھی۔

"گھر جلدی آنا۔ پھر تم نے مجھے ڈنر پہ لے کر جانا ہے۔"

"اینورسری کل ہے مادام' اور جہاں تک ڈنر کا تعلق ہے تو کل حسینہ بنائے گی نا کدو گوشت۔" وہ سادہ سی شرٹ پہنے' جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا' ہشاش بشاش سا مسکراتا کہہ رہا تھا۔

"کیا ہم آج رات بارہ بجے نہیں سیلبریٹ کر سکتے ہیں؟" وہ خفا ہوئی۔

"کس چیز کو سیلبریٹ کرنا ہے؟ آپ نے مجھ سے انتقام کے لیے میری زندگی کو جہنم بنانے کی نیت سے جو عقد کیا تھا' اس کو سیلبریٹ کرنا ہے کیا؟"

"نہیں' تمہاری دولت اور اس شاندار جاب کو سیلبریٹ کرنے کے لیے جس پہ تم روز جاتے ہو اور جس کے لیے میں نے تم سے شادی کی تھی۔" وہ جل کر بولی تھی۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ گرم صبح بھی خوشگوار لگنے لگی تھی۔

"میں تمہیں کسی ڈنر پہ نہیں لے جا رہا۔ تم نے موقع ضائع کر دیا مجھ سے برتن دھلوا کے۔" ابھی وہ اور بھی کچھ کہتا جب گیٹ کے باہر ٹائر رگڑ کر رکنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں چونکے۔ ایک کار رکی' دروازے کھلے اور پھر بیل بجی۔ فارس آگے آیا اور دروازہ کھولا۔

"شہرین!" وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ زمر نے اس کے کندھے کے پیچھے سے جھانکا۔ باہر شہری کھڑی تھی۔ باب کٹ سنہرے بالوں کو کھلا چھوڑے' گلے میں اوٹ پٹانگ مالائیں ڈالے' ایک کان میں بالی پہنے' دوسرا کان خالی' وہ ہیجان کا شکار نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر بے چینی سے بولی تھی۔

"فارس! تم میرے لیے کیا کرو گے اگر میں تمہارے کیس میں تمہاری مدد کروں؟"

"وعلیکم السلام شہری! مجھے بھی تم سے مل کے بہت خوشی ہوئی۔" وہ تحمل مگر غور سے اسے دیکھ کے بولا تھا۔

"مجھے کسی ایک سائیڈ پہ ہونا ہے کیونکہ جلد ہی گواہی کے لیے بلائی جاؤں گی۔ اس لیے مجھے بتاؤ' تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

شہرین نے اس کی بات کو نظر انداز کیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے ہوئے سوچتا رہا۔

"یہ منحصر ہے اس پہ کہ تمہارے پاس کیا ہے۔"

"نوشیرواں کا لائسنس' جو اس کی گلاک گن کا ہے۔"

فارس کے ابرو بے یقینی سے اٹھے' اس نے مڑ کے زمر کو دیکھا جو اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"اندر آجاؤ۔"

"تمہارا گھر وائرڈ ہو سکتا ہے' میں خطرہ مول نہیں

لے سکتی۔ تمہیں باہر آنا ہو گا۔"

"او کے۔" اس نے ایک نظر زمر پہ ڈالی۔ اس وقت کی ایک آخری نظر۔ اور باہر نکل گیا۔ زمر اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا دماغ گلا کہ گن میں اٹکا ہوا تھا مگر دل فارس میں۔ ابھی وہ اس پہ خفا ہو رہی تھی مگر ایک دم یہ گھر سے گیا تو لگا جیسے سب کچھ خالی ہو گیا ہے۔ کاش وہ نہ جائے، آج کا دن اس کے ساتھ گزارے مگر او نہوں۔ وہ سر جھٹکتی واپس کار کی طرف آئی۔

"وہ ضروری کام سے گیا ہے' اتنا خود کو کسی کا عادی نہیں کرنا چاہیے زمر بی بی!" خود کو دل میں پکارا اور خود ہی ہنس دی۔ (زمر بی بی؟ واؤ!)

☆ ☆ ☆

بندہ پرور جو ہم پہ گزری ہے
جو ہم بتائیں تو کیا تماشا ہو

سورج سوا نیزے پہ تھا جب سعدی ان فلیٹ بلڈنگ کی لفٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ ساتھ میں گردن ادھر ادھر گھما کر اندازہ بھی کر رہا تھا کہ درست جگہ پہ ہے یا نہیں۔ عمارت تو یہی تھی' فلیٹ نمبر بھی اسے کچھ کچھ سا یاد تھا۔ فلور کے بارے میں وہ قدرے متذبذب تھا۔ پھر اندازے سے ایک بٹن پہ انگلی رکھی تو لفٹ کے دروازے بند ہونے لگے۔

مطلوبہ فلور پہ اتر کے وہ غیر شناسا نظروں سے اطراف میں دیکھتا آگے آیا۔ پودا' راہداری' فلیٹ کا دروازہ۔ غالباً" یہی تھا احمر کا فلیٹ' مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہاں ہر فلور ایک سا لگتا تھا۔ ایک سے پودے۔ ایک سے دروازے۔ خیر۔ وہ آگے آیا اور دروازے کے ساتھ لگی بیل بجائی۔ پھر سر پہ جمی پی کیپ درست کرتا ذرا ہٹ کے کھڑا ہو گیا' تاکہ دروازے کے سوراخ سے دیکھنے والا اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ (شاید احمر اس کو avoid کر رہا ہو تو کم از کم یوں وہ کسی اور کے دھوکے میں دروازے تو کھول دے گا۔)

اندر فلیٹ نیم اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ صرف کمرے کی بتی جل رہی تھی جس میں وہ تین آدمی اس کے سر پہ کھڑے تھے۔ وہ ہنوز بندھا ہوا نیچے بیٹھا تھا' اور سر نیہوڑا رکھا تھا۔ گھنٹی کی آواز پہ سب چونکے۔ احمر نے بھی سر اٹھایا۔ وہ پہلے سے زیادہ نقاہت زدہ دکھتا تھا۔

"ارے اس وقت کون آگیا؟ ہاں؟ بول۔" ان کے سرغنہ نے اس کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"جا کر خود کیوں نہیں دیکھ لیتے؟" وہ تلخی سے بولا تھا تو اس نے جھٹکے سے اس کے سر کو چھوڑا۔ پھر باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد واپس آیا۔

"کوئی آدمی ہے' شکل نہیں دکھائی دے رہی۔ اس طرف منہ کر کے کھڑا ہے۔ سر پہ کیپ پہن رکھی ہے۔" اس نے موبائل پہ میجک آئی سے تصویر بنالی تھی اور اب احمر کو دکھا کے پوچھ رہا تھا۔ "کون ہے یہ؟"

احمر نے ایک بے نیاز نظر تصویر پہ ڈالی۔

"یہ؟ یہ تو پزا والا ہے۔ اس کے اوٹ لٹ کا بل دینا تھا مجھے۔ دو ہزار روپے۔"

پھر سے گھنٹی بجی۔ تیز چنگھاڑتی آواز۔ تینوں نے باری باری ایک دوسرے کو دیکھا۔

"خود ہی تھک کے چلا جائے گا۔ بجانے دو گھنٹیاں۔" ایک نے مشورہ دیا۔

"ویسے بھی کوئی اور تو اس کے پاس آتا جاتا نہیں ہے۔ سو کسی کو شک نہیں ہو گا۔"

"اور ہم نے اس کو یہیں رکھنا ہے' یہاں سے لے جا بھی نہیں سکتے۔" ان کی مدھم آوازیں احمر شفیع کو سنائی دے رہی تھیں۔

"میری کار پارکنگ میں کھڑی ہے۔ اس پزا بوائے نے وہ دیکھ لی ہو گی۔ اسے پتا ہے کہ میں گھر پہ ہوں۔ اس نے اپنی طرف سے پیسے دے کر کھانے میں غلط اعداد و شمار لکھے تھے' اور اب وہ پیسے لیے بغیر نہیں جائے گا۔ دروازہ نہ کھولا تو پارکنگ میں جا کر میری کار کے شیشے توڑ دے گا' نتیجتاً" گارڈز اوپر مجھے بلانے آئیں گے' پھر کیا کرو گے تم لوگ؟"

"چپ کر کے بیٹھو۔" ایک غرایا تھا۔

"میرے ہاتھ کھولو اور مجھے وہ ہزار روپے دو' تاکہ میں اسے پکڑا کے چلتا کروں۔ مجھے پتا ہے تم لوگوں نے مجھے مارنا نہیں ہے۔ اور تمہارے مالک سے ملنے کا مجھے خود بھی کافی شوق ہے تو میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ پکڑے جاؤ۔ میرے ہاتھ کھولو' میرا منہ دھلواؤ' تاکہ میں اس کو چلتا کروں۔" ان تینوں نے پھر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گھنٹی ہنوز بج رہی تھی۔

چند منٹ بعد دھلے چہرے والا احمر دروازے کے ساتھ کھڑا تھا' اس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے دو نوٹ تھے اور اس کی پشت سے ایک آدمی نے پستول کی نال لگا رکھی تھی۔ اندر کی ساری بتیاں بجھادی تھیں' تاکہ وہ دروازہ کھولے تو باہر والا اندر نہ جھانک سکے۔

"پہلے پوچھو کہ کون ہے' اور کوئی چالاکی مت کرنا۔" وہ ابھی تک مشکوک تھا۔ احمر نے گہری سانس لی اور کھنکھار کے آواز لگائی۔

"اے۔۔۔ پزا بوائے ہو نا؟"

"ہاں جی' پزا بوائے ہوں۔ اب دروازہ کھولو۔" وہ خفگی سے بولا تھا۔ احمر نے فاتحانہ نظروں سے اغواکار کو دیکھا اور پھر آگے بڑھا۔ دروازہ ذرا سا کھولا اور سر باہر نکالا۔ سامنے سعدی کھڑا تھا۔

"مرے کیوں جا رہے ہو دو ہزار روپے کے لیے؟ گھنٹی بجا بجا کے دماغ خراب کردیا ہے میرا۔ دو پزے کیا منگوا لیے' تم لوگ تو جان کو آجاتے ہو۔ یہ پکڑو۔" غصے سے بولتے اس کے ہاتھ میں نوٹ تھمائے۔

سعدی ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

"خبردار جو اب گھنٹی بجائی۔ دفع ہو جاؤ ادھر سے۔ اور اگر اب دروازہ بجایا' تو کان کھول کر سن لو' میں سیکیورٹی والوں کو بلا لوں گا۔"

"کیا۔۔۔ کیا۔۔۔؟" وہ سنبھل کے کچھ بول بھی نہ پایا تھا کہ احمر نے اس کے منہ پہ دروازہ بند کردیا۔ سعدی نے بے اختیار دروازہ بجایا۔ "احمر۔۔۔ ایک منٹ میری بات سنو۔"

"دفع ہو جاؤ خاور' ورنہ میں سیکیورٹی کو بلا لوں گا۔" وہ حلق پھاڑ کے چلایا تھا۔ سعدی کا ہاتھ رک گیا۔ ساکت۔ شل۔ (خاور؟) وہ چند لمحے کھڑا ہاتھ میں پکڑے نوٹ دیکھتا رہا' پھر شل سا پلٹ گیا۔

ان کا سرغنہ میجک آئی سے باہر جھانک رہا تھا۔ وہ چلا گیا تو اسے سکون ملا۔ وہ واپس مڑا اور احمر کے ہاتھ پیچھے باندھ کر ہتھکڑی لگانے لگا۔ احمر نے کوئی مزاحمت نہیں کی' خاموشی سے خود کو بندھواتا رہا۔

سعدی اسی شل سی کیفیت میں سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ لفٹ کے بجائے وہ زینے سے جا رہا تھا' جانے کیوں۔ بار بار الجھ کر احمر کے الفاظ پہ غور کرتا۔ شاید اندر کوئی لڑکی ہو' اور وہ اسے بھگانا چاہ رہا ہو۔ مگر پزا بوائے۔۔۔ جب پہلی بار ادھر آیا تھا تو احمر اسے پزا بوائے سمجھا تھا۔ آج برسوں بعد اس لقب سے پکارا تھا۔ مگر "خاور؟" اور "یہ نوٹ"۔ اس نے وسط سیڑھیوں پہ رک کر ان دو نوٹوں کو دیکھا۔ وہ لپٹے ہوئے تھے۔ اس نے ان کو کھولا۔

دونوں نوٹوں کے درمیان۔۔۔ تازہ خون لگا تھا۔ بالکل تازہ سرخ بوندیں۔ سعدی یوسف سناٹے میں رہ گیا۔

اوپر اب وہ احمر شفیع کو اندھیرے لاؤنج سے گزار کے روشنی والے کمرے میں لے جا رہے تھے۔ جیسے ہی وہ اندر آیا' روشنی میں اس کے ہاتھ کی پشت عیاں ہوئی' جس پہ ایک کٹ لگا تھا (جو اس نے اندھیری راہداری میں دروازے کے لاک کے ساتھ رگڑ کے لگایا تھا) اور یہاں پہنچنے تک اس کو مسلسل دوسرے ہاتھ سے دبا کر رکھنے کے باعث اس سے خون رسنا رک گیا تھا۔ زائد خون وہ کپڑوں سے رگڑ کر صاف کرچکا تھا اور جس لمحے ان تینوں نے اسے واپس بیڈ کے قریب باندھا' اس کے ہاتھ پہ ان کو ایسا کچھ نہ دکھائی دیا' جو ان کو کسی شک میں ڈالتا۔ اب وہ ٹولی کی صورت کھڑے باتیں کر رہے تھے' اگلا لائحہ عمل طے کر رہے تھے' اور احمر خاموشی سے بیٹھا وال کلاک کو دیکھ رہا تھا۔ گھڑی لمحہ بہ لمحہ وقت کو گن رہی تھی۔ ٹک ٹک۔۔۔ ٹک ٹک۔۔۔

✵ ✵ ✵

کیا بہاروں نے 'نئے عہد کی دستک دی ہے!

شہریاروں کی خزاؤں کا سحر جاتا ہے

اس چھوٹے سے آفس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کمپیوٹر کے سامنے ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ماؤس چلا رہا تھا اور فارس اس کے کندھے پہ جھکا اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ شہرین دوسری طرف کھڑی تھی۔

"ملا کچھ؟" وہ بے چینی سے بولی تو فارس نے سنجیدگی سے اسکرین کو دیکھتے، گردن دائیں بائیں ہلائی۔ "نوشیرواں کے نام سے کوئی ریکارڈ نہیں آ رہا۔"

"ہاشم کاردار کے نام سے کچھ کنز آ رہی ہیں میڈم۔" آفیسر نے اطلاع دی۔

"نوشیرواں کا ریکارڈ وہ مٹا چکے ہوں گے۔ جب ہمیں اتنی آسانی سے منسٹری کے ڈیٹا بیس تک ایکسس مل گئی ہے، تھینکس ٹو یور فادر شہری، تو ان کو بھی مل گئی ہوگی۔" فارس افسوس سے کہتا سیدھا ہوا۔ "تمہارا شکریہ مگر وہ ریکارڈ مٹا چکے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ہارڈ کاپیز کہاں ہوتی ہیں؟" شہری نے افسر کو سوچتے ہوئے مخاطب کیا۔

فارس ایک دم چونکا۔ "ہاں واقعی، ہارڈ کاپیز کا ریکارڈ تو ہوگا نا۔"

"وہ تو میم..." وہ ذرا ہیجان سے بولا۔ "ایک دوسری بلڈنگ میں ہیں، اور وہاں آپ کو میں یوں نہیں لے کر جا سکتا۔" شہری نے تندہی سے اسے گھورا اور پرس کھولا۔ چند گلابی کڑک نوٹ نکالے اور اس کے سامنے میز پہ ڈالے۔

"ہمیں وہ فائل چاہیے، اس لیے اب تم ہمیں اس بلڈنگ میں لے کر جاؤ گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے میم، مگر..." اس نے دھیرے سے نوٹ اٹھائے۔ "شفٹنگ کے دوران فائلز کو ڈبوں سے نکال لیا گیا تھا۔ ان کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ اتنے بڑے تین کمرے فائلز سے بھرے ہوئے ہیں۔ دیکھنے میں پورا دن لگ جائے گا۔"

"یعنی اگر ہاشم نے وہ فائل نکالنی ہوتی تو اسے بھی کئی بندے لگا کے کئی گھنٹے کام کروانا پڑتا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اتنا خوار کون ہو اور صرف سافٹ کاپی مٹانے پہ اکتفا کیا ہو۔" وہ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شہری کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

"یعنی فائل مل جانے کے چانسز زیادہ ہیں۔ گڈ۔ فاروق ہمیں ادھر لے چلو۔ چلو نا، اب شکل کیا دیکھ رہے ہو؟" شہری نے آنکھیں دکھائیں تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"سنو۔" پھر وہ اس کے قریب آئی۔ "اگر لائسنس ڈھونڈ دیا میں نے تمہیں تو تم بھی میرا ایک کام کرو گے، اچھا۔" اسے یاد دلایا۔ فارس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ "پہلے لائسنس مل جائے پھر دیکھتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

ہوا کی زد پہ... ہمارا سفر ہے کتنی دیر
چراغ ہم کسی شام زوال ہی کے تو ہیں

مور چال پہ رات اتر آئی تھی۔ حنین یہ تسلی کرنے کے بعد کہ امی سو چکی ہیں، اور اب اس کو ڈانٹ نہیں سکتیں، اپنی الماری سے وہ سارا سامان نکالنے لگی جو اسٹینسل پینٹ کرنے کے لیے اسے چاہیے تھا۔ صبح یا تو امی لاؤنج کی دیوار پہ ایک خوب صورت شاہکار دیکھیں گی یا صرف "شاہکار"! تب تک جو بھی ہو، وہ اپنا کام اچھا یا برا کر چکی ہوگی۔ بہت جوش سے چیزیں اکٹھی کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

زمر اپنے کمرے میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے فون اٹھا کے دیکھ لیتی۔ فارس صبح کا گیا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ وال کلاک پہ سیکنڈ والی سوئی ٹک ٹک کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔

باہر حنین اب اسٹینسل کے خاکے کو دیوار پہ چپکا رہی تھی۔ اس کی خالی جگہوں پہ اسے رنگ بھرنا تھا۔

فارس ایک نیم تاریک آفس میں کھڑا تھا۔ بتیاں بند تھیں، اور وہ الماری سے فائلوں کا گٹھا نکال کے زمین پہ رکھ رہا تھا۔ قریب میں اسٹول پہ بیٹھی شہری فائلوں

کے ڈھیر میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ افسر بھی ساتھ بیٹھا ایک ایک صفحہ کھول کے دیکھ رہا تھا۔ بتیاں بند تھیں اور وہ تینوں پنسل ٹارچز کی مدد سے کام کر رہے تھے۔ فضا میں گرد اور گھٹن تھی۔ ست روی تھی۔ وقفے وقفے سے شہری کھانستی پھر ناک رگڑتی اور کام کرنے لگ جاتی۔

احمر شفیع کے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے باہر کار میں موجود سعدی خاموش سا بیٹھا تھا۔ بالکل چپ۔ جیسے کسی کا منتظر ہو۔

اوپر فلیٹ میں وہی گھٹن زدہ ماحول چھایا تھا۔ اغوا کاروں کا ایک کارندہ دوسرے سے بے چینی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "اسے پنڈی والے گودام لے چلتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی اور آجائے اس کا پوچھنے۔"

"نہیں' اس کو کہیں نہیں لے کر جانا۔ باہر موو کرنے میں بہت خطرہ ہے۔ یہیں کرنا ہے جو کرنا ہے۔"

نیچے بندھے احمر کی نظریں ہنوز گھڑی پہ جمی تھیں۔ دل بھی اسی آواز کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ ہر گزرتے سیکنڈ پہ ایک دفعہ ڈوب کر ابھرتا۔ کیا کوئی آئے گا اس کی مدد کے لیے؟ کیا سعدی سمجھ پائے گا؟ یا وہ بے نام و نشان یہیں مر جائے گا؟

مورچال کے لاؤنج میں حنہ اسٹول پہ کھڑی دیوار پہ پینٹ کر رہی تھی۔ آہٹ پہ چونکی۔ تیار سی زمر کمرے سے نکل رہی تھی۔ حنہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ اس وقت کس کی شادی میں جارہی ہیں؟"

"اپنی شادی کی اینورسری میں جارہی ہوں۔"

"کل بیس مئی ہے؟ ایک سال ہو گیا؟"

"کل نہیں۔ ابھی بارہ بجے سے بیس مئی ہے اور فارس صاحب کو اتنے دن سے ڈنر ڈنر کرنے کے بعد بالآخر آج وقت مل ہی گیا مجھے ڈنر پہ بلانے کا۔"

حنہ کی آنکھیں چمکیں۔ "کہاں بلایا ہے؟"

"ہم دونوں کے لیے ایک یادگار جگہ ہے وہ۔ زیادہ سوال مت پوچھو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"ویسے ان کو چاہیے تھا آپ کی مرضی کی جگہ پہ لے کر جاتے آپ کو۔ ٹیبل ریزرو کر کے بتا رہے ہیں اب۔"

"وہ تو گواہ کو ملوانے کا بہانہ کر کے بلا رہا ہے' مگر اکیلے آنے کا کہا' اور وہ بھی بیس مئی کی رات۔ ظاہر ہے وہ مجھے سرپرائز دینا چاہتا ہے۔ اوکے اللہ حافظ۔" وہ مسکرا کر اس کو الوداع کہتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ حنین کے دل نے تمنا کی کاش کہ وہ آج پھر چابیاں بھول جائے اور واپس آئے' مگر وہ عجلت میں تھی۔ خیر' حنہ سر جھٹک کر کام کرنے لگی۔

اندھیرا بھرے آفس میں وہ تینوں زمین پہ بیٹھے فائل پہ فائل چیک کیے جارہے تھے' جب فارس نے جیب سے موبائل نکالا۔ نو سگنل۔ شاید یہاں جیمرز لگے تھے۔ وہ موبائل واپس ڈال کے کام کرنے لگا۔

چند لمحے گزرے تھے جب شہری کا موبائل بجا۔ سر جھکائے کام کرتے فارس کے ہاتھ بالکل تھم گئے۔

"ہاں ٹھیک ہے' تم اس کو دوا دے دو اور...." سونی کو بخار تھا اور وہ فون پہ ملازمہ کو ہدایت دے رہی تھی۔ فون کان اور کندھے کے درمیان لگائے' وہ ساتھ ہی فائل کے صفحے بھی الٹ رہی تھی۔ فارس دم سادھے بیٹھا رہا۔ شہری نے فون بند کیا تو فارس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر پھر دیکھا۔ "نو سگنل۔"

اب کی بار اس نے نظریں اٹھائیں تو وہ مختلف نظریں تھیں۔ غور سے چبھتے ہوئے انداز میں شہری کو دیکھا۔ "تم بہت ست روی سے کام کر رہی ہو۔ جلدی ہاتھ چلاؤ۔" بظاہر مصروف سے انداز میں بولا تھا۔ شہری "کر تو رہی ہوں' ڈسٹ بہت ہے" کہہ کر نزاکت سے کھانسی' اور پھر اگلی فائل اٹھالی۔

وہ فائلز اٹھائے کھڑا ہوا اور دروازے کے ساتھ نصب الماری کے سامنے جار کا۔ فائلز اندر رکھیں اور یونہی الماری میں سر گھسائے چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ کن اکھیوں سے وہ دونوں کو دیکھ بھی رہا تھا۔ شہری کی اس طرف پشت تھی' البتہ آفیسر بھی ادھر جاتا' کبھی

ادھر۔ ساتھ ہی بار بار کلائی کی گھڑی پہ بھی ٹارچ مارتا۔ شہری کے ہاتھ بھی سست روی سے چل رہے تھے دونوں کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر کس کا؟

وہ چند ثانیے الماری میں سر دیے کھڑا رہا۔ جیسے ہی اس نے دیکھا کہ آفیسر کی اس طرف پشت ہوئی ہے' وہ سُرعت سے پیچھے ہٹا اور کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ بنا چاپ پیدا کیے وہ راہداری عبور کر کے زینے کی طرف لپکا۔ جوتے اتار کے ہاتھ میں پکڑ لیے اور تیز تیز سیڑھیاں اترنے لگا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ماتھے پہ پسینہ تھا۔

اندھیرے کمرے میں شہری اسی طرح بیٹھی ٹارچ کی روشنی فائلز پہ ڈال رہی تھی۔ دفعتاً" وہ سیدھی ہوئی اور گردن تھکاوٹ کے انداز میں دائیں بائیں موڑی' تو چونکی۔ تیسری ٹارچ کی روشنی دکھائی نہ دی تو اس نے جلدی سے ٹارچ الماری پہ ڈالی۔

وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ حواس باختہ سی اٹھی اور باہر دوڑی۔ راہداری' دوسرے آفسز کے مقفل دروازے' زینہ' سب سنسان پڑے تھے۔ اس نے بے اختیار ماتھا چھوا۔

"اوہ نو۔" پھر پیچھے گھومی اور چلائی۔ "وہ بھاگ گیا ہے' جاؤ اسے ڈھونڈو۔" آفیسر ہڑبڑا کے اٹھا اور باہر لپکا۔ وہ اب پریشانی سے فون کان سے لگائے ہوئے تھی۔

"ہاشم۔۔۔ پولیس مت بھیجو۔ وہ جا چکا ہے۔ میرا کیا قصور؟ مجھے واقعی۔ علم نہیں ہو سکا۔" وہ جھنجلا کے کہہ رہی تھی۔

رکھے تھے۔ معصوف سے انداز میں جیسے کوئی تھکا ہارا مکین گھر کو لوٹتا ہے' وہ سیدھا لفٹ تک آیا اور گارڈز کو نظر انداز کر کے اندر سوار ہو گیا اور مطلوبہ بٹن دبا دیے۔ لفٹ منزل بہ منزل فضا میں اوپر سفر کرنے لگی۔ احمر کا فلور آیا تو وہ باہر نکلا۔ سامنے مخالف سمت میں کئی دروازے بند پڑے تھے۔ سعدی جلدی سے نیچے زمین پہ بیٹھا' اور دونوں لفافوں سے پیکٹ نکالے' پھر ان کو کھول کے زمین پہ الٹنے لگا۔ ان میں سرمئی سفید سا سفوف تھا جس کی عجیب سی بدبو تھی۔ سفوف کا ڈھیر لگا کے اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی آتو نہیں رہا؟ مگر راہداری سنسان پڑی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے دوسرے لفافے سے ایک بوتل نکالی' ڈھکن کھولا' دوسرا ہاتھ ناک پہ جمایا اور مائع سفوف پہ الٹ کر ایک دم پیچھے ہٹا۔ سرسر کی آواز آئی اور نہ کوئی آگ لگی' نہ شعلے بلند ہوئے مگر سفوف جلنے لگا' اور سیاہ دھواں فضا میں بلند ہونے لگا۔ شاپرز وغیرہ کو ڈسٹ بن میں پھینکا' وہ تیزی سے دیوار پہ لگے فائر الارم تک آیا اور اسے کھینچ دیا۔ پھر بھاگ بھاگ کے چاروں دروازوں کو کھٹکھٹانے لگا۔ مگر فائر الارم کی آواز اتنی بلند تھی کہ دستک کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پوری بلڈنگ ایک دم جاگ اٹھی تھی۔ ساری راہداری دھوئیں سے بھر گئی تھی' جیسے نچلے فلور پہ آگ لگی ہو اور دھواں اٹھ کے یہاں تک آرہا ہو' اور سعدی یوسف ناک پہ ہاتھ رکھے ایک ایک دروازہ بجا رہا تھا۔

"باہر نکلو۔ آگ لگی ہے۔ جلدی نکلو۔" احمر کا دروازہ بجا کے وہ دھڑکتے دل سے چلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

شمعیں باغی ہیں خاک کر دیں گی
آندھیوں سے کہو سدھر جائیں

احمر شفیع کے فلیٹ کی بلڈنگ اسی طرح سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کے اوپر۔۔۔ آسمان پہ چمکتا ہوا تھال جیسا چاند نظر آرہا تھا۔ زیر زمین پارکنگ میں کار کھڑی کر کے سعدی باہر نکلا۔ سر پہ کیپ تھی' آنکھوں پہ گلاسز تھے' اور دونوں ہاتھوں میں گروسری کے شاپر پکڑ

☼ ☼ ☼

یہ جو ٹھہراؤ بظاہر ہے' اذیت ہے میری
جو تلاطم مرے اندر ہے سکوں ہے میرا

وہ خوب صورت ہوٹل آج بھی روشنیوں سے منور اور عالی شان دکھتا تھا جیسا کہ ماہ کامل کی اس حسین رات میں اسے لگا تھا۔ رات کے گیارہ بجنے کے باوجود لابی میں خاصی گہما گہمی تھی۔ زمر لبوں پہ مسکراہٹ

سجائے، سیاہ جھلملاتے لباس میں تیار سی ادھر ادھر چہرہ گھماتی آگے بڑھ رہی تھی۔ نظریں فارس کو تلاش کر رہی تھیں۔ سارا دن اس کو دیکھا نہیں تھا، وہ واقعی اسے مس کرنے لگی تھی۔

"فارس غازی کے نام سے ٹیبل ریزرو ہے؟" اس نے استقبالیہ پہ کھڑے باوردی افسر سے پوچھا۔

"جی، ادھر آجائیے۔" وہ اسے مودب سے انداز میں آگے لے گیا۔ وہ مسکراہٹ دبائے آگے چلتی گئی۔

ہاشم کاردار کے آفس میں صرف ایک بتی روشن تھی۔ یا پھر کونے میں رکھے ایکوریم کی بتیاں جل رہی تھیں۔ عجیب نیم تاریکی پُراسرار سا ماحول بنا ہوا تھا۔ وہ شرٹ کے کف موڑے کھڑا، رئیس کے کندھے کے اوپر سے جھک کر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں میں چمک تھی۔

"وہ ہوٹل میں آگئی ہے سر!"

"گڈ۔ تمہیں کیسے پتا چلا وہ اس ہوٹل کا سن کر مان جائے گی؟"

"کیونکہ وہ چند دن پہلے غازی سے فون پہ کہہ رہی تھی کہ اسے اس ہوٹل میں ڈنر کرنا ہے۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی یہاں آچکے ہیں۔"

"ویری گڈ۔ اب اس کو کال ملاؤ۔ اور ہاں، فارس کے سگنلز کھول دو۔ اب تک وہ گھر پہنچ گیا ہوگا، اس کو پریشان ہونے دو۔" کھیل شروع ہو چکا تھا، وہ دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔ مزا تو اب آنے لگا تھا۔

"راجر، باس!" رئیس نے سر کو خم دیتے چند کلکس کیے اور پھر اسپیکر پہ گھنٹی جانے کی آواز سنائی دینے لگی۔...

آبدار عبید اپنے کمرے میں بیٹھی لیپ ٹاپ پہ کام کر رہی تھی، جب دروازہ زور سے بجا۔ اس کے ابرو بھنچے۔ گردن موڑ کے دیکھا۔

"اندر آجاؤ۔" تحکم مگر ناگواری سے پکارا۔ دروازہ کھلا اور سامنے ملازمہ نظر آئی۔

"ہاشم کاردار صاحب نے آپ کے لیے کار بھیجی ہے۔ آپ کو آفس بلوایا ہے۔" وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ ذرا حیران، ذرا پریشان۔

"بابا کہاں ہیں؟"

"وہ گھر نہیں آئے۔"

"میری کار نکلواؤ، ڈرائیور اور دو گارڈز کو کہو تیار رہیں، میں آرہی ہوں۔" ملازمہ کے جاتے ہی اس نے تیزی سے موبائل اٹھایا۔ اوپر ہاشم کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

"آفس اباؤٹ فارس غازی"

چار الفاظ میں ساری بات ہی ختم کردی تھی اس نے۔ وہ چند لمحے متذبذب سی کھڑی رہی۔ پھر پلٹ کے خود کو آئینے میں دیکھا۔ سفید لمبی قمیص کے ساتھ سفید ٹراؤزر پہنے، وہ سرخ بالوں کو کیچر میں اونچا باندھے ہوئے، عام سے حلیے میں نظر آتی تھی۔ دل اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ لباس بدلنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے سرخ رومال اٹھایا، ماتھے کے اوپر باندھا، بالوں کو پھر سے کیچر میں کسا اور باہر کو لپکی۔

ہوٹل کا ریستوران اریا زرد روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پس منظر میں بجتی مدھم سروں کی موسیقی، جا بجا بجے خوشبودار پھول، اور اس کی میز کے وسط میں رکھی موم بتی، سب مل کر خوب صورت پُرفسوں ماحول بنائے ہوئے تھے۔ وہ کہنیاں میز پہ رکھے ہتھیلیوں پہ ٹھوڑی گرائے منتظر سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ انتظار کی خوشی اب بے چینی اور فکر میں بدلتی جا رہی تھی۔

احمر کے اپارٹمنٹ کا دروازہ دھڑا دھڑ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ دروازے کی درز سے دھواں اندر بھی داخل ہو رہا تھا۔ باہر لوگوں کی چیخ و پکار الگ تھی۔ کمرے میں نیچے بندھے احمر نے چونک کر وہ فائر الارم سنا تھا، پھر اس نے تینوں کی طرف سر گھمایا جو ایک دم پریشان ہوگئے تھے۔

"بلڈنگ میں آگ لگ گئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے یہ فالس (جھوٹا) الارم ہو۔" سرغنہ مشکوک تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟ نکلو یہاں سے، ورنہ ہم سب جل کر مر جائیں گے۔" احمر شفیع چلایا تھا۔ سرغنہ ابھی تک متذبذب دکھائی دیتا تھا، مگر دوسرے دونوں اغوا کار جلدی جلدی ساری نقدی، چیک بکس، کارڈز وغیرہ

زیورات والے بیگ میں بھرنے لگے۔

باہر کا شور و غل پہلے سے مزید بڑھ گیا تھا۔ سرغنہ چند لمحے کھڑا دیکھتا رہا، پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ لاؤنج عبور کیا اور بیرونی دروازہ کھولا۔ پھر ایک دم پیچھے کو ہٹا۔ باہر دھواں ہی دھواں تھا۔ سیاہ گہرا دھواں۔ وہ کھانستے ہوئے ذرا سا آگے بڑھا۔

"کیا ہوا ہے۔ کدھر آگ لگی ہے؟" اس نے ادھر ادھر بھاگتے لوگوں سے پوچھا۔ چیخ و پکار اور افراتفری میں ایک جملہ کان میں پڑا تھا۔ "آگ نہیں ہے، کسی نے کوڑا جلایا ہے شاید، دھواں ہے اس کا۔" وہ لوگ بالٹی بھر بھر کے اس سڑتے سفوف پہ ڈال رہے تھے، جس سے دھوئیں کا رنگ مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

"اوہ۔" سرغنہ فوراً اندر کو لپکا اور دروازہ بند کیا۔ اپارٹمنٹ کے اندر بھی کافی دھواں بھر چکا تھا۔ وہ کھانستا ہوا آگے آیا اور احمر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ احمر بندھا پڑا تھا اور وہ دونوں جلدی جلدی چیزیں سمیٹنے میں لگے تھے۔

"کوئی آگ واگ نہیں لگی۔ ذرا سا دھواں ہے بس۔ واپس رکھو سب کچھ۔ ہم کہیں نہیں جا رہے۔"

وہ ڈپٹ کے بولا تو احمر کی رنگت پھیکی پڑنے لگی۔ اس نے بے چینی سے گھڑی کو دیکھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سرغنہ کرسی کھینچ کے پھر سے اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"چلو پھر سے تفتیش شروع کرتے ہیں۔ ہاں تو مزید کتنا پیسہ ہے تمہارے پاس؟"

✡ ✡ ✡

آدمی کو خدا نہ دکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

روشنیوں سے مزین ہال کی چند میزیں ہی بھری تھیں، باقی سب خالی تھیں۔ لوگ اٹھ اٹھ کے اب جانے لگے تھے۔ زمر اداسی سے بیٹھی گھنگریالی لٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی، جب اس کا فون تھرتھرایا۔ اس نے گہری سانس لے کر اسے کان سے لگایا۔

"کہاں ہو تم فارس؟"

"تم کہاں ہو؟ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں تمہارا۔"

"انتظار تو میں کر رہی ہوں۔ ریسٹورنٹ ایریا میں بیٹھی ہوں۔ تم بتاؤ، تم کہاں ہو، میں وہیں آ رہی ہوں۔"

"اوہ میں سمجھا ابھی تم پہنچی بھی نہیں ہوگی۔ میں اوپر ہوں۔ ففتھ فلور پہ۔ روم نمبر 507 میں۔ تم ادھر ہی آجاؤ۔ ہمارا گواہ یہاں ہی ہے۔"

"گواہ۔" وہ پرس اٹھاتے ہوئے ٹھٹکی، پھر ایک نظر میز پہ سجے پھولوں کو دیکھا۔ "گواہ سے ملوانا تھا؟ واقعی؟ تو یہ ٹیبل کیوں ریزرو کروائی تھی؟"

"آجاؤ پھر بتاتا ہوں، جلدی۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

زمر چہرے پہ خفگی کا تاثر سجائے، فون کان سے لگائے اٹھی اور آگے بڑھنے لگی۔ "ویسے کون ہے یہ گواہ؟"

"تم خود دیکھ لوگی۔"

"اچھا مگر یہ ہوٹل میں کیوں ہے؟" وہ لفٹ کے سامنے جا رکی۔ تین لفٹس کے بند دروازے نظر آرہے تھے۔ سب اوپر تھیں۔ اس نے باری باری تینوں کو نیچے آنے کا بٹن پریس کیا۔ جو جلدی آجائے غنیمت ہوگی۔

"کچھ فائلز تھیں اس کے پاس، اس سے لینے کے لیے یہاں آنا پڑا۔ آرام سے دے نہیں رہا تھا تو.... کمپرومائز پوزیشن میں لانا پڑا۔" لفٹ آکے نہیں دے رہی تھی۔ تب ہی اس نے دیکھا، کونے والی لفٹ آچکی تھی اور دروازے کھل گئے تھے۔ اندر سے وہ خالی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھ گئی۔

"اوہ گاڈ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟ اچھا مجھے مت بتاؤ۔" لفٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے 5 کا ہندسہ دبایا اور فون کان سے لگائے بولی۔ "مجھے اپنے جرم کا گواہ مت بنانا۔"

"تم میرے خلاف گواہی نہیں دے سکتیں۔"

"اچھا' وہ کیوں؟" وہ مسکراہٹ دبائے پوچھ رہی تھی۔ لفٹ کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی' وہ کن انکھیوں سے لفٹ کی دو مخالف دیواروں کو دیکھ سکتی تھی جو آئینے سے ڈھکی تھیں۔ دائیں بائیں گویا دو بڑے بڑے آئینے لگے ہوں۔ پیچھے کی دیوار لوہے کی تھی۔

"کیونکہ تم میری بیوی ہو' اور Spousal Privilge کے تحت تم میرے خلاف گواہی نہیں دے سکتیں۔ اب آجاؤ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

زمر ایک دم بالکل ٹھہر گئی۔ لفٹ فضا میں اوپر کو اٹھ رہی تھی۔

"Spousal Privilge" اس نے دہرایا۔

(یہ قانون شہادت میں ایک آرٹیکل ہے' جس کے تحت میاں بیوی کو دوران شادی کی گئی گفتگو کے بارے میں ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے پہ مجبور نہیں کیا جاسکتا' ماسوائے اس کے کہ کیس وہ دونوں آپس میں لڑ رہے ہوں' جیسے طلاق' بچوں کی کسٹڈی یا کوئی اور کیس۔)

"ہاں' ہزبینڈ وائف پریویلج۔"

"اور آرٹیکل نمبر کیا ہے اس کا؟" زمر کی سوچتی نظریں لفٹ کی ننھی اسکرین پہ لگی تھیں جس پہ ہندسے بدل رہے تھے۔ دوسرا فلور' تیسرا.....

"کیا؟" وہ جواباً" بولا تھا۔

رئیس نے ٹائپ کرتے ہوئے گڑبڑا کے ہاشم کو دیکھا۔ "اس کو شک ہو گیا ہے شاید۔"

"تم عموماً" آرٹیکلز کو ان کے نمبرز کے ساتھ کوٹ کرتے ہو' مجھے متاثر کرنے کے لیے' آج نہیں کیا تو میں پوچھ رہی ہوں کہ اس کا آرٹیکل یاد ہے یا بھول گیا؟ آخر ٹیچر رہی ہوں میں تمہاری۔" وہ محتاط سا پوچھ رہی تھی۔

(ہاشم تیزی سے کی بورڈ پہ جھکا اور ٹائپ کرنے لگا۔)

"میں اس وقت کافی فکر مند ہوں' اور تمہارا منتظر بھی اس لیے کہہ نہیں سکا۔ قانون شہادت آرٹیکل..... خوش؟" خفگی سے بولا تھا وہ.....

لفٹ کا نمبر 4 سے بدل کر اب 5 ہو گیا تھا۔ دروازے کھلے مگر زمر باہر نہیں نکلی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ بولی تھی۔

"اور جس فارس غازی کو میں جانتی ہوں' وہ انتہائی بے کار اسٹوڈنٹ تھا۔ (اس نے دروازے بند ہونے کے بٹن پہ انگلی رکھی اور گراؤنڈ فلور پریس کیا۔) اور اس کو اس قانون کا آرٹیکل نمبر یاد ہونا تو دور کی بات اس کو یہ تک معلوم نہیں ہوگا کہ قانون شہادت میں ایسا کوئی آرٹیکل ہے بھی یا نہیں۔ مگر وہ واحد شخص جو انگلیوں پہ آرٹیکلز یاد رکھتا ہے' وہ ہاشم کاردار ہے' اس لیے بہت شکریہ میری اینیورسری برباد کرنے کے لیے ہاشم' مگر میں اب مزید تمہاری اسکیم کا حصہ نہیں بنوں گی۔ سنا تم نے؟" وہ صدمے اور دکھ سے چلائی تھی۔

دوسری جانب چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ لفٹ نیچے اتر رہی تھی۔ 3 ..... 2 1

"اب بہت دیر ہو چکی ہے' ڈی اے۔" فارس کی آواز میں کہا گیا اور لائن مردہ ہو گئی۔ زمر کی رنگت دہکنے لگی تھی۔ اس نے فون پرس میں ڈالا اور لفٹ کے دروازے کو دیکھنے لگی۔ دل و دماغ میں طوفان برپا تھے۔

1 سے 6 ہوا اور پھر..... لفٹ ہنوز نیچے اتر رہی تھی۔ وہ چونکی۔ جلدی سے بٹنوں پہ ہاتھ مارا۔ دروازہ کھولنے کا بٹن دبایا۔ ایگزٹ۔ بار بار مگر بٹن مردہ تھے۔ لفٹ نیچے کا سفر کرتی جا رہی تھی۔ B1 اور پھر..... B2 ..... اور ایک دم وہ جھٹکے سے رک گئی۔ لفٹ کی بتی جلنے بجھنے لگی۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔

زمر نے پریشانی سے بار بار ایگزٹ دبایا' مگر لفٹ مردہ ہو چکی تھی۔ زمین سے دو منزل نیچے' وہ یقیناً" پارکنگ ایریا۔ وہ بھی تہ خانے کی اندھیر پارکنگ میں رکی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے لفٹ کے فون کی طرف لپکی' ریسیور کان سے لگایا اور کال کا بٹن دبایا۔ رابطہ ملنے کی ٹون پہ وہ جلدی سے بولی۔ "پلیز ہیلپ می' میں بی ٹو میں لفٹ میں ہوں' لفٹ جام ہو گئی ہے اور....."

"اور میں نے کہا نا' اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب

"آپ کی کسی عقل مندی کا فائدہ نہیں، مسز زمر!" وہ ہاشم تھا اور وہ بہت سکون سے کہہ رہا تھا۔ زمر سناٹے میں رہ گئی۔

"کتنے اعتماد اور ڈھٹائی سے اتنے ماہ آپ کورٹ میں میرے خلاف بولتی رہیں، آپ کو کیا لگا تھا؟ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا؟ میں تو سب کچھ ٹھیک کرنے جا رہا تھا۔ میں تو گلٹی تھا، مگر آپ کو انصاف چاہیے تھا۔ یو نو واٹ زمر، اب میں گلٹی نہیں ہوں۔ اب مجھے افسوس نہیں ہو رہا۔ اب میں جان گیا ہوں کہ میں نے تم لوگوں کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا جو تم ڈیزرو نہیں کرتے۔ تم سب کا یہی انجام ہونا چاہیے۔"

"فارس تمہیں جان سے مار دے گا، ہاشم۔ مجھے باہر نکالو۔" وہ پھٹی ہوئی آواز میں چلائی تھی۔

"فارس کی جان ہی تو لے رہا ہوں۔ یہ اوپر کونے میں کیمرہ دیکھ رہی ہو؟ سی سی ٹی وی کیمرہ؟" زمر نے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ سر اوپر اٹھایا۔ "اس میں تمہاری فوٹیج بنتی جائے گی۔ تمہیں مرنے میں ابھی ایک یا سوا ایک گھنٹہ لگے گا۔ تمہارے مرنے کے بعد میں یہ فارس کو دے دوں گا، وہ اسے روز دیکھے گا، اور وہ اس کو دیکھ دیکھ کے پاگل ہو جائے گا، مگر اب مجھے افسوس نہیں ہو گا۔ وہ اسی قابل ہے۔"

"اللہ پوچھے گا تم سے ہاشم۔" اس نے ریسیور واپس پٹخا اور اپنا موبائل نکالا۔ موبائل پہ نو سگنل نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کی سم کو ڈس ایبل کر چکے تھے۔ اس اسے واپس بھیجنے کی کوشش کی، ایمرجنسی کال کرنے کی کوشش کی۔ سب بے سود۔ موبائل ناکارہ ہو چکا تھا۔

وہ اسے پرس سمیت نیچے فرش پہ رکھے دروازے تک آئی اور اسے پیٹنے لگی۔ "کوئی ہے؟ ہیلپ می۔ کوئی ہے؟ مجھے باہر نکالو۔" دونوں ہاتھوں سے وہ بار بار دروازہ بجا رہی تھی، بلند آواز میں چلا رہی تھی، مگر کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ تاریک سنسان پارکنگ ایریا میں۔ سطح زمین سے کئی فٹ اندر۔ آہنوں سے ڈھکے ایک ڈبے میں وہ مقید تھی اور اس سے دو منزلیں اوپر، زمین پہ ٹہلتے لوگوں کو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ یہاں ہے۔

"کوئی ہے؟ پلیز مجھے کوئی باہر نکالے۔" گھٹن سے اس کو پسینے آ رہے تھے۔ اس کا سانس بوجھل ہو رہا تھا۔ مگر وہ پوری قوت سے چلا رہی تھی۔ آنکھ سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

"فارس، آجاؤ۔ پلیز آجاؤ۔ فارس پلیز۔۔۔" آواز لڑکھڑا رہی تھی، دل ڈوب رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ ابھی ابھی گھر آیا تھا اور حنین جو اسے بتا رہی تھی، وہ اس کے قدموں سے زمین کھینچ لینے کے لیے کافی تھا۔ لمحے بھر میں ذہن میں سارے پزل کے ٹکڑے آپس میں مل گئے تھے۔ شہری۔۔۔ پولیس۔۔۔ اس کا نو سگنل دیتا فون۔۔۔ وہ بے اختیار باہر کو بھاگا۔ فون آن کر کے دیکھا تو اب سگنل آ رہے تھے۔ اس نے تیزی سے زمر کا نمبر ڈائل کیا مگر آگے سے رابطہ ممکن نہیں کی ٹیپ چلنے لگی تھی۔ وہ چابی لیے باہر کو دوڑا۔

اسٹول پہ کھڑی حنین کے ہاتھوں سے پینٹ برش سب گر گیا تھا۔ وہ چند لمحے تو حق دق، شل سی کھڑی رہی، پھر ایک دم جست لگا کر نیچے اتری اور ننگے پیر باہر کو بھاگی۔

"ماموں! رکیں۔ میری بات سنیں۔"

وہ کار کا دروازہ کھول رہا تھا جب وہ تیزی سے آئی اور اس کا بازو تھام لیا۔ "ہٹو سامنے سے حنین۔" اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا، پورا جسم پسینے میں نہا رہا تھا، اور یوں لگتا تھا گویا جان نکل رہی ہو۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہ سب ہاشم نے کیا ہے، میں اسے جان سے مار دوں گا۔" وہ غرایا تھا۔

"کیا اس کو نہیں پتا ہو گا کہ آپ یہی کریں گے؟ اگر یہ سب اسی نے۔۔۔ یقیناً" "یہ سب اسی نے کیا ہے" "تو وہ آپ کے انتظار میں ہو گا، وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔" وہ کہنے کے ساتھ رو بھی رہی تھی، ابھی تک

اس کی کہنی تھام رکھی تھی۔

"تمہارا دماغ درست ہے؟ زمر مشکل میں ہے' زمر ٹھیک نہیں ہے اور تم کہتی ہو میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھا رہوں؟ ہٹو۔" اس نے بازو چھڑایا اور کار کا دروزاہ کھولا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" حنہ نے پوری قوت سے دروازہ واپس دھکیلا' فارس کی انگلیاں درمیان میں آگئیں' مگر اس نے دروازے کو دھکیلے رکھا۔

"اس طرح زمر تو نہیں ملیں گی۔ اس نے زمر کو کسی جگہ پہ بلایا تھا۔ جو آپ دونوں کے لیے یادگار ہے۔ اپنے گھر نہیں۔ ہاشم سے بعد میں نپٹ لیجیے گا' پہلے زمر کو ڈھونڈیں ماموں۔ زمر زیادہ اہم ہیں۔ ہر انتقام' ہر بدلے سے زیادہ اہم۔"

فارس نے آنکھیں بند کیں اور چند گہرے سانس اندر کھینچے۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے تو حنہ نے بھی دروازہ چھوڑ دیا۔

"کسی جگہ کا نام لیا تھا اس نے؟" وہ اب ذرا سنبھل کے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں' مگر ہم ان کے فون کی آخری جی پی ایس لوکیشن چیک کر سکتے ہیں۔" وہ تیزی سے اندر کو بھاگی۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ شاک میں' ملال میں۔ اس کو کیوں لگتا تھا کہ اب وہ لوگ مشہور ہو چکے ہیں' تو ہاشم ان کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟ وہ غلط تھا اور وہ غلط عورت کی حفاظت کر رہا تھا۔

سر جھٹک کے اس نے چند مزید گہرے سانس لیے اور اندر آیا۔ حنہ اوپر اپنے کمرے میں کمپیوٹر کے سامنے الجھی بیٹھی تھی۔ وہ اس کے کندھے کے پیچھے سے آکر جھکا اور اسکرین دیکھی۔

"انہوں نے زمر کے فون کی لوکیشن کلون کی ہوئی ہے۔ تقریباً" پچاس' پچپن' مختلف جگہوں پہ زمر کے فون کے سگنل اس وقت آرہے ہیں۔" اس نے خوف زدہ ہو کر فارس کو دیکھا۔ "اب کیا کریں؟"

وہ اب پہلے سے ٹھنڈا اور سنبھلا ہوا لگ رہا تھا۔ چند لمحے سوچتی آنکھوں سے اسکرین کو دیکھتا رہا' پھر سیدھا ہوا۔

"میں اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔"

"مگر کہاں؟" وہ فکرمندی سے بولی تھی۔

"ہاشم کے گھر!" اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ اب کی بار وہ غصے میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ صرف کچھ سوچ رہا تھا۔



بلڈنگ کی راہ داریوں میں چھایا دھواں اب ختم ہوتا جا رہا تھا۔ شوروغل کی آوازیں بھی ماند پڑ گئی تھیں۔ احمر کے فلیٹ کے اندر سیاہ مرغولے بھی بیٹھتے جا رہے تھے۔ ایک آدمی اس کے سر پہ کھڑا تفتیش کر رہا تھا' بے معنی سوالات جو صرف اس کو تھکانے کے لیے دو دن سے پوچھے جا رہے تھے' جبکہ باقی دونوں لاؤنج میں بیٹھتے تھے۔ (سعدی کی غیر موجودگی کا فارس اور حنہ نے نوٹس نہیں لیا؟)

یہ وہی وقت تھا جب ایک نے آواز سنی۔ کھانسنے کی مردانہ آواز۔

وہ ایک دم چونک کے بیٹھا۔ پستول نکال لیا۔ آواز ذرا بلند ہوئی۔ ایک فوراً" دروازے کی طرف آیا اور کان لگا کر سننا چاہا۔ مگر آواز باہر سے نہیں آرہی تھی' وہ اپارٹمنٹ کے اندر سے آرہی تھی۔ لاؤنج میں کھلتے گیسٹ باتھ روم کے دروازے کے پار۔

دوسرے نے آواز کا منبع پہلے ہی تلاش کر لیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں پستول پکڑ کر سینہ تانے دبے قدموں باتھ روم کی طرف جا رہا تھا۔ باتھ روم کے اندر کوئی کھانس رہا تھا۔ اور کھانسے ہی جا رہا تھا۔ اغواکار باتھ روم کے دروازے کے سامنے' پستول تانے رکا اور پیر سے دروازہ دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر سنک پہ جھکا نوجوان بری طرح کھانس رہا تھا۔ بار بار نل سے منہ پہ پانی ڈالتا' پھر کھانسنے لگ جاتا تھا۔ اغواکار کو چند لمحے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ گھر میں کیسے گھسا؟ اور اسے دیکھتے ہی گولی مار دینی چاہیے یا نہیں؟ مگر وہ نقاہت سے کھانس رہا تھا۔ اسے کوئی نہیں

ماری جاسکتی تھی۔ وہ تیزی سے آیا اور اسے شرٹ کی پشت سے دبوچ کر باہر کی طرف کھینچا۔

"ارے۔ کیا کر رہے ہو۔ کیا کر رہے ہو۔" وہ نوجوان چلایا تھا، مگر وہ پستول اس کی گردن سے لگائے ڈپٹ کر خاموش رہنے کا کہتا اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کر آگے لے جانے لگا۔ دوسرا ساتھی سامنے سے آگیا' اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ سعدی نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ "گولی مت چلانا۔ پلیز گولی مت چلانا۔ میں بیمار ہوں۔"

چند لمحوں بعد اسی اغواکار نے سعدی یوسف کو احمر شفیع کے ساتھ فرش پہ پھینکا تھا۔ ان کے سرغنہ نے بے یقینی سے نووارد کو دیکھا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں کو۔ "یہ کون ہے؟" اور احمر نے اس سے زیادہ بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ دھوئیں کے ساتھ اندر آگیا تھا۔ وہی ہے جس کو اس نے دو ہزار روپے دیے تھے۔" سرغنہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔ اس نے گریبان سے پکڑ کے سعدی کو کھڑا کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کے غرایا۔

"کون ہو تم؟"

سعدی نے باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھے۔

"میں احمر کا دوست ہوں۔ اس نے جو نوٹ دیے تھے' ان میں خون لگا تھا' میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ مگر اس سے پہلے میں نے ڈھائی گھنٹے پارکنگ ایریا میں بیٹھ کر تم لوگوں پہ نظر رکھی تھی اور تمہارا یہ ساتھی۔۔۔" اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ "کھانا لینے جب باہر نکلا تھا تو میں نے اس کی تصویر کھینچ لی تھی اور اپنے ایک دوست کو بھیجی تھی' اس نے اس کا شناختی کارڈ نکال دیا تھا مجھے اور وہاں پہ موجود پتے کے خانے میں تمہاری مالکن صاحب زادی صاحب کے ایف ٹین والے گھر کا پتا لکھا تھا اور چونکہ میں بہت مشہور ہوں' تو مجھے پولیس کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں ایک نیوز اینکر کو کہہ آیا ہوں کہ اگر میں ایک گھنٹے تک اس سے رابطہ نہ کروں تو چینل پہ چلا دے کہ صاحب زادی صاحبہ نے مجھے اغوا کر کے مار

دیا ہے۔ مرنے سے پہلے قاتل کا نام بتا دینا قانونی طور پہ بہت اہمیت رکھتا ہے نا' اس لیے تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے۔ ہم دونوں کو اپنی مالکن کے پاس لے چلو اور مجھے ان سے بات کرنے دو' ٹھیک!"

سنجیدگی سے کہتے جھٹکے سے گریبان چھڑایا۔ وہ تینوں ڈرائیور اور گارڈیل کے غنڈے ایک دوسرے کو تکنے لگ گئے تھے۔ پھر ایک آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ پیچھے موڑے۔ سعدی نے مزاحمت نہیں کی۔ چپ چاپ خود کو بندھواتا رہا۔ پھر وہ تینوں تیزی سے باہر نکل گئے۔

احمر ابھی تک بے یقینی سے اسے گھور رہا تھا۔ "اور تم پولیس کو' فارس کو' کسی کو نہیں لے کر آئے؟ کوئی اسلحہ' کوئی چیز ساتھ نہیں لائے؟"

"ریلیکس۔۔۔ میں اپنی زبان ساتھ لایا ہوں۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

"لعنت ہے تم پہ سعدی۔ وہ ہمیں مار دیں گے۔" وہ دبا دبا سا چلایا تھا۔

"بے فکر رہو' مجھے اغوا ہونے کی عادت ہے۔ میرا تجربہ اس فیلڈ میں تم سے زیادہ ہے۔ اس لیے چپ کر کے انتظار کرو۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے گھڑی کو دیکھا۔ وہ اب بھی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ لمحہ لمحہ ریت کی مانند پھسل رہا تھا۔



زمر لفٹ میں ادھر ادھر ٹہل کر' دروازے پہ ہاتھ مار مار کے اب تھک چکی تھی۔ وہ دروازے کے بالکل ساتھ ٹھنڈے فرش پہ اکڑوں بیٹھ گئی تھی اور بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے تھے۔ ذرا ذرا وقفے سے وہ مٹھی سے دروازہ بجاتی تھی۔

"کوئی ہے؟ کھولو اسے۔ مجھے باہر نکالو۔" آواز بیٹھ گئی تھی اور آنسو چہرے پہ لڑھک لڑھک کر خشک ہو چکے تھے اور اپنے نشان چھوڑ گئے تھے۔ وہ بار بار ذہن سے اپنے دیے گئے خیال کو جھٹکتی تھی۔ ہاں اسے دمہ تھا' مگر آج وہ کوئی اٹیک خود پہ نہیں ہونے دے گی۔ وہ چند گھنٹے گزار لے گی اور صبح تک کوئی اسے نکال ہی لے گا۔ ہاشم اس کی موت کو حادثاتی دکھانا چاہتا ہے تو اب بھی تو نہیں اڑائے گا نا اسے۔ بس چند گھنٹے اور۔۔۔

ٹپ۔۔۔ ٹپ۔۔۔ کوئی عجیب سی آواز تھی۔ جس پہ اس نے چونک کے گردن گھمائی۔ آگے پیچھے دائیں بائیں۔۔۔ ہر طرف دیکھا۔ یہ کس شے کی آواز تھی؟ پھر گردن اٹھائی تو منہ کھل گیا۔ لفٹ کے اوپر' کسی ننھے سے سوراخ سے پانی کی باریک سی دھار نیچے گر رہی تھی۔ زمر کی نگاہوں نے دھار کا نیچے تک تعاقب کیا۔ وہ لفٹ کے فرش پہ پانی گرا رہی تھی۔

ایک گھنٹہ لگے گا تمہیں مرنے میں! اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ ایک گھنٹے میں وہ لفٹ پانی سے بھر جائے گی۔ وہ اسے ایک زندہ انسان کا آب زیدان بنانے جا رہا تھا۔ وہ اسے ڈبو کے مارنا چاہ رہا تھا۔ او خدایا۔ وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور پھر سے دروازہ پیٹنے لگی۔

"مجھے باہر نکالو۔ پلیز کوئی ہے۔۔۔ پلیز میری مدد کرو۔" اس دفعہ آواز میں خوف اور وحشت تھی۔

اندھیرے آفس میں بیٹھا ہاشم سنجیدگی سے اسکرین پہ نظر آتی فوٹیج کو دیکھ رہا تھا۔ پانی نے فرش کو گیلا کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ لڑکی اب بدحواس ہو رہی تھی۔

"یہ مرنے کا کتنا شان دار طریقہ ہو گا' فارس غازی! ایکوریم میں مرنا۔" اس نے زیر لب تبصرہ کیا۔ رئیس نے صرف ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی اور اپنا کام کرنے لگا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

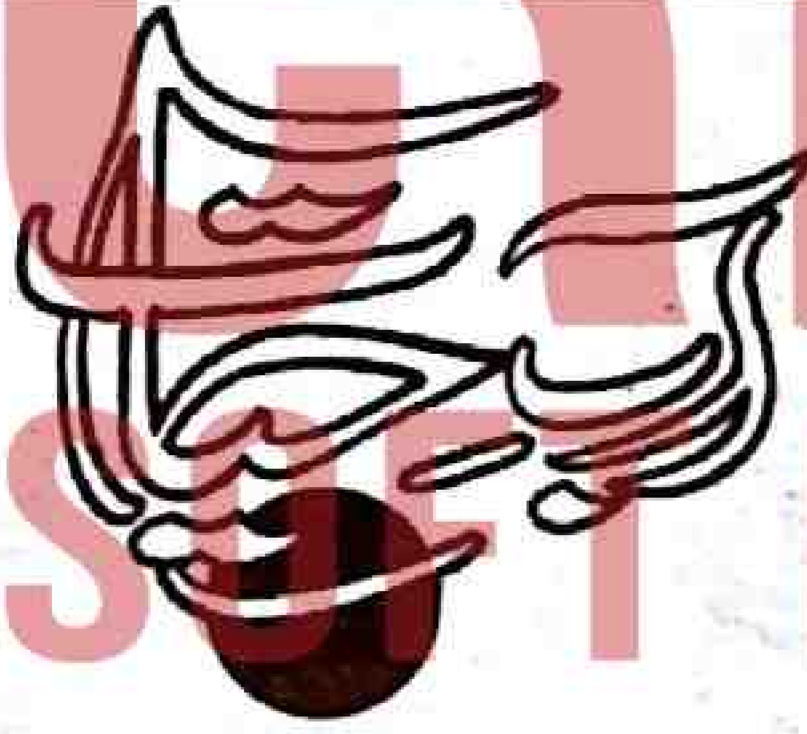
معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں ۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

Aanchal Digest November 2016

October 29, 2016



عمیرہ احمد



آبِ حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایئررنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں' جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈکوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی' اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہوکر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

"چوبیسویں قسط"

جبریل نے ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے شخص کو بغور دیکھا۔ وہ اس سے چند سال بڑا لگتا تھا۔ ایک بے حد مناسب شکل و صورت کا بے حد سنجیدہ نظر آنے والا مرد جو کلین شیوڈ تھا۔ حالانکہ جبریل کے ذہن میں اس کا جو خاکہ تھا وہ ایک داڑھی والے مرد کا تھا۔

ویٹران کے سامنے کافی رکھ کر چلا گیا تو احسن سعد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"میرے بارے میں آپ یقیناً بہت کچھ سن چکے ہوں گے میری سابقہ بیوی سے۔" اس کے لہجے میں ایک عجیب سی تحقیر اور یقین تھا' اور ساتھ ہونٹوں پر ابھر آنے والی ایک طنزیہ مسکراہٹ بھی۔ جبریل نے کچھ ایسا ہی جملہ اس میسج میں پڑھا تھا جو احسن سعد نے فون کالز پر اس سے رابطہ کرنے پر ناکامی پر اس کے لیے چھوڑا تھا۔

"مجھے اپنی سابقہ بیوی کے بارے میں تمہیں کچھ بتانا ہے۔"

چھ گھنٹے آپریشن تھیٹر میں کھڑے رہنے کے بعد اس کاغذ پر لکھی وہ تحریر پڑھتے ہی جبریل کا دماغ پل بھر کے لیے گھوم کر رہ گیا تھا۔ جس ریسپشنسٹ نے ڈاکٹر احسن سعد کا وہ پیغام جبریل سکندر کے لیے نوٹ کیا تھا اس نے وہ چٹ جبریل کو دیتے ہوئے بے حد عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا' وہ ایک بے حد اہانت آمیز فقرہ تھا اور اسے پڑھنے اور سننے دیکھ کر کوئی بھی جبریل سکندر کے حوالے سے عجیب سے احساسات کا شکار ہوتا' اس کے باوجود کہ اس اسپتال میں جبریل بے حد "صاف ستھرا ریکارڈ" رکھنے والے چند نوجوان ڈاکٹرز میں سے ایک تھا۔

"آر یو شیور' دس از فار می (آپ کو یقین ہے کہ یہ میرے لیے ہے)" جبریل ایک پاکستانی نام دیکھنے کے باوجود اس پیغام کو پڑھ کر اس ریسپشنسٹ سے پوچھے بغیر رہ نہیں سکا' نہ وہ احسن سعد کو جانتا تھا نہ کسی سابقہ بیوی کو۔۔۔ اور یہ شخص اس سے ایمرجنسی میں ملنا چاہتا تھا۔ اسے لگا کوئی غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔

"اوہ آیا آئی ایم پریٹی شیور!" اس ریسپشنسٹ نے جواباً کہا۔

جبریل الجھے ذہن کے ساتھ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے گیا تھا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے وہیں کھڑے کھڑے احسن سعد کے اس نمبر پر کال کی جو اس چٹ پر لکھا ہوا تھا پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ یوں جیسے وہ اسی کے انتظار میں تھا اور جبریل کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے جبریل کا نام لیا۔ ایک لحہ کے توقف کے بعد جبریل نے یس کہا۔

"مجھے آپ سے فوری طور پر ملنا ہے' میں کچھ دن کے لیے یہاں ہوں اور پھر چلا جاؤں گا۔" احسن سعد نے جلدی سے کہا۔

"مگر آپ مجھ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتا۔"

چٹ کے اس پیغام کے باوجود جبریل پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

"میں عائشہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" احسن سعد کے جملے پر جبریل کا ذہن بھک سے اڑ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عائشہ کا شوہر اس سے رابطہ کرے گا۔۔۔ اس نے احسن سعد کا نام نہ نساء سے سنا تھا نہ ہی عائشہ سے اور نہ ہی اسفند کی تدفین کے موقع پر کسی سے' جہاں وہ دس پندرہ منٹ رک کر نساء اور ڈاکٹر نورین سے ہی تعزیت کر کے آیا تھا۔ اگر احسن سعد وہاں تھا بھی تو ان دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی' اور اب یک دم بیٹھے بٹھائے وہ نہ صرف اس کو کال۔۔ کر رہا تھا' بلکہ کال کر کے وہ بات بھی عائشہ ہی کے بارے میں کرنا چاہتا تھا لیکن کیا بات۔۔۔؟

"عائشہ عابدین؟" جبریل نے بڑے محتاط لہجہ میں اس سے پوچھا' اس بار یہ یقین ہونے کے باوجود کہ وہ عائشہ عابدین ہی کا شوہر ہو سکتا تھا' اس کو فوری طور پر کوئی اور "عائشہ" یاد نہیں آئی تھی جس کا شوہر اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا اور رابطہ کرنے کی ضرورت تو یقیناً اسے عائشہ کے شوہر سے بھی متوقع نہیں تھی۔

"ہاں۔۔۔ ڈاکٹر عائشہ عابدین۔" دوسری طرف سے احسن سعد نے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں یہ سمجھ نہیں پارہا کہ آپ مجھ سے ملنا کیوں چاہ رہے ہیں؟" جبریل کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ "میں آپ کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔"

"آپ مجھے ٹھیک سے نہیں جانتے لیکن میری سابقہ بیوی کو ضرورت سے زیادہ جانتے ہیں' اسی لیے اسے وکیل فراہم کررہے ہیں۔۔۔ اس کی ضمانت کروا رہے ہیں۔"

جبریل خاموش رہا۔ احسن سعد کے طنز میں صرف تحقیر نہیں تھی۔ "باخبری" بھی تھی۔۔۔ وہ مکمل معلومات رکھنے کے بعد ہی اس سے رابطہ کررہا تھا۔

"میں آپ کے اسپتال سے زیادہ دور نہیں ہوں۔۔۔ اور میں زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا آپ کا کیونکہ آپ بھی مصروف ہیں اور فالتو وقت میرے پاس بھی نہیں ہے۔۔۔ لیکن آپ سے ملنا اس لیے ضروری ہے کیونکہ ایک مسلمان کے طور پر میں آپ کو اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جس کا اندازہ آپ کو نہیں ہے اور چاہتا ہوں آپ وہ غلطی نہ کریں' جو میں نے کی ہے۔"

وہ احسن سعد بہت لمبی بات کرتا تھا' اس کی بات سنتے ہوئے جبریل نے سوچا مگر وہ اس کی بات سننے سے بھی پہلے اس سے ملنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ وہ احسن سعد سے مل کر اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ عائشہ کے خلاف وہ کیس واپس لے لے جو اس نے فائل کیا تھا۔ اس وقت احسن سعد کے ساتھ ملنے کی جگہ طے کرتے ہوئے اسے یقین تھا کہ وہ اس شخص کو سمجھا لے گا' اس کے باوجود کہ اس نے نساء سے اس کے بارے میں بے حد خوف ناک باتیں سنی تھیں۔ اس کے باوجود کہ اس نے عائشہ عابدین کی وہ حالت دیکھی تھی مگر کہیں نہ کہیں جبریل سکندر اسے ایک خراب شادی اور خراب سے زیادہ بے جوڑ شادی ہی سمجھتا رہا تھا جس میں ہونے والی غلطیاں ایک طرفہ نہیں ہوسکتی تھیں۔ کہیں نہ کہیں ایک مرد کے طور پر اس کا یہ خیال تھا کہ ساری غلطیاں احسن سعد کی نہیں ہوسکتیں' کچھ خامیاں عائشہ عابدین میں بھی ہوں گی۔۔۔ کہیں نہ کہیں جبریل سکندر یہ جاننے کے بعد کہ احسن سعد کی فیملی بے حد مذہبی تھی' ان کا طرف دار تھا۔ اس کا خیال نہیں اسے یقین تھا کہ وہ اتنے سخت نہیں ہوسکتے جتنا اس نے ان کے بارے میں سنا تھا۔ کہیں نہ کہیں وہ طرف داری اس حافظ قرآن کے لیے بھی رکھتا تھا جو اس کی طرح قرآن جیسی متبرک شے کو اپنے سینے اور ذہن میں رکھتا تھا۔ وہ یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ جس دل میں قرآن محفوظ کیا گیا ہے' وہ اتنا سخت اور بے رحم ہوسکتا ہے۔ اسے یقین تھا جو بھی کچھ تھا اس میں غلط فہمیوں کا زیادہ قصور ہوگا' بری نیت اور اعمال کی نسبت اور وہ اسی خیال کے ساتھ احسن سعد سے ملنے آیا تھا' اس یقین کے ساتھ کہ وہ اسے سمجھالے گا اور اس جھگڑے کو ختم کروادے گا اور احسن سعد سے مصافحہ کرنے' کافی پینے کے لیے اس میز پر بیٹھنے تک اس کا یہ یقین قائم رہا تھا' جو احسن سعد کی گفتگو کے آغاز کے ساتھ ہی ہوا ہونا شروع ہوگیا تھا۔

"عائشہ نے کبھی مجھ سے آپ کے حوالے سے بات نہیں کی۔"

جبریل نے اس پر نظریں جمائے نرم لہجے میں کہا۔ احسن سعد قہقہہ مار کر ہنسا' جبریل اپنی بات مکمل نہیں کرسکا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی گفتگو میں ہنسنے والی کیا بات تھی۔

"میں نہ تو بے وقوف ہوں' نہ ہی بچہ۔" اس نے اپنے قہقہے کے اختتام پر جبریل سے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم بے وقوف ہو اور نہ ہی بچے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں۔" جبریل نے جواباً "بڑے محتاط انداز میں کہا۔

"تو پھر مجھ سے بچوں جیسا برتاؤ نہ کرو۔" احسن سعد نے ایک بار پھر اس کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی آواز اب بلند تھی' ماتھے پر بل اور ہونٹ بھینچے ہوئے۔۔۔ اس نے کافی کے اس کپ کو ہاتھ سے دور دھکیل دیا

تھا جس سے کچھ دیر پہلے اس نے ایک گھونٹ لیا تھا۔ کافی چھلک کر میز پر گری تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اب مٹھیوں کی شکل میں بھنچے ہوئے میز پر تھے۔ لمحوں میں احسن سعد نے کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدلا تھا۔ وہ اب شدید غصے میں نظر آرہا تھا اور جبریل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان چند جملوں میں جن کا تبادلہ ان کے درمیان ہوا تھا ایسا کیا تھا جس نے اسے ایسا غضب ناک کردیا۔

"تم اس عورت کے Guaranter (ضامن) بنے ہوئے ہو اور تم مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ اس نے تم سے میرے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہا۔" اس کی آواز اب پہلے سے بھی زیادہ بلند ہوگئی تھی' آس پاس کی میزوں پر بیٹھے لوگوں نے گردنیں موڑ کر ان کو دیکھا۔ جبریل نے ایک نظر اطراف میں مڑتی گردنوں کو دیکھا پھر بے حد مدھم آواز میں اس سے کہا۔

"اگر تم اس آواز اور انداز میں مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو تو میں یہاں ایک منٹ بھی مزید ضائع نہیں کرنا چاہوں گا۔" جبریل نے کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنا والٹ جیب سے نکالا اور دوسرے ہاتھ کو فضا میں ذرا سا بلند کرکے ویٹر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اسے بل لانے کا اشارہ کیا۔ احسن سعد کو یک دم ہی احساس ہوا' وہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو غلط طریقے سے ہینڈل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"میں اپنے بیٹے کے قتل کی وجہ سے اس قدر فرسٹریٹڈ ہوں کہ.... آئی ایم سوری۔" وہ اگلے ہی لمحے گرگٹ کی طرح ایک بار پھر رنگ بدل گیا تھا۔ اب اس کی آواز ہلکی تھی۔ بھنچی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی پڑگئی تھیں اور وہ ایک ہاتھ سے اپنا ماتھا اور کنپٹیاں رگڑ رہا تھا۔ جبریل نے اس تبدیلی کو بھی اتنی ہی باریکی سے دیکھا تھا جتنی باریکی سے اس نے پہلی تبدیلی دیکھی تھی اور اس نے احسن سعد کی معذرت کو قبول کیا تھا۔

"تم میرے مسلمان بھائی ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس دھوکے سے بچالوں جو میں نے کھایا۔" اس کا اگلا جملہ جبریل کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ احسن سعد اب بے حد نرم اور دھیمے انداز میں بات کررہا تھا' بے حد شائستگی کے ساتھ..... جبریل نے ٹوکے بغیر اسے بات کرنے دی۔

"میری بیوی ایک بدکردار عورت ہے..... جس طرح اس نے تمہیں الو بنایا ہے اپنی مظلومیت استعمال کرکے..... اسی طرح تم سے پہلے درجنوں کو بنا چکی ہے۔ وہ کسی بھی مرد کو منٹوں میں اپنی مٹھی میں کرکے انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں عائشہ کے لیے اتنا زہر موجود تھا کہ جبریل دم بخود رہ گیا تھا' وہ جن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا' وہاں طلاق بھی ہوتی تھی' بریک اپ بھی مگر کوئی اپنی بیوی کے بارے میں اس طرح کی گفتگو نہیں کرتا تھا جس طرح کی گفتگو احسن کررہا تھا۔

"میرا عائشہ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا اور میں سمجھ نہیں پارہا کہ تمہاری باتوں کو الزامات سمجھوں یا غلط فہمی؟" جبریل مداخلت کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"یہ حقائق ہیں۔" احسن نے جواباً" کہا۔

"جو بھی ہے مجھے ان میں دلچسپی نہیں۔ عائشہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے اور میں نے صرف اس لیے اس کی مدد کی کیونکہ اس کی بہن میری کلاس فیلو تھی۔" احسن نے اس کی بات کاٹی "تم اس کی بہن کو جانتے ہوگے اس عورت کو نہیں..... اس فاحشہ اور حرافہ کو نہیں....."

"زبان کو لگام دو....." جبریل کا چہرہ اور کانوں کی لویں بیک وقت سرخ ہوئی تھیں' وہ احسن سے اس طرح کے الفاظ کی توقع نہیں کررہا تھا۔

"تم اگر اس عورت کو جانتے ہوتے تو تمہیں ان الفاظ پر کبھی اعتراض نہ ہوتا۔ وہ اس سے زیادہ گندے الفاظ کی مستحق ہے۔" احسن کی زبان ویسے ہی چلتی رہی تھی۔

"وہ تمہاری بیوی رہ چکی ہے' تمہارے ایک بچے کی ماں ہے۔ وہ کم از کم تم سے یہ الفاظ ڈیزرو نہیں کرتی۔ بیوی بری ہو سکتی ہے' ماں بھی۔۔۔ مگر عورت کی عزت ہوتی ہے نا۔۔۔ اتنی عزت تو دکھاؤ اس کے لیے۔" جبریل بے حد ٹھنڈے مزاج کا تھا' لیکن جو "گفتگو" وہ سن رہا تھا وہ اس جیسے ٹھنڈے مزاج کے شخص کو کھولانے کے لیے بھی کافی تھی۔

"جو عورت بیوی رہ چکی ہو اس کی کیا عزت۔" احسن سعد نے جواب نہیں دیا تھا' اپنی ذہنیت کو اس کے سامنے ننگا کر کے رکھ دیا تھا۔

"Then I Pity on You' مجھے تم پر ترس آرہا ہے۔

اور اس عورت پر بھی جو تمہاری بیوی رہی۔" جبریل نے بے حد سرد لہجے میں اس سے کہا تھا' اسے اندازہ ہو گیا تھا وہ غلط شخص کو سمجھانے بیٹھا تھا۔

"اس سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں پھر تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟" احسن سعد نے جواباً" اسے ایک جھلسانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ "تم اسے جانتے ہی کتنا ہو کہ ایک شوہر کی رائے کو رد کر رہے ہو؟"

"میں اسے سولہ سال کی عمر سے جانتا ہوں' اسے بھی۔۔۔ اس کی فیملی کو بھی۔۔۔ اور وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی اور ہے۔۔۔"

احسن سعد کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزرا تھا۔

"سو آئی واز رائٹ' اٹ واز این اولڈ افیئر۔" (اس کا مطلب ہے میں ٹھیک سمجھا تھا۔ یہ ایک پرانا افیئر ہے)

"شٹ اپ۔ یو آر سک۔" (بکواس بند کرو۔ پاگل ہو تم۔)

جبریل کو اب اپنے سر میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ تھوڑی ہی دیر میں احسن سعد کے ساتھ اسی کی طرح گالم گلوچ پر اتر آئے گا۔۔۔ وہ شخص کسی کو بھی مشتعل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ کسی کو بھی پاگل کر سکتا تھا۔

"تم مجھ سے کس لیے ملنے آئے ہو؟" جبریل نے اس بل جیکٹ کے اندر بل کی رقم رکھتے ہوئے بے حد بے زاری سے کہا جو ویٹر بہت پہلے رکھ کر گیا تھا' یہ جیسے احسن سعد کے لیے اشارہ تھا کہ وہ وہاں سے جانا چاہتا ہے۔

"میں تمہیں صرف اس عورت کے بارے میں بتانے آیا تھا کہ۔۔۔" جبریل نے بے حد درشتی سے اس کی بات کاٹی "اور میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں اس کے یا اس کے کردار کے بارے میں کچھ بھی سننے میں۔۔۔ بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں ہوں کیونکہ وہ کیا ہے' کیسی ہے' یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔"

"پھر تم اس عورت کو سپورٹ کرنا بند کرو۔" احسن سعد نے جواباً" اس سے کہا تھا۔

"میں اسے اس لیے سپورٹ کر رہا ہوں کیونکہ کوئی ماں اپنی اولاد کو نہیں مار سکتی۔۔۔ لاپروا تھی تب بھی اس لاپروائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس اولاد کو مارنا چاہتی تھی اور اس کے خلاف قتل کا کیس کر دیا جائے۔" جبریل اب بے حد درشت ہو رہا تھا۔ یہ شاید احسن کا رویہ تھا' جس نے اس کا سارا لحاظ منٹوں میں غائب کر دیا تھا۔

"تم پہلے یہ طے کرو کہ تمہیں عائشہ سے نفرت ہے کیوں؟ اس کے عورت ہونے کی وجہ سے؟ بیوی ہونے کی وجہ سے؟ ہلکے کردار کی ہونے کی وجہ سے یا اپنے بیٹے کو مارنے کے شبہ کی وجہ سے۔۔۔ تم بیٹھ کر پہلے طے کرو کہ تمہاری اتنی گہری نفرت کی وجہ ہے کیا؟" جبریل اس سے کہتا گیا تھا۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" احسن سعد نے درشتی سے کہا۔ "میں تم سے سائیکالوجی پڑھنے نہیں آیا۔"

جبریل نے سر ہلایا۔ "یقیناً" کبھی بھی۔ میں بھی تم سے اخلاقیات پڑھنے نہیں آیا۔ تم مسلمان ہو' بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ جس عورت کو طلاق دے دی گئی ہو' اس کے حوالے سے کیا ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں اور اس میں کم از کم یہ ذمہ داری شامل نہیں ہے کہ تم ہر موڑ کے سامنے بیٹھ کر اس پر کیچڑ اچھالو۔"

"تم مجھے میرا دین سکھانے کی کوشش مت کرو۔" احسن سعد نے اس کی بات کاٹ کر بے حد تنفر سے کہا تھا۔ "میں حافظ قرآن ہوں اور تبلیغ کرتا ہوں۔ درجنوں غیر مسلموں کو مسلمان کرچکا ہوں۔ تم مجھے یہ مت بتاؤ کہ میرا دین مجھ پر عورتوں کے حوالے سے کیا ذمہ داری عائد کرتا ہے اور کیا نہیں۔ تم اپنے دین کی فکر کرو کہ ایک نامحرم عورت کے ساتھ افیئر چلا رہے ہو اور مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں اپنی سابقہ آوارہ بیوی کی شان میں قصیدے پڑھوں۔"

وہ بات نہیں کررہا تھا۔ زہر اگل رہا تھا۔ وہ جبریل کی زندگی میں آنے والا پہلا تبلیغی تھا جس کی زبان میں جبریل نے مٹھاس کی جگہ کڑواہٹ دیکھی تھی۔

"تمہاری تصویریں میں نے شادی کے بعد بھی اس کے لیپ ٹاپ میں دیکھی تھیں اور تب اس نے کہا تھا تم اس کی بہن کے دوست ہو' تمہارا اور اس کا کوئی تعلق نہیں' لیکن میں غلط نہیں تھا' میرا شک ٹھیک تھا۔ کوئی لڑکی بہن کے بوائے فرینڈ کی تصویریں اپنے لیپ ٹاپ میں جمع کرکے نہیں رکھتی۔" احسن سعد کہہ رہا تھا اور جبریل دم بخود تھا۔ "اور آج تم نے بتادیا کہ یہ افیئر کتنا پرانا تھا۔۔۔ اسی لیے تو اس عورت نے جان چھڑائی ہے میرے بیٹے کو مار کر۔"

اس کی ذہنی حالت اس وقت جبریل کو قابل رحم لگ رہی تھی۔ اتنی قابل رحم کہ وہ بے اختیار کہنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

"احسن! اس نے تمہارے بیٹے کو نہیں مارا۔۔۔ وہ سرجری میں ہونے والی ایک غلطی سے مارا گیا۔" اس کی زبان سے وہ نکلا تھا جو شاید اس کے لاشعور میں تھا اور جس سے وہ خود نظریں چراتا پھر رہا تھا۔ احسن کو اس کا جملہ سن کر کرنٹ لگا تھا اور جبریل پچھتایا تھا۔۔۔ وہ ایک برا دن تھا اور اس برے دن کا وہ ایک وہ بدترین وقت تھا۔

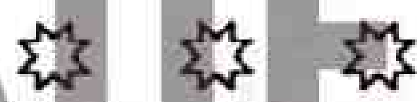
"تم کیسے جانتے ہو یہ؟" احسن نے سرسراتی ہوئی آواز میں اس سے کہا تھا۔

"کیونکہ میں اس آپریشن ٹیم کا حصہ تھا۔" اس بار جبریل نے سوچ سمجھ کر کہا تھا۔ بدترین انکشاف وہ تھا جو ہوچکا تھا' اب اس کے بعد کی تفصیلات کا پتا چلنا یا نہ چلنا بے معنی تھا۔ احسن دم سادھے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ساکت' پلکیں جھپکائے بغیر اس کے چہرے کا رنگ سانولا تھا سرخ یا زرد۔۔۔ چند لمحوں کے لیے جیسے' جبریل کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوگیا تھا۔

"وہ سرجری میں نے نہیں کی تھی احسن۔۔۔ میں اسسٹ کررہا تھا ڈاکٹر ویزل کو۔۔۔ اور مجھے یہ بھی یقین نہیں ہے کہ سرجری میں واقعی کوئی غلطی ہوئی تھی یا وہ میرا وہم تھا۔"

جبریل نے اس کے سامنے جیسے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی۔ احسن سعد وہاں اسے عائشہ عابدین سے بدگمان کرنے آیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے جواباً "جبریل سے کیا پتا چلنے والا تھا۔

وہ یک دم اٹھا اور وہاں سے چلا گیا تھا۔ جبریل سکندر وہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔



"ہیلو' بیک ان یو ایس اے۔" صبح سویرے اپنے فون کی اسکرین پر ابھرنے والی اس تحریر اور بھیجنے والے کے نام نے رئیسہ کو چند لمحوں کے لیے ساکت کیا تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ یہ توقع کررہی تھی کہ وہ واپس آنے کے بعد

اس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ حالات جو بھی تھے ان دونوں کے درمیان بہرحال ایسا کچھ نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے چھپنا پڑتا۔ "ویلکم بیک" کا ٹیکسٹ اسے بھیجتے ہوئے رئیسہ نے ایک بار پھر خود کو یاد دلایا تھا کہ زندگی میں ہونے والے اس پہلے بریک اپ کو اس نے دل پر نہیں لیا تھا۔ اور بار بار خود کو کرائی جانے والی یاددہانی ضروری تھی۔ درد ختم نہیں ہو رہا تھا لیکن کم ضرور ہو تا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تھمتا ضرور تھا۔

"یونیورسٹی جا رہی ہو؟" وہ نہا کر نکلی تو اس نے فون پر ہشام کا اگلا ٹیکسٹ دیکھا۔ اس نے ہاں کا جوابی ٹیکسٹ کرتے ہوئے اسے اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

"ملیں؟" اگلا ٹیکسٹ فوراً" آیا تھا۔ وہ کارن فلیکس کھاتے ہوئے میز پر پڑے فون پر چمکتے اس سوال کو دیکھتی رہی۔ کہنا چاہتی تھی۔ "اب کیسے؟" مگر لکھا تھا۔

"نہیں میں مصروف ہوں۔" کارن فلیکس حلق میں اٹکنے لگا تھا' وہ اب اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دل سنبھالنے کی ساری کوششوں کے باوجود اس کا سامنا مشکل ترین تھا۔ وہ روایتی لڑکی نہیں بننا چاہتی تھی۔ نہ گلے شکوے کرنا چاہتی تھی' نہ طنز۔ نہ جھگڑا۔ اور نہ ہی اس کے سامنے رونا۔ وہ بحرین بہرحال اس لیے نہیں گیا تھا کہ بچھڑ جاتا۔

فون کی اسکرین پر جواباً" ایک منہ چڑاتی تصویر آئی تھی یوں جیسے اس کے بہانے کا مذاق اڑا رہی ہو۔ رئیسہ نے اسے اگنور کیا اور اسے جواباً" کچھ نہیں بھیجا۔

پندرہ منٹ بعد اس نے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلنے پر گاڑی سمیت اسے وہاں پایا تھا۔ وہ شاید وہیں بیٹھے ہوئے اسے ٹیکسٹ بھیج رہا تھا' ورنہ اتنی جلدی وہ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسے سرپرائز دینا اچھا لگتا تھا اور رئیسہ کو یہ سرپرائز لینا۔ مگر یہ کچھ دن پہلے کی بات تھی۔

وہ اس کے بلائے بغیر اس کی طرف آئی تھی' دونوں کے چہروں پر ایک دوسرے کو دیکھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ ابھری' حال احوال پوچھا گیا' اس کے بعد رئیسہ نے اس سے کہا۔

"مجھے آج یونیورسٹی ضرور جانا ہے۔ کچھ کام ہے۔"

ہشام نے جواباً" کہا۔ "میں ڈراپ کر دیتا ہوں اور ساتھ کچھ گپ شپ بھی لگالیں گے۔ بڑے دن ہو گئے ہمیں ملے اور بات کیے۔"

رئیسہ نے اس سے نظریں چرالی تھیں۔ مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی ہشام نے اس کی طرف مڑتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"کیا؟" رئیسہ نے انجان بننے کی کوشش کی۔ یہ کہنا کہ میں ناخوش ہوں' دل شکستہ ہوں' کیونکہ تم مجھے امیدیں دلاتے دلاتے کسی اور لڑکی کو اپنی زندگی میں لے آئے ہو۔ یہ سب کم از کم رئیسہ کی زبان پر نہیں آسکتا تھا۔

"تمہارا موڈ آف ہے؟" وہ اب بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ موڈ کیوں آف ہو گا؟" رئیسہ نے جواباً" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں' یہی تو جاننا چاہتا ہوں۔" وہ الجھا ہوا تھا۔ "تم کچھ دنوں سے مکمل طور پر غائب ہو میری زندگی سے۔ بحرین سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی' لیکن تم کال ریسیو نہیں کرتیں' نہ ہی میسجز کا جواب دیتی ہو۔ ہوا کیا ہے؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے کیا وجہ ہو سکتی ہے میرے اس رویے کی؟" رئیسہ نے جواباً" اس سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" ہشام نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کہا تھا۔

"میں اب یہ سب ختم کرنا چاہتی ہوں۔" رئیسہ نے اس سے کہا۔

وہ چونکا نہیں 'اسے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر بولا۔

"یعنی میرا اندازہ ٹھیک ہے 'تمہارا موڈ واقعی آف ہے۔" رئیسہ نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنے بیگ سے انگوٹھی کی وہ ڈبیا نکالی اور گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھ دی 'ہشام کچھ بول نہ سکا۔ گاڑی میں خاموشی رہی 'پھر ہشام نے کہا۔

"تم نے انگیجمنٹ کی خبر پڑھ لی ہے؟"

"اس سے بھی پہلے مجھے یہی خدشہ تھا 'اس لیے اس خبر سے میں حیران نہیں ہوئی۔" رئیسہ نے مدہم آواز میں اس سے کہا 'بڑے ٹھنڈے انداز میں جس سے وہ ہمیشہ پہچانی جاتی تھی۔

"میں نے تم سے ایک کمٹمنٹ کی تھی رئیسہ! اور میں اپنا وعدہ نہیں توڑوں گا۔ نیوز پیپر میں آنے والی ایک خبر ہم دونوں کے درمیان دیوار نہیں بن سکتی 'اتنا کچا رشتہ نہیں ہے یہ۔" ہشام بڑی سنجیدگی سے کہتا گیا تھا۔

"نیوز پیپر کی خبر کی بات نہیں ہے ہشام! تمہاری فیملی کے فیصلے کی بات ہے۔۔۔ تم اب ولی عہد ہو۔۔۔ تمہاری ذمہ داریاں اور تم سے رکھی جانے والی توقعات اور ہیں۔۔۔"

وہ اس کی بات پر ہنسا تھا۔

"ولی عہد۔۔۔ میں ابھی تک نہ اپنے اس رول کو سمجھ پایا ہوں اور نہ ہی یہ اندازہ لگا پا رہا ہوں کہ میں اس منصب کے لیے اہل ہوں بھی یا نہیں۔۔۔ یہ پاور پالٹکس ہے۔۔۔ آج جس جگہ پر ہم ہیں۔۔۔ کل ہوں گے بھی یا نہیں۔۔۔ کوئی یقینی بات نہیں۔۔۔ اگر مجھے فیصلہ کرنا ہوتا تو میں کبھی یہ عہدہ نہ لیتا 'مگر یہ میرے باپ کی خواہش ہے۔" وہ اب سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

رئیسہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "غلط خواہش نہیں ہے۔۔۔ کون ماں باپ نہیں چاہیں گے 'اپنی اولاد کے لیے ایسا منصب۔۔۔ تم خوش قسمت ہو 'تمہیں ایسا موقع ملا ہے۔" وہ مدہم آواز میں کہتی گئی۔

"پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا۔" ہشام نے جواباً کہا۔ "لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ کوئی بھی چیز لاٹری میں نہیں ملتی۔ یہ ضروری ہے ولی عہد کے لیے کہ وہ ایک شادی شاہی خاندان میں کرے وہ بھی پہلی 'میری اور تمہاری شادی ہو چکی ہوتی تو اور بات تھی 'لیکن اب نہیں ہو سکتا کہ میں شاہی خاندان میں شادی سے انکار کروں۔ جنہوں نے میرے باپ کی بادشاہت کا فیصلہ کیا ہے 'انہوں نے ہی یہ فیصلہ بھی کیا ہے۔ مجھ سے اس بارے میں رائے نہیں لی گئی 'مجھے بتایا گیا تھا۔" وہ خاموش ہوا۔

"میں اندازہ کر سکتی ہوں اور اسی لیے تم سے کوئی شکایت نہیں کر رہی۔۔۔ میرے اور تمہارے درمیان ویسے بھی کون سے عہد و پیمان ہوئے تھے کہ میں تم کو کسی بات کے لیے الزام دوں۔۔۔ اسی لیے ختم کرنا چاہتی ہوں خود یہ سب کچھ 'تاکہ تم اگر کوئی obligation محسوس کر رہے ہو تو نہ کرو۔۔۔ اور میں ہرٹ نہیں ہوں۔" اس نے بات ختم کی 'توقف کیا پھر آخری جملہ بولا۔

"تم ہوئی ہو 'میں جانتا ہوں اور میں نادم بھی ہوں۔" ہشام نے اس کی بات کے اختتام پر کہا۔ "اور میں یہ سب ختم نہیں کرنا چاہتا 'نہ ہی میں تم سے اس لیے ملنے آیا ہوں۔ رئیسہ! میں تم سے بھی شادی کروں گا اور یہ بات میں نے اپنی فیملی کو بتا دی ہے اور انہیں اعتراض نہیں ہے۔"

وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی اتنا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"حمین بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ پتا نہیں اس کی زبان کالی ہے یا وہ ضرورت سے زیادہ عقل مند ہے۔" وہ اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

ہشام پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔ "وہ کیا کہتا ہے؟"

"یہی جو تم ابھی کہہ رہے ہو۔۔۔ دوسری شادی۔ وہ کہتا ہے کہ بادشاہ حرم رکھتے ہیں اور حرم کی ملکہ بھی کنیز ہی ہوتی ہے۔"

ہشام کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکا' یوں جیسے لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو' پھر اس نے جیسے مدافعانہ انداز میں کہا۔

"عربوں میں ایسا نہیں ہوتا' اگر بادشاہ کی چار بیویاں بھی ہوں تو بھی۔۔۔"

رئیسہ نے بڑی نرمی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے کسی بادشاہ سے شادی کرنے کی خواہش نہیں تھی' میں ہشام سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ تمہاری مجبوری ہو سکتی ہے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا' میری مجبوری نہیں ہے۔ میں محبت کرتی ہوں' لیکن دل کے ہاتھوں اتنی مجبور نہیں ہوں کہ تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہ سکوں۔"

اس کے لہجے میں وہی حقیقت پسندی تھی جس کے لیے ہشام اس کو پسند کرتا تھا مگر آج پہلی بار وہ عقل' وہ سمجھ بوجھ اسے بری لگی تھی۔

"اتنا کمزور رشتہ تو نہیں ہے ہمارا رئیسہ۔" اس نے رئیسہ کی بات کے جواب میں کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ بہت مضبوط ہے' لیکن میرا خیال غلط تھا۔ میری ممی کبھی بھی ایسی شادیوں کے حق میں نہیں تھیں اور میں سمجھتی تھی یہ bias ہے۔۔۔ لیکن آج مجھے احساس ہوا ہے کہ وہ ٹھیک کہتی ہیں۔۔۔ تہذیب کا فرق بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔" رئیسہ کہہ رہی تھی۔ "کبھی بھی بہت بڑا مسئلہ بن سکتا ہے جیسے ابھی ہوا۔۔۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ یہ سب پہلے ہو گیا ہے۔۔۔ بعد میں ہوتا تو۔۔۔" وہ رکی' ہشام نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

"میں تمہاری ممی سے متفق نہیں ہوں۔ محبت کا رشتہ ہر فرق سے بڑا اور طاقت ور ہوتا ہے۔"

"مانتی ہوں' لیکن وہ تب ہوتا ہے جب مرد کی محبت میرے بابا جیسی پیور ہو اور وہ میرے بابا کی طرح اپنے فیصلے پر قائم رہ سکے۔" رئیسہ نے کہا۔ اس نے سالار سکندر کا حوالہ دیا تھا' اگر محبت کے بارے میں اسے کوئی ریفرنس یاد تھا تو وہ اپنے ماں باپ کی آپس میں محبت ہی کا تھا اور وہ حوالہ ہشام نے بہت بار سنا تھا' لیکن آج پہلی بار اس نے ہشام کا موازنہ سالار سکندر سے کیا تھا اور علی الاعلان کیا تھا۔

"میں بھی اپنی محبت میں بہت کھرا ہوں اور تمہارے لیے لڑ سکتا ہوں۔" اس نے رئیسہ سے کہا تھا۔ اس کا وہ حوالہ اور موازنہ اسے پہلی بار شدید برا لگا تھا۔ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے۔ بحرین میں سر اور آنکھوں پر بٹھایا جا رہا تھا اور یہاں وہ اسے ایک "عام آدمی" کے سامنے چھوٹا گردان رہی تھی۔

"ہاں تم ہو محبت میں کھرے' لیکن تم لڑ نہیں سکتے ہشام! نہ مجھے زندگی میں شامل کرنے کے لیے' نہ ہی مجھے اپنی زندگی میں رکھنے کے لیے۔" رئیسہ نے اب گاڑی کا دروازہ کھول لیا تھا۔

"میں پھر بھی اپنے ماں باپ کو تمہارے ماں باپ کے پاس رشتے کے لیے بھیجوں گا اور یہ وقت بتائے گا کہ میں تمہارے لیے لڑ سکتا ہوں یا نہیں۔" گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے رئیسہ نے اسے کہتے سنا تھا۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ پیچھے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ہشام کے جملے کو سنتے ہوئے سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک ہفتہ جبریل سکندر کے لیے عجیب ذہنی انتشار لایا تھا۔ احسن سعد ایک بے حد ڈسٹرب کردینے والی شخصیت رکھتا تھا اور وہ اسے بھی ڈسٹرب ہی کرکے گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے اسفند کی سرجری سے متعلقہ انکشاف پر اب وہ کیا رد عمل ظاہر کرے گا۔ جس بات کا اسے خدشہ تھا' وہ اس کیس میں کسی بھی حوالے سے اپنی نامزدگی تھی' جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے طور پر اپنے کیریر کے اس اسٹیج پہ اپنے پروفیشن سے متعلقہ کسی اسکینڈل یا کیس کا حصہ بننا اپنے کیریر کی تباہی کے مترادف تھا' لیکن اب اس پر پچھتانے کا فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا' وہ ہوچکا تھا اور اسی ہفتے بے حد سوچ بچار کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ عائشہ کو بھی اس سرجری کے حوالے سے وہ سب کچھ بتادے گا' جو وہ احسن سعد کو بتاچکا تھا۔ ان حالات میں ایسا کرنا بے حد ضروری ہوگیا تھا۔

اس نے ہفتے کی رات کو اسے فون کیا تھا' فون بند کیا۔۔۔ جبریل نے اس کے لیے پیغام چھوڑا تھا کہ وہ اسے کال بیک کرے' آدھے گھنٹے کے بعد اس نے عائشہ کا نام اپنی اسکرین پر چمکتا دیکھا۔

کال ریسیو کرنے کے بعد ان کے درمیان حال احوال کے حوالے سے چند سیکنڈز کی گفتگو ہوئی' پھر جبریل نے اس سے اگلے دن ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔

"کس لیے ملنا چاہتے ہیں آپ؟" عائشہ نے بے تاثر انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

"یہ بات میں آپ کو سامنے بیٹھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔" اس نے جواباً کہا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے پوچھا کہ وہ کس وقت اس سے ملنا چاہتا ہے۔

"کسی بھی وقت جب آپ کے پاس وقت ہو۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

"گیارہ' بارہ بجے؟" عائشہ نے چند لمحے سوچ کر اس سے کہا۔

"ڈن۔" اس نے جواباً کہا اور عائشہ عابدین نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔

جبریل فون ہاتھ میں لیے اگلا جملہ سوچتا ہی رہ گیا۔ احسن سعد نے اس سے کہا تھا اس نے عائشہ عابدین کے لیپ ٹاپ میں اس کی تصویریں دیکھی تھیں' جبریل کو یاد نہیں پڑتا تھا اس کے اور عائشہ کے درمیان کبھی تصویروں کا تبادلہ ہوا ہو اور تصویروں کا کوئی تبادلہ تو اس کے اور نساء کے درمیان بھی نہیں ہوا تھا' لیکن نساء کے پاس اس کے گروپ فوٹوز ضرور تھے۔۔۔ مگر عائشہ ان تصویروں کو اپنے پاس اس طرح الگ کیوں رکھے ہوئے تھی۔۔۔ وہ گروپ فوٹوز ہوتے تو احسن سعد اس میں سے صرف جبریل کو پہچان کر اس پر اعتراض نہ کرتا' یقیناً" عائشہ کے پاس اس کی کچھ الگ تصویریں بھی تھیں اور وہ تصویریں وہ کہاں سے لے سکتی تھی۔۔۔؟ یقیناً" فیس بک سے جہاں وہ اس زمانے میں اپنی تصویریں باقاعدگی سے اپ لوڈ کیا کرتا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر حمین۔۔۔ وہ اس کے بارے میں بہت سوچنا نہیں چاہتا تھا' لیکن سوچتا چلا گیا۔ احسن سعد سے ملاقات کے بعد عائشہ عابدین کے لیے اس کی ہمدردی میں دس گنا اضافہ ہوگیا تھا۔

وہ اگلے دن ٹھیک وقت پر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑا تھا اور پہلی بیل پر ہی عائشہ عابدین نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ شاید پہلے ہی اس کی منتظر تھی۔ سیاہ ڈھیلے پاجامے اور ایک بلوئی شرٹ کے ساتھ فلپ فلاپس پہنے' اپنے بالوں کو ایک ڈھیلے جوڑے کی شکل میں سمیٹے' وہ جبریل کو پہلے سے بہتر لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کے حلقے بھی کم تھے۔ وہ بے حد خوب صورت تھی اور سولہ سال کی عمر میں بھی اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی کسی کی نظروں کو جکڑ سکتا تھا۔ جبریل کو احساس ہوا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس نے جبریل

کے ہاتھوں میں اس چھوٹے سے گلدستے کو دیکھا جس میں چند سفید اور گلابی پھول تھے اور اس کی ساتھ ایک کوکیز کا پیک۔ اس کا خیال تھا وہ دونوں چیزیں اسے تھمائے گا، لیکن وہ دونوں چیزیں اٹھائے اندر چلا گیا تھا۔
کچن کاؤنٹر پر اس نے پہلے پھول رکھے، پھر کوکیز کا وہ پیک اور پھر وہاں پڑے کافی کے اس مگ کو دیکھا جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ یقیناً اس کے آنے سے پہلے اسے پی رہی تھی۔ ایک پلیٹ میں آدھا آملیٹ تھا اور چند چکن ساسیجز۔ وہ ناشتا کرتے کرتے اٹھ کر گئی تھی۔
"میں بہت جلدی آگیا ہوں شاید؟" جبریل نے پلٹ کر عائشہ کو دیکھا جو اب اندر آگئی تھی۔
"نہیں، میں دیر سے جاگی ہوں۔ آج سنڈے تھا اور رات کو اسپتال میں ڈیوٹی تھی۔" اس نے جواباً" جبریل سے کہا۔
"آپ کا سنڈے خراب کر دیا میں نے۔" جبریل نے مسکراتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ وہ اب لاؤنج میں پڑے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ عائشہ کا دل چاہا اس سے کہے۔ اس کی زندگی میں ہر دن پہلے ہی بہت خراب تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی اور کچن کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔
"یہ آپ میرے لیے لائے ہیں؟" جبریل نے اسے پھول اٹھاتے ہوئے دیکھا۔
"جی!" اس نے جواباً" کہا۔
"اس کی ضرورت نہیں تھی۔" اس نے جبریل کو دیکھا، پھر انہیں ایک گل دان میں لگانے لگی۔
"یہ بھی جانتا ہوں۔" جبریل نے کہا۔ ان پھولوں کو اس گل دان میں لگاتے ہوئے عائشہ کو خیال آیا کہ وہ شاید دو ڈھائی سال کے بعد اپنے لیے کسی کے لائے ہوئے پھولوں کو چھو رہی تھی۔ آخری بار اس کے گھر آنے والے پھول اسفند کے لیے اس کے کچھ عزیز و اقارب کے لائے ہوئے پھول تھے۔ اس نے ان تکلیف دہ یادوں کو جیسے سر سے جھٹکنے کی کوشش کی۔
"آپ بریک فاسٹ کریں، ہم پھر بات کرتے ہیں۔" جبریل کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ سینٹر ٹیبل پر پڑی اون کی سلائیاں اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ بے حد دلچسپی کے ساتھ۔
"یہ آپ کا شوق ہے؟" اس نے اسکارف کے اس حصے کو چھوتے ہوئے کہا، جو آدھا بنا تھا۔
"وقت گزارنے کی ایک کوشش ہے۔" آملیٹ کی پلیٹ سے آملیٹ کا ایک ٹکڑا کانٹے کی مدد سے اٹھاتے ہوئے عائشہ نے جواب دیا۔
"اچھی کوشش ہے۔" جبریل نے مسکراتے ہوئے اون کی سلائیوں کو دوبارہ اس باکس میں رکھا جس میں وہ پڑے تھے۔
"آپ یہ کافی لے سکتے ہیں۔ میں نے ابھی بنائی تھی، پی نہیں..... میں اپنے لیے اور بنا لیتی ہوں۔" اس نے کافی کا مگ لا کر اس کے سامنے ٹیبل پر پڑے ایک میٹ پر رکھ دیا تھا، وہ خود دوبارہ ناشتا کرنے کچن کاؤنٹر کے پاس پڑے اسٹول پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔
"میرا خیال تھا آپ مجھے ناشتے کی بھی آفر کریں گی۔" جبریل نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔
"میں نے اس لیے آفر نہیں کی کیونکہ آپ قبول نہیں کرتے۔" اس نے ساسیجز کے ٹکڑے کرتے ہوئے جواباً" کہا۔
"ضروری نہیں۔" جبریل نے اصرار کیا۔
"آپ ناشتا کریں گے؟" ٹھک سے اس سے پوچھا گیا۔
"نہیں....." جبریل نے کہا اور پھر بے ساختہ ہنسا۔ "میں ناشتا کر کے آیا ہوں، اگر پتا ہوتا کہ آپ کروا سکتی ہیں تو

نہ کرکے آتا۔ Assumptions بڑی نقصان دہ ہوتی ہیں۔" اس نے کہا' عائشہ خاموشی سے اس کی بات سنتے ہوئے ناشتا کرتی رہی۔

"میں آپ کی کال کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اس توقع کے باوجود کہ آپ کال نہیں کریں گی۔" جبریل نے اس سے کہا۔ وہ کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔

عائشہ نے چکن سامبجز کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے اسے دیکھا۔ اسے ایک کاغذ پر لکھا ہوا سوری کا وہ لفظ یاد آگیا تھا جو وہ اسے ایک لفافے میں دے کر گیا تھا اور جسے دیکھ کر وہ بے حد الجھی تھی۔ وہ اس سے کس بات کے لیے معذرت خواہ تھا۔ کس چیز کے لیے شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود کوئی وضاحت کوئی توجیہہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اتنا الجھنے کے باوجود اس نے جبریل کو فون کرکے اس ایک لفظ کی وضاحت نہیں مانگی تھی۔ وہ اس شخص سے راہ و رسم بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ بار بار اس سے بات کرنا' اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ ہر بار اس کی آواز' اس سے ملاقات' عائشہ عابدین کو پتا نہیں کیا کیا یاد دلانے لگتا تھا۔ کیسا کیسا پچھتاوا اور احساس زیاں تھا جو اسے ہونے لگتا تھا اور عائشہ اپنے ماضی کے اس حصے میں نہیں جانا چاہتی تھی جہاں جبریل سکندر کھڑا تھا۔ وہ اس باب کو بند کرچکی تھی۔

جبریل نے اسے کچن کاؤنٹر کے پار اسٹول پر بیٹھے اپنی خالی پلیٹ پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں دیکھا' اس نے جبریل کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا یوں جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے جو کہنے آیا تھا' وہ کیسے کہے گا۔ اس وقت اس نے بے اختیار یہ خواہش کی تھی کہ کاش اس نے اس سرجری کے دوران ڈاکٹر ویزل کی وہ غلطی دیکھی ہی نہ ہوتی۔

"آپ کا وزیٹنگ کارڈ مجھ سے کھو گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں' وہ میں نے کہاں رکھ دیا تھا۔" وہ بولی تھی اور اس نے بے حد عجیب ایکسکیوز کی تھی۔ یعنی وہ اسے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ اس نے جبریل کا نمبر محفوظ نہیں کیا ہوا تھا۔

کچھ کہنے کے بجائے جبریل نے اپنی جیب سے والٹ نکال کر ایک اور وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اسے اون سلائیوں کے اس ڈبے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے گم نہ ہو شاید۔" عائشہ نے نظریں چرالی تھیں۔ وہ پلیٹیں اٹھاتے ہوئے انہیں سنک میں رکھ آئی۔

"آپ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔" اپنے لیے کافی بناتے ہوئے اس نے بالآخر جبریل کو بات یاد دلائی جس کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔

"احسن سعد مجھ سے ملنے آیا تھا۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جبریل نے اس سے کہا۔ اس کا خیال تھا وہ بری طرح چونکے گی۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ انتہائی غیر متوقع جواب تھا۔ جبریل چند لمحے بول نہیں سکا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ کافی کو اس انہماک سے بنا رہی تھی جیسے اس کی زندگی کا مقصد کافی کا وہ کپ بنانا ہی تھا۔

"اس نے مجھے کال کی تھی۔" اس نے جیسے جبریل کی خاموشی کو سمجھتے ہوئے مزید کہا۔

جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اب کیا کہے۔ اگر احسن سعد نے اسے کال کی تھی' جبریل سے ملاقات کے بعد تو یہ ممکن نہیں تھا کہ اس نے عائشہ کو اسفند کی سرجری کے حوالے سے اس کے اعتراف کے حوالے سے کچھ نہ کہا ہو۔ اور اگر اس نے عائشہ سے ذکر کیا تھا تو عائشہ اس وقت اتنے پرسکون انداز میں اس کے سامنے کیسے بیٹھی رہ سکتی تھی۔ احسن سعد نے جبریل کے کام کو مشکل سے آسان کردیا تھا' مگر اب اس کے بعد اگلا سوال جبریل کو سوجھ نہیں رہا تھا۔

وہ اب اپنا کافی کا مگ لیے اس کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

"اب آپ کو یہ تو پتا چل گیا ہو گا کہ میں کتنی گناہ گار اور قابل نفرت ہوں۔"

عائشہ عابدین کے لہجے میں عجب اطمینان تھا' یوں جیسے وہ خود پر ملامت نہیں' اپنی تعریف کر رہی ہو۔ جبریل اسے دیکھتا رہا۔ عائشہ عابدین کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تکلیف اور درد بھی نہیں جو جبریل نے ہر بار اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہ شرمندگی اور ندامت بھی نہیں جو ہر بار اس کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب کچھ بھی نہیں تھا اور اس کے جملے نے جبریل کے سارے لفظوں کو گونگا کر دیا تھا۔

"احسن نے آپ کو یہ بتایا کہ سرجری میں ـــ" جبریل کو پتا نہیں کیوں شبہ ہوا کہ شاید احسن نے اسے کچھ نہیں بتایا' ورنہ عائشہ عابدین کی زبان پر کچھ اور سوال ہونا چاہیے تھا۔

"ہاں!" اس یک لفظی جواب نے جبریل کو ایک بار پھر کچھ بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا' وہ اب اسے نہیں دیکھ رہی تھی' اس کافی کے مگ سے اٹھتی بھاپ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ یوں جیسے وہ ہاتھوں میں کوئی کرسٹل بال لیے بیٹھی ہو' جس میں اپنا مستقبل دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ماضی وہ تھا جسے وہ بھولنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی اور حال میں اسے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ زندگی کے اس حصے سے بس آنکھیں بند کر کے گزرنا چاہتی تھی' احسن سعد کی چلاتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"گالی ـــ گالی ـــ اور گالیاں ـــ" وہ فون کان سے لگائے کسی میکانکی انداز میں وہ گالیاں سن رہی تھی جو کئی سال اس کی زندگی کے شب و روز کا حصہ رہی تھیں اور وہ انہیں سنتے ہوئے اب بے حس ہو چکی تھی۔ ان برے لفظوں کا زہر اب اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑتا تھا۔ نہ اسے شرم محسوس ہوتی تھی نہ تذلیل' نہ ہتک' نہ غصہ' نہ پریشانی۔ طلاق کا کیس چلنے کے دوران' طلاق ہونے کے بعد اور اسفند کی کسٹڈی کے کیس کے دوران بھی احسن کا جب دل چاہتا تھا' وہ اسے اسی طرح فون کرتا تھا اور یہی سارے لفظ دہراتا تھا' جو اس نے اب بھی دہرائے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود اس کی کال نہ لینے کی ہمت نہیں کر پاتی تھی۔ نفسیاتی طور پر وہ اس قدر خائف تھی کہ اسے یوں لگتا تھا وہ اس کی کال نہیں سنے گی تو وہ اس کے گھر آجائے گا۔ وہ اس سے یہی کہتا تھا اور وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ امریکہ میں تھی۔ اس کی ایک کال پر پولیس احسن سعد کو کبھی اس کے گھر کے پاس پھٹکنے بھی نہ دیتی۔ لیکن عائشہ اتنی بہادر ہوتی تو اس کی زندگی ایسی نہ ہوتی۔ استحصال کی ایک قسم وہ بھی تھی جو اس نے اپنی شادی قائم رکھنے کے لیے' ایک اچھی بیوی اور اچھی مسلمان عورت بننے کی جدوجہد کرتے ہوئے سہی تھی۔ استحصال کی دوسری قسم وہ تھی جو اس نے اسفند کی زندگی میں باپ نام کی اس محرومی کو نہ آنے کے لیے سہی تھی' جو خود اس کی زندگی میں تھی۔

اسفند کے ایک کندھے میں پیدائشی نقص تھا' وہ اپنا بازو ٹھیک سے اٹھا نہیں پاتا تھا اور وہ Slow Learner (کند ذہن) تھا اور اس کے یہ دونوں "نقائص" احسن سعد اور اس کی فیملی کے لیے ناقابل یقین اور ناقابل معافی تھے۔ ان کی سات نسلوں میں کبھی کوئی بچہ کسی ذہنی یا جسمانی نقص کا شکار کبھی نہیں ہوا تھا۔ تو ان کے گھر میں اسفند کی پیدائش کیسے ہوئی؟ یہ بھی عائشہ کا قصور تھا۔ اس کے جینز کا' اس کے اعمال کا' وہ اس کا عذاب اور سزا تھی۔ احسن سعد اور اس کی فیملی کے لیے آزمائش کیوں بنا تھا۔ اور عائشہ کے کھوکھلے لفظ اب بالکل گونگے ہو گئے تھے۔ اسے بھی یقین تھا کہ اس کی اولاد کی یہ تکلیف اس کے کسی گناہ کا نتیجہ تھی' پر کون سا گناہ ـــ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اسے نہیں ملتا تھا اور اس معذور اولاد کے ساتھ اس نے احسن سعد کی اطاعت کی ہر حد پار کر لی تھی' صرف اس لیے کیونکہ اسے لگتا تھا کہ اس کے بیٹے کو باپ کی ضرورت تھی۔ وہ اکیلی اسے کیسے پالتی۔

وہ اسفند کی پیدائش کے بعد امریکہ گئی تھی اور یہاں احسن نے اسے رہائش پذیر ہونے کے لیے کہا تھا کیونکہ وہ معاشی طور پر اتنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتا تھا۔ عائشہ نے سوچے سمجھے بغیر اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع

کروا دیا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ احسن کو یک دم ایسے کون سے اخراجات نظر آنے لگے تھے جس کے لیے اس کا کام کرنا بھی ضروری تھا اور وہاں آنے کے ایک سال بعد اسے پتا چلا تھا کہ اس کے امریکہ آنے کے چند مہینے بعد ہی احسن نے پاکستان میں دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ اب اکثر پاکستان جاتا تھا اور عائشہ کو کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آچکی تھی۔ وہ انکشاف کسی نے اس کی فیملی کے سامنے کیا تھا جو احسن سعد کی دوسری بیوی اور اس کے خاندان کو جانتا تھا۔ عائشہ عابدین کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس خبر پر کس طرح کے ردعمل کا اظہار کرتی' یہ سب فلموں اور ڈراموں میں ہوتا تھا' مگر اس کے ساتھ جو ہوا تھا اس کے بعد اسے فلمیں اور ڈرامے بھی سچ لگنے لگے تھے۔

احسن سعد نے بے حد ڈھٹائی سے دوسری شادی کا اعتراف کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور چار شادیاں بھی کر سکتا ہے اور یہاں تو اس کے پاس ایک بے حد مضبوط وجہ تھی کہ اس کی بیوی اسے صحت مند اولاد نہیں دے سکتی تھی جو اس کی دوسری بیوی اسے دے گی۔

زندگی میں وہ پہلا لمحہ تھا جب عائشہ عابدین تھک گئی اور اس نے احسن سعد اور اس کی فیملی کے بجائے اپنی فیملی کی بات مانتے ہوئے اس سے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا' اور اس فیصلے نے احسن سعد کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اسے عائشہ عابدین سے ایسے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اسفند کے نام کچھ جائیداد تھی جو عائشہ کے نانا نے عائشہ کے نام کرنے کے بجائے جائیداد کی تقسیم کے دوران اس کے بیٹے کے نام گفٹ کی تھی اور احسن کی نظر میں عائشہ کی کچھ قدر و قیمت تھی تو اس کی بڑی وجہ یہی تھی۔ اسے عائشہ کے کردار پر شک تھا۔ بے عملی اور بے ہدایتی کی شکایت تھی' لیکن اس سب کے باوجود وہ عائشہ کو آزاد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مگر اس کا کوئی حربہ کارگر نہیں ہوا تھا۔

عائشہ کی طلاق کی پروسیڈنگ کے دوران پاکستان میں احسن سعد کی دوسری بیوی نے بھی شادی کے آٹھ ماہ بعد خلع کا کیس فائل کروا دیا تھا۔ احسن سعد اور اس کی فیملی نے اس کے بعد کچھ مشترکہ فیملی فرینڈز کے ذریعے مصالحت کی بے انتہا کوششیں کی تھیں مگر..... عائشہ کی فیملی نے ایسی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا' اور عائشہ اس سارے عرصے میں ایک کیچوے کی مانند رہی تھی' جو ہو رہا تھا وہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر جو بھی ہو رہا تھا' وہ خود نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تب بھی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ صحیح کر رہی تھی یا غلط۔ اللہ کے نزدیک اس کا یہ عمل گناہ تھا یا نہیں اور اگر وہ گناہ تھا تو وہ چاہتی تھی یہ گناہ کوئی اور اپنے سر لے لے لیکن اسے احسن سعد سے نجات دلا دے۔

جس دن اس کی طلاق فائنل ہوئی تھی' اس دن اس نے حجاب اتار دیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا اب وہ کتنی بھی نیکیاں کر لے' وہ اللہ کی نظروں میں گناہ گار رہے گی۔ احسن سعد نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ نہیں کی تھی' اس نے اسے اس دین سے بھی برگشتہ کر دیا تھا جس کی پیروکار ہونے پر عائشہ عابدین کو فخر تھا۔

"تمہارے یار کو بتا آیا ہوں تمہارے سارے کرتوت۔" احسن سعد نے فون پر دھاڑتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ "تم کیا پلان کر رہی ہو کہ میرے بیٹے کو مار کر تم اپنا گھر بساؤ گی' رنگ رلیاں مناؤ گی..... میں صرف تمہیں جیل نہیں بھیجوں گا' تمہارے اس یار کو بھی بھیجوں گا' جس نے میرے بیٹے کا آپریشن کر کے جان بوجھ کر اسے مارا اور اس نے خود اپنے منہ سے مجھے بتایا ہے۔"

وہ بکتا جھکتا بولتا ہی چلا گیا اور وہ سنتی رہی۔

"عائشہ.....!" جبریل کی آواز نے ایک بار پھر اسے چونکایا۔ اس کے ہاتھوں میں موجود کافی کے مگ سے اب بھاپ اٹھنا بند ہو چکی تھی۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ عائشہ نے سر اٹھا کر جبریل کو دیکھا۔ وہ اب اسے بتا رہا تھا کہ

اس آپریشن کے دوران کیا ہوا تھا۔ اور اسے یقین نہیں تھا' صرف اس کا اندازہ تھا کہ ڈاکٹر وریل سے اس آپریشن میں کچھ غلطیاں ہوئی تھیں۔ اور قصوروار نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ یہ اس کی بے وقوفی ہی تھی کہ وہ یہ انکشاف احسن سعد کے سامنے کر بیٹھا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔ احسن سعد آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

اس کی بات کے اختتام پر عائشہ کی زبان سے نکلنے والے جملے نے جبریل کو حیران کر دیا تھا۔ وہ اسی طرح پرسکون تھی' وہ اگر کسی شدید جذباتی ردعمل کی توقع کر رہا تھا تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ کسی غصے کا اظہار' کوئی ملامتی لفظ' کچھ بھی نہیں۔ وہ جواباً" اسے تسلی دے رہی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہو گا۔

"میں نے احسن کو بتا دیا ہے کہ میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو مانتے ہوئے کورٹ میں اسفند کے قتل کا اعتراف کر لوں گی۔"

اس کے اگلے جملے نے جبریل کا دماغ جیسے بھک سے اڑا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔" جیل کے ایک سنتری نے ـــ راہداری جتنی لمبی بیرک کی ایک دیوار کے ساتھ چادر زمین پر ڈال کر سوئے اس بوڑھے آدمی کو بڑی رعونت کے عالم میں اپنے جوتے کی ٹھوکر سے جگایا تھا۔ وہ ہڑبڑایا نہیں' ویسے ہی پڑا رہا اور لیٹے لیٹے اس نے آنکھیں کھول کر سر پر کھڑے اس سنتری کو دیکھا۔ اسے یقین تھا اسے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اس سے ملنے کون آسکتا تھا۔ پچھلے بارہ سالوں سے تو کوئی نہیں آیا تھا' پھر اب کون آئے گا۔

"ارے اٹھ۔۔۔ مرا پڑا ہے۔۔۔ سنا نہیں ایک بار کہ کوئی ملنے آیا ہے۔" سنتری نے اس بار کچھ زیادہ طاقت سے اسے ٹھوکر ماری تھی' وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"کون آیا ہے؟" اس نے سنتری سے پوچھا۔

"وہی میڈیا والے کتے۔" سنتری نے گالی دی۔

"سزائے موت کے قیدیوں سے انٹرویو کرنا ہے انہیں"

اس نے ایک بار پھر لیٹنے کی کوشش کی لیکن سنتری کے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کی حرکت نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ ان میڈیا والوں سے بے زار تھا اور این جی اووالوں سے بھی جو وقتاً" فوقتاً" وہاں سروے کرنے آتے تھے۔ ان کے حالاتِ زندگی جاننے' ان کے جرم کی وجوہات کریدنے' جیل کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے۔ وہ جیسے سرکس کے جانور تھے جنہیں ان کے سامنے پیش ہو کر بتانا پڑتا کہ انہوں نے جو کیا' کیوں کیا؟ کیا اب انہیں پچھتاوا تھا اور کیا انہیں اپنے گھر والے یاد آتے تھے؟

بے زاری کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اس سنتری کے پیچھے چلتا گیا جو اسے بیرک سے نکال کر ملاقاتیوں والی جگہ کے بجائے جیلر کے کمرے میں لے آیا تھا اور وہاں غلام فرید نے پہلی بار ان چار افراد کو دیکھا جن میں سے دو گورے تھے اور دو مقامی خواتین۔ وہ چاروں انگلش میں بات کر رہے تھے اور غلام فرید کے اندر داخل ہوتے ہی ان کے اور جیلر کے درمیان کچھ بات چیت ہوئی اور پھر جیلر اس سنتری کے ہمراہ وہاں سے چلا گیا۔

"غلام فرید؟" ایک عورت نے تصدیقی انداز میں اس سے پوچھا تھا۔ غلام فرید نے سرہلایا۔

"بیٹھو!" اسی عورت نے اشارے سے سامنے پڑی ایک کرسی پر اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

غلام فرید کچھ نروس ہوا تھا' لیکن پھر وہ جھجکتا' سکڑتا' سمٹتا ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ایک گورے نے اس کے بیٹھتے ہی ہاتھ میں پکڑے ایک فون سے اس کی کچھ تصویریں لی تھیں۔

جس عورت نے اس سے گفتگو کا آغاز کیا تھا وہ اب پنجابی میں اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کس جرم میں کب وہاں آیا تھا۔ غلام فرید نے رٹے رٹائے طوطے کی طرح اس کے ان دس بارہ سوالات کا جواب دیا تھا اور پھر انتظار میں بیٹھ گیا تھا کہ وہ اب ان بنیادی سوالات کے بعد ایک بار پھر سے اس کے جرم کو کرید نا شروع کریں گے پھر جیل میں اس کی زندگی کے بارے میں پوچھیں گے اور پھر۔
مگر اس کی توقع غلط ثابت ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کی زبانی اس کا نام، ولدیت، رہائش، جرم کی نوعیت اور جیل میں آنے کے سال کے بعد اس سے پوچھا تھا۔
"جیل سے باہر آنا چاہتے ہو غلام فرید؟" وہ گورا تھا مگر اس بے شستہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ غلام فرید کو لگا اسے سننے میں کچھ دھوکہ ہوا ہے۔
"جیل سے باہر آنا چاہتے ہو؟" اس آدمی نے جیسے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے تھے۔
"جیل سے باہر۔؟" غلام فرید نے سوچا۔ ایک لمحہ کے لیے کیا وہ جیل سے باہر آنا چاہتا تھا؟ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ جو اس آدمی کے لیے جیسے غیر متوقع تھا۔

"کیوں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔
"باہر آکر کیا کروں گا؟" غلام فرید نے جواباً کہا تھا۔ "نہ کوئی گھر ہے نہ خاندان اور اس عمر میں محنت مزدوری نہیں ہوتی۔ جیل ٹھیک ہے، یہاں سب ملتا ہے۔" غلام فرید نے کہا تھا اس نے سوچا تھا۔ اب سروے کے سوال بدل گئے تھے۔
"اگر تمہیں ڈھیر سارا پیسہ، ایک شان دار سا گھر اور ایک بیوی بھی مل جائے تب بھی باہر آنا نہیں چاہتے؟ زندگی نئے سرے سے شروع کرنا نہیں چاہتے؟" اس بار دوسری عورت نے اس سے کہا تھا۔
بہت سارا پیسہ۔۔۔؟ غلام فرید نے سوچا۔ بہت سارے پیسے کی خواہش نے ہی تو مسئلہ پیدا کیا تھا اس کے لیے۔۔۔ اسے پتا نہیں کیا کیا یاد آیا تھا اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی جب وہ سوچتا تھا تو اسے سب یاد آجاتا تھا۔ اپنی کڑوی زبان والی بیوی جس کے عشق میں وہ گرفتار تھا اور جو کبھی شہد جیسی میٹھی تھی۔۔۔ اور وہ بچے۔۔۔ ایک دو سال کے وقفے سے باری باری پیدا ہونے والے نو بچے۔ جن میں سے چند بروں کے علاوہ اسے اب کسی کا نام اور شکل یاد نہیں تھی۔ وہ مولوی جو اس کا دشمن تھا اور وہ سود جو ختم ہی نہیں ہوتا تھا، اسے آج بھی وہ رقم یاد تھی جو اس نے سود پر لی تھی اور وہ رقم بھی جو بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک دن وہ اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھا تھا۔
"سالار سکندر یاد ہے تمہیں؟" اس کو خاموش دیکھ کر اس گورے نے غلام فرید سے پوچھا تھا۔
غلام فرید کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت آئی تھی۔ جھریوں سے بھرے چہرے، بڑھے بالوں اور بے ترتیب داڑھی کے ساتھ پھٹے پرانے ملگجے کپڑوں میں وہاں ننگے پاؤں بیٹھے بھی اسے سالار سکندر یاد تھا۔۔۔ اور اس کا باپ۔۔۔ اور وہ نفرت بھی جو اس کے دل میں ان کے لیے تھی اور بہت سے ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی جنہوں نے اس کا استعمال کیا تھا۔
غلام فرید نے زمین پر تھوکا تھا۔ کمرے میں بیٹھے چاروں افراد کے چہروں پر مسکراہٹ ابھری۔

☼ ☼ ☼

"میرے بچپن میں، میری زندگی میں جتنا بڑا رول آپ لوگوں کی فیملی کا تھا، پچھلے پانچ سالوں میں اتنا ہی بڑا رول اس شخص کا ہے۔"

عبداللہ نے عنایہ کو بتایا تھا۔ چند ہفتوں بعد ہونے والی اپنی منگنی سے پہلے یہ ان کی دوسری ملاقات تھی۔ عنایہ ایک سیمی نار میں شرکت کے لیے کیلی فورنیا آئی تھی اور عبداللہ نے اسے ڈنر پر بلایا تھا۔ وہ اسے ڈاکٹر احسن سعد سے ملوانا چاہتا تھا جو اسی کے اسپتال میں کام کرتے تھے اور وہ ہمیشہ سے ان سے بہت متاثر تھا۔ عنایہ نے کئی بار اس سے پچھلے سالوں میں اس شخص کے حوالے سے سنا تھا جس سے وہ اب تھوڑی دیر میں ملنے والی تھی۔

"مسلمان ہونا آسان تھا میرے لیے... لیکن مسلمان رہنا اور بننا بڑا مشکل تھا۔ ڈاکٹر احسن نے یہ کام بڑا آسان کر دیا میرے لیے۔ جبریل کے بعد یہ دوسرا شخص ہے جسے میں رول ماڈل سمجھتا ہوں کہ وہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔"

عبداللہ بڑے پرجوش انداز میں عنایہ کو بتا رہا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے سن رہی تھی۔ عبداللہ جذباتی نہیں تھا، بے حد سوچ سمجھ کر بولنے والوں میں سے تھا اور کسی کی بے جا تعریف کرنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔

"کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہو تم ان سے۔" عنایہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔

"تم جیلس تو نہیں ہو رہیں؟" اس نے عنایہ کو چھیڑا۔

"ہوئی تو نہیں لیکن ہو جاؤں گی۔" اس نے جواباً" مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے تم ان سے ملو گی تو تم بھی میری ہی طرح متاثر ہو جاؤ گی ان سے۔" عبداللہ نے کہا۔ "میں اپنے نکاح میں ایک گواہ انہیں بناؤں گا۔"

عنایہ اس بار قہقہہ مار کر ہنسی تھی۔ "عبداللہ ہم اس قدر انسپائرڈ (متاثر) ہوا ان سے؟ مجھے تھوڑا بہت اندازہ تو تھا لیکن اس حد تک نہیں... مجھے اب اور اشتیاق ہو رہا ہے ان سے ملنے کا۔" عنایہ نے اس سے کہا "وہ یقیناً" اچھے شوہر بھی ہوں گے اگر تم نکاح میں بھی انہیں گواہ بنانا چاہتے ہو تو۔" عنایہ کو مزید تجسس ہوا تھا۔

"بس اس ایک معاملے میں خوش قسمت نہیں رہے وہ۔" عبداللہ یک دم سنجیدہ ہو گیا "اچھی بیوی ایک نعمت ہوتی ہے اور بری ایک آزمائش... اور انہیں دوبار اس آزمائش سے گزرنا پڑا۔ ان کی نرمی اور اچھائی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ان کی بیویوں نے۔" عبداللہ کہہ رہا تھا۔

"Ohhh that's sad" (اوہ! یہ افسوس ناک ہے) عنایہ نے کریدے بغیر افسوس کا اظہار کیا۔

"تمہیں پتا ہے تم سے شادی کے لیے بھی میں نے ان سے بہت دعا کروائی تھی اور دیکھ لو ان کی دعا میں کتنا اثر ہے ورنہ تمہارے پیرنٹس آسانی سے ماننے والے تو نہیں تھے۔" عبداللہ اب بڑے فخریہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میرے پیرنٹس کسی کی دعاؤں کے بجائے تمہارے کردار اور اخلاص سے متاثر ہوئے ہیں عبداللہ۔" عنایہ نے اسے جتایا۔

اسے اپنی بے یقینی کا وہ عالم ابھی بھی یاد تھا جب چند مہینے پہلے عبداللہ سے پاکستان میں ملنے کے بعد امامہ نے اسے فون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ انہوں نے اس کا رشتہ امریکہ میں مقیم ایک ہارٹ سرجن کے ساتھ طے کر دیا ہے، وہ کچھ دیر کے لیے بھونچکارہ گئی تھی۔ اس سے پہلے جو بھی پروپوزلز اس کے لیے زیر غور آتے تھے، عنایہ سے مشورہ کیا جاتا تھا اور پھر اسے ملوایا جاتا تھا۔ یہ پہلا پروپوزل تھا جس کے بارے میں اسے اس وقت اطلاع دی جا رہی تھی جب رشتہ طے کر دیا گیا تھا۔ عجیب صدمے کی حالت میں اس نے امامہ سے کہا تھا۔

"مگر ممی! آپ کو مجھے پہلے ملوانا چاہیے تھا اس سے۔ اس کے بارے میں مجھ سے کچھ پوچھا تک نہیں آپ نے۔"

"تمہارے بابا نے بات طے کی ہے۔" امامہ نے جواباً" کہا۔ عنایہ خاموش ہو گئی۔ عجیب دھچکا لگا تھا اسے۔

"تم نہیں کرنا چاہتیں؟" امامہ نے اس سے پوچھا تھا۔

"نہیں میں نے ایسا تو نہیں کہا' پہلے بھی آپ لوگوں ہی کو کرنا تھا تو ٹھیک ہے۔"

عنایہ نے کچھ بجھے دل کے ساتھ کہا تھا۔ اسے عبداللہ یاد آیا تھا اور بالکل اسی لمحے امامہ نے اس سے کہا۔

"عبداللہ نام ہے اس کا۔" نام سن کر بھی لحظہ بھر کے لیے بھی اسے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ایرک عبداللہ کی بات کر رہی تھی۔ امامہ اس قدر کٹر مخالف تھی ایرک عبداللہ سے شادی کی کہ عنایہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ جس عبداللہ کا اتنے دوستانہ انداز میں ذکر کر رہی تھی' وہ وہی تھا۔

"او کے۔" عنایہ نے بمشکل کہا۔

"تم سے ملنا بھی چاہتا ہے۔ وہ نیویارک آیا ہوا ہے میں نے اسے تمہارا ایڈریس دیا تھا۔" امامہ کہہ رہی تھی۔

عنایہ نے بے ساختہ کہا "ممی پلیز' اب اس طرح میرے سر پر مت تھوپیں اسے کہ آج مجھے رشتہ طے ہونے کی خبر دے رہی ہیں اور آج ہی مجھے اس سے ملنے کا بھی کہہ رہی ہیں۔ ویسے بھی اب رشتہ طے ہو گیا ہے' ملنے نہ ملنے سے کیا فائدہ ہو گا۔" اس نے جیسے اپنے اندر کا غصہ نکالا تھا۔

"اس کی فیملی بھی شاید ساتھ ہو۔۔۔ اس کی ممی سے بات ہوئی ہے میری۔۔۔ اگلے ٹرپ پر میں بھی ملوں گی اس کی فیملی سے۔۔۔ منگنی کا فارمل فنکشن تو چند مہینوں بعد ہو گا۔" امامہ نے اس طرح بات جاری رکھی تھی جیسے اس نے عنایہ کی خفگی کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

عنایہ صدمہ کی کیفیت میں اگلے ایک گھنٹے تک وہیں بیٹھی رہی تھی اور ایک گھنٹے کے بعد اس کے دروازے پر بیل بجنے پر اس نے جس شخص کو دیکھا تھا' اسے لگا تھا سردیوں کے موسم میں ہر طرف بہار آ گئی ہے۔ گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول ٹہنی سمیت اسے پکڑاتے ہوئے دروازے پر ہی اس نے عنایہ سے پھاوڑا مانگا تھا تاکہ اس کے دروازے کے باہر پڑی برف ہٹا سکے۔ وہ کئی سالوں بعد مل رہے تھے اور عنایہ کو وہی ایرک یاد آیا تھا جو اکثر ان کے گھر میں لگے پھول۔ توڑ توڑ کر اس کو اور امامہ کو لا کر دیا کرتا تھا اور جس کا پسندیدہ مشغلہ سردیوں میں اپنے اور ان کے گھر کے باہر سے برف ہٹانا تھا۔

"وہ یہاں ہے۔" عبداللہ کی آواز اسے خیالوں سے باہر لے آئی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ کے دروازے پر نمودار ہونے والے کسی شخص کو دیکھتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ عنایہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ احسن سعد سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا اس سے ہونے والا اگلا سامنا اس کی زندگی میں کتنا بڑا بھونچال لانے والا تھا۔



"تمہارے لیے کوئی لڑکی دیکھیں؟" امامہ نے اس صبح ناشتے کی ٹیبل پر حمین سے کہا تھا۔ وہ ان کے پاس چند دنوں کے لیے پاکستان آیا ہوا تھا۔ یہ اس کی روٹین میں شامل تھا۔ بنا بتائے کچھ دنوں کے لیے امامہ اور سکندر عثمان سے ملنے آجانا۔ اپنی زندگی اور بزنس کی بے پناہ مصروفیات میں بھی وہ کبھی یہ نہیں بھولتا تھا۔

"صرف ایک لڑکی؟" حمین نے بڑی سنجیدگی سے امامہ سے کہا جو اس کی پلیٹ میں کچھ اور آملیٹ ڈال رہی تھی۔ وہ پچھلے کچھ عرصے سے ہر بار اس کے پاکستان آنے پر اس سے شادی کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھی' وہ ہنس کر ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا تھا۔

"میں سیریس ہوں' مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" امامہ نے اسے گھورا تھا۔

"باقی تینوں میں سے ہر ایک آزاد پھر رہا ہے تو میں نے کیا گناہ کیا ہے۔" حمین نے اس سے کہا تھا۔

"جبریل کے پاس ابھی شادی کے لیے وقت نہیں۔۔۔ عنایہ کی تو ریزیڈنسی مکمل ہوتے ہی کر دوں گی۔ رئیسہ اور

تمہارے لیے اب تلاش شروع کرتی ہوں۔" امامہ نے اپنے لیے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کچھ تعمیری کام کرنا چاہیے۔" حمین نے اسے چھیڑا۔

"مثلاً؟" اس نے جواباً بڑی سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

"ڈھونڈتا ہوں آپ کے لیے کوئی تعمیری کام۔" حمین نے آملیٹ کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہاں کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے اور اس عمر میں نئے سرے سے کوئی ایکٹوٹی ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے۔ اتنے سالوں سے ایک روٹین کی عادی ہوں اور پاپا کو اس طرح گھر چھوڑ کر میں کوئی ایکٹوٹی ڈھونڈنا بھی نہیں چاہتی۔" امامہ نے اس سے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا' یوں جیسے اسے خدشہ ہو وہ واقعی اس کے لیے کوئی ایکٹوٹی ڈھونڈنے نہ چل پڑے' وہ تھا بھی تو ایسا ہی۔

حمین نے امامہ کو بڑے پیار سے دیکھا۔ وہاں اسلام آباد کے ایک گھر میں اپنی منتخب کردہ گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہوئے بھی وہ ان سب کی زندگی کا محور تھی۔ حمین نے جو سال بچپن میں یہاں سالار اور جبریل کی عدم موجودگی میں امامہ کے ساتھ گزارے تھے' وہ ان دونوں کو بہت قریب لے آئے تھے۔ وہ اس سے پہلے اپنے ہر دکھ سکھ کی بات جبریل سے کرنے کی عادی تھی' اب حمین سے کرنے لگی تھی۔ اس نے امامہ کی بات سننے اور ماننے کی عادت ان ہی سالوں میں سیکھی تھی۔

"ممی! آپ نے فیملی کے لیے سب سے زیادہ قربانیاں دی ہیں۔" حمین نے یک دم پتا نہیں کس ذہنی رو میں اس سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات پر چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

"ہمیشہ عورت ہی دیتی ہے حمین۔۔۔ میں نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا۔" اس نے بڑی لاپروائی سے حمین سے کہا تھا۔

"اگر آپ کو کبھی اپنے جیسی کوئی عورت ملے تو مجھے اس سے ضرور ملوائیں' ہو سکتا ہے میں شادی کر لوں اس سے بلکہ فوراً کر لوں گا۔" اس نے کہا۔

امامہ بڑے پر اسرار انداز میں مسکرائی "یہ کام تو بڑا آسان کر دیا ہے تم نے میرے لیے۔"

"تمہارے ساتھ چلنا اور زندگی گزارنا بھی بہت مشکل ہوگا حمین۔۔۔ تم بھی کام کے معاملے میں اپنا بابا جیسے ہو۔۔۔ workaholic جو کام سامنے ہو نے پر سب کچھ بھول بیٹھے۔" امامہ نے اس سے کہا تھا۔

"بابا سے موازنہ نہ کریں میرا۔۔۔ ان کی اور میری اسپیڈ میں بہت فرق ہے۔" وہ خوش دلی سے ہنسا تھا۔

"رئیسہ اچھی لڑکی ہے۔" امامہ نے یک دم کہا تھا۔ حمین کی سمجھ میں نہیں آیا' اسے بیٹھے بٹھائے رئیسہ کیوں یاد آگئی تھی۔ امامہ نے بھی اس سے آگے کچھ نہیں کہا تھا۔

"ہاں' رئیسہ بہت اچھی لڑکی ہے۔" اس نے بھی سوچے سمجھے بغیر ماں کی بات کی تائید کی تھی اور اسے ہشام اور رئیسہ کا مسئلہ یاد آگیا تھا جسے ڈسکس کرنے کے لیے وہ امامہ کے پاس آیا تھا۔ مگر اگلے دن سکندر عثمان کی اچانک موت نے اسے یہ کرنے نہیں دیا۔

☆ ☆ ☆

سکندر عثمان ان سب کی زندگی سے بے حد خاموشی سے چلے گئے تھے۔ وہ حمین کی وہاں آمد کے دوسرے دن نیند سے نہیں جاگے تھے۔ اس وقت اس گھر میں صرف امامہ اور حمین ہی تھے' طیبہ امریکہ میں تھیں۔

اس رات حمین' سکندر عثمان کے پاس بہت دیر تک بیٹھا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا

ماما اور ان کے لیے ہی آتا تھا۔ سکندر عثمان سے وہ سالار کے دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ انسیت رکھتا تھا اور ایسا ہی انس سکندر عثمان بھی اس سے رکھتے تھے۔ الزائمر کی اس انتہائی اسٹیج پر بھی حمین کے سامنے آنے پر ان کی آنکھیں چمکتی تھیں یا کم از کم دوسروں کو لگتی تھیں۔ کچھ بھی بول نہ سکنے کے باوجود وہ اسے دیکھتے رہتے تھے اور وہ دادا کا ہاتھ پکڑے ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ ان سے خود ہی بات چیت کی کوشش کرتا رہتا۔ خود سوال کرتا' خود جواب دیتا' جیسے بچپن میں کرتا تھا اور ویسی ہی باتیں جو بچپن میں ہوتی تھیں' اور تب سکندر عثمان ان کے جواب دیا کرتے تھے۔

"دادا! بتائیں شتر مرغ کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟" وہ ان کے ساتھ واک کرتے کرتے یک دم ان سے پوچھتا۔ سکندر عثمان الجھتے شتر مرغ کی تصویر ذہن میں لانے کی کوشش کرتے پھر ہار مانتے۔

"مرغ کی دو ہوں گی تو شتر مرغ کی بھی دو ہوں گی دادا۔۔۔ یہ تو سوچے بغیر بتا دینے والا جواب تھا۔" سکندر عثمان اس کی بات پر سر ہلانے لگتے۔

سکندر عثمان کی یادداشت کے دیے' حمین سکندر نے اپنے سامنے ایک ایک کر کے بجھتے دیکھے تھے اور ایک بچے کے طور پر الزائمر کو نہ سمجھنے کے باوجود اس نے اپنے دادا کے ساتھ مل کر ان دیوں کی روشنی کو بچانے کی بے پناہ کوشش کی تھی۔

وہ کسی بھی چیز کا نام بھول جانے پر انہیں تسلی دے دیا کرتا تھا کہ یہ نارمل بات تھی۔۔۔ اور بھولنا تو اچھا ہوتا ہے اسی لیے وہ بھی بہت ساری چیزیں بھولتا ہے۔ وہ بچے کی لاجک تھی اور بڑے کے سامنے لنگڑی تھی مگر سکندر عثمان کو اس عمر میں اس بیماری سے لڑتے ہوئے ویسی ہی لاجک چاہیے تھی جو انہیں یہ یقین دلا دیتی کہ وہ ٹھیک تھے' سب کچھ "نارمل" تھا۔

حمین ان کی بیماری کے بڑھتے جانے پر آہستہ آہستہ کر کے ان کے کمرے کی ہر چیز پر اس چیز کا نام کاغذ کی چٹوں پر لکھ کر چسپاں کر دیا کرتا تھا تاکہ دادا کچھ نہ بھولیں' وہ جس چیز کو دیکھیں' اس کا نام یاد کرنے کے لیے انہیں تردد نہ کرنا پڑے۔ وہ چٹیں سینکڑوں کی تعداد میں تھیں اور اس کمرے میں آنے والے ہر شخص کو ایک بار' سکندر عثمان کے ساتھ اس بیماری سے لڑنے والے اس دوسرے شخص کے بارے میں سوچنے پر بھی مجبور کر دیتیں اور حمین نے اس بیماری کے سامنے پہلی بار اس دن ہار مانی تھی' جس دن سکندر عثمان اس کا نام بھول گئے تھے۔ وہ بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔ وہ آخر اس کا نام کیسے بھول گئے تھے؟ اس وجود کا جو چوبیس میں سے بارہ گھنٹے ان کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا۔ اس کے سامنے کھڑے سکندر عثمان اس کا نام یاد کرتے' اٹکتے' الجھتے' ہکلاتے' گڑگڑاتے رہے اور حمین ان کی جدوجہد اور بے بسی دیکھتا رہا۔

پھر وہ بڑی خاموشی سے سینٹر ٹیبل کے پاس گھٹنے ٹیک کر بیٹھا۔ وہاں پڑی ایک اسٹک آن چٹ اس نے اٹھائی' اس پر اپنا نام لکھا اور پھر اپنے ماتھے پر اسے چسپاں کرتے ہوئے وہ سکندر عثمان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا اور شاید زندگی میں پہلی بار' لیکن وہ نہیں رویا تھا' اس نے جیسے سکندر عثمان کے سامنے اس بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بات الزائمر سے جنگ کرتے اس شخص کے لیے مذاق نہیں تھی۔ وہ اس کے نام کے اسپیلنگ کرتے کرتے ہنس پڑے تھے اور پھر ہنستے ہنستے وہ وہیں کھڑے کھڑے اپنی مٹھیاں بھینچتے' رونے لگے تھے اور ان سے قد اور عمر میں چھوٹے حمین نے اپنی عمر سے بڑے اس بوڑھے شخص کو تھپکتے ہوئے تسلی دی تھی جو اپنی "نااہلی" اور "مجبوری" پر نادم تھا اور جو اپنے چہیتے ترین رشتے کا نام یاد رکھنے سے بھی قاصر تھا۔ ان کی اس بیماری نے حمین سکندر کو وقت سے پہلے میچور کر دیا تھا۔ جبریل نے سالار

سکندر کی بیماری کو جھیلا تھا' حمین نے سکندر عثمان کی۔ وہ اسے اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کے لیے اسے اپنی چیزیں دینا شروع ہو گئے تھے۔

"دادا! آپ کو یہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" حمین جیسے سمجھ جاتا تھا کہ وہ بارٹر ڈیل۔۔۔ کس شے کے لیے تھی "میرے پاس دنیا میں جتنا وقت ہے' آپ کے لیے ہے۔"

(I have all the time in the world for you)

وہ جیسے انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا۔ وہ پھر بھی اسے کچھ نہ کچھ دینے کی کوشش کرتے' حمین ان کے بہت سارے رازوں سے واقف تھا۔ ان بہت ساری جگہوں سے بھی جہاں وہ اپنی قیمتی چیزیں چھپاتے تھے اس پر ان کے اعتبار کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر چیز چھپاتے ہوئے صرف حمین سکندر کو بتاتے تھے صرف اس لیے کیونکہ انہیں یہ خدشہ تھا کہ وہ کہیں اس جگہ کو بھی نہ بھول جائیں جہاں وہ سب کچھ چھپا رہے تھے۔ اور ایسا ہی ہوتا تھا' ان کے بھولنے پر حمین انہیں وہ چیز نکال کر دیتا تھا۔ وہ کمرہ جیسے ان دونوں دادا اور پوتے کے لیے چھپن چھپائی والی جگہ بن گیا تھا۔

"ایک دن تم بہت بڑے آدمی بنو گے۔" سکندر عثمان اس سے اکثر کہا کرتے تھی "اپنے بابا سے بھی بڑے آدمی "

وہ ان کی بات غور و فکر کے بغیر سنتا پر بیچ میں انہیں ٹوک کر پوچھتا۔

"خالی بڑا آدمی بنوں گا یا rich (امیر)؟" بابا تو rich (امیر) نہیں ہیں۔" اسے جیسے فکر لاحق ہوئی۔ سکندر عثمان ہنس پڑے۔

"بہت امیر ہو جاؤ گے۔۔۔ بہت زیادہ۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" اسے جیسے اطمینان ہوتا "لیکن آپ کو کیسے پتا؟" اسے یک دم خیال آیا۔

"کیونکہ میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں۔" سکندر عثمان بڑھاپے کی اس لاٹھی کو دیکھتے جو ان کے سب سے عزیز بیٹے کا ان کے لیے تحفہ تھا۔

"اوکے۔" حمین کے ذہن میں مزید سوالات آئے تھے لیکن وہ دادا سے اب بحث نہیں کرتا تھا۔

"میں تم پر دنیا میں سب سے زیادہ اعتماد کرتا ہوں۔" وہ اکثر اس سے کہتے تھے اور وہ بڑی سنجیدگی سے ان سے کہتا

"اور آپ واحد انسان ہیں جو یہ کام کرتے ہیں" اور سکندر عثمان جواباً" کسی بچے کی طرح ہنسنے لگتے تھے۔

"جب میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا تو یہ رنگ تم امامہ کو دے دینا۔" اعتماد کے ایسے ہی ایک لمحے میں انہوں نے حمین کو وہ انگوٹھی دکھائی تھی' جسے وہ کئی سال اپنی ماں کی انگلی میں دیکھتا رہا تھا۔

"یہ تو ممی کی رنگ ہے۔" حمین جیسے چلّایا تھا۔

"ہاں تمہاری ممی کی ہے۔۔۔ سالار نے شادی پر گفٹ کی تھی اسے۔۔۔ پھر وہ اسے بیچ کر سالار کے پراجیکٹ میں کچھ انویسٹمنٹ کرنا چاہتی تھی' تو میں نے اسے لے کر اسے وہ رقم دے دی۔ میں اسے واپس دوں گا تو وہ نہیں لے گی اور میں نہیں چاہتا' وہ اور سالار اسے بیچ کر مجھے میرا قرض واپس دینے کی کوشش کریں۔"

سکندر عثمان بتاتے گئے تھے۔ انہوں نے اسے ایک تھیلی میں ڈال کر اپنی وارڈروب کے ایک چور خانے میں حمین کے سامنے رکھا تھا۔ وہ چور خانہ حمین نے بھی پہلی بار ہی دیکھا تھا۔

"آپ اسے لاکر میں کیوں نہیں رکھوا دیتے؟" اس نے سکندر عثمان کو مشورہ دیا تھا۔ وہ مسکرا دیے تھا۔

"میرے مرنے کے بعد لاکر سے جو کچھ بھی نکلے گا' وہ ساری اولاد کی مشترکہ ملکیت ہوگا۔ کوئی یہ امامہ کو نہیں دے گا۔" سکندر نے کہا۔

"لیکن آپ will (وصیت) میں لکھ سکتے ہیں۔" سکندر اس کی بات پر ہنس پڑے تھے۔

"میری اولاد بہت اچھی ہے لیکن میں زندگی میں ان سے بہت ساری باتیں نہیں منوا سکتا تو مرنے کے بعد کیسے منوا سکوں گا' جب تمہاری اولاد ہوگی تو تمہیں سمجھ آجائے گی میری باتوں کی۔" انہوں نے جیسے بڑے پیار کے ساتھ اس سے کہا تھا۔

سکندر عثمان کی موت کے ایک ہفتے کے بعد اس گھر میں ان کی اولاد ترکے کی تقسیم کے لیے اکٹھی ہوئی تھی اور حمین سکندر کی سمجھ میں وہ بات آگئی تھی ——— سکندر عثمان اپنی زندگی میں ہی سب کچھ تقسیم کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس صرف چند چیزیں رکھی تھیں جن میں وہ گھر بھی تھا' لیکن ان چند چیزوں کی ملکیت پر بھی سب میں کچھ اختلافات ہوگئے تھے اور یہ اختلافات بڑھ جاتے اگر سالار سکندر اور اس کا خاندان سکندر عثمان کے رہ جانے والے اثاثوں پر اپنے حصے کے حوالے سے کلیم کرتا۔ وہ ان کے خاندان کا مشترکہ فیصلہ تھا۔

سکندر عثمان کے بچنے والے اثاثوں میں سے سالار سکندر اور اس کے خاندان نے کچھ نہیں لیا تھا۔ البتہ سکندر عثمان کا وہ گھر حمین سکندر نے خریدنے کی آفر کی تھی کیونکہ طیبہ پہلے بھی زیادہ تر اپنے بیٹوں کے پاس بیرون ملک رہتی تھیں اور وہ اب مستقل طور پر ان کے پاس رہنا چاہتی تھیں اور ان کے وہاں سے شفٹ ہو جانے کے فیصلے کے بعد اس گھر کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور اس فیصلے کے دوران کسی نے امامہ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ سالار سکندر اور اس کے اپنے بچوں کے علاوہ جنہیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ سکندر عثمان کے چلے جانے کے بعد اس گھر کے نہ رہنے سے ایک شخص ایک بار پھر دربدر ہونے والا تھا۔ حمین نے اس گھر کو صرف امامہ کے لیے خریدا تھا اور ان یادوں کے لیے جو ان سب کی اس گھر سے وابستہ تھیں۔ اور اس نے جس قیمت پر اسے خریدا تھا' وہ مارکیٹ سے دوگنی تھی۔



"ممی! مجھے آپ کو ایک امانت دینی ہے۔" حمین رات کو سالار اور امامہ کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ صبح واپس جا رہا تھا۔ باری باری —— سب ہی واپس جا رہے تھے۔ سالار اور وہ دونوں کچھ دیر پہلے ہی کمرے میں آئے تھے' جب وہ دستک دے کر ان کے کمرے میں آیا تھا۔

"امانت؟" وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ حمین نے ایک تھیلی اس کے ہاتھ پر رکھی اور اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پہلے حمین پھر سالار کو دیکھا جو فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

"آپ خود دیکھ لیں۔" حمین نے اسے کہا' امامہ نے تھیلی میں ہاتھ ڈال کر اندر موجود چیز نکالی اور ساکت رہ گئی۔ فون پر بات کرتا سالار بھی اسی طرح ٹھٹکا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دونوں اس انگوٹھی کو سیکنڈز میں نہ پہچان جاتے جو ان کی زندگی کی بہترین اور قیمتی ترین یادوں میں سے ایک تھی۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملی؟" امامہ نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔ سالار نے فون منقطع کر دیا تھا۔

"دادا نے بچپن میں میرے سامنے وارڈروب میں ایک دراز میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ اگر وہ اسے

بھول جائیں تو ان کے مرنے کے بعد میں اسے وہاں سے نکال کر آپ کو دے دوں۔" حمین کہہ رہا تھا۔

"وہ آپ کو یہ واپس دے دینا چاہتے تھے لیکن انہیں خدشہ تھا کہ آپ اسے نہیں لیں گی اور ایسا نہ ہو آپ اور بابا ان کا قرض ادا کرنے کے لیے اسے بیچ دیں۔"

آنسو سیلاب کی طرح امامہ کی آنکھوں سے نکل کر اس کے چہرے کو بھگوتے چلے گئے۔ سکندر عثمان ہمیشہ اس کا بہت شکریہ ادا کرتے رہتے تھے لیکن اس تشکر کو انہوں نے جس طرح اپنے جانے کے بعد اسے پہنچایا تھا' اس نے امامہ کو بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ایک شفیق باپ تھے لیکن اس سے بڑھ کر ایک شفیق سسر تھے۔

"تم نے کبھی بھی پہلے اس رنگ کے بارے میں ذکر نہیں کیا۔" سالار نے اپنے سامنے بیٹھے اپنے اس بیٹے کو دیکھا جو آج بھی ویسا ہی عجیب اور گہرا تھا جیسا بچپن میں تھا۔

"میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی کسی کو اس انگوٹھی کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ یہ ایک امانت تھی' میں خیانت نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ باپ سے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہموار قدموں سے چلتا ہوا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ دونوں تب تک اسے دیکھتے رہے جب تک وہ غائب نہیں ہو گیا۔

"میں یہ انگوٹھی حمین کی بیوی کو دوں گی۔ اس پر اگر کسی کا حق ہے تو وہ حمین کا ہے۔" اس کے جانے کے بعد امامہ نے مدھم آواز میں سالار سے کہا تھا۔ وہ انگوٹھی ابھی بھی اس کی ہتھیلی پر تھی جسے وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ رہی تھی' کئی سالوں کے بعد' کئی سال پہلے کی ساری یادیں ایک بار پھر زندہ ہو گئی تھیں۔

سالار نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس نے امامہ کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی لی اور بڑی نرمی سے اس کی انگلی میں پہنا دی۔ اس کی مخروطی انگلی میں آج بھی بے حد آسانی سے پوری آگئی تھی۔

"تمہارا بہت شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا میں امامہ۔" اس نے امامہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہنا شروع کیا "تم نے پاپا کی جتنی خدمت کی ہے' وہ میں نہیں کر سکتا تھا نہ ہی میں نے کی ہے۔"

"سالار!" امامہ نے اسے ٹوکا تھا۔ "تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔"

"مجھے اگر زندگی میں دوبارہ شریک حیات کا انتخاب کرنے کا موقع ملے تو میں آنکھیں بند کر کے تمہیں چنوں گا۔"

وہ نم آنکھوں کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس نے ہاتھ کی پشت پر سجی اس انگوٹھی کو دوبارہ دیکھا۔ سولہ سال کی جدائی تھی جو اس نے اس گھر میں سالار سے الگ رہ کر جھیلی تھی۔ وہ تب چند سال یہاں گزارنے آئی تھی اور تب وہ جیسے تلوار کی ایک دھار پر ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ وہ سکندر عثمان کا خیال رکھتے ہوئے دن رات سالار کے لیے خوف زدہ رہتی تھی اور اس نے سالار کو یہ نہیں بتایا تھا مگر اس نے یہ دعا کی تھی تب کہ اگر سکندر عثمان کی خدمت کے عوض اسے اللہ نے کوئی صلہ دینا تھا تو وہ سالار سکندر کی زندگی اور صحت یابی کی شکل میں دے دے اور آج سولہ سال بعد اسے لگتا تھا شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی زندگی کا وہ ساتھی آج بھی اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انگوٹھی ایک بار پھر سے اس کے ہاتھ میں سج گئی تھی اور وہ سولہ سال بعد بالآخر ایک بار پھر سے سالار اور اپنے بچوں کے ساتھ مستقل طور پر امریکہ جا کر رہ سکتی تھی۔ بے شک وہ اپنے رب کی کسی بھی نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتی تھی۔

"میں نے آج بہت عرصے بعد ایک خواب دیکھا..... وہی خواب۔" وہ چونکی' سالار اسے کچھ بتا رہا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

"ہشام مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔" اپنے سامان کی پیکنگ کرتے ہوئے حمین نے رئیسہ سے کہا وہ بھی ابھی سکندر عثمان کے گھر پر ہی تھی اور چند دن اسے بھی وہاں ٹھہرنا تھا۔ وہ حمین کو اس کا کچھ سامان دینے آئی تھی جب اس نے اچانک اس سے کہا تھا۔

"وہ شاید دادا کی تعزیت کے لیے ملنا چاہتا ہوگا۔" وہ ایک لمحہ کے لیے اٹکی پھر اس نے روانی سے اس سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔" حمین نے اسی طرح کام میں مصروف ہوتے ہوئے کہا "تعزیت کے لیے وہ تم سے ملتا یا بابا سے ملتا، مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تم دونوں کے درمیان کچھ بات چیت ہوئی ہے کیا؟" اس نے اپنے ہمیشہ کے دوٹوک اور صاف گو انداز میں رئیسہ سے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ رئیسہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر اس نے حمین سے اپنی اور ہشام کی کچھ ہفتے پہلے ہونے والی ملاقات اور گفتگو دہرائی تھی۔

"تو اب وہ کیا چاہتا ہے؟" حمین نے پوری بات سننے کے بعد صرف ایک سوال کیا تھا کوئی تبصرہ نہیں۔

"پتا نہیں.... شاید تم سے کہے گا کہ تم مجھے منالو۔"

حمین نے نفی میں سر ہلایا "نہیں وہ مجھ سے یہ کبھی نہیں کہے گا کہ میں تمہیں اس کی دوسری بیوی بننے پر آمادہ کروں، اتنا عقل مند تو ہے وہ کہ ایسا پرپوزل میرے پاس لے کر نہ آئے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"رئیسہ! تم کیا چاہتی ہو؟" چند لمحے بعد اس نے دوٹوک انداز میں رئیسہ سے پوچھا۔

"میری چوائس کا ایشو نہیں ہے۔" وہ کچھ بے دلی سے مسکرائی "اس کا مسئلہ جینوئن ہے، تم نے ٹھیک کہا تھا، وہ شاہی خاندان ہے اور اس کے اپنے قواعد و ضوابط ہیں۔ اپنی سوچ ہے، مجھے بہت پہلے ہی اس میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔"

حمین اسے دیکھتا رہا، اس کے سامنے بیٹھی وہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بولتی جارہی تھی یوں جیسے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بادشاہ بزدل ہے۔" حمین نے مدھم آواز میں اس سے کہا۔ وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ "اور بزدل نہ پیار کر سکتے ہیں نہ حکومت، نہ وعدہ نبھا سکتے ہیں نہ تعلق۔" حمین نے جیسے اسے ہشام بن صباح کا مسئلہ چار جملوں میں سمجھایا تھا جو وہ سمجھنے سے گریزاں تھی۔

"لوگ پیار کے لیے تخت و تاج ٹھکراتے ہیں نا تو وہ ٹھکرائے.... اگر بادشاہ رہ کر تمہیں زندگی کا ساتھی نہیں بنا سکتا تو بادشاہت چھوڑ دے۔" رئیسہ ہنس پڑی۔

"بادشاہت چھوڑ دے.... میرے لیے؟ میں اتنی قیمتی نہیں ہوں حمین کہ کوئی میرے لیے بادشاہت چھوڑتا پھرے۔" اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے ہو.... ہو سکتا ہے تمہیں پتا نہ ہو.... اور اگر وہ تمہاری قدر و قیمت پہچاننے کے قابل نہیں ہے تو ساتھ زندگی گزارنے کے قابل تو بالکل نہیں ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تو حل میرے پاس ہے۔ اب دیکھتے ہیں اس کی سمجھ میں آتا ہے یا نہیں.... میں واپس جا کر اس سے ملوں گا۔" حمین نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ رئیسہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹر احسن سعد آپ کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ وہ بتا رہے تھے کہ ان کے والد صاحب بابا کے بھی بڑے قریبی دوست تھے۔ عبداللہ ہی بتا رہا تھا کہ وہ اور ان کے والد، دادا کی تعزیت کے لیے امریکہ میں آکر ملیں گے بابا سے۔" عنایہ چہل قدمی کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ اور جبریل لان میں چہل قدمی کر رہی تھے جب عنایہ کو اچانک عبداللہ کے ذکر چھیڑے جانے پر احسن سعد یاد آیا اور اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو اس نے جبریل سے اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھا۔

احسن سعد کا نام ہی جبریل کو چونکانے کے لیے کافی تھا' لیکن وہ یہ سن کر زیادہ حیران ہوا تھا کہ جس احسن سعد کی وہ بات کر رہی تھی وہ نہ صرف جبریل سکندر کو جانتا تھا بلکہ اس کا باپ سالار کا قریبی دوست تھا۔ وہ الجھا تھا جس احسن سے وہ ملا تھا اس نے ایسا کوئی ذکر یا حوالہ نہیں دیا تھا۔ اسے عائشہ کے سابقہ شوہر کی تفصیلات کا پتا نہیں تھا سوائے اس کے نام' پروفیشن اور اسٹیٹس کے۔ فوری طور پر وہ یہ سمجھ نہیں سکا کہ یہ وہی احسن سعد تھا یا وہ کسی اور کا ذکر کر رہی ہے یہ بات کنفیوز کر رہی تھی۔

"عبداللہ تو بے حد انسپائرڈ ہے اس سے' کہہ رہا تھا نکاح کے گواہوں میں سے ایک وہ احسن سعد کو رکھے گا۔ اس نے تو احسن سعد کو پیرو مرشد بنایا ہوا ہے' ہر بات میں اس کا حوالہ دیتا ہے۔" وہ کہتی جا رہی تھی اور جبریل بے چین ہونے لگا تھا۔

"عبداللہ ان ہی کے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ مجھے بھی اچھا لگا وہ۔ ذکر تو پہلے بھی عبداللہ سے سنتی رہی تھی لیکن مل کر مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ کافی ینگ ہے۔ بہت باعلم ہے دین کے بارے میں۔ اور حافظ قرآن بھی ہے۔"

مماثلت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جبریل اب بولے بغیر نہیں رہ سکا۔

"شادی شدہ ہے؟" اس نے خواہش کی تھی وہ کوئی اور احسن سعد ہو۔ "نہیں بس یہی بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے اس کے ساتھ۔" عنایہ کے جواب نے جیسے اس کا دل نکال کر رکھ دیا تھا۔

"بیوی سائیکو اور خراب کریکٹر کی تھی۔ کسی کے ساتھ اس کا افیئر چلتا رہا اور احسن سعد بے چارے کو پتا ہی نہیں تھا پھر ڈائی وورس ہو گئی لیکن بیوی نے بچے کی کسٹڈی بھی نہیں دی اور اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ مل کر اس معذور بچے کو جان سے مار دیا تاکہ دونوں شادی کر سکیں اور بچے کے نام جو جائیداد تھی' وہ اسے مل جائے۔ احسن سعد نے کیس کیا تھا اپنی سابقہ بیوی کے خلاف قتل کا۔ تو اس عورت نے کچھ پیچ اپ کرنے کی کوشش میں اس بچے کے نام جو بھی جائیداد تھی' وہ اس کے نام کر کے معافی مانگی ہے۔ بہت اچھا انسان ہے' وہ کہہ رہا تھا معاف کروے گا' اب بیٹا تو چلا گیا۔" عنایہ بڑی ہمدردی کے ساتھ وہ تفصیلات سنا رہی تھی۔

"تم جانتی ہو وہ بوائے فرینڈ کون ہے جس نے احسن سعد کی بیوی کے ساتھ مل کر اس کے معذور بچے کا قتل کیا ہے؟" جبریل نے یک دم اسے ٹوکا تھا۔ عنایہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جبریل کا سوال جتنا عجیب تھا' اس کا لہجہ اور تاثرات اس سے زیادہ عجیب۔

"نہیں میں کیسے جان سکتی ہوں' ویسے عبداللہ' احسن سعد سے کہہ رہا تھا کہ اسے اپنی سابقہ بیوی اور اس کے بوائے فرینڈ کو معاف نہیں کرنا چاہیے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" عنایہ نے روانی میں کہا اور جبریل کے اگلے جملے نے اس کا ذہن جیسے بھک سے اڑا دیا تھا۔

"وہ بوائے فرینڈ میں ہوں۔" بے حد بے تاثر آواز میں جبریل نے اس سے کہا تھا۔

"اور عنایہ! میں اب کبھی عبداللہ سے تمہاری شادی بھی نہیں ہونے دوں گا۔" اس کا اگلا جملہ پہلے سے بھی زیادہ ناقابل یقین تھا۔

سالار سکندر، سکندر عثمان کے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ لائٹ آن کر کے اس نے سکندر عثمان کے بستر کو دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی نمی دوڑی تھی۔ کئی سالوں سے اب اس کے اور ان کے درمیان صرف خاموشی کا رشتہ ہی رہ گیا تھا۔ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اسے ان کے وجود سے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔

"میں اپنی نظروں کے سامنے تمہیں جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا سالار! اس لیے بس یہی دعا کرتا ہوں کہ تم سے پہلے چلا جاؤں۔۔۔ تمہارا دکھ نہ دکھائے اللہ کسی بھی حالت میں مجھے۔"

سالار کو لگا جیسے یہ جملے پھر اس کمرے میں گونجے تھے۔ انہوں نے اس کی بیماری کے دوران کئی بار اس سے یہ باتیں کہی تھیں۔ اور ان کی دعا قبول ہو گئی تھی، وہ سالار کا دکھ دیکھ کر نہیں گئے تھے۔

"کیا فرق پڑتا ہے پاپا۔۔۔ ہر ایک کو جانا ہے دنیا سے۔۔۔ جس کا رول ختم ہو جائے وہ چلا جاتا ہے۔" سالار کئی بار انہیں جواباً کہتا تھا۔

"جوان بیٹے کا غم اللہ کسی کو نہ دکھائے سالار۔" وہ رو پڑے تھے اور یہ آنسو سالار نے ان کی آنکھوں میں صرف اپنی بیماری کی تشخیص کے بعد دیکھنا شروع کیے تھے، ورنہ سکندر عثمان کہاں بات بات پر رو پڑنے والے آدمی تھے۔

وہ ان کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اور امامہ اب وہاں سے جانے والے تھے۔ وہ کمرہ اور وہ گھر اب بے مکین ہونے والا تھا۔ وہ دو ہفتوں سے وہاں تھا اور اس سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ حمین پہلے جا چکا تھا اور اب جبریل اور عنایہ بھی اس کے پیچھے چلے جاتے، پھر امامہ۔۔۔ جو سب سے آخر میں وہاں سے جاتی اور پھر پتا نہیں اس گھر میں دوبارہ کبھی وہ یوں اکٹھے بھی ہو پاتے یا نہیں۔۔۔ اور اکٹھے ہوتے بھی تو بھی پتا نہیں کب۔

زندگی کیا شے ہے، کیسے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔۔۔ وقت کیا شے ہے رکتا ہے تو رک ہی جاتا ہے، چلتا ہے تو پہیوں پر۔

"میں آپ جیسا باپ کبھی نہیں بن سکا اپنی اولاد کے لیے، پاپا۔" اس نے مدہم آواز میں وہاں بیٹھے خود کلامی کی۔ "میں آپ جیسا بیٹا بھی کبھی نہیں بن سکا۔" وہ رک کر دوبارہ بولا۔

"لیکن میرے بیٹے آپ جیسے باپ بنیں اور آپ جیسے ہی بیٹے۔۔۔ میرے جیسے نہیں۔۔۔ میری صرف یہ دعا ہے۔"

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ ٹیبل پڑے ان کے گلاسز اٹھا کر چھوئے پھر انہیں ٹیبل پر رکھ کر دوبارہ اٹھ گیا۔

✡ ✡ ✡

"بیوی کو کیوں مارا؟"

"ایک بڑے آدمی کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات تھے۔"

"پھر؟"

"پھر مجھے پتا چلا کہ جسے میں اپنی بیٹی سمجھتا تھا، وہ بھی اس کی بیٹی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر۔۔۔ بس برداشت نہیں کر سکا میں۔۔۔ میں غیرت مند تھا، اسے بھی قتل کر دیا، باقی اولاد کو بھی۔۔۔ پتا نہیں وہ بھی میری تھی یا نہیں۔"

CNN پر غلام فرید کے ساتھ ہونے والا وہ انٹرویو انگلش سب ٹائٹلز کے ساتھ چل رہا تھا اور دنیا کے تمام بڑے

چینلز اس وقت اس انٹرویو کو بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ صرف دس منٹوں میں دنیا بھر میں سالار سکندر اور SIF ایک بار پھر زبان زدعام ہونے والی تھی اور اس بار یہ "شہرت" نہیں رسوائی تھی جو اس خاندان کے حصے میں آنے والی تھی۔

"وہ بڑا آدمی کون تھا؟" انٹرویو نے غلام فرید سے اگلا سوال کیا۔

"میں اس کا چوکیدار تھا" اس کے اسکول کا۔ اس نے مجھے اس لیے وہاں سے نکال دیا کہ اس کے میری بیوی سے تعلقات تھے۔"

انٹرویو کرنے والے نے غلام فرید کو ٹوکا۔ "اس بڑے آدمی کا نام کیا تھا؟"

"سالار سکندر" غلام فرید نے بے حد روانی سے کہا۔

دنیا بھر کی ٹی وی اسکرینز پر عین اسی لمحے سالار سکندر کی تصویر نمودار ہوئی تھی اور پھر اس کے چند لمحے بعد رئیسہ سالار کی۔ بیک وقت۔ ایک ہی جیسی تصویریں۔

وہ CIA کا اسٹنگ آپریشن نہیں تھا' وہ انہوں نے پوری قوت اور طاقت سے مغربی انٹیلی جنس ایجنسیز کے اشتراک سے دنیا کے کامیاب ترین اسلامی مالیاتی نظام کے بانی اور SIF کی بنیادوں پر دن دہاڑے حملہ کیا تھا۔

"غلام فرید تم کیا چاہتے ہو؟" انٹرویو لینے والا اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

غلام فرید ایک لحظہ کے لیے رکا پھر اس نے کہا۔ "سالار سکندر کے لیے پھانسی کی سزا۔"

✡ ✡ ✡

نیروبی کے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں ہونے والی تقریب افریقہ کی تاریخ کے یادگار ترین لمحوں میں سے ایک تھی۔ کچھ گھنٹوں کے لیے دنیا کی تمام اکنامک مارکیٹس جیسے اس ایک تقریب پر فوکس کرکے بیٹھ گئی تھیں جہاں SIF حمین سکندر کی کمپنی TAI کے ساتھ مل کر افریقہ میں دنیا کے سب سے بڑے مالیاتی فنڈز کے قیام کا اعلان کرنے والی تھی۔ وہ انضمام نہیں تھا' اشتراک تھا اور دنیا کا کوئی بڑا مالیاتی ادارہ نہیں تھا جس کا سربراہ وہاں اس فائیو اسٹار ہوٹل کے بینکویٹ ہال میں موجود نہ ہو۔ وہاں دنیا کے بہترین دماغ تھے' اپنی اپنی فیلڈ کے نامور لوگ اور ان لوگوں کے جمگھٹے میں وہاں سالار سکندر اور حمین سکندر اس گلوبل فنڈ کا اعلان کرنے والے تھے۔ جس کی مالیت دنیا کے تمام بڑے مالیاتی اداروں کو پچھاڑنے والی تھی۔

9:14 پر بھی ٹیلی اسکوپ کی آنکھ سے اس ٹارگٹ کلر کو وہ "مہمان" لفٹ کے دروازے سے نمودار ہوتا نظر نہیں آیا۔ لیکن وہ دم سادھے' آنکھ ٹیلی اسکوپ پر ٹکائے' ایک انگلی ٹریگر پر رکھے لفٹ کا دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔

دس۔۔۔ نو۔۔۔ آٹھ۔۔۔ سات۔۔۔ چھ۔۔۔ پانچ۔۔۔ چار۔۔۔ تین۔۔۔ دو۔۔۔ ایک۔۔۔

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

راؤ سمیرا ایاز

خوب سے اور زندگی

بے بسی کی ایک ایسی حد ہوتی ہے جب انسان کچھ کر نہیں سکتا۔ ہر حربہ ناکام ہو جاتا ہے.... کوئی بھی کوشش بار آور نہیں ہو پاتی۔ سمندر میں ڈوب رہا ہر شخص خواہ وہ بہترین تیراک بھی ہو مگر پھر بھی وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کر پاتا۔ جتنے بھی ہاتھ پیر مار لے.... ختم شد سب....

ایسی ہی ایک مشکل میں اس کی ذات تھی....

وہ تین بہنیں تھیں اور بھائی ایک اور وہ ان میں سب سے چھوٹی۔

لیکن اس کی فیملی سے پہلے وہاں دو بھائی اور دو بہنیں اور بھی تھے.... یعنی اس کے بابا، چاچا اور پھپھیاں.... دادا، دادی حیات.... کسی چیز کی کوئی کمی نہیں تھی.... رحمت و برکت جہاں موجود ہو، وہاں مادی اشیاء میں بھی تنگی کا سوال ہونا مشکل ہی ہو جاتا ہے.... صوم و صلواۃ کا پابند یہ گھرانہ تمام برادری میں ممتاز تھا۔

"اچھا تو ظہیر الدین کے پوتے ہو تم ؟ اچھا تم بیٹے.... واہ بھئی شان دار۔" عزت و تکریم میں بھی کہیں کوئی کمی نہ تھی۔

لیکن کوئی بھی چیز چاہے وہ مادی ہو یا انسان، مکمل نہیں ہوتی، کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہوتی ہے اور یہاں کمی تھی ذہنی سوچ کی....

کیسے....؟

ظہیر الدین صاحب کے دونوں بیٹے محی الدین اور شفیع الدین ایک کامیاب انسان تھے.... دونوں نے ہی گریجویٹ کر رکھا تھا مگر ان کی بہنیں آٹھویں پاس....

"بس شادی کروا دو ان کی.... اب محلے میں ہی اسکول تھا تو اتنا بھی پڑھ لیا بہت ہے، اب کون رکھوالی کرے گا ان کی.... ڈیڑھ گھنٹے کے سفر پہ ہیں، باقی کالجز اور اسکول اور ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو اتنا ہی پڑھا دیا جائے تو بہت ہے۔ باقی اصل تعلیم تو قرآن پاک کی ہے جو کہ وہ پڑھ چکی ہیں۔ بس اب کوئی فکر نہیں۔"

ظہیر الدین کی رائے سے سب ہی متفق تھے، کیا دادی کیا بیٹے مگر زہرہ سے چھوٹی نجمہ....

"مگر مجھے پڑھنا ہے...." احتجاجاً کروشیے کی بیل واپس رکھ دی.... زہرہ سر اٹھائے دیکھنے لگی۔

"اگر آگے پڑھ بھی لو گی تو کون سا ڈاکٹر یا انجینئر کی ڈگری لے لو گی...." پر اطمینان انداز۔

"آپا.... ڈاکٹر، انجینئر بننے سے انسان کسی ایک علم میں تو ماہر ہو جاتا ہے مگر اصل علم تو ان کتابوں سے ملتا ہے جو ذہن کو سمندر کی طرح وسیع اور دل کو آسمان کی طرح کشادہ کر دیتا ہے، مجھے صرف علم کی خواہش ہے۔" اس کی رندھی آواز....

"جو کبھی بھی پوری نہیں ہو سکتی...." نجمہ کو لگا، کسی نے اس کی آنکھوں کے سامنے دھواں چھوڑ دیا ہو، کسیلا، بے حد کڑوا.... اور پھر اس کے بعد ان آنکھوں سے بہتے بے زبان آنسوؤں میں اس کی ساری خواہشیں اور سارے خواب بہہ گئے۔

اور وہی ہوا جو ظہیر الدین نے چاہا.... ان کی بیوی نے بیٹیوں کو کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی.... نہ شادی سے پہلے اور نہ بعد میں مگر زندگی کا ڈھب بدلتے موسموں کی طرح بدلنے لگا۔ اونچی نیچی چھتیں کشادہ و کھلے کمروں میں بدل گئیں.... اور صوتی اور سماعتی

آنکوں کی بھی اشکال بدل گئیں۔

محی الدین کی شادی پہلے اور آخر کے شفیع الدین کی چار سال بعد ہوئی۔ اور اولاد شادی کے دو سال بعد۔۔۔ لیکن محی الدین پر اللہ نے رحمت و برکت کے دروازے کھلے ہی رکھے اور انھوں نے ان پر اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت کے۔۔۔ مگر مسئلہ تب ہوا جب ان کی سب سے بڑی دونوں بیٹیوں نے آٹھویں کے امتحان میں جانے کے لیے برقع پہننا شروع کیا۔۔۔ چادری برقع کا نقاب اور اسی پر آگے ڈالی گئی جالی میں سے جھانکتی دو آنکھیں۔۔۔

یہ موسم گرما کی صبح تھی کچھ ٹھنڈی، کچھ گرم۔۔۔ صحن میں کھڑی وہ دونوں کسی بات پر بے ساختہ ہنستے ہوئے برقع اوڑھنے لگی تھیں جب ان کے چچا شفیع الدین اچانک ہی اندر داخل ہوئے۔۔۔ اور ثناء شبانہ کی آنکھوں پر گئی جن میں لگا گہرا کاجل شفاف آنکھوں کو نمایاں کرتا خوب صورتی کی مثال تھا۔۔۔ تیرہ، چودہ سال کی وہ لڑکیاں اپنی اونچی اٹھان سے سترہ، اٹھارہ کی لگتی تھیں مگر چہرے کی معصومیت عمر کا پول کھول دیتی تھی۔

مگر شفیع الدین کو ان کے چہرے کی معصومیت نہیں آنکھ کا وہ کاجل دکھا تھا، وہ دھاڑے تھے۔۔۔ "یہ کاجل کیوں ڈالا ہے آنکھوں میں، پڑھنے جا رہی ہو یا بر ڈھونڈنے۔"



وہ دونوں صرف بات سمجھنے لگی تھیں مگر صحن کے ساتھ سے کے باورچی خانے سے ان کی ماں آنے میں نے ہاتھ لیے بات کی گہرائی تک پہنچتی 'بے ساختہ صحن میں آگئی تھیں۔

"یہ کس طرح کی بات کر رہے ہیں بھائی بچیوں سے آپ۔" ان کا چہرہ سرخ تھا۔ کیونکہ یہ ان کی بیٹیوں کی تھیں 'ان کی تذلیل بھی ان کی تربیت کی۔

"تو یہ آپ کی شہ ہے جو یہ اس طرح سرخی میک اپ کر کے گھر سے نکلتی ہیں... یہ ہمارا خاندان ہے بھابھی 'یہاں کے اطوار اب تک تو آپ کو جان لینے چاہیے تھے... یہاں کی لڑکیاں کھڑکیوں دروازے کے پردوں سے نہیں لٹکتیں نہ ہی گھر سے باہر نکلتے یوں بجتی سنورتی ہیں۔ کل یہ فاطمہ کھڑکی میں کھڑی تھی اور سامنے ہی محلے کا لفنگا عبدل اور اب یہ شبانہ یوں کاجل لگائے نہ جانے کسے..." یہ شفیع الدین تھے جنہیں خاندان کی عزت کا پاس تھا جو اس طرح رکھنا چاہ رہے تھے کہ شبانہ و فاطمہ کی کم عمری کی معصومیت جل کر راکھ ہونے لگی اور ان کی ماں...

"بس کریں بھائی! اس طرح کی گھٹیا باتیں کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔" وہ چیخ اٹھیں۔

اور پھر ایک محاذ کھل گیا لڑائی کا...

صحن میں بچھی چارپائی کے نیچے بالکل کونے میں چھپی کھلونوں سے کھیلتی بیلی نے وہاں موجود ہر فرد کا لفظ لفظ سنا جو چاچا جان نے کہا اور جو ماں نے مگر انجان و الجھی سی وہ ذرا ذرا ڈری وہیں بیٹھی رہی لیکن... وہ واقعہ ذہن سے محو ہونے والا نہیں تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا یہ بات لڑائی سے ہوتی معرکہ بن جائے گی۔

اور یہ جنگ چار ہفتے چلی اور جیت خاندان والوں کے سر...

لیکن اس کی ماں نے بہت کوششیں کیں اور شبانہ و فاطمہ نے آٹھویں تک پڑھ لیا...

اور اس سے پہلے کی وہ رات...

"محی الدین! یہ غلط ہے... میری بیٹیاں ایسی نہیں ہیں۔ شفیع بھائی کو اتنی گری ہوئی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔" وہ غصے و بے بسی سے اونچا بول رہی تھیں 'نیچے کمرے میں ہی دری پر لیٹی بیلی کی سوتے ہوئے آنکھ کھلی۔

"دیکھو آمنہ! میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس گھر کی بیٹیاں زیادہ نہیں پڑھتیں۔ اور رہا شفیع تو وہ ویسے بھی بد دماغ ہے 'تھوڑا سخت 'تھوڑا نرم 'بہر حال میں اس سے بات کر لوں گا۔"

"لیکن میری بیٹیاں یہ امتحان ضرور دیں گی۔" ان کا لہجہ اٹل تھا۔

"آمنہ...!" محی الدین نے انہیں تنبیہاً پکارا۔

"نہیں محی الدین 'ماں اور بیٹی کی عزت سانجھی ہوتی ہے اور اسی سبب تو کہا جاتا ہے کہ بیٹیاں ماؤں کی پرچھائیاں ہوتی ہیں کیونکہ مائیں اپنی تمام تر ذہانت 'علم' دنیاوی و دینی باتیں 'تربیت کے پانی میں گھول کر پلا دیتی ہیں انہیں اور مجھے تو اپنی بیٹیوں کو دونوں جہاں میں سرخرو کرنا ہے... میں خود انہیں لینے جاؤں گی اور چھوڑنے بھی..." اور انہوں نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔

دادا کی غضب ناکی اور دادی کی ناراضی انہوں نے سب کو ہی پیچھے چھوڑ دیا مگر اس کا نتیجہ محی الدین کو بھگتنا پڑا۔

"محی الدین بڑوں کی اس قدر حکم عدولی 'ہم اپنے گھر میں نہیں سہ سکتے۔" باپ کی اس گرج پر وہ خاموش رہے اور فطرتاً بھی وہ نرم مزاج 'صلح جو شخص تھے۔

"تم اور تمہاری بیوی نے من مانی کی 'مگر ہم خاموش رہے فقط اپنی عزت کے سبب 'مگر یہ دو ہفتے ہماری جان جلا گئے ہیں 'خاندان کی عورت یوں گلیوں میں پھرے گی 'یہ ہم بہت ہمت سے برداشت کر گئے ہیں لیکن اب ہم کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تم دونوں میاں 'بیوی کے ساتھ ہمارا گزارہ نہیں... اپنا الگ کھاؤ پیو اور رہو 'پچھلے دالان والا حصہ... ہم نے خالی کر دیا ہے وہاں رہو گے تم اب۔"

وہ حق دق کھڑے رہ گئے اور آمنہ 'وہ خود بھی... ان کی اتنے سالوں کی خدمت 'خلوص و محبت کی یہ

قدر کی تھی انہوں نے۔۔۔ یہ دیکھا کہ بہو گلیوں میں پھری یہ نہیں سوچا کہ یہ کام اس نے اپنے شوق و خواہش کے لیے نہیں بلکہ ان کی نسل کی بقا کے لیے کیا تھا۔

"لیکن بابا جان! یہ سب آمنہ نے اس لیے کیا کہ مجھے ان دو ہفتوں میں شہر جا کر رکنا پڑا مال کی سپلائی کے لیے اور شفیع الدین تو ویسے ہی ناراض ہے پھر کون بچیوں کو لے کر جاتا۔۔۔ سلمان ابھی چھوٹا ہے۔"

اپنے باپ کے اس حکم کو روکنے کے لیے انہوں نے وضاحت دی۔۔۔ گڑگڑائے مگر وہ نرم نہیں پڑے اور رہیں اماں جان وہ کہاں شوہر کے فیصلوں پر کچھ کہنے کی جرأت کرتیں۔۔۔ جو کہا وہ پتھر پہ لکیر۔۔۔

"ہم کچھ نہیں جانتے' ذرا سے کہ کے فیصلہ وہی رہے گا۔" محی الدین کے لب بھینچے رہے اور آمنہ یونہی خاموش آنسو بہاتی رہیں کہ انحراف کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دو کمروں اور ایک کچن کے ساتھ بنے باتھ روم میں قابل ذکر وہ آدھا کچا اور آدھا پکا صحن تھا۔۔۔ ساتھ ہی آخری کونے میں بنا وہ کنواں۔۔۔ اور بے حد گھنے سایہ دار نیم کی ٹھنڈی چھایا تھی اور جس کے نیچے کھیلتے بیلی نے اپنا بچپن گزارا تھا۔۔۔ لیکن اس ہجرت نے اس کا کچا ذہن بدل ڈالا تھا۔۔۔ بھلے بھل طرح طرح کے سوالات۔

"ہم یہاں کیوں آگئے؟"

"چاچا' چاچی! یہاں کیوں نہیں ہیں ہمارے ساتھ؟"

دادا' دادی نے کیوں ہمیں یہاں بھیج دیا؟"

ایسے ہی لامتناہی سوالات کے سلسلے تھے جنہیں دونوں بہنیں خاموشی سے اور ماں۔۔۔ خوب صورتی سے ٹالتی رہیں۔۔۔

مگر نو سال کی عمر میں اس وقت ہونے والے معرکے کو وہ اس وقت سمجھنے لگی تھی جب چوتھی کلاس میں وہ تمتماتے چہرے کے ساتھ اپنا اعزازی تمغہ اور یہ چھوٹی سی ٹرافی ہاتھ میں لیے گھر آئی۔

یہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو یوں اسکول میں نمایاں ہوئی تھی۔۔۔ شان دار نمبروں سے پاس ہونے پر مگر گھر والوں کے رویے۔۔۔ ناقابل فہم۔۔۔

ماں بہنیں ذرا سا مسکرائیں۔۔۔ باپ نے سر پہ ہاتھ رکھا اور رہا بھائی تو وہ اپنی دنیا میں مست و مگن۔۔۔ اور بیلی کی چھوٹی سی دنیا وسعت میں بدلنے کو ہوئی۔ خاموش نظروں سے اپنے میڈل اور اعزازی تمغے کو دیکھا جسے تمام تر اساتذہ نے سراہا تھا کلاس فیلوز نے رشک و حسد سے دیکھا تھا۔۔۔ لیکن وہاں ملنے والی تمام تر پذیرائی گھر والوں کے سرد رویے میں ڈوبنے لگی۔

تب اس کے ذہن میں سوال ابھرا "کیوں۔۔۔؟" اور کیوں کا اک نقطہ سا ذہن میں گرا اور پھیلی سیاہی کی مانند بڑا ہوتا گیا۔

"کیا کرو گی اتنی جان کھپا کر' نہ کھانے کا ہوش' نہ پینے کا۔۔۔ تم نے کون سا ڈگری لینی ہے۔۔۔" دو سالہ بڑا بھائی سلمان صبح سے دیکھ رہا تھا اسے جو سب کچھ بھلائے اپنے پانچویں کے پرچوں کی تیاری میں گم تھی۔

جبکہ گھر میں دو بہنوں کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔۔۔

بیلی نے بے ساختہ سر اٹھایا۔۔۔ "کیوں میں کیوں نہیں لے سکتی ڈگری۔"

"یہ کارنامہ نہ دونوں پھوپھیاں کر پائیں اور نہ ہماری دونوں بہنیں تو پھر تم کیسے کر سکتی ہو۔۔۔ یہ ہمارے خاندان کی روایت نہیں ہے۔۔۔۔۔" وہ اس کے پاس رکھی چھلے ہوئے کینو سے بھری پلیٹ میں سے چند پھانکیں اٹھاتا چلا گیا لیکن جاتے جاتے ان خاندان کے مردوں کی زبان بول گیا۔۔۔ انداز بچکانہ تھا اور ذہن کچا۔۔۔

اور کچا ذہن صاف شفاف پانی کی طرح ہوتا ہے جس میں اگر ایک قطرہ بھی رنگ کا گرا دیا جائے تو وہ قطرہ تو کبھی واپس نہیں آسکتا۔ ہاں مگر شفاف پانی۔۔۔ تاعمر رنگ دار رہ سکتا ہے۔

یہی بات تھی جو سلمان کی شخصیت سے عیاں تھی

اس کی بات سے عیاں تھی۔۔۔ گھر بدل سکتے ہیں گھر والے بدل سکتے ہیں مگر روایات و اقدار کی جو گھٹی پلائی جا چکی تھی وہ نسل در نسل برقرار رہنے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

مگر بلی کے دماغ میں نہ جانے کیوں اس "نہ" کے آگے اپنی پھپھیوں اور بہنوں کی طرح فل اسٹاپ نہ لگ سکا۔۔۔ بلکہ ایک سوالیہ نشان رہ گیا۔ وجہ 'بنتی تھی کیا اس "حد" کی۔۔۔ وہ اپنی سوچوں میں ڈوبتے 'ابھرتے اس کے دن رات ۔۔۔ میں ایک دن ایسا طلوع ہوا جو اپنے ساتھ جواب لے آیا۔

اسکول میں پارٹی رکھی گئی۔۔۔ تیاریاں 'بات چیت پارٹی کے حوالے سے ہونے لگیں 'کس رنگ کے کپڑے 'جوتے 'میک اپ 'بال پن۔۔۔ کوئی شرارہ پہننے والا تھا کوئی غرارہ۔۔۔ بھرپور جشن منانے کا ارادہ تھا۔ اس نے گھر سے اجازت لی۔۔۔ تو منع ہو گیا۔۔۔ دل دکھا مگر فوراً" جواب دینے کی عادت نہیں تھی۔۔۔ لڑکیوں نے اس سے پوچھا تو اس نے منع کر دیا۔

"ارے یہ کیا بات ہوئی۔ ہمارا سارا گروپ آرہا ہے سوائے تمہارے ۔۔۔ کہو تو تمہیں گھر سے لے آئیں۔" پہلی بار وہ گڑبڑائی تھی۔

"ارے نہیں 'بس ہمارے ہاں اس طرح سے پارٹی وغیرہ میں جانے کی اجازت مشکل سے ملتی ہے۔"

"تو ہم کون سا گانے یا ڈانس کا مقابلہ کر رہے ہیں۔" ان کی ناراضی و بے زاری پر ان کی کلاس میں موجود ٹیچرز بھی چونک گئیں۔۔۔ اور انہیں سننے لگیں۔

"بھئی گھر والوں کی مرضی کے بغیر وہ اگر نہیں آسکتی تو تم لوگ فورس مت کرو۔" ٹیچر روبینہ نے نرمی سے کہا تھا۔

"مگر ٹیچر! صرف پارٹی ہی تو ہے۔۔۔" لڑکیوں کا دبا دبا اصرار تھا۔ الجھن تھی ان کے لہجے میں۔ تب ہی مس غزالہ نے بھی حصہ لیا تھا۔

"ارے بھئی۔ تم اسے مت کچھ کہو 'یہ محی الدین صاحب کی بیٹی ہے۔۔۔ اس کے خاندان والے ذرا سخت مزاج کے ہیں۔۔۔ ان کی بیٹیاں کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔" بات ایسی تھی کہ لڑکیوں نے بے دلی سے سر ہلایا اور ادھر ادھر بکھرنے لگیں لیکن وہ وہیں کھڑی تھی کہ مس روبینہ و غزالہ کے ساتھ کب سے خاموش کھڑی مس فریدہ نے اس گفتگو کو کسی کی ذات کے رکیدنے کا سبب بنا لیا۔

"اس طرح سے گھر والوں کو سختی نہیں کرنی چاہیے۔ اس طرح کے سخت ماحول میں پلی بڑھی لڑکیوں پر اس سختی کے منفی اثرات بھی پڑ سکتے ہیں۔۔۔ پھر وہ رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔۔۔ اس جگہ سے فرار کے لیے جہاں نہ رہنے کی آزادی ہوتی ہے اور نہ ہی پڑھنے کی۔" اور ان جملوں نے بلی پر وہیں کھڑے کھڑے اسے نو سال کی عمر میں پہنچا دیا جہاں اس کے چاچا شفیع الدین اس کی بہن پر چیخ رہے تھے۔

"یہ کاجل کیوں ڈالا ہے آنکھ میں تم اسکول جا رہی ہو یا بر ڈھونڈنے۔"

اور اب وہ اس کے معنی 'سبق و اسباق سمیت سمجھ چکی تھی۔ برسوں پرانی پہیلی آج بوجھ لی تھی۔

یہ کس قسم کا خوف تھا اور کس قسم کی احتیاطی تدابیر تھیں۔۔۔ وقت کا گول سکہ دھیرے دھیرے بڑھتا بھی اس کی اس بے چینی کو دور نہ کر پایا۔۔۔

اسے اعزازات ہر سال ملتے اور وہ لا کر خاموشی سے رکھ دیتی 'کبھی میز کی دراز میں 'کبھی اپنی الماری میں اور کبھی کچن میں بنے اسٹور میں۔۔۔ وہ چاہ کر بھی اس حقیقت کو نہ مان سکی کہ اگر آگے بڑھنا نہیں ہے کوئی راستہ 'کوئی شاہراہ ایسی نہیں ہے 'جس کا رستہ اس کے گھر سے نکل سکتا ہو تو وہ اس محنت سے جی چرا لے جو علم کے لیے اور جو اس کے جینے کی وجہ تھی۔۔۔ سبب تھی اس کی ذات کی سرخروئی کا۔۔۔

اپنے ہر عمل میں خاموش 'ایک وقت ایسا آ ہی گیا جو اس خاندان کے در و دیوار کو ہلا دینے کا سبب بن گیا۔۔۔

☆ ☆ ☆

بہت ساری خوبیوں اور خامیوں کے مرکز

ظہیرالدین کے خاندان میں اخلاق و کردار کی کمی نہیں تھی۔

اور اس میں ایک یہ بھی شامل تھی۔۔۔

"میں بھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گی جس سے خاندان میں سب کو شرمندگی اٹھانی پڑے۔" بڑھتے وقت کے ساتھ وہ روز ایک گانٹھ باندھتی، پھر ایک اور دن ایک اور گانٹھ اور ان سالوں میں اس میں اتنی مضبوطی آگئی کہ جن دنوں اس کے آٹھویں کے امتحانات کا شور اٹھا انہی دنوں کی ایک سہ پہر کھانا کھاتے باپ کے سامنے جا ٹھہری۔

"بابا۔۔۔" اور اس معصوم و حسین آواز پر سیل فون کان سے لگائے محی الدین چونکے، حیرت سے سامنے کھڑی اپنی نوعمر بیٹی کو دیکھا جو سال کے شاید دو دن ہی ان سے ملتی تھی، ایک میٹھی عید اور دوسری بقر عید۔۔۔ تو پھر آج کون سا خاص دن تھا مگر جو بھی تھا انہیں اک عجب سی خوشی ہوئی، اتنی کہ سیل فون پر بات ادھوری چھوڑ کر اسے ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔

"ہاں بھئی کہو میرا بچہ۔۔۔" شفقت، محبت، لاڈ۔ بیلی کا حوصلہ بڑھا۔

"وہ میرے ایگزام ہونے والے ہیں آٹھویں کلاس کے بابا۔"

"اچھا تو کچھ چاہیے۔۔۔" اس کا چہرہ دیکھتے محبت سے پوچھا اور اسے جو چاہیے تھا وہ اس پر خاموش ہی رہی تو وہ دوبارہ کہنے لگے۔ "ٹھیک بھئی ابھی کچھ چاہیے تو بولو۔۔۔ پھر اس کے بعد تو تم کو میں سلائی کڑھائی سیکھنے کے لیے بہترین کورا، زری اور پوتھ کے موتی لا کردوں گا، بنارسی اور ہر رنگ کا کپڑا جو تم چاہو۔۔۔ ٹھیک ہے یا پھر ریڈی میڈ لینا چاہو تو وہ بھی دلا دوں گا۔" آخری جملہ سرگوشی سے اس کے کان میں کہا تھا مگر ان میں سے ایک لفظ بھی اسے کوئی خوشی نہیں دے سکا۔

"نہیں بابا! مجھے یہ سب نہیں چاہیے، مجھے، مجھے آگے پڑھنا ہے۔۔۔" بولتے، اٹکتے نگاہ اٹھائے بغیر وہ کہہ گئی تو پہلے باپ کا ہاتھ اس کے شانوں سے ہٹا اور پھر اس کی جلی نظر اٹھی۔۔۔ تو کچھ دیر پہلے والے شفیق بابا لمحے میں بدل گئے۔

وہ اب ظہیرالدین کے بیٹے محی الدین لگے۔۔۔ اتنی سنجیدگی، اتنی سرد و تیز بلا نظر۔۔۔

"نہیں بیٹا! تم آگے نہیں پڑھ سکتیں۔۔۔" وہ بولے تو لہجے میں کہیں نرمی باقی تھی مگر گرمی ذرا زیادہ تھی۔

اس کے لب بے آواز ہلے۔۔۔ "بابا۔"

"میرے باپ نے بھی کبھی اپنی بات نہیں دہرائی، سو مجھے بھی بات دہرانے کی عادت نہیں ہے بیٹا۔۔۔ جو مانگو گی، ملے گا سوائے اس "ایک" کے، میں نہیں چاہتا کہ اب اس عمر میں یہ گھر بھی چھوڑ کر نکل جاؤں۔"

انہوں نے اپنی بات کی۔ کھانے سے ہاتھ کھینچا اور اٹھ کر چلے گئے، پیچھے وہ گم صم رہ گئی۔

اس قدر گم صم و خاموش کہ اسباب زندگانی سے ہی دور ہونے لگی، کھانے بیٹھتی تو کھایا نہیں جاتا، پڑھنے بیٹھتی تو دل اچاٹ سا ہونے لگتا۔۔۔ کیونکہ آگے کا راستہ کسی اندھی گہری کھائی کی طرح سیاہ تھا۔

رات کے گرم اندھیرے میں صحن میں دری بچھائے چت لیٹے سیاہ ہوتے آسمان کو تکتی۔۔۔

"آخر لڑکیوں کو ہی کیوں روکا جاتا ہے پڑھنے سے، یہ کیسی روایات ہیں، جو علم حاصل کرنے سے روکتی ہیں۔ غصہ و جبر کی یہ کون سی انسانی شکل ہے یا یہ طاقت و برتری کا گھمنڈ ہے، جو ایک صاف شفاف پانی پینے سے ہی روک دیتا ہے۔۔۔" اس کا صاف معصوم ذہانت سے بھرپور ذہن خواب و خواہش کی حد سے آگے بڑھنے لگا اتنا کہ یہ فقط ایک رات نہ رہی۔

"یہ سب سیاہ آسمان ہیں، چمکتے تارے نہیں۔۔۔ دن میں بکھرے رنگ برنگے اجالوں سے خوب صورت، اپنے ظاہری انداز سے، اپنی محبت و شفقت سے مگر ذہنی عقل میں سیاہ بدنما داغ ہے۔۔۔" ایک اور ذہنی سفر۔۔۔ کروٹ کے بل لیٹ کر دیکھنے جیسا انداز۔۔۔ جب چیزیں اپنی حیثیت میں صاف دکھائی دیتی بھی ہیں اور نہیں بھی۔۔۔ ہوائیں ڈولتی، ابھرتی پتنگ جیسا، ندی میں

ڈولتی ناؤ کے جیسے۔ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ذات کے کس بہاؤ میں تھی۔

وہ خاموش تھی تو اس نے اخذ کیا کہ سمجھ گئی مگر وہ اپنی سمجھ سے بہت دور بہہ چلی گئی تھی۔

اور یہ دوری اس رات واضح ہوئی جب اچانک ہی گہرے بادلوں کے سائے سیاہ آسمان پہ دور دور بکھرنے لگے اور چاند نے بھی اپنی آنکھ مچولی کا کھیل شروع کر دیا۔ اور جس کی روشنی فلیش لائٹ کی طرح صحن میں کبھی پڑتی تو روشنی ہو جاتی اور کبھی اندھیری کا راج بکھر جاتا۔

"میں پڑھنا چاہتی ہوں، علم حاصل کرنا چاہتی ہوں اور علم ہے کیا، ایک سمندر، ایک پیاس، جس کی خواہش نہیں مٹتی، جیسے مجھ سے ختم نہیں ہو رہی۔ لیکن مجھے اسے ختم کرنا ہے۔ کیونکہ میں چاہے کتنی کوشش کرلوں میں اپنے اس خواب کو سچ ہوتے نہیں دیکھ سکتی، اپنی خواہش کو مار نہیں سکتی لیکن اپنی علم کی پیاس کو ضرور "ختم" کر سکتی ہوں۔" اس نے اپنی خشک ہوتی زبان کو سختی سے منہ میں ہی بھینچ لیا۔

بنا آہٹ وہ اٹھی اور اندر چلی گئی اور اس کا جانا کیسا تھا!

خواب کے جیسا۔

چند لمحوں بعد وہ واپس آئی تو ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا۔

پکا صحن پار کرتے وہ کچے میں اتر آئی۔ دھیمے دھیمے سے قدم کوئی جلدی نہیں۔ کوئی تیزی نہیں۔

اور اس میں نیم کی ٹھنڈی چھاؤں بھی پیچھے رہ گئی۔

اور وہ اس گول کھلے منہ کے اندھیرے غار جیسے دہانے پر جا کھڑی ہوئی۔

"جس مشکل میں پھنسی ہوئی ہوں اسے یہی ایک راستہ نکال سکتا ہے۔" اس نے ساکت لٹکے ڈول کی رسی کا سرا پکڑ کر کھینچا اور اسے زمین پر رکھتے اس میں اپنا بھرا تھیلا خالی کر دیا اور ڈول اس کے اعزازی تمغات سے بھر گیا۔ لیکن اپنی اس ناقدری کا شور بھی مچا گیا۔ جس پر آمنہ کی آنکھ کھل گئی۔

اور ان ہی تمغوں میں سے سب سے اوپر اس ستارے نما میڈل۔ کو جب چاند نے حیرت سے دیکھا تو اس پر پڑتی روشنی کی تمام تر چمک محی الدین کی آنکھوں پر پڑی ان کی نیند کو بے چین کر گئی۔ جسے شور بھی نہ ختم کر پایا تھا۔ بے چین ہو کر اٹھتے ان دونوں نفوس نے حیرت سے کنویں کے پاس کھڑی بلی اور اس کے پاس رکھے ڈول کو دیکھا جو لبالب بھرا ہوا تھا۔

منظر تھا کہ طلسم کدہ۔ وہ نہ اٹھ سکے نہ لیٹے رہ سکے۔

اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے بلی نے ڈول اٹھایا اور کنوئیں میں چھوڑ دیا ساتھ اس کے وجود کو بھی ایک جھٹکا لگا تھا وہ ہل کر رہ گئی تھی اپنی جگہ سے۔

"بلی۔" ایک چیخ تھی جو آمنہ کے منہ سے نکلی تھی اور اس ہیجان خیز چیخ پر طلسم ٹوٹا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگی تھیں کنوئیں کی طرف اور محی الدین ساکت کھڑے تھے۔ کیونکہ ایک بے حد سخت ہاتھ پڑا تھا وہ بھی سیدھا ان کے حلق پر جو انہیں بے جان کھڑے قد کا مجسمہ بنا گیا تھا۔

لوگ آ رہے تھے، جا رہے تھے اور ان کے چہروں پر ٹھہرے عکس۔ جیسے بے حد حیرت کا، تعجب کا، تاسف کا، غصے کا۔

"ایسا قدم اٹھانے سے پہلے کوئی سو دفعہ سوچے۔"

غصے کا عکس۔

"ایسا عمل نہ کبھی اس خاندان میں کسی نے کیا نہ ہم نے دیکھا و سنا۔" تاسف کا عکس۔

"مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی ہمت آ کیسے گئی۔ لڑکی ذات اور ایسا عمل۔" تعجب و حیرت کے عکاس۔

لیکن عکس در عکس ان چہروں سے اب کسی کو بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اس فرق کی حد بندی کی باریک سی لکیر کو عبور کر گئے تھے تو کیا ڈر اور خوف۔

محی الدین کے جھکے چہرے سے آنسو ٹپکے تھے۔

آمنہ کی سرخ و گلابی رنگوں سے مزین آنکھ میں

آنسو بے چین تھے۔۔۔ بے بس تھے کہ انہیں راہ نہ مل رہی تھی۔۔۔
کیونکہ یہ آنسو یہ آنسو اک بوجھ و دکھ سے آزاد ہو جانے کے بعد خوشی کے تھے۔۔۔
اسی لمحے و اسی پل میں محی الدین کے جھکے چہرے پر سایہ سا پڑا تھا۔
بے حد لمبا و گہرا۔۔۔ انہوں نے جھکا سر اٹھایا۔۔۔
"مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہیں تھی محی الدین کہ تم باپ کو یوں بھری دنیا و خاندان میں نیچا دکھاؤ گے۔۔۔"
غضب سے بھرے ظہیر الدین کو شفیع الدین نے سہارا دیتے طنزیہ و خشمگیں نگاہوں سے بڑے بھائی کو دیکھا۔
صحن میں ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔
"آج تک مجھ سمیت خاندان کے کسی بھی فرد نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا جس سے خاندان کی عزت پر حرف آسکے اباجان۔"
"تو پھر یہ کیا ہے۔۔۔" ظہیر الدین نے لب بھینچے ان کے دائیں طرف اشارہ کیا جہاں بلبلی سفید لباس میں ملبوس تھی۔۔۔
محی الدین نے چونک کر ان کے اشارہ کرتے ہاتھ کی سمت دیکھا اور پھر چند لمحے یونہی کھڑے وہیں دیکھتے رہے۔۔۔ اور پھر اپنے قدم وہیں بڑھا دیے۔
ظہیر الدین اور شفیع الدین کے چہروں پر اطمینان سا اترنے لگا۔ اور آمنہ منہ کھولے انہیں لحظہ بہ لحظہ بلبلی کی طرف بڑھتے دیکھ رہی تھیں۔۔۔ اور دم سادھے بلبلی نے انہیں دیکھا پھر اپنے اطراف کے لوگوں کو لیکن محی الدین خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑتے اسے اپنے باپ کے سامنے لے آئے۔

"بیٹیاں، بیٹوں کی بہ نسبت باپ کی عزت و مرتبے کی زیادہ لاج رکھتی ہیں اباجان۔۔۔ اور خاص طور سے وہ بیٹیاں جو ضبط نفس رکھتی ہیں۔" نرم نگاہوں سے بلبلی کو دیکھا "میری بیٹی کی خواہش علم ہے جس نے اسے ضبط نفس دیا۔۔۔ میری بات کی لاج رکھنا سکھایا، پھر میں اس کا پڑھنے کا شوق کیوں پورا نہیں کر سکتا۔" آمنہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بلبلی کے چمکتے چہرے کو دیکھا

جس نے انسانی ذہنی حد کی سوکھی زمین ہری کردی تھی۔۔۔ پیش رفت بہار گل تھی۔۔۔
"محی الدین! تم پچھتاؤ گے۔۔۔"
"کبھی نہیں۔۔۔" مضبوط لہجے میں اپنے چھوٹے بھائی کو جواب دیتے بلبلی کو دیکھا۔ جو سر اٹھائے مطمئن کھڑی اپنے باپ کو اپنے لیے جنگ لڑتا دیکھ رہی تھی۔ ان کے دیکھنے پر مسکرائی تو اک طاقت و زندگی ان کے اندر دوڑا تھی۔
"میرا تم سے اور تمہارے خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔" ظہیر الدین نے فیصلہ سنا دیا تھا۔۔۔ اب مہر لگنا لازمی تھی مگر اس سے پہلے ہی محی الدین کے الفاظ انہیں جما گئے۔
"تعلق تب ہی ٹوٹتے ہیں اباجان! جب زندگی و موت کے بیچ سے روح نکل جاتی ہے۔۔۔ آپ کا احترام و حکم اپنی جگہ مگر میں اپنی بیٹی کی زندگی میں ابھرتی پیاس کو اس کی موت سے نہیں قلم کی نوک سے بجھانا چاہتا ہوں۔۔۔ چلو بلبلی۔۔۔ تمہیں ہاسٹل چھوڑ آؤں۔۔۔ بیگ لے آؤ اندر سے۔۔۔" پلٹتے ہوئے بلبلی نے بیگ لیا اور ان کے ساتھ آگے بڑھتی دہلیز پار کر گئی۔۔۔ مگر جانے سے پہلے اک نظر کنوئیں پر ڈالی تو آنکھیں نم ہوئیں اور اس سیاہ رات کا منظر تازہ۔۔۔
آمنہ کا جلال بھرا خوف زدہ تھپڑ اور اس کا سکتہ۔
"یہ کیا کر رہی تھیں تم ابھی گر کر مر جاتیں۔"
"میں تو بس اپنے علم کی پیاس بجھا رہی تھی۔"
بلبلی کا معصوم جملہ تھا یا اک تیز دھار آری۔۔۔ لمحوں میں ان کے بت بنے وجود کے پرخچے اڑ گئے تھے اور محی الدین کے ذہن کے گرد کھڑی روایات اقدار کی دیواریں لمحوں میں گھن کھائی لکڑی کی طرح زمین بوس ہو گئیں۔
فہم و ادراک کے ان لمحوں کا کوئی مول نہیں ہوتا جو انسان کی سوچ کو وہ وسعت دے جائے جس کا حدود اربع علم کے سمندر سے بھی وسیع ہو جائے جس قدر بھی بڑھے تشنگی سے سیرابی کا سفر کبھی رکتا نہیں بہتے دھارے سا رواں رہتا ہے۔۔۔ ہے ناں۔۔۔!!



اُسے میں نے ہی لکھا تھا کہ

لہجے برف ہو جائیں تو پگھلا نہیں کرتے

پرندے ڈر کے اُڑ جائیں تو لوٹا نہیں کرتے

اُسے میں نے ہی لکھا تھا

یقیں اُٹھ جائے تو شاید کبھی واپس نہیں آتا

ہواؤں کا کوئی طوفاں کبھی بارش نہیں لاتا

اُسے میں نے ہی لکھا تھا کہ ...!

شیشہ ٹوٹ جائے تو پھر کبھی جڑ نہیں پاتا

جو رستے سے بھٹک جائے، کبھی مڑ نہیں پاتا

اُسے کہنا!

وہ بے معنی ادھورا سا خط اُسے میں نے

ہی لکھا تھا

اُسے کہنا

دیوانے کبھی مکمل خط لکھا نہیں کرتے

نادیہ ارشد

نہ ہوئی ہم سے شب بسر نہ ہوئی
کس سے پوچھیں کہ کیوں سحر نہ ہوئی

بزم میں یہ ادا ہم ہی سمجھے
سب کو دیکھا ادھر نظر نہ ہوئی

اے مرا حال پوچھنے والے
تجھ کو اب تک مری خبر نہ ہوئی

وہ اسی زندگی پہ مرتے ہیں
جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی

کیسے کیسے ستم ہوئے تجھ پر
کیوں مرے دل، تجھے خبر نہ ہوئی

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

خوش رہیں وہ یہ مدعا تھا عزیز
نہ ہوئی زندگی بسر نہ ہوئی

عزیز لکھنوی





روز و شب کے سلائے ہیں
ان پہ جب بہار آئے
باغباں کی رکھوالی
اور جھنڈ پیڑوں کے
اس قدر نہ ہوں گھیرے
یہ نہ ہو شگوفوں کے
دم ہی گھٹ کے رہ جائیں
زندگی بوجھ بن جائے
خوشبوئیں سزا ٹھہریں
سرد، زرد سوچوں میں
وہ سمٹ کے رہ جائیں
لڑکیاں ہیں پھلواری
لڑکیوں کو کھلنے دو
پھول اور شگوفوں پر
تتلیاں تو آتی ہیں
تتلیاں ضروری ہیں
خواب گر نہ دیکھیں تو
لڑکیاں ادھوری ہیں

فرحت زاہد

بچھڑنا ہے تو خوشی سے بچھڑو
سوال کیسے، جواب چھوڑو
کسے ملی ہیں جہاں میں خوشیاں
کسے ملے ہیں عذاب، چھوڑو
نئے سفر پہ جو چل پڑے ہو
مجھے خبر ہے کہ خوش بڑے ہو
یہ کون اجڑا تمہارے پیچھے
یہ کس کے ٹوٹے ہیں خواب، چھوڑو
محبتوں کے تمام وعدے نبھائے کس نے
بھلائے کس نے؟
تمہیں پشیمانی ہو گی جاناں
جو میری مانو حساب چھوڑو!

محمد اطہر طاہر





رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوجبیرہ بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔

"یہ آیت ہم انصاریوں کے بارے میں نازل ہوئی:
"ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہجرت کرکے) ہمارے پاس تشریف لائے اور ہمارے ایک ایک آدمی کے دو دو، تین تین نام ہوتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات انہیں ان ناموں سے پکارتے تو عرض کیا جاتا۔
" اے اللہ کے رسول! وہ اس نام سے ناراض ہوتا ہے۔"

تب یہ آیت نازل ہوئی۔
" ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھو۔"

فوائد و مسائل،

1- کسی کو ایسے نام یا لقب سے نہیں پکارنا چاہیے جو اسے ناگوار ہو۔

2- مسلمان کو دوسرے مسلمان کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے اور بلاوجہ ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے اس کے جذبات مجروح ہوں۔

صحیح طریقہ،

ایک ڈاکٹر اور ایک پادری ایک دوسرے کے پیشے کو نشانہ بنا رہے تھے۔ باتوں باتوں میں پادری نے شہر کی ایک معزز شخصیت کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو ڈاکٹر نے کہا۔

"صاف بات تو یہ ہے کہ انہیں مجھ سے زیادہ تمہاری ضرورت ہے۔"

پادری نے فکر مند ہو کر کہا۔ "اچھا کیا ان کی طبیعت اتنی زیادہ خراب ہے؟"

ڈاکٹر بولا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے آپ تقریر بہت اچھی کرتے ہیں۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے سو جائیں۔ مگر وہ ہیں کہ ان کو نیند ہی نہیں آتی۔"

عینی سحر۔ ہری پور

لفظ باتیں کریں،

☆ سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے اور اسے متاثر کرنے کی خواہش ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے اور نہ خوش۔

☆ سیدھے سادے انسان کے لیے زندگی آسان اور سمجھ دار کے لیے زندگی مشکل ہوتی ہے۔

☆ مبالغہ ایک حقیقت ہے جس کی فطرت قابو سے باہر ہوتی ہے۔

☆ بڑے سے بڑے غنی اور بڑے سے بڑے فقیر کے درمیان حدِ فاصل ایک دن کی بھوک اور ایک دن کی پیاس ہے۔

(خلیل جبران)

زارا ڈوگر۔ گوجرانوالہ

فضول کام،

ایک معیاری پرچے کے مدیر کو ایک لڑکی کی لکھی ہوئی کہانی موصول ہوئی۔ مدیر نے لکھا۔

" محترمہ! آپ کی کہانی ہمارے معیار پر پوری اترتی ہے، بڑی دلچسپ بھی ہے، ہم اس کو شائع کر رہے ہیں اور معاوضہ بھی بھیج رہے ہیں لیکن آپ کی تحریر پڑھنے میں سخت دشواری ہوتی ہے۔ براہ کرم آپ ٹائپ شدہ مسودہ بھجوایئے۔"

لڑکی کی طرف سے جواب ملا۔ "مجھے ٹائپ کرنا آتا

تم ہی اپنا وقت کہانیاں لکھنے میں ضائع کرتی ہو؟"

لوک داستانیں،

پنجاب کی ثریجڈی یہ ہے کہ اس کے پاس جتنے لیجنڈ عاشق ہیں، سب مردہ ہیں۔ ہیر رانجھا بھی ان میں سے ہیں۔ کیدو ایسی کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ اسے کیدو اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی زندگی کا اصول تھا جو دیکھو سب کہہ دو۔ پنجاب کی لوک داستانیں پڑھ کر لگتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی جدائی کا آغاز محبت سے اور اختتام بھی محبت سے ہوتا ہے اور نئی نسل کو اس سے بچانے کا ایک طریقہ ہے کہ اسے نصاب میں شامل کر دیا جائے۔

(ڈاکٹر یونس بٹ۔ بٹ صورتیاں)

فوزیہ ثمر بٹ۔ آمنہ رئیس۔ گجرات

انصاف اور قانون،

بادشاہ نے گدھوں کو قطار میں چلتے دیکھا تو کمہار سے پوچھا۔

"تم انہیں کس طرح سیدھا رکھتے ہو؟"

کمہار نے جواب دیا کہ جو بھی گدھا لائن توڑتا ہے تو اسے سزا دیتا ہوں۔ بس اسی خوف سے یہ سب سیدھا چلتے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا: کیا تم میرے ملک میں امن قائم کر سکتے ہو؟"

"کمہار نے ہامی بھر لی۔ شہر آئے تو بادشاہ نے اسے منصف بنا دیا۔

کمہار کے سامنے ایک چور کا مقدمہ لایا گیا۔ کمہار نے فیصلہ سنا دیا کہ چور کے ہاتھ کاٹ دو۔

جلاد نے وزیر کی طرف دیکھا اور کمہار کے کان میں بولا۔

"جناب یہ وزیر صاحب کا خاص آدمی ہے۔"

کمہار نے دوبارہ کہا۔ "چور کے ہاتھ کاٹ دو۔"

اس کے بعد خود وزیر نے کمہار کے کان میں سرگوشی کی۔ "جناب تھوڑا خیال کریں۔ یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

کمہار بولا: "چور کا ہاتھ اور وزیر کی زبان دونوں کاٹ دو۔"

کمہار کے صرف ایک فیصلے کے بعد پورے ملک میں امن قائم ہو گیا۔"

آمنہ محمد نوید۔ چیچو کی ملیاں

رونے کے انداز نرالے،

* عرب کی خواتین:۔ چہرہ ڈھانپ کر روتی ہیں۔
* عراق کی خواتین:۔ چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر آنسو بہاتی ہیں۔
* اٹلی کی خواتین:۔ اپنے سر کو دوسرے کے کندھے پر رکھ کر روتی ہیں۔
* امریکہ کی خواتین:۔ سر کو گھٹنے پر مار کر روتی ہیں۔
* جرمنی کی خواتین:۔ چہرے پر غمگین کیفیت طاری کر لیتی ہیں۔
* جاپانی خواتین:۔ چیخ چنگھاڑ کر روتی ہیں۔
* نیوزی لینڈ کی خواتین:۔ آنسو بہانا پسند نہیں کرتیں، صرف رونی صورت بناتی ہیں۔
* بھارتی خواتین:۔ بال بکھیر کر اور بین کر کے روتی ہیں۔
* پاکستانی خواتین:۔ یہ تمام انداز اپنا لیتی ہیں لیکن خاص انداز یہ ہے کہ خود نہیں روتیں بلکہ اپنے شوہر اور سسرال والوں کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ہیں۔

نادیہ، نجمہ۔ گلستان جوہر

انسان کا دل،

عبادتیں، ان کا تقدس، اور اہمیت اپنی جگہ لیکن کسی انسان کا دل راضی کرنا سب اہمیتوں سے زیادہ اہم ہے۔

(واصف علی واصف)

بھید،

سلطان مراد نے ایک رات بڑی گھٹن اور تکلیف میں گزاری لیکن وہ اس کا سبب نہ جان سکا۔ اس نے

اپنے سیکیورٹی انچارج کو بلایا اس کو اپنی بے چینی کی خبر دی۔ بادشاہ کی عادت تھی کہ وہ بھیس بدل کر عوام کی خبر گیری کرتا تھا۔ بولا۔

"چلو کچھ وقت لوگوں میں گزارتے ہیں۔"

شہر کے ایک کنارے پر پہنچے تو دیکھا ایک آدمی گرا پڑا ہے۔ بادشاہ نے اسے ہلا کر دیکھا تو مردہ انسان تھا۔ لوگ اس کے پاس سے گزرے جا رہے تھے۔

بادشاہ نے لوگوں کو آواز دی۔

"ادھر آؤ بھئی۔" لوگ جمع ہو گئے اور وہ بادشاہ کو پہچان نہ سکے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ بادشاہ نے کہا۔

"آدمی مرا ہوا ہے۔ اس کو کسی نے کیوں نہیں اٹھایا، کون ہے یہ اور اس کے گھر والے کہاں ہیں؟"

لوگوں نے کہا "یہ بہت بڑا اور گناہ گار انسان ہے۔"

تو بادشاہ نے کہا۔

"کیا یہ امت محمدیہ میں سے نہیں ہے۔ چلو اس کو اٹھاؤ اور اس کے گھر لے چلو۔"

لوگوں نے میت گھر پہنچا دی۔ اس کی بیوی نے خاوند کی لاش دیکھی تو رونے لگی۔ لوگ چلے گئے۔ بادشاہ اور اس کا سیکیورٹی انچارج وہیں کھڑے عورت کا رونا سنتے رہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میں گواہی دیتی ہوں۔ بے شک تو اللہ تعالیٰ کا ولی ہے اور نیک لوگوں میں سے ہے۔"

سلطان مراد بڑا متعجب ہوا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لوگ تو اس کے متعلق یہ باتیں کر رہے تھے اور اس کی میت کو ہاتھ لگانے کو تیار نہ تھے۔"

اس کی بیوی نے کہا "مجھے بھی لوگوں سے یہی توقع تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ میرا خاوند ہر روز شراب خانے جاتا۔ جتنی ہو سکے شراب خریدتا اور گھر لا کر گڑھے میں بہا دیتا۔ اور کہتا کہ چلو کچھ تو گناہوں کا بوجھ مسلمانوں سے ہلکا ہو۔"

اسی طرح رات کو ایک بری عورت کے پاس جاتا اور اس کو ایک رات کی اجرت دے دیتا اور اس کو کہتا کہ اپنا دروازہ بند کر لے۔ کوئی تیرے پاس نہ آئے۔" گھر آ کر کہتا۔ الحمدللہ! آج اس عورت کا اور نوجوان مسلمانوں کے گناہوں کا میں نے کچھ بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔

لوگ اس کو ان جگہوں پر آتا جاتا دیکھتے تھے۔ میں اسے کہتی تھی کہ یاد رکھ! جس دن تو مر گیا لوگوں نے تجھے غسل دینا ہے نہ تیری نماز جنازہ پڑھنی ہے۔ اور نہ تجھے دفنانا ہے۔

وہ مسکرا دیتا اور مجھ سے کہتا کہ گھبرا مت تو دیکھے گی کہ میرا جنازہ وقت کا بادشاہ، علماء اور اولیا پڑھیں گے۔"

یہ سن کر بادشاہ رو پڑا اور کہنے لگا۔

"میں سلطان مراد ہوں۔ کل ہم اس کو غسل دیں گے۔ ہم اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائیں گے اور اس کی تدفین بھی ہم کروائیں گے۔"

چنانچہ اس کا جنازہ بادشاہ، علماء اولیاء اور کثیر عوام نے پڑھا۔

آج ہم بظاہر کچھ دیکھ کر یا محض دوسروں سے سن کر اہم فیصلے کر بیٹھتے ہیں۔ اگر ہم دوسروں کے دلوں کے بھید جان جائیں تو ہماری زبانیں گونگی ہو جائیں۔

ثمرہ اقرا۔ کراچی

حسرت

حاصل اور لاحاصل کے دائروں میں سب گھوم رہے ہیں۔ حاصل کی ناقدری اور لاحاصل کی حسرت ختم ہی نہیں ہوتی۔

رویہ

لاشعوری طور پر لوگوں کا رویہ آپ کے ساتھ آپ کے لباس کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا کوشش کیجیے کہ آپ کا لباس صاف ستھرا اور باوقار ہو۔



خالدہ جیلانی



ویجیہ حبیب ____ عبدالحکیم

کتنی دلکش ہے اس کی خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

فوزیہ ثمر بٹ ____ گجرات

تو سمندر ہے تو اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

نخبہ اکرم ____ گاؤں گوٹیکی

لہجے کے بعد اب وہ بدلتا نگاہ بھی
رستہ بدل کے ہم اُسے حیران چھوڑ آئے

سیدہ لوبا سجاد ____ کہروڑ پکا

تیرے بغیر گزرتا نہیں تھا اک پل بھی
تیرے بغیر مگر زندگی گزاری ہے

ارم ذوالفقار، ____ کراچی

کبھی پیغام اُلفت، کبھی مجھ سے بدگمانی
تیری یہ بھی مہربانی، تیری وہ بھی مہربانی

سارا ملک ____ خانیوال

مجھے تھا زعم، میں بکھر گیا محسن
وہ ریزہ ریزہ تھا مگر اپنے اختیار میں تھا

عائشہ جہانگیر مرالی ____ کبیر والا

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

فرحانہ ____ گوجرہ

فرصت قلیل اور کہانی طویل ہے
باتیں تو ہیں ہزار مگر جانے دیجیے

سدرہ، سعدیہ، صبا سلیم ____ قیوم آباد

دیوار خستگی ہوں مجھے ہاتھ مت لگا
میں گر پڑوں گا دیکھ سہارا نہ دے مجھے

خالدہ ____ گاؤں اوکھا

کتنا آسان تھا تیرے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے
اُس کی وہ جانے اُسے پاس وفا تھا کہ نہ تھا
تم فراز اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

آمنہ اُجالا ____ ڈہرکی

سفر کے باب میں کتنے عجیب لوگ ہیں ہم
کہاں کا قصد کیا چل پڑے کہاں کے لیے
ہوا پہ لکھا ہوا حرف ہی سہی دُنیا
تمام رنگ اسی نقش رائیگاں کے لیے

انجل ____ ڈہرکی

ملے ہیں بعد مدت کے، بلا کے سرد ہیں لہجے
کہ جلنا بھی نہیں ممکن، پگھلنا بھی نہیں ممکن
بہت ناکامیاں لے کر ہوا ہوں خاک کا قیدی
چلو اب آج سے گھر سے نکلنا بھی نہیں ممکن

آمنہ اُجالا ____ ڈہرکی

میرے قصے میں تو تم آتے ہو
میرے حصے میں کیوں نہیں آتے؟

گڑیا راجپوت ____ جاتری

اب جان ہی دینے کی باری ہے محسن
میں کہاں تک ثابت کروں کہ وفا مجھ میں ہے

نبیلہ ناز بھٹینگ ____ موڑ الہ آباد

زندگی ایک گہری، کڑوی، لمبی سانس
دوست پہلے جی تو لیں، مرنا تو ہے

ثناء عبدالقیوم ____ بنکہ چیمہ

یہ کناروں سے کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشا ہو
بندہ پرور جو ہم پہ گزری ہے
ہم بتائیں تو کیا تماشا ہو

عائشہ رباب ______ کراچی

فریاد کر رہی ہے تری ہوئی نگاہ
دیکھے ہوئے کسی کو زمانہ گزر گیا

عفیفہ فاطمہ ______ بہاولپور

تو کسی در پہ گیا ہو تو خبر ہو تجھ کو
کس قدر کار اذیت ہے سوالی ہونا

اقراء نجیب ______ وہاڑی

مجھے تو آتا ہے لطف اب راتوں کو جاگنے میں وصی
تنہائیاں جب دوست بن جائیں تو اندھیرے بھی اچھے لگتے ہیں

سیدہ نیست زہرا ______ کہروڑ پکا

مجھے سعد تجھ سے گلہ، کہ میں خود ہی تجھ سے ملا نہیں
مری زندگی بھی عذاب ہے، تیری زندگی بھی عذاب ہے

حورین زینب ______ کہروڑ پکا

گزر گئے جو خوشبوئے رائیگاں کی طرح
وہ چند روز میری زندگی کا حاصل تھے

شاہدہ ظفر ______ کراچی

خاک اڑاتے ہوئے بازاروں میں دیکھا سب نے
میں کبھی گھر سے نکلتا بھی نہیں تھا شاید
زیست کرنے کے سب انداز اسے ازبر تھے
مجھ کو مرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا شاید

بریرہ اکرام ______ کراچی

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

گڑیا شاہ ______ کہروڑ پکا

کوئی پل ہو تیرے ساتھ کا میری عمر بھر کو سمیٹ لے
میں فنا بقا کے سارے سفر اسی ایک پل میں گزار دوں

حورین زینب ______ کہروڑ پکا

وہ جن کا پیار تھا نظروں کی کائنات کبھی
قریب آکے وہی دل کے شہر لوٹ گئے
کہاں کہاں سے سمیٹے گا وہ ہمیں محسن
کہ ہم تو آئینے کی طرح ٹوٹ پھوٹ گئے

زمرد محبوب ______ داؤد آباد

میں ستارہ نہیں مگر پھر بھی
آج کل گردشوں میں رہتا ہوں

سیدہ نوباد سجاد ______ کہروڑ پکا

تیرے ہوتے ہوئے میرے خالق
مجھ پر ہر شخص نے خدائی کی

ثمرین اکرام ______ میرپور خاص

جب محبت کرنی ہے تو پھر حالات سے ڈرنا کیسا
جنگ لازم ہو تو لشکر نہیں دیکھے جاتے

کائنات اصغر۔ لونڈ دار ______ ڈہرکی

مجھے لہجوں کے بدلنے سے ہمیشہ خوف آتا ہے
کہ جب لہجے بدلتے ہیں، کوئی اپنا نہیں رہتا

آبرو چوہدری ______ سرگودھا

یہ شہر طلسمات ہے کچھ کہہ نہیں سکتے
پہلو میں کھڑا شخص فرشتہ ہے کہ ابلیس

درخشاں، افشاں زین ______ کراچی

صبحوں سے ہیں مغلوب تو پھر زعم ہے کیسا
راتوں پہ ہیں غالب تو سحر کیوں نہیں کرتے

کے رآر ______ فیصل آباد

اب کے کچھ اور ہی ڈھب سے آنکھ لگی
نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی!

نمرہ شیرازی ______ پنڈ دادن خان

ساری عمر لکھتے رہے پھر بھی ورق سادہ ہی رہا
جانے وہ کیا لفظ تھے جو ہم سے نہ تحریر ہوئے

تسنیم کوثر ______ کراچی

ہجر میں کس کو بلاؤں تو بلاؤں کس کو
موت اچھی ہے الٰہی! کہ قیامت اچھی

ایمان نہمید، مدیحہ ______ کراچی

ہم نے کانٹوں کو بھی نرمی سے چھوا ہے اکثر
لوگ بے درد ہیں پھولوں کو مسل دیتے ہیں

کائنات اصغر۔ لونڈ دار ______ ڈہرکی

ہے میری ذلت میں کچھ میری شرافت کی دلیل
جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں

دانیہ عقیل کی ڈائری سے

ہر چیز فانی ہے۔ زندگی کا یہ جوش، یہ طمطراق سب فضول، سب بے کار ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا آخر یہ سب گورکھ دھندا کیا ہے اور کیوں ہے؟ افتخار عارف نے زندگی کی اس رائیگانی کو کس طرح محسوس کیا؟ اس غزل میں دیکھیے۔

آنکھ کی نمی بھی رائیگاں
دل کی روشنی بھی رائیگاں

زندگی تو تھی ہی وہم محض
وہمِ زندگی بھی رائیگاں

کاروبارِ عشق بھی فضول
خطرِ آگہی بھی رائیگاں

بے وقارِ حسنِ بے نیاز
خود سپردگی بھی رائیگاں

صبح خیزیاں بھی بے جواز
گریۂ شبی بھی رائیگاں

منہدم جانِ نقش و عکس
صوتِ سرمدی بھی رائیگاں

عارضی مسرتیں بھی خاک
دردِ دائمی بھی رائیگاں

پائمال باغِ آرزو
دل شکستگی بھی رائیگاں

نمرہ اقرأ کی ڈائری سے

زندگی کے بحرِ بیکراں میں اپنا پتا کس نے پایا ہے۔ آغاز سے انجام تک حیرت ہی حیرت ہے۔ سلیم احمد کی یہ غزل زندگی کو ایک پیغام دیتی ہے۔

جس طرح دریا بجھا سکتے نہیں صحرا کی پیاس
اپنے اندر ایک ایسی تشنگی بن جائیے

دیوتا بننے کی حسرت میں معلق ہو گئے
اب ذرا نیچے اُتریے، آدمی بن جائیے

وسعتوں میں لوگ کھو دیتے ہیں خود اپنا شعور
اپنی حد میں آئیے اور آگہی بن جائیے

ایک پتنگے نے یہ اپنے رقصِ آخر میں کہا
روشنی کے ساتھ رہیے روشنی بن جائیے

عالمِ کثرت کہاں ہے اب اکائی میں سلیم
خود میں خود کو جمع کیجیے اور کئی بن جائیے

ثوبیہ قطب کی ڈائری سے

زندگی ایک معمہ ہے۔ انسان اسے گزارنے کے باوجود اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہت سارے لوگ، بہت سارے حالات و واقعات جو نظر آتے اور پیش آتے ہیں ان کی حقیقت وہ ہوتی ہے جو اکثر آنکھ سے اوجھل ہوتی ہے۔ ایسے ہی خیالات کو واضح کرتی یہ غزل آپ سب کی نظر۔

مجھ سے پوچھتے کیا ہو زندگی کے بارے میں
اجنبی بتائے گا کیا اجنبی کے بارے میں

غرض صرف اتنا ہے دوستی کے بارے میں
آدمی غلط سمجھا آدمی کے بارے میں

غیر کو بُرا کہہ دوں، غیر تو نہیں ایسا
آپ ہی سے شکوہ ہے آپ ہی کے بارے میں

بے وفا کہا مجھ کو آپ نے بجا لیکن
اس طرح نہیں کہتے ہر کسی کے بارے میں

یہ غریب لوگوں کے گھروں سے دُور رہتی ہے
تجربہ ہے یہ میرا چاندنی کے بارے میں

اقرا صادق کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ نظم قارئین کے نام۔

گلہ ہوا سے نہیں ہوا تو اندھی تھی
مگر وہ برگ کہ ٹوٹے تو پھر ہرے نہ ہوئے
مگر وہ سر کہ جھکے اور پھر کھڑے نہ ہوئے
مگر وہ خواب کہ بکھرے تو بے نشاں ٹھہرے
مگر وہ ہاتھ کہ بچھڑے تو استخواں ٹھہرے
گلہ ہوا سے نہیں تندیٔ ہوا سے نہیں
عدو کے سنگ سے اغیار کی جفا سے نہیں
گلہ تو گرتے مکانوں کے بام و در سے ہے
ہوا کا کام تو چلنا ہے اس کو چلنا تھا
کوئی درخت گرے یا رہے اسے کیا
گلہ تو اہل چمن کے دل و نظر سے ہے
خزاں کی دھول میں لپٹے ہوئے شجر سے ہے
گلہ سحر سے نہیں رونقِ سحر سے ہے

رابعہ رشید کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر فیض احمد فیض کی "نسخہ ہائے وفا" سے انتخاب تمام قارئین کے لیے اور دوستوں کے لیے۔

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائشِ دل و نظر کی، وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے

کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آکے رکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی، وہ سارے عنواں وصال کے سے

نگاہ و دل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی
وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے سے

بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سبک تر، کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے

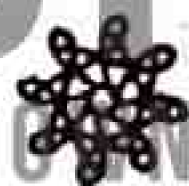
تم ہی کہو رند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آکر بیٹھے ہیں میکدے میں، وہ اٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

الوینہ، فرینہ، فائزہ کی ڈائری سے

عید کے موقع پر میں اپنی ڈائری میں تحریر عید کے حوالے سے یہ نظم اپنی تمام قارئین بہنوں کی نذر کرتی ہوں۔

دعا

ہلال عید کی شب
تیرے صحنِ چمن میں
روزِ عید کی چاندنی جگمگائے
میری دعا ہے کہ
تیرے گھر کے آنگن میں
ستاروں کی مالا اتر آئے
مسرت کے ان لمحوں میں
خوشیاں تیرے گرد جھلملائیں
بہاروں سے تیرا دامن بھر جائے



افشاں آفریدی۔۔۔ جرمنی

محترم بھائی صاحب! آپ کی والدہ کے انتقال کی خبر سے دلی رنج ہوا۔ اللہ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ان کے درجات بلند کرے۔ ان کی آگے کی منزلیں آسان کرے اور آپ کو اس عظیم دکھ سے ابھرنے کی طاقت عطا کرے۔

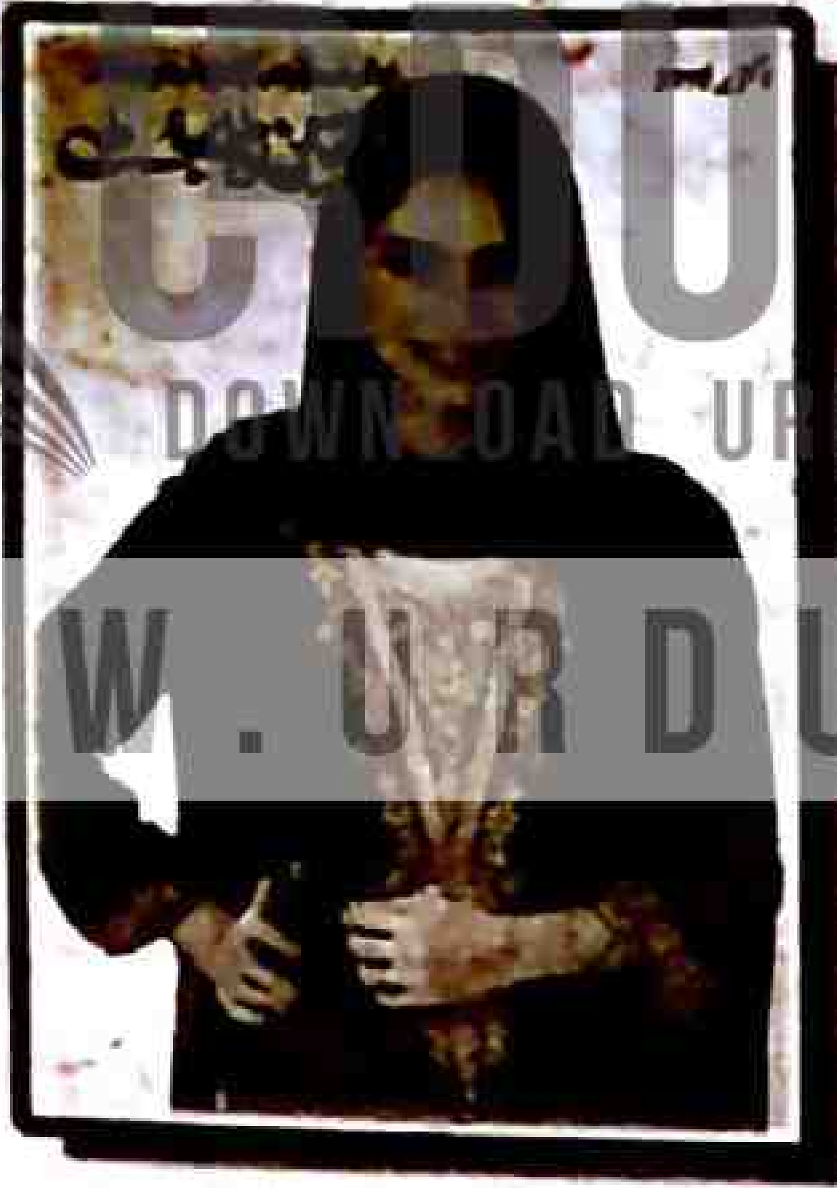
یہ وہ نقصان ہے، جس کی کوئی بھرپائی نہیں، تاہم اللہ تعالیٰ صبر کے ذریعے آپ کو اس سانحے کو برداشت کرنے والا بنادے۔ (آمین)

سائرہ رضا۔۔۔ کراچی

تعزیتی الفاظ کہنا میرے لیے ہمیشہ بہت مشکل مرحلہ رہا ہے۔ بے وزن اور کھوکھلے جملے، مگر کہنے پڑتے ہیں، کہنے چاہئیں بھی۔۔۔ کیونکہ وہ غم زدہ، جن کے دل تکلیف سے رس رہے ہوں انہیں یہ رسمی جملے پھاہے کی طرح لگتے ہیں۔ میں مسیحائی کا دعویٰ تو نہیں کرسکتی۔ مگر جناب عامر محمود صاحب، جناب آذر صاحب و دیگر۔۔۔ میں آپ سب کے لیے دکھی ہوں کہ آپ سے وہ نعمت و رحمت چھن گئی، جس کا بدل کوئی نہیں، وہ جنہوں نے ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھایا۔ منہ میں نوالے ڈالے۔ گویائی خدا دیتا ہے۔ مگر بولنے کا سلیقہ ماں سکھاتی ہے۔ وہ جو آج خود خاموش ہوگئیں۔ یہ جو سناٹا ہے اور یہ جو خالی پن۔۔۔ یہ بھر نہیں سکتا، مگر ہم ہی کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ ہاں یہ تھوڑا مشکل ضرور ہے۔ مگر زندگی تو آسان ہے ہی نہیں۔ رب تعالیٰ کے حضور دعاگو ہوں کہ وہ آپ کی والدہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمائے۔

نورین فیاض۔۔۔ منڈی بہاؤالدین

کہانیوں پر تو سب ہی تبصرہ کرتے ہیں۔ میں آج صرف قارئین کے خطوط پر تبصرہ کروں گی۔ سرورق پر جو کہ عموماً اچھا بلکہ بعض دفعہ قارئین اچھے بھلے ٹائٹل کے بارے میں بھی کہہ دیتی ہیں کہ سرورق بالکل پسند نہیں آیا۔ میری پیاری بہنو! آپ کو تنقید کا حق دیا گیا ہے تو اسے فرض نہ بنالیں کہ اچھے کو بھی برا کہنا ضروری سمجھیں۔ ہاں ٹائٹل کے بارے میں ایک رائے دوں گی کہ اور کچھ ہو نہ ہو، ہماری ماڈل کے سر پر دوپٹا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور ہو۔ اور میری ایک بہن نے "نمل" کے بارے میں لکھا، یقین کریں مجھے بہت دکھ ہوا اور برا بھی لگا۔ اس نے لکھا اور



نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

آپ نے شائع بھی کردیا۔ آپ تو ہمارے جذبات اور نمرہ احمد کے خیالات اور کاوش کا احترام کرتیں۔ میری بہنو آپ کو جو پسند نہیں آتا وہ نہ پڑھیں۔ آپ کے پڑھنے کے لیے ڈائجسٹ میں اور بہت کچھ ہے، لیکن پلیز "نمل" اور "آبِ حیات" کے بارے میں کچھ غلط نہ لکھیں۔ نمل کے بارے میں ابھی صرف اتنا ہی کہوں گی کہ نمرہ احمد نے کمال کردیا ہے۔ ان کے علاوہ سائرہ رضا بہت بہت اچھا لکھتی ہیں۔ "دشت جنوں" بہت اچھا لگ رہا ہے۔ کہانیوں میں طنزومزاح اور رومانس ضرور ہونا چاہیے، یہ میری فرمائش ہے۔ رومانس تو دال میں تڑکے کی طرح ہوتا ہے۔ پلیز عمر ماروی مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے تو سندھی بہنوں کو تو بہت ہی اچھا لگا ہوگا۔

ج: پیاری نورین! آپ نے جاب اور بچوں کی مصروفیات سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھا۔ بہت شکریہ۔ پیاری بہن نمل نمرہ احمد کی بہترین تخلیق ہے اور ہر ماہ ہم

خود بے چینی سے اس کا انتظار کرتے ہیں، لیکن خطوط کا یہ سلسلہ ہماری رائے کے لیے نہیں قارئین کی رائے کے لیے ہے، ہم پوری دیانت داری سے قارئین کی رائے آپ تک اور متعلقہ مصنفین تک پہنچاتے ہیں ہماری بیشتر قارئین "نمل" کو پسند کررہی ہیں۔ ہم ان کی رائے شائع کرتے ہیں تو اس کو بھی صرف ایک رائے سمجھیں۔ ویسے بھی اس سلسلے کو صرف تعریفی خطوط تک محدود کردیا گیا تو یہ سلسلہ بہت پھیکا اور بے رنگ ہوجائے گا۔

کہانیوں کے بارے میں آپ کی فرمائش اپنی مصنفین تک پہنچارہے ہیں۔

نگہت سیما۔۔۔ چکوال

آپ کی والدہ کے انتقال کے متعلق پڑھا۔ ازحد افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ سب بہن، بھائیوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) ماں کا رشتہ یقیناً "یقیناً ایسا ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ان کی کمی آپ کو ساری زندگی محسوس ہوتی رہے گی۔ لیکن مشیت ایزدی کے سامنے انسان بے بس ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور آگے کے راستے آسان کرے۔ (آمین)

تحسین اطہر۔۔۔ نامعلوم شہر

نیلم منیر کی تصویر سے سجا ٹائٹل دل میں اتر گیا اور جس ناول نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ ہے "نمل" بہت ہی زبردست ناول ہے۔ آپ کے دونوں پرچے ہی بہت اچھے ہیں، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے، حالانکہ میرے شوہر کو میرا پڑھنا پسند نہیں ہے، لیکن ڈانٹ وغیرہ کھا کر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا، البتہ وہ مان گئے ہیں کہ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میری دو بیٹیاں ہیں، ایک نے ابھی اسکول شروع کیا ہے۔ میری چھوٹی بیٹی کسی کو میرے رسالے کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔ آپ کے دونوں پرچوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں تو اپنی جیٹھانی اور دیورانی کو بھی کہانی پڑھنے کو دیتی ہوں۔

ج:۔ پیاری تحسین! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے خواتین ڈائجسٹ سے بہت کچھ سیکھا اور اسے آگے بھی بڑھا رہی ہیں۔ اچھی بات ان پر ہی اثر کرتی ہے جن میں اچھائی کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں فرمائے۔

فرحت عباس۔۔۔ پیرو جھنگ

میں ایک بال بچے والی گھریلو خواتین میں سے ہوں اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی جاب بھی کرتی ہوں تو وقت بہت کم ملتا ہے، لیکن خواتین کو نہ پڑھوں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا، اسکول کے دنوں سے ہی شوق تھا اور اب تو ماشاء اللہ بچے بھی جوان ہوچکے ہیں تو آپ خود ہی اندازہ لگائیں۔ خواتین کے کون کون سے سلسلے کی تعریف کروں سمجھ میں نہیں آتا سب ہی سلسلے بہت اور۔۔۔ بے حد اچھے ہیں۔ نمل میرا موسٹ فیورٹ ناول ہے۔

ج:۔ پیاری فرحت! آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی، پرچے حاصل کرنے کے لیے آپ ہمارے سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ میں فون کرلیں۔ نمبر یہ ہے۔

021-32721777

ام ہالہ۔۔۔ دہلی کالونی کراچی

اس وقت خط لکھنے کی وجہ فوزیہ ثمر بٹ، آمنہ رئیس، ہانیہ عمران، گجرات کا خط ہے۔ انہوں نے افسانہ "خوابوں کے رنگ" پر جس طرح کا تبصرہ کیا، اس سے سچی بات ہے دل کو ٹھیس پہنچی۔ بہن! آپ کو جو چیز نہ ماننے والی لگ رہی ہے، وہ صرف اس لیے کہ آپ خود بھی اس چیز سے گزری نہیں، یہ آپ پہ بیتا نہیں، ڈیزائنر لان کے پورے پورے جوڑے درزی کو دے کر، پلٹ کر بچے کپڑوں کے متعلق استفسار نہ کرنے والے کیا جانیں کہ ان کی کترنوں سے کیسے کیسے کپڑے، کیسے جوڑے وجود میں آتے ہیں۔ معصوم اور بھولی رائٹر صاحبہ نہیں، آپ ہیں، جب ہمارا پیٹ بھرا ہو، تن پہ بہترین پورا جوڑا ہو، کھانے کو اک سے اک طعام ہو، تو پھر جو باتیں رائٹر صاحبہ نے لکھی ہیں، وہ جوک اور داستان امیر حمزہ ہی لگتی ہے۔ جس دور کے پچاس روپے میں ہیرو نے کھایا پیا، بھولے بھولے، آپ کو کیا معلوم کہ کتنوں کے لیے آج بھی وہ پچاس روپے، پچاس ہی رہے ہوں، بڑھ کر 500 نہ ہوسکے ہوں دور کیوں جائیں خود میں آج بھی اپنی بیٹیوں کے کپڑے ان ہی بچی ہوئی کترنوں سے بناتی ہوں، انہیں سجاتی ہوں، سنوارتی

ہوں۔ اگر ہمارے پاس آپ کی طرح ہزاروں نہیں ریڈی میڈ خریدنے کو تو کیا ہم خود پر عید کی خوشیاں حرام کرلیں؟ آپ کے لیے یہ سب یقیناً "ناقابل یقین ہوگا" لیکن اس سے بھی کہیں آگے کے ہیں معالات یقین اب بھی نہ آئے تو کنیز نبوی کے اس ماہ کے ناول "عمر ماروی" میں تھریوں کے حالات پڑھ لیں۔ کس طرح معمولی معمولی چیز کو استعمال میں لیا جاتا ہے کس طرح اس سے پیٹ بھرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے اندر سے احساس نام کی چیز بھی نکل گئی ہے۔ بے شک وہ محض کردار تھے، لیکن ایسے کتنے ہی زندہ کردار ہمارے اردگرد بکھرے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں۔ ان کا یہ طرز زندگی ہمارے نزدیک "حد سے بڑھی ہوئی کفایت شعاری" ہے۔ افسوس! بہن شائستہ اکبر نے "میرے کوزہ گرا" غزل کے خالق کا نام پوچھا ہے۔ تو بہن! اس کے شاعر کا نام "فیصل ہاشمی" ہے۔ میری معلومات کے مطابق، کیونکہ یہ غزل میری ڈائری میں بھی موجود ہے اور شاعر کا یہی نام لکھا ہوا ہے اور میں نے بھی یہ غزل ان ہی رسالوں (شعاع، خواتین) میں سے اتاری تھی، کسی بہن نے بھیجی تھی۔

ج:۔ پیاری ام ہالہ! محبت کرنے والوں سے بھلا ایسے ناراض ہوتے ہیں کیا؟ صرف ایک خط شائع نہ ہونے پر اتنی ناراضی! کتنی خراب بات ہے نا؟ پیاری ہالہ! ہم آپ سے پوری طرح متفق ہیں، اس سے بھی زیادہ خراب حالات میں لوگ گزارہ کررہے ہیں لیکن فوزیہ نے جو کچھ لکھا وہ ان کے خیالات تھے۔ رائٹر نے جو کچھ لکھا وہ ان کے مشاہدات تھے اور آپ نے جو بہترین تبصرہ کیا وہ ہمارے اور آپ کے خیالات ہیں۔ ہوسکتا ہے بہت سے لوگ اس سے بھی اتفاق نہ کریں۔ مگر کم از کم ہمارے ادارے کی حد تک تو ہر شخص اپنی رائے رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کے لیے آزاد ہے، بشمول قارئین۔ خط تو آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔ کبھی افسانہ نگاری پر بھی توجہ دیں۔

تسکین گل، فائزہ حسینہ۔۔۔۔ عیسیٰ خیل

ایک بہت لمبے عرصے کی خاموشی کے بعد آپ کی محفل میں آئے ہیں، وجہ؟ میری پیاری امی جان کی ناگہانی وفات۔ یہ ایک ایسا صدمہ تھا جس سے سنبھلنے میں بہت ٹائم لگا اور پھر گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑ گیا۔ پھر تو بالکل ہی فرصت نہ رہی۔ سب سے پہلے "نمل" کا ذکر کروں گی، جس کی تعریف کے لیے الفاظ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ آپی! نمل میں حنین اپنے ہاتھ پر Bingo لکھ کے ہاشم کو دکھاتی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ آپی آپ سے ایک فرمائش ہے مجھے پوری امید ہے کہ آپ ضرور غور فرمائیں گی۔ ویسے تو ناول ناولٹ اور افسانے میں کہیں نہ کہیں کوئی مزاح کا رنگ نظر آجاتا ہے، مگر میری اور میری بہنوں کی یہ خواہش ہے کہ کسی مزاحیہ کہانی کو سلسلہ وار بھی شائع کیا جائے۔ یقین جانیں ہم شبلی اور جوادی کو بہت مس کرتے ہیں۔ تمام قاری بہنوں سے بھی التماس ہے اس معاملے میں میری بھرپور تائید کرتے ہوئے آپ بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ تاکہ ہر ماہ ایک ہلکی پھلکی تحریر پڑھنے کو ملے۔ آخر میں میری بہنیں حسینہ اور فائزہ کی طرف سے بہت بہت سلام۔

تسکین، فائزہ اور حسینہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی والدہ کی وفات کا بہت افسوس ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ اور آپ کے لیے آسانیاں کرے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

Bingo علامتی طور پر جیتنے کا اشارہ ہوتا ہے۔

اقصیٰ افضل للیانی۔۔۔۔ سرگودھا

واہ مزہ جی کیا بات ہے آپ کی۔ اس ناول نے میرے ذہن کی گرہیں کھول دیں، میں چاہتی ہوں یہ ناول کبھی ختم نہ ہو۔ اس ناول کے تمام کردار جان دار ہیں، لیکن مجھے فارس بے حد اچھا لگتا ہے۔ جواہرات کا انجام تو بے حد برا ہوگا۔ اس کے بعد بات ہوجائے "آبِ حیات" کی تو یہ واقعی آبِ حیات ہے۔ عمیرہ احمد کو پہلی بار پڑھا ہے اور ان کے ناول میں مجھے حمین سکندر بے حد اچھا لگتا ہے۔ سمیرا حمید کا ناولٹ بھی بہت اچھا تھا۔ مجھے مشعل پر بہت غصہ آیا۔ نعیمہ ناز کا ناولٹ رشتوں کا احساس لیے ہوئے تھا کہ تمام رشتوں میں ایک دوسرے کا احساس کرنا بہت ضروری ہے۔ کنیز نبوی کا عمر ماروی اچھا لگا۔ ماروی کی تھر سے محبت نے بے حد متاثر کیا۔ آمنہ ریاض کے ناول میں

یہ جاننے میں دلچسپی ہے کہ آیوشمتی ہے کیا؟ افسانے بھی سب اچھے تھے 'لیکن ہمارا کچن دلچسپ تھا۔ مجھے نمرہ احمد' عمیرہ احمد 'سمیرا حمید' سائرہ رضا' ایمل رضا' عفت طاہر بے حد پسند ہیں۔

پیاری اقصیٰ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید' آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

شبانہ عندلیب۔۔۔ گوجرانوالہ

سب سے پہلے کہنی سنی پڑھی۔ محمود ریاض کی اہلیہ کا پڑھ کر دل سے دکھ ہوا۔ دکھ کی اس گھڑی میں ہم دل سے ان کی فیملی کے ساتھ ہیں۔ اللہ مرحوم کے درجات بلند فرمائیں اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔ (آمین)

سب سے پہلے اپنا فیورٹ نمل پڑھا۔ گزشتہ سے پیوستہ اچھی قسط تھی۔ یہ قسط حنین کے نام رہی۔ زمر اور فارس کی نوک جھونک بہت اچھی لگتی ہے۔ "آب حیات" حسب مزاج اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔

ج: پیاری شبانہ! آپ کی تعریف و تنقید مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

ڈائجسٹ کا ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ اکتوبر کا شمارہ ہر اعتبار سے قابل تعریف تھا' لیکن پھر بھی کہیں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ رنگا رنگ سلسلہ بھی کچھ ادھورا سا' خالی خالی سا لگا۔ "آب حیات" کی یہ قسط بس سو سو لگی۔ "دشت جنوں" میں خوش نصیب کا کردار بہت زیادہ اوور لگتا ہے اسی لیے اس کے سین بہت ہی سرسری سا پڑھتی ہوں اور یہ معاویہ کی آئے کت کے لیے نفرت یک دم پسندیدگی میں بدل گئی' بالکل پسند نہیں آیا۔ منفرا کے کردار کو رائٹر بالکل بھول گئی ہے۔ "عمر ماروی" روایتی اسٹوری کو جس خوب صورتی سے لکھا ہے۔ اٹس آؤٹ اسٹینڈنگ' طرز تحریر بہت زیادہ اثر انگیز تھی' تھیم بہت جان دار تھا۔ "نمل" سپر ڈوپر یہ ایک ایسا ناول ہے جس سے دل ہی نہیں بھرتا۔ "تو حرف بیاں" فنٹاسٹک تحریر تھی' سمیرا حمید نے کمال کر دیا۔ عادل کی مشعل کے لیے بے اختیاری' ہر وقت اس کی پسند' ناپسند کا خیال کرنا' اس کی کیئر کرنا اپنی شخصیت کو ہی بدل دیا۔ رائیگاں نہیں گئی۔ "کسی راہ کی چاہ میں" بہت متاثر کن تحریر تھی۔ موضوع بہت ہی اسٹرونگ تھا۔ صفا نے لیفٹی کو ریجیکٹ کرکے اچھا فیصلہ کیا۔ افسانوں میں "اپنا کچن" بیسٹ تھا۔ "آگہی" بھی قابل تعریف تھا اور متاثر کن تحریر تھی "او پوزیٹو" موضوع بہت اچھا تھا۔

ج: پیاری مسرت! ہر ماہ ہمیں بڑی تعداد میں خط موصول ہوتے ہیں' اس لیے اگر کسی ماہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکے تو دل چھوٹا نہ کیا کریں۔ آپ کی اور آپ کے خطوط کی جگہ تو ہمارے دل میں ہے۔ ہر ماہ ہم بڑے شوق سے آپ کا نامہ شوق پڑھتے ہیں۔ شائع نہیں کر پاتے وہ ہماری مجبوری ہے۔

آنسہ طارق۔۔۔ کراچی

بچپن میں ایک کتاب امی کے پرانے بکسے سے ملی۔ میں تیسری یا شاید چوتھی کلاس میں تھی۔ میں نے بھی اس کتاب کو چھپ چھپ کر پڑھنا شروع کیا۔ ایک دن امی نے پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ بڑی مار پڑی 'اب کیا لکھوں۔ اس کتاب کا نام تھا۔ "خواتین ڈائجسٹ" وقت گزرتا رہا' اس کتاب سے میرا تعلق مضبوط سے مضبوط ہو تا گیا۔ ایک وقت ایسا آیا۔ جب بھری دنیا میں اس "خواتین" کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ رخسانہ نگار' راحت جبیں بہت زبردست' بہت پیاری' بہت اعلا' فائزہ افتخار کی ہر تحریر زبردست' اب تو کافی عرصہ ہو گیا ہے ان کا کچھ بھی پڑھے ہوئے۔ آپ پلیز ان سے کچھ لکھوائیں۔ اس دور کی تمام رائٹرز بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ خاص کر سائرہ رضا' عمیرہ احمد' تنزیلہ ریاض' کنیز نبوی سب بہت پیاری۔ کنیز نبوی کافی عرصے بعد آئی ہیں۔ "عمر ماروی" کو تے کر ایک بار دکھی کر جائیں گی اور ہم ان کا انتظار کرتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ باقی تمام بھی بہت پیارا بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ "نمل" "دشت جنوں" "آب حیات" بہت خوب صورت ناول ہیں۔

ج: پیاری آنسہ! خواتین میں شائع ہونے والی ہر تحریر سبق آموز اور تفریح کا سامان لیے ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیشتر قارئین کے گھر والے اس پر اتنا معترض کیوں ہوتے ہیں۔ اس میں نہ تو مخرب اخلاق مواد ہوتا ہے' نہ ہی سستی محبت کی ہیجان انگیز داستانیں۔ یہ رسالہ خالصتاً بہنوں کی تفریح طبع کے لیے ہے' جس میں تمام

اخلاقی حدود و قیود کا خیال رکھا جاتا ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ آپ کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے اور خوشیوں کے دروازے آپ پر کھول دے۔ (آمین)

فریحہ عمر شیخ۔ کنڈیارو

مجھے لگتا ہے کہ "نمل" پورے ڈائجسٹ کی جان ہے اور اگر جان نکل جائے تو انسان مر جاتا ہے' اس لیے ابھی اسے ختم نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے "خواتین" میں اگر کوئی کہانی شوق سے پڑھتی ہوں تو وہ صرف اور صرف "نمل" ہے۔ "آب حیات" میں امامہ کا رونا سمجھ سے باہر ہے۔ پتا نہیں کیوں روتی ہے اتنا۔ خوشی ہو تب بھی رونا۔ خیر غم میں تو رونا بنتا ہے۔ لیکن بات بات پہ رونا نہیں بنتا بھئی۔ ایک اور بہترین ناول "نمل" کے بعد "دشت جنوں" ہے۔ بھئی واہ کیا بات ہے آمنہ ریاض کی۔ اوہ سوری۔ ویسے آپس کی بات ہے میرا آمنہ جی سے سوال ہے کہ آپ نے کبھی آیوشمتی کو دیکھا ہے؟ کیسی لگتی ہے دیکھنے میں؟ دیکھا تو سامہ نے تھا آیوشمتی کو اور پھر اس کے بعد کچھ نہ دیکھ سکا بے چارا۔

ج: پیاری فریحہ! "نمل" کے ختم ہونے پر پریشان نہ ہوں۔ نمرہ احمد "نمل" کے بعد ایک اور زبردست ناول لکھیں گی۔ امامہ کے رونے کی بات پر ہمیں حیرانی ہوئی کیونکہ وہ بہت باہمت اور بہادر ہے۔ آپ نے اسے کب روتے دیکھ لیا؟

سیدہ ہر جبیں رباب نے لکھا ہے

جب سے ہوش سنبھالا لفظوں سے آشنائی ہوئی' تب سے ان رسائل کی دیوانی ہوں۔ تب جب در ثمین اور کنیز نبوی رائٹر نہیں بالکل نئی اور بہت اچھی تبصرہ نگار ہوتی تھیں۔

اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں ان رسائل سے شدید ناراض ہو گئی۔ وجہ؟ آخر وجہ کیا تھی اس کی؟ وجہ وہی گھسی پٹی کہ میری کہانی شائع نہیں کی۔ مجھے تکلیف اس بات نے نہیں دی کہ میری کہانیاں ناقابل اشاعت تھیں' تکلیف تو آپ کے رویے کی لاتعلقی سے پہنچی۔ "آپ کی تحریر میں تو کچھ بھی نہیں۔" وہ قاریہ جو آپ کے رسائل کی دیوانی ہے۔ جس نے شادی سے پہلے اپنے شوہر سے شرط رکھی ہو' رسائل نہیں چھوڑوں گی' اس کے ساتھ اتنی بے مہری اور بے زاری تو نہ دکھائی ہوتی۔ میری کہانیاں ناقابل اشاعت تھیں۔ ایک چھوڑ دس خامیاں گنوا دیتے' لیکن پھر بھی میں مطمئن رہتی' ایک ایک کرکے ساری خامیاں دور کرنے کی کوشش کرتی کہ چلو کبھی تو خامیاں دور ہوں گی' کبھی تو پرفیکٹ لکھ لوں گی۔ مانتی ہوں کہ آپ کے لاکھوں قارئین ہیں' ایک خاموش قاری جیسی رباب پڑھنا چھوڑ بھی دے تو فرق نہیں پڑتا آپ کو' لیکن میری ذاتی رائے کے مطابق لکھاری بہنوں کے ساتھ ساتھ قاری بہنیں بھی عزت اور محبت کی حق دار ہوتی ہیں۔ میں نے ہاشم ندیم کا ایک انٹرویو پڑھا تھا' انہوں نے

بشریٰ سعید کو صدمہ

بشریٰ سعید کے نوجوان بھائی عمر سعید اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ عمر سعید بے مثال تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ بشریٰ سعید کے چھوٹے بھائی ہی نہیں ان کے دوست بھی تھے۔ بشریٰ نے جو کچھ لکھا' اس میں عمر سعید کا بڑا حصہ ہے۔ بشریٰ نے بتایا کہ عمر سعید اکثر ان کی ادھوری کہانیاں لکھ کر پوسٹ کر دیتے' پھر تخلیق کے میدان میں وہ بشریٰ سے آگے نکل گئے اور اس طرح "رقص جنوں" اور "سفال گر" جیسی تخلیقات ادب کا حصہ بنیں۔ ان کی وفات ادب کا بہت بڑا نقصان ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ عمر سعید کے اہل خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ہم دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ عمر سعید کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

کہا "میں خدا اور محبت" کا مسودہ لے کر ایک ایڈیٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا یہ انتہائی فضول ہے' اس میں کچھ بھی نہیں اور اب آپ دیکھیں کہ "خدا اور محبت" کہاں تک پہنچا۔ خیر میں تو بتا رہی تھی کہ آپ کو رسالوں سے ناراضی کا قصہ۔ میرا امی کے گھر جانا ہوا۔ وہاں "شعاع' خواتین" کو دیکھا تو ناراضی بھول گئی۔ عمیرہ کے "آب حیات" کو دیکھ کر دکھ ہوا۔ اب تک محروم تھی اس سے اور پھر میں نے سوچا کہ "اہتمام محبت" کے لیے ایک بار پھر افسانہ لکھتی ہوں "خواتین" میں۔ اگر اب کی بار پھر وہی بے مہری دکھائی تو آئندہ نہیں لکھوں گی کبھی بھی۔

ج: برجیس! آپ کو ہماری بے مہری' رکھائی' بے رخی کا شکوہ ہے' ہو سکتا ہے کہ نادانستگی میں ہمارے رویے سے آپ کو ایسا تاثر ملا ہو' لیکن غرور و تکبر تو معاذ اللہ ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ غرور و تکبر تو صرف اس پاک ذات کو زیبا ہے جو سارے جہانوں کا خالق ہے۔ جہاں تک بے مہری اور رکھائی کا تعلق ہے تو ہم اپنی قارئین کا' ان کی رائے کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ اپنی قارئین سے دلی لگاؤ بھی رکھتے ہیں۔ ہم ان کا دل دکھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہماری ایک بھی قاری بہن پرچا پڑھنا یا ہمیں خط لکھنا چھوڑ دے' ہمیں بہت فرق پڑتا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ہم صفحات کی مجبوری کی وجہ سے تمام خطوط شائع نہیں کرپاتے ہیں۔ ہمیں نہیں پتا کہ آپ کی کہانی کے بارے میں ———— اتنا سخت جواب کس نے دیا۔ بہرحال ہماری نظر سے آپ کی کہانی نہیں گزری' نہ ہی ہمارے ریکارڈ میں آپ کی کوئی کہانی ہے۔ آپ ہمیں کسی ہلکے پھلکے موضوع پر افسانہ' ناول' ناولٹ لکھ کر بھجوائیں۔ ایک بات کا خیال رکھیں کہ دکھی قسم کی کہانیاں ہماری قارئین پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے کسی جسمانی یا ذہنی معذوری پر نہ لکھیں۔

عائشہ رباب۔۔۔ کراچی

حسب عادت کہنی سنی سے پڑھنا شروع کیا۔ دعائے مغفرت کا پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ بے اختیار خدا کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ "کرن کرن روشنی" پڑھی۔ افسوس سے آنکھیں بھر آئیں۔ آج ہم شادیوں میں کس قدر بے دردی سے کھانا ضائع کرتے ہیں اور اسی لیے کھانے پر سے برکت اٹھائی جارہی ہے۔ انشاء جی کو پڑھ کر مزا آگیا۔ روبینہ عارف کا تفصیلی انٹرویو بہت اچھا لگا۔ "حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ" میرا گل عثمان میں اپنی جھلک نظر آئی۔ پر میرا بچپن اتنا طویل نہیں تھا۔ ہمارے نام میں اس بار کوئی بھی "بہت دلچسپ خط" نہیں تھا۔ جس پر تبصرہ کیا جائے۔ "ناول" "وحشت جنوں" آیو شمنی کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ خوش نصیب اب کچھ مثبت بھی سوچیے' یہ کیا بس انتقام ہی انتقام۔ "مکمل" بہت ہی فنٹاسٹک' حسن نے تو ہاشم کی بولتی بند کردی۔ لیکن کیا ہے ہاشم کو دکھ ہوتا ہے تو ہمیں بھی دکھ ہوتا ہے۔ "عمر ماروی" مکمل ناول خوش اسلوبی سے اختتام کو پہنچا۔ ناولٹ تو "حرف بیاں" اچھی کہانی تھی۔ اینڈ پڑھ کر اچھا لگا۔ اتنی ناراضی تو حق ہے عادل کا۔ "کسی راہ کی چاہ میں" نعیمہ ناز نے بہت اچھا لکھا۔ صفا نے عقل مندی سے فیصلہ کیا۔ شکیب کا انداز بہت اچھا تھا۔ افسانے سارے ہی بہت اچھے لگے۔ "ذرا سا" پڑھ کر دکھی ہوگئی۔ "او لوز یئو" بہترین موضوع' طرز تحریر بہت ہی زبردست۔ "آگہی اور نفرت" بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ "اپنا کچن" پڑھ کر بہت مزا آیا۔ علی حسن سے ملاقات اچھی رہی۔

ج: پیاری عائشہ! تفصیلی تبصرے کے لیے تہِ دل سے ممنون ہیں' امید ہے آئندہ بھی شرکت کرتی رہیں گی۔

ماریہ۔۔۔ کراچی

کچھ ماہ پہلے ایک خط اور (شعاع) کے لیے کہانی پوسٹ کروائی۔ لیکن نا جی نا' آپ تو جیسے قسم کھائے بیٹھی ہیں کہ مجھ جیسی نئی قارئین کے خط لگانے تو دور پڑھنے بھی نہیں ہیں۔ جب بھی فون کھڑکاؤ تو اٹھانے کی زحمت تو دور میرے خیال میں بیل بجتے ہی سب لوگ اپنا منہ ہی دوسری طرف موڑ لیتے ہوں گے۔ (ہیں نا)

کافی ماہ پہلے کسی نیک دل خاتون نے کہانی کے بارے میں صرف یہی بتایا کہ مجھے تو پسند آئی ہے' لیکن فائنل فیصلہ دوسرے لوگوں کے پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔ اب آتے ہیں اکتوبر کے شمارے کی طرف' تو سب سے پہلے تو میں عطیہ خالد کے ہاتھ چومنا چاہوں گی۔ اس کے بعد اسماطاہر کا "اپنا کچن" زبردست' ایسی ہلکی پھلکی تحریر پڑھ کے مزا آجاتا ہے۔ بہت عرصے بعد میں نے نعیمہ ناز کی تحریر پڑھی' زبردست۔ مزا آگیا۔ نعیمہ جی نے بہت خوب صورت لکھا۔ روبینہ عارف سے ملاقات بھی خوب رہی۔

ج :۔ پیاری ماریہ! فون کی بیل پر منہ موڑنے کی ضرورت تو تب پڑے جب فون ٹھیک ہو' پی ٹی سی ایل والوں کی مہربانی سے فون اکثر و بیشتر خراب ہی رہتا ہے۔ آپ کی شاعری کے لیے معذرت۔ افسانہ کے بارے میں نیک دل خاتون نے جو آپ کو بتایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تحریر زیر غور ہے۔ یعنی پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھو اور یہ آپ سے کس نے کہا کہ ہم نئی قارئین کے خط نہیں لگاتے ہیں۔ اکثر پرانی قارئین تو یہ شکوہ کرتی نظر آتی ہیں کہ ان کو اب اہمیت نہیں دی جا رہی۔ نعیمہ ناز ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں۔ آپ جلد ان کا سلسلہ وار ناول بھی پڑھ سکیں گی۔

طہ مصطفیٰ۔۔۔ فاروق آباد

"خواتین و شعاع" اپنے خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ جگمگاتا گھر آیا تو دل خوش ہوگیا۔ ٹائٹل دونوں ہی بہت جان دار اور شان دار تھے۔ مگر اس دفعہ میں رسالہ پڑھ نہیں پائی۔ وجہ بہت سی ہیں۔ جاب' اسٹڈی اور بھائی کی وفات نے مانو دنیا اندھیر کردی۔ بہت حوانے کہا۔ خاندان بڑی اہمیت کا حامل ہے' مگر میں پانچ ستمبر سے سات ستمبر کی صبح دس بجے تک کا منظر نہیں بھول سکتی' بھائی زندگی اور موت کی کش مکش میں گھر پڑا تھا' مگر کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی حال ہی دریافت کرلیں۔ حالانکہ سارا خاندان ایک ہی محلے میں آباد ہے۔ سات ستمبر کی صبح دس بجے عماد مصطفیٰ ہمارا شاہزادہ بھائی جو صرف چھتیس سال کا تھا اپنی بیماری سے لڑتے لڑتے فوت ہوگیا۔ جب وہ چلا گیا تو پورا خاندان آگیا۔ شاید دنیاداری اسی کو کہتے ہیں۔ پہلے میں بہت سے ڈائجسٹ پڑھتی رہی ہوں' مگر "خواتین و شعاع" ایک معیاری ڈائجسٹ ہے۔ رہنمائی کرنے والا صاف ستھرا۔ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد جیسی رائٹرز لکھتی ہیں' جو کہ ساتھ رہنمائی کرتی ہیں۔ پہلے میں چادر اوڑھتی تھی۔ اب عبایا لیتی ہوں۔ قرآن کو برسوں بعد ہاتھ لگاتی تھی' مگر اب الحمدللہ ترجمے کے ساتھ پڑھتی ہوں روزانہ۔

ج :۔ پیاری طہ! آپ کے بھائی کی وفات پر دلی افسوس ہوا' اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آپ سب کو صبر دے۔ بلاشبہ یہ دکھ بہت بڑا ہے۔ صبر آتے آتے ہی آئے گا۔ اپنے رشتہ داروں کی طرف سے دل صاف کرلیں۔ کسی رشتہ دار سے بھی توقع رکھے بغیر اپنے فرائض کی ادائی کا نام ہی صلہ رحمی اور اعلا ظرفی ہے اور اعلا ظرف لوگ کبھی ناکام نہیں ہوتے۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ آپ کی کہانیوں کا موضوع بھی اچھا تھا' لیکن آپ سنبھال نہ سکیں۔ کہانی بہت گڈمڈ ہے۔ بہتر ہے کہ آپ محنت کرکے دوبارہ لکھیں۔

شبانہ شمس بلوچ۔۔۔ کموکی سندھ

دیا" "اعجاز کا رنگ میں بہن سمیرا گل عثمان کے بارے میں پڑھا' انہوں نے آخر میں یہ لکھا کہ کوئی بھی بہن ان سے اپنی کہانیاں لکھوا سکتی ہیں تو یقین کریں ۔ یہ پڑھ کے میرے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرے خاندان میں ہزاروں کہانیاں ہیں' پر افسوس کہ میں انہیں لکھ نہیں سکتی۔

ج :۔ پیاری شبانہ! اگر ہم نے آپ کو خط کے ذریعے سمیرا گل کا ایڈریس بھیجا تو آپ کے گھر والوں کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے آپ ہمیں فون کرلیں۔ فون نمبر یہ ہے۔ 021-3271666 یا ہمیں اپنا فون نمبر لکھ کر بھجوا دیں' ہم آپ کو فون کرلیں گے۔

ندا ظفر راجپوت۔۔۔ چیچہ وطنی ساہیوال

یہ میرا کسی بھی ڈائجسٹ میں بھیجا جانے والا پہلا خط ہے۔ امید ہے کہ آپ ضرور شامل کریں گے۔ میری خط لکھنے کی وجہ صرف اور صرف نمرہ احمد ہیں' "مصحف" سے ہی متاثر ہو کر میں نے ایک دینی مدرسے میں داخلہ لے لیا' مجھ سے جس کسی نے بھی مدرسے جانے کی وجہ پوچھی تو میں نے یہی اعتراف کیا کہ مجھے "مصحف" نے یہ راہ دکھائی۔ میں نے ایک کہانی لکھی ہے جو کہ طویل تر ہوتی جا رہی ہے' اگر وہ قسط وار ہو جائے تو کیا میں آپ کو قسط وار ہی بھیجوں یا پھر ایک دفعہ میں ساری ارسال کردوں۔

ج :۔ فی الحال تو آپ ہمیں کوئی مختصر اور خوش گوار انجام کا افسانہ لکھ کر بھیجیں' تاکہ آپ کی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ ہو سکے۔ طویل تحریروں کے لیے کم از کم تین اقساط ضرور بھیجیں' تاکہ کہانی کا اندازہ ہو سکے۔ آئندہ پورے پرچے پر آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

سرور فاطمہ ہنی۔۔۔ صوابی کے پی کے

خواتین کے سارے سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ "کہنی کی" سے لے کر "بیوٹی بکس" تک۔ اگر ہر ایک سلسلے پر تفصیلی تبصرہ شروع کیا تو پھر تو گئے کام سے اس لیے صرف کہانیوں پر بات کرتی ہوں تو جی دل ڈن عمیرہ احمد صاحبہ کیا کہنے آپ کے مگر ایک بات ہے وہ یہ کہ بچے تو ہمارے ہاں بھی ہیں وہ تو ذرے کے ٹکڑے ہیں۔ دکان پر جانے کو کہہ دو تو بھی کمیشن لیتے ہیں نہ تو وہ حمین جبرئیل کی طرح ذہین و فطین ہیں نہ ان کی طرح با ادب و باملاحظہ۔ "دشت جنوں" میں آمنہ جی ہمیں آبو شمتی سے ڈرا ڈرا کر اچھا نہیں کر رہیں ویسے یہ ناول بھی بہت بیسٹ ہے۔ دوسری طرف کیف اور خوش نصیب کی نوک جھونک بے ساختہ دانتوں کی نمائش پر مجبور کردیتی ہے۔ "نمل" کے لیے تو الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔ یہ کہ فارس اور زمر کو الگ نہیں کروانا کسی بھی صورت۔ دوم یہ کہ حنین کا ٹانکہ ہاشم سے بالکل بھی فٹ نہیں کرنا۔ ہاں آبدار اور ہاشم کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ مگر زمر اور فارس کے درمیان اگر یہ آپی صاحبہ آئیں تو میں نے اسے سمندر میں ڈبو کر سچ مچ ہی آپی بنا دینا ہے اور رہی جواہرات تو میرا دل کر رہا ہے اس سے سارے ہیرے کے زیورات لے لوں۔ اس کے بعد بھلے یہ زندہ رہے یا مردہ میری بلا سے۔ اس نوشیرواں کے بچے کو تو پھانسی چڑھا دیں کچے دھاگے سے۔ ہاہا۔ ہاشم کے ساتھ تو دل کر رہا ہے کہ اس نے جو بال جیل سے پیچھے کیے ہوئے ہوں وہ آگے کرو اور پھر سارے فین کو دکھاؤ کتنا مضحکہ خیز لگے گا۔

ج: پیاری ہنی! خط پڑھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ بھی حمین سے کم نہیں۔ خواہ مخواہ امی کو تنگ کیا۔ آپ کا خط جتنا دلچسپ ہے اگر افسانہ بھی ایسا ہی ہوتا تو کیا بات تھی۔ "حلالہ" کے لیے معذرت چاہتے ہیں، ہم ایسے موضوعات پر کہانیاں نہیں لگاتے۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن موضوع اچھا نہیں، کوئی اور ہلکا پھلکا موضوع منتخب کر کے لکھیں۔

آپ کے پچھلے خط تاخیر سے ملنے کے باعث شامل نہ ہو سکے۔ یہ خط بروقت موصول ہونے کے باعث شامل کیا جارہا ہے۔

افشین ہاشمی۔ روح رواں سیف

میری تجزیہ نگاری اور کسی اور کا نام اور جگہ مزا دے گئی۔ شرک کا مطلب سمجھا گئی۔ قربانیوں کے متعلق تمام اعلان شدہ کو چھوتی لگیں۔ کاش یہ بھی لکھ دیتے کہ قربانی کا جانور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا قائم مقام ہوتا ہے اس کو بیلو کر تزئین نہیں کرنا چاہیے۔ اس جانور کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔ کیٹ واک نہیں کروانی چاہیے۔ شیریں انور اچھی لگیں۔ لیکن جو پیٹ بھریں کتابوں سے اور جم کے پھوہڑ ہوں، انہیں کتنی اچھی لگ سکتی ہیں؟ ہاہاہا۔ آمنہ ریاض نے ابتدا ہی اچھا اٹھایا۔ سویرا فلک کے کندھے پر سر رکھ کر رونے کو دل چاہتا ہے۔ لکھاری اتنی ظالم کیوں ہوتی ہیں؟ فرح طاہر نے جس طرح روئی کے ساتھ کیا وہ ہماری اماں بھی کرتی تھیں۔ پر وقت اب بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ شاید ہم ہی نہ سیکھ سکے۔ ام طیفور "مہوک" اچھا تھا۔ پر کیا ان کو یہ نہیں پتا کہ نسب میں باپ کا نام ہی لکھا جاتا ہے۔ ایثار، وفا، جرأت، خلوص، مٹی سے پیار کا نام ہے۔

ج: پیاری افشین! ستمبر کے شمارے پر آپ کا تبصرہ شامل ہے۔ پچھلی دفعہ جگہ کا نام لکھا تھا، اپنا نہیں، اب اپنا نام لکھا ہے تو بتایا نہیں کہ کہاں سے پوسٹ کیا ہے۔ پھر اس طرح تو ہو گا اس طرح کے کاموں میں، دوسری بات یہ کہ جو جانور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ آیا تھا اور جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا تھا صرف وہ ان کا قائم مقام تھا۔ ہم جو قربانی کرتے ہیں وہ سنت ابراہیمی کی پیروی ہوتی ہے۔ قائم مقامی نہیں۔ لکھاری خواتین اس لیے ظالم لگتی ہیں کیوں کہ وہ نسبتاً "سچ بولتی ہیں اور سویرا فلک کے کندھے پر سر رکھ کر رونا چاہتی ہیں تو ضرور روئیں۔

ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں اور جب پتا ہے کہ اصولوں پر سمجھوتا نہیں کرتے تو کہانی کی بابت پوچھا کیوں؟ ویسے آپ کی کہانی ہمیں ملی نہیں۔

خبریں و بریں

واصفہ سہیل



دھوکا

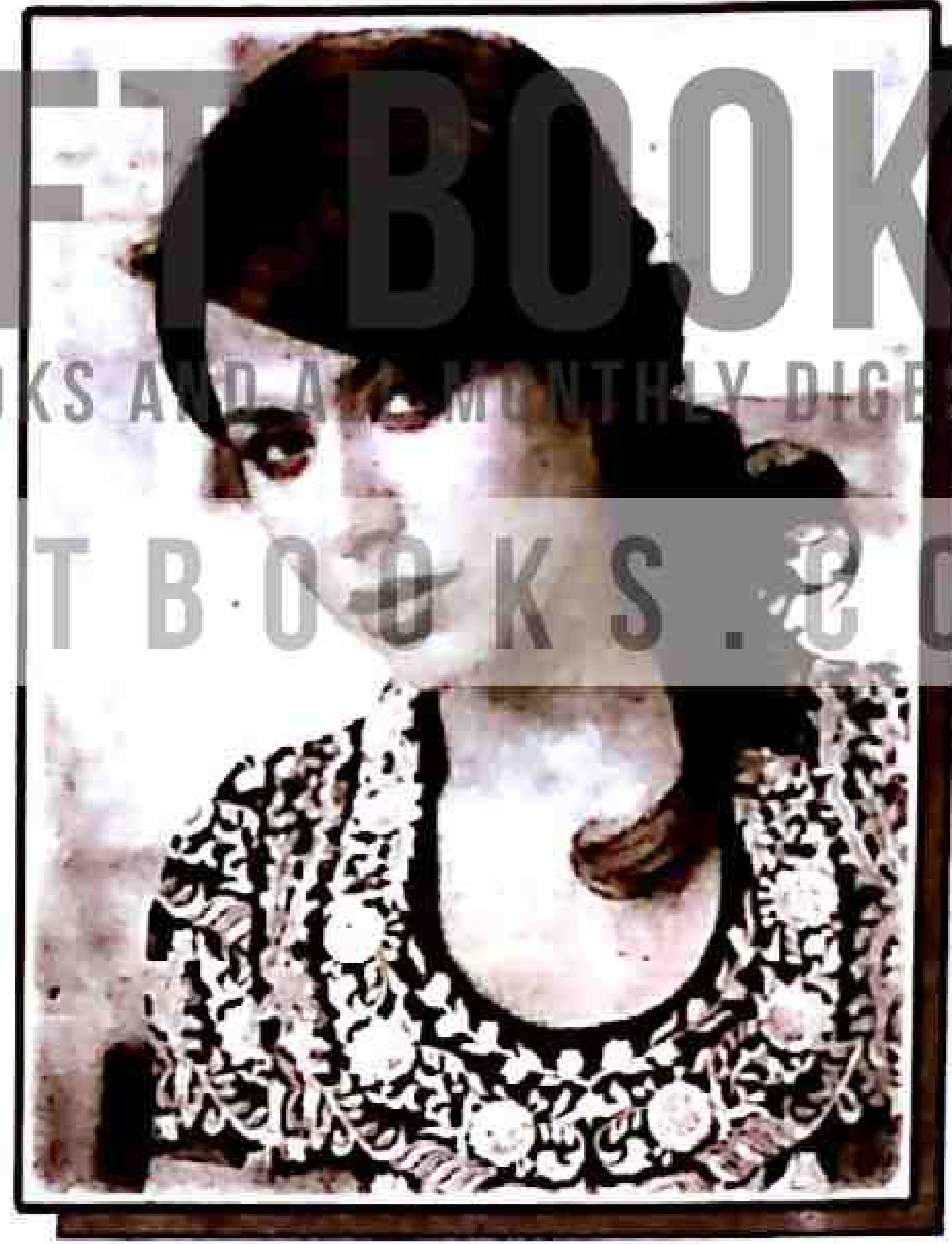
براؤن بریڈ (جو دراصل بران بریڈ ہے) کو اکثر لوگ صحت کے لیے بہترین غذا سمجھتے ہیں لیکن دراصل یہ ایک مفروضہ ہے۔ کیوں کہ اس کو بناتے ہوئے اس کے ایک حصے میں سے بہت سارے غذائی اجزا الگ کردیے جاتے ہیں اور اسے بلیچنگ کے عمل سے گزارا جاتا ہے۔ اور اسے ایک مخصوص عمل سے گزری ہوئی گندم سے تیار کیا جاتا ہے اور اس میں نمکین پرزرویٹوز شامل کیے جاتے ہیں۔ کسی حصے میں شکر بھی شامل کی جاتی ہے اور ہم جو اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ براؤن بریڈ میں فائبر کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، دراصل فائبر اس میں بے حد کم ہوتے ہیں اور کاربوہائیڈریٹس کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ (بیکری والو! اب بیچو براؤن بریڈ.....!)

اخروٹ

موسم سرما کے آغاز ہی میں دوسرے ڈرائی فروٹس کے ساتھ ساتھ اخروٹ کی مانگ میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اخروٹ بظاہر بہت سخت نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت یہ بہت حساس اور نازک ہوتا ہے۔ جو درجہ حرارت اور ہوا سے بہت جلدی متاثر ہو جا[تا ہے]۔ اخروٹ کبھی چھلا ہوا نہ لیں اور نہ اسے چھیل کر زیادہ دیر تک رکھیں۔ اگر مہینہ بھر تک اخروٹ رکھنا ہے تو انہیں کسی ایئر ٹائٹ بوتل میں رکھ کر فریج میں رکھ دیں۔ اگر اخروٹ سال بھر رکھنا مقصود ہو تو اسے فریزر میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ بہت زیادہ گرمی میں رکھنے کی صورت میں اخروٹ میں موجود اومیگا 3 (جو دل کی دوست چکنائی) کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لیے اسے تلنے اور بھوننے کی صورت میں احتیاط کرنا ہوگی۔ اس کے گرد لپٹے ہوئے بہت باریک کاغذی چھلکے میں بہت اہم اینٹی اوکسیڈنٹس شامل ہوتے ہیں جو اسے دل اور دماغ کے لیے قابل قدر غذا بنا دیتے ہیں۔ باقاعدگی سے اخروٹ کھانا ایک صحت مند عادت ہے۔ کیوں کہ اس میں موجود میلاٹونن آپ کی نیند کے دوران اسے کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتا ہے۔

سکون

ہولی وڈ کی اداکارہ لنزے لوھن اسلام کی طرف راغب ہو رہی ہیں۔ ترک ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے "لنزے" نے کہا کہ اسلامی تعلیمات لینے اور برائی کے راستے سے اچھائی کی طرف آنے پر انہیں ان کے معاشرے نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ نیویارک کی سڑکوں پر اسلامی کتب کے ساتھ جاتے ہوئے میرا مقصد تصاویر بنوانا ہرگز نہیں تھا بلکہ میرے پیچھے سائے کی طرح لگے فوٹوگرافر نے یہ تصاویر سوشل میڈیا پر جاری کرکے میری خفیہ سرگرمیوں کو بلاوجہ عام کردیا۔ ان تصاویر کے بعد امریکا میں مجھے سخت تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ اس تنقید سے تنگ آکر میں نیویارک سے لندن چلی آئی تھی کیوں کہ اس وجہ سے مجھے اپنے ہی ملک میں سیکیورٹی کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور میرے لوگوں نے ہی مجھ سے ڈرنا شروع



کردیا جیسے میں دہشت گرد ہوگئی ہوں حالانکہ میں اسلام کا مطالعہ اپنے سکون کے لیے کررہی ہوں۔

انتقام

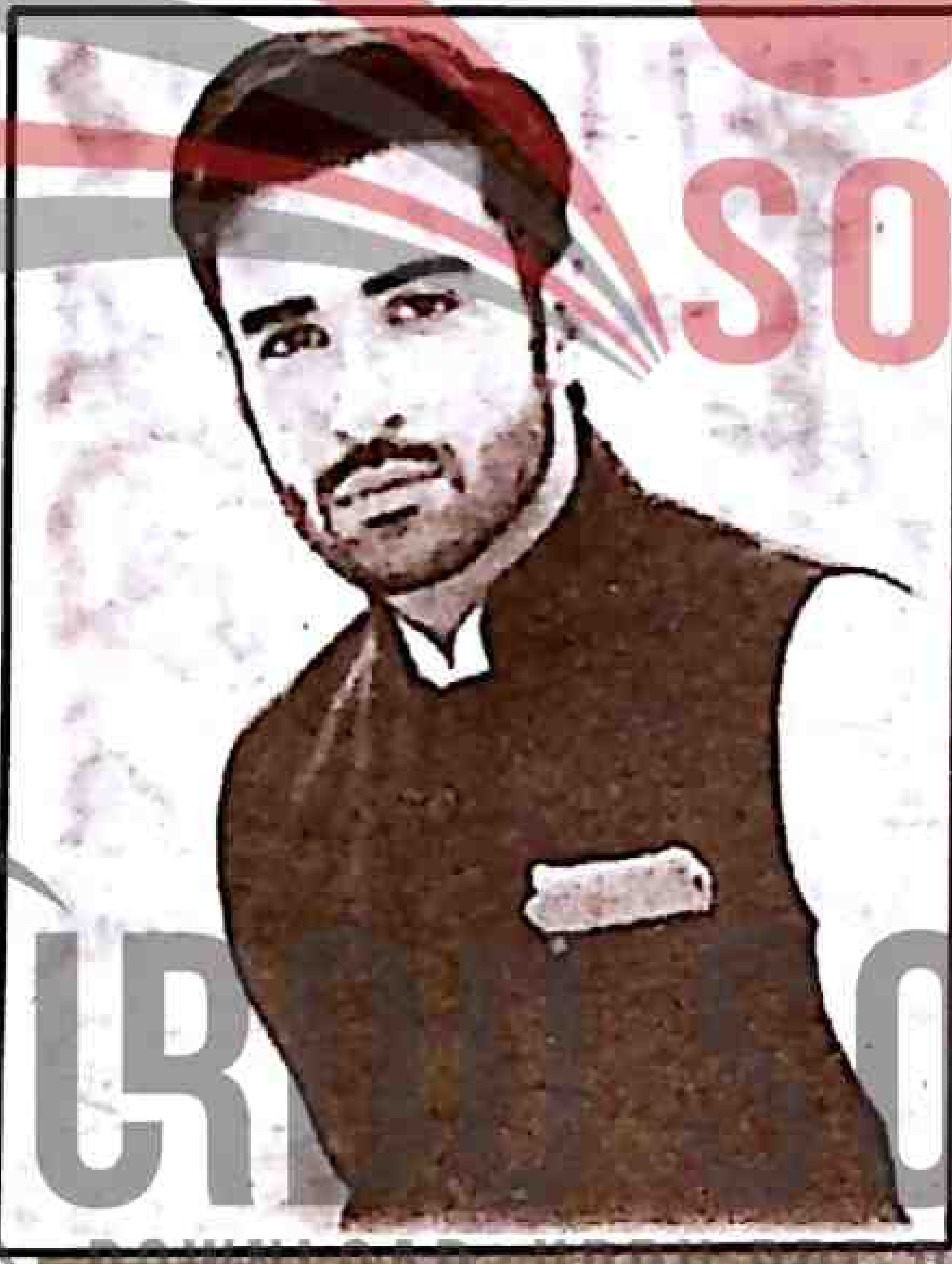
ایان علی منی لانڈرنگ کیس میں بری طرح پھنسی ہوئی ہے اس کے باوجود اسے متعدد فلموں کی آفرز ہورہی ہیں۔(ہائیں ایان علی اور فلم۔۔۔؟) اور اس میں سے ایک آفر ایان علی نے قبول بھی کرلی ہے۔ (پروڈیوسر ڈائریکٹر کی شہرت حاصل کرنے کی بہت ہی۔۔۔ بھئی گھٹیا کوشش ناں۔) جو انہیں کراچی کے فلم ساز نے بھاری معاوضے کے عوض دی تھی۔ (کہیں وہ۔۔۔؟ وہ تو نہیں) جب کہ ایان علی کے اس کیس میں ملوث ہونے کی وجہ سے اشتہاری ادارے انہیں اپنے کمرشل میں لینے سے بچ رہے ہیں، فیشن ماڈلنگ والے بھی انہیں لینے سے پرہیز کررہے ہیں۔ (یعنی ان میں کچھ۔۔۔ تو باقی ہے۔ بھئی اخلاقیات۔۔۔ اور کیا۔۔۔؟)

تضاد

اظفر رحمٰن ایک جانے مانے فنکار ہیں انہوں نے اپنی مختصر سی فنکارانہ زندگی میں بہت سے منفی اور مثبت کرداروں کے ساتھ ساتھ مزاحیہ کردار بھی ادا کیے ہیں۔ وہ ایک اچھے اداکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے اور سمجھ دار میزبان بھی ہیں۔ اظفر رحمٰن نے اپنے حالیہ انٹرویو میں انکشاف کیا ہے کہ وہ بھی شادی کا لڈو جنوری میں کھا ہی لیں گے۔ (اب لڈو کڑوا ہو رہا ہے تو اظفر ہی جانیں۔۔۔!) اظفر رحمٰن اس بارے میں کہتے ہیں کہ "اب ـــــــ وہ ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتے ہیں (شادی کے بعد۔۔۔ پرسکون۔۔۔ زندگی۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو اظفر۔۔۔!) وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بھی بچے ہوں ان کا ایک گھر ہو (کیا ابھی سڑک پر رہتے ہو؟) جہاں وہ سکون سے رہ سکیں۔ (پھر وہی بات سکون اور شادی۔ کتنا تضاد ہے۔ ناں۔۔۔؟)

خوف

زر احمد پاکستانی نژاد برطانوی اداکار ہیں ان دنوں وہ اسٹار وارڈ کے سیکوئل میں کام کررہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ "فلم ڈی ریل کنٹنٹ فنڈامنٹلسٹ" اور "دی نائٹ آف" جیسے بڑے پروجیکٹ میں بھی اپنے کردار کو بخوبی نباہ چکے ہیں۔ زر احمد کا کہنا ہے کہ "میں نے



Join Us on Facebook

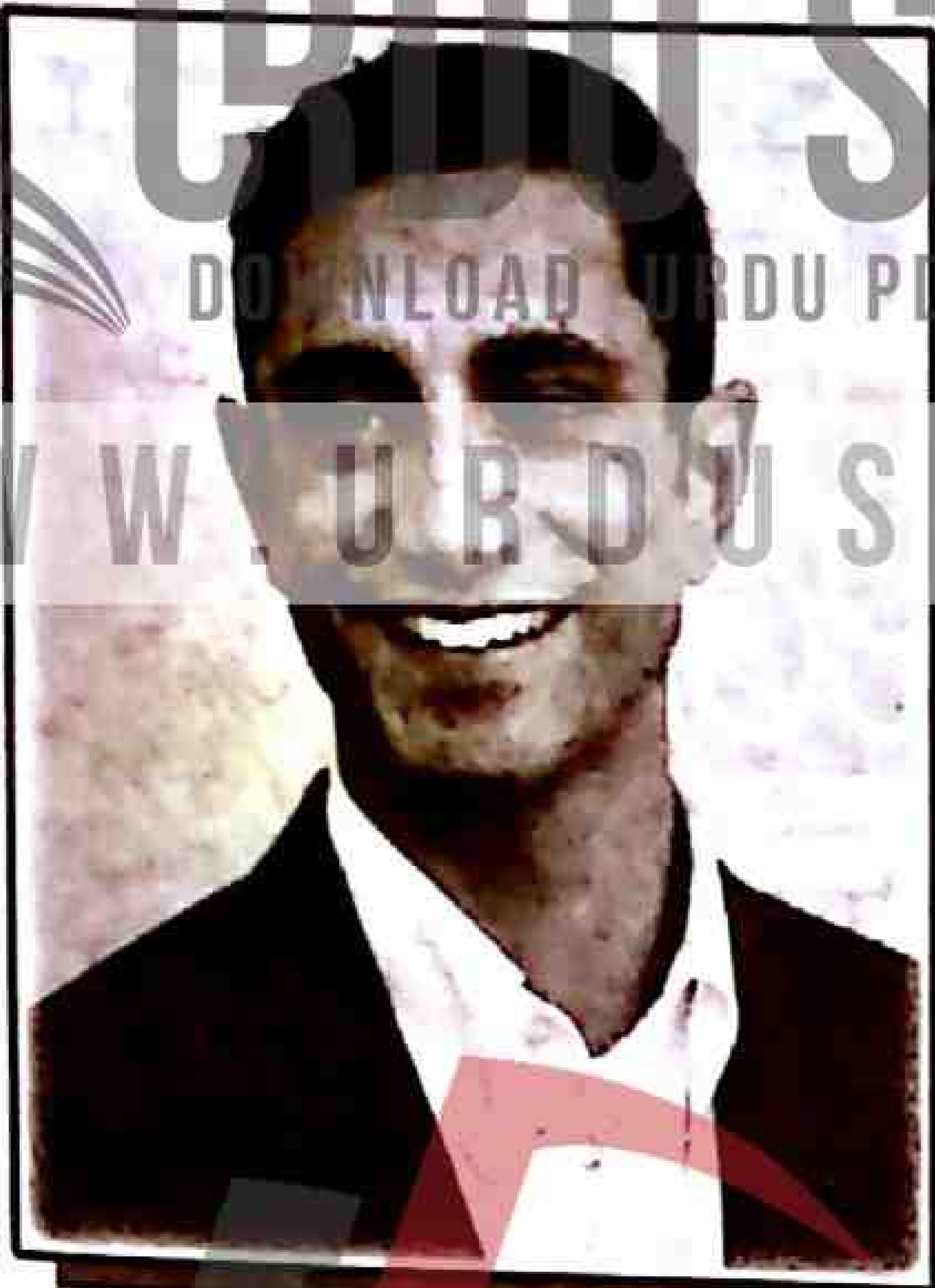
Get Notificatons of Newly Uploaded Books



Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books



زیادہ تر کردار نائن الیون کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں اور پاکستانیوں کو درپیش رہنے والے مسائل سے متعلق کیے ہیں۔ اسی وجہ سے برطانیہ اور امریکا میں انہیں آئے دن نسلی تعصب کا نشانہ بنایا جاتا ہے (تو بھئی اپنے ملک میں آجاؤ ناں) انہوں نے مزید بتایا کہ جب وہ فلم "روڈ ٹو گوانتانامو" کی شوٹنگ مکمل کر چکے تو برطانوی انٹیلی جنس افسران نے انہیں گھیر لیا اور خفیہ مقام پر لے جاکر انہیں دھمکیاں دیں اور پوچھا کہ "تم اداکار ہو یا اداکار کے روپ میں کوئی دہشت گرد ہو؟" (یعنی اتنی اچھی اداکاری کرتے تھے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے؟)



اِدھر اُدھر سے

☆ کوئٹہ کے وجود پر لگنے والا ایک زخم بھرتا بھی نہیں تو دوسرا لگ جاتا ہے۔ جب ایک رات کے حملے میں ہمارے ساٹھ سے زائد زیر تربیت نوجوان محافظ شہید ہو جائیں اور جب بدلتی ہوئی عالمی صورت حال میں پاکستان کے لیے مزید مشکلات پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جائیں۔ تب ایک مثالی لیڈر کو احتسابی تحریک کے التوا کا اعلان کرتے ہوئے یہ معاملہ عدلیہ پر چھوڑ کر خود ملک مخالف بیرونی اور داخلی محاذوں پر سرگرم عمل ہونا چاہیے۔

(اعجاز منگی۔۔۔ آواز حق)

☆ ہم میڈیا کے ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں باسٹھ جوانوں کی شہادت کی خبر بھی مشکل سے ایک دن کے لیے ٹی وی چینلز کی ریٹنگ کی پیاس بجھاتی ہے۔

(یاسر پیرزادہ۔۔۔ ذرا ہٹ کے)

☆ "وقت آنے پر لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں" سنا تھا، لیکن وقت آنے پر فرزند راولپنڈی کو باپ بناتا پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔

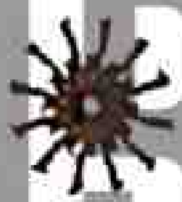
(یاسر پیرزادہ۔۔۔ ذرا ہٹ کے)

حقیقت یہ ہے کہ عمران نہ تو کبھی جمہوری جدوجہد کا حصہ رہے اور نہ ہی پرانی سیاسی جماعتوں کی روایتی سوچ کو انہوں نے تسلیم کیا۔ اب جس راہ پر وہ چل نکلے ہیں۔ اس سے ان کی واپسی ممکن نہیں ہے۔

(عباس مہکری۔۔۔ نشیب و فراز)

پریس رپورٹ کے مطابق عمران خان نے شہباز شریف پر کسی فرنٹ مین کے ذریعے اربوں روپوں کی بدعنوانی کا الزام لگایا۔ اس پر شہباز شریف نے ہتک عزت کا دعویٰ کر دیا تاکہ وہ عدالت سے انصاف لے کر اپنا نام کلیئر کرا سکیں۔ یہاں الجھن یہ ہے کہ ریکارڈ کے مطابق آخری مرتبہ جس ہتک عزت کے کیس کا فیصلہ آیا تھا وہ دس سال تک چلا اور الزام لگانے والے کی کمزور سی معذرت پر ختم ہو گیا۔

(نجم سیٹھی۔۔۔ انصاف)



آپ کا باورچی خانہ

نصرت آصف

کہتے ہیں، جس لڑکی کا سلیقہ دیکھنا ہو تو سب سے پہلے اس کا باورچی خانہ دیکھو۔ باورچی خانہ لڑکی کے سلیقے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ باورچی خانہ صاف ستھرا ہوگا تو پھر دل لگا کر کام کرنے کو دل چاہے گا۔ میرے سگھڑاپے میں میری دادی کا بہت عمل دخل رہا ہے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی ہدایات ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ جواب میں آپ کے ساتھ "آپ کا باورچی خانہ" میں شیئر کررہی ہوں۔ امید ہے آپ کو میری باتیں پسند آئیں گی۔

س ۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں۔ پسند ناپسند' غذائیت؟

ج ۔ گھر میں زیادہ افراد ہوں تو پسند ناپسند پس پشت چلی جاتی ہے لیکن پھر ہفتے کے سات دنوں کو دیکھتے ہوئے اور افراد خانہ کو دیکھتے ہوئے پسند کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔ ساتھ ساتھ غذائیت کا تڑکا اور گھر والوں کی صحت کا بھی خیال رکھتی ہوں۔

س ۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں' کھانے کا وقت ہے کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کرسکیں۔

ج ۔ جیسے بارش اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور اچانک برستی ہے اسی طرح اگر اچانک مہمان آجائیں تو پریشان نہیں ہوتی کیونکہ فریزر میں کچھ چیزیں تیار کرکے رکھی ہوتی ہیں جیسے شامی کباب' قیمے کے رول وغیرہ' پلاؤ جلدی بن جاتا ہے تو وہی بنالیتی ہوں۔ گوشت کی ایک ترکیب حاضر ہے۔ چاہے تو چکن کے ساتھ بنالیں۔

دہی گوشت

ضروری اجزا :

نرم گوشت	ایک کلو
دہی	تین پاؤ
پسا ہوا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
پسا ہوا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	ایک گڈی
نمک' مرچ	حسب ذائقہ
کوکنگ آئل	آدھا کپ

ترکیب :

گرم مسالا' زیرہ' دھنیا' مرچ اور نمک دہی میں ڈال لیں۔ پھر اسے بلو کر تھوڑا پانی ڈال کر گاڑھی لئی جیسا بنالیں۔ یاد رہے کہ دہی اور مسالے خوب اچھی طرح مکس ہوجانے چاہئیں اس آمیزے کو کچھ دیر اسی حالت میں پڑا رہنے دیں اور پھر پتیلی میں تیل ڈال کر اسے کڑکڑائیں اور گوشت تیل میں ڈال کر بھوننے کے دوران میں دہی اور مسالوں کا آمیزہ ڈال دیں۔ دہی کے آمیزے کی وجہ سے گوشت جلد ہی گل جائے گا اور نہ گلے تو کچھ دیر دم پر رکھ دیں۔ سالن تیار ہوجانے پر ہرا دھنیا کتر کر ڈال دیں۔

س ۔ صبح کا ناشتا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ کوئی خصوصی ترکیب۔

ج ۔ صبح کے ناشتے میں عام طور پر رات کا سالن جو بچا ہوا ہوتا ہے وہی سب کھالیتے ہیں۔ ہاں اتوار والے دن تھوڑا خصوصی اہتمام ہوجاتا ہے۔ کبھی چنے کا سالن' کبھی آلو کی بھجیا وغیرہ بن جاتی ہے۔ میرے ہاتھوں کی بھجیا سب کو بہت پسند ہے خاص میرے ہزبینڈ کو بہت پسند ہے۔ ترکیب حاضر خدمت ہے۔

ضروری اجزا :

آلو	آدھا کلو ہیوبز میں کاٹ لیں

ٹماٹر	تین پاؤ' باریک کاٹ لیں
پیاز	دو عدد
کوکنگ آئل	آدھا کپ
ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک چمچہ
کٹی لال مرچ	ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ

ہری مرچ' ہرا دھنیا اوپر سے ڈالنے کے لیے

ترکیب :

پیاز کو باریک کاٹ کر ہلکی براؤن کرلیں۔ اس کے بعد ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال کر اور ٹماٹر ڈال کر بھونیں اور تمام مسالے ڈال دیں۔ آخر میں آلو ڈال کر بھونیں۔ جب آلو گل جائیں تو ہری مرچ اور دھنیا ڈال کر گرم گرم پراٹھوں کے ساتھ پیش کریں۔

س ۔ آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

ج ۔ ہمارے گھر — گھر میں کھانا کھانا پسند کیا جاتا ہے۔ عموماً" یہ ہوتا ہے کوئی لے جائے یا پھر کسی کی سالگرہ یا کوئی خوشی کا موقع آجائے تو باہر جاکر کھالیا جاتا ہے۔

س ۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج ۔ موسم کے تو کیا کہنے' موسم تو خود پکار کر کہتا ہے کہ مجھے انجوائے کرو' خاص کر سردی اور بارش کا موسم۔ گرمیوں میں زیادہ تر کڑی چاول' دال چاول وغیرہ بنالیتی ہوں۔ سردیوں میں آلو کے پراٹھے گھر والے شوق سے کھاتے ہیں اور بارش کا موسم ہو تو کون ہے جو پکوڑوں سے لطف اندوز نہ ہوتا ہو۔ سارے پکوان اور رنگ موسموں سے ہی تو ہیں۔

س ۔ اچھا پکانے کے لیے آپ کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج ۔ کہتے ہیں کہ ذائقہ پکانے والے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ قدرتی طور پر عطا کرتا ہے' وہ ٹھیک ہے لیکن محنت سے کام کیا جائے تو اس کا انعام بھی اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے تو میرا تو یہ نظریہ ہے کہ اچھا کھانا پکایا جائے دل کے ساتھ محبت کے ساتھ اور محنت کے ساتھ تو محنت رنگ لائے گی اور کھانے والا برسوں آپ کے کھانے کی لذت کو یاد رکھے گا۔

س ۔ کچن کی کوئی ٹپ جو آپ دینا چاہیں۔

ج ۔ چینی کے مرتبان میں چیونٹیاں گھر بنانا اپنی شان سمجھتی ہیں لہٰذا اس مرتبان میں آپ اگر لونگ ڈال دیں تو چیونٹیاں مرتبان کے قریب بھی نہیں پھٹکیں گی۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

نمکین ڈشز کھا کھا کر یقیناً" آپ لوگ سیر ہو چکے ہوں گے سو آج منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے روایت سے ہٹ کر میٹھے کا اہتمام کیا ہے۔ امید ہے پسند آئے گا۔

گلاب جامن

اجزا :

خشک دودھ	ایک پیالی
انڈا	ایک عدد
چینی	ایک کھانے کا چمچ
بیکنگ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
میدہ	تین کھانے کے چمچ
گھی تلنے کے لیے	دو کھانے کے چمچ

شیرے کے لیے

چینی	آدھا کلو
پانی	دو پیالی
پسی ہوئی الائچی	آدھا چائے کا چمچ

چاندی کے ورق' بادام اور پستے سجانے کے لیے

ترکیب :

ایک پیالے میں گلاب جامن کے تمام اجزا ملا کر گوندھ لیں اور اس کی چھوٹی چھوٹی بالز بنا لیں۔ کڑاہی میں گھی گرم کر کے اس میں گلاب جامن سنہری رنگ ہونے تک تلیں۔ آنچ بہت دھیمی کر دیں۔

دیگچی میں شیرے کے اجزا ڈال کر گاڑھا شیرہ تیار کریں اور چولہا بند کر کے تلی ہوئی گلاب جامن شیرے میں ڈال کر تیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔

جب گلاب جامن شیرہ جذب کر لیں تو ڈش میں نکال لیں۔ انہیں چاندی کے ورق' بادام اور پستے سے سجا کر پیش کریں۔

رس گلے

اجزا :

دودھ	ایک کلو
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچ
میدہ	دو کھانے کے چمچ
چینی	دو کپ
پانی	تین کپ

ترکیب :

دودھ کو گرم کر لیں' جب ابال آنے لگے تو لیموں کا رس ڈال کر ملا لیں۔ پانچ منٹ پکنے دیں کہ دودھ اچھی طرح پھٹ جائے۔ اسے دس منٹ ٹھنڈا ہونے دیں۔ اس دوران چینی اور پانی پین میں ڈال کر پکا کر شیرہ تیار کر لیں۔

اب پھٹے دودھ کو ململ کے کپڑے میں ڈال کر اوپر پانی ڈالیں کہ لیموں کا کھٹا پن نکل جائے اور پھر اچھی طرح نچوڑ لیں۔

پنیر کو باؤل میں ڈال کر اس میں میدہ ملا کر ہاتھ سے سات آٹھ منٹ مسلیں۔ اب چھوٹے بالز بنا لیں' بالز میں کوئی کریک نہ ہو ورنہ رس گلے پھٹ جائیں گے۔ اور ان کو شیرے میں ڈال کر ڈھک کر دس منٹ تیز آنچ پر پکائیں اور پھر پانچ منٹ ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ شیرے سے نکال کر ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

رس ملائی

اجزا :

خشک دودھ	ایک کپ
انڈا	ایک عدد
گھی	ایک چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دودھ	ایک کلو

چینی	ایک کپ
پستہ، بادام سجاوٹ کے لیے	

ترکیب:

خشک دودھ، انڈا، بیکنگ پاؤڈر اور تیل کو ایک بڑے پیالے میں ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ جب آمیزہ اچھی طرح یکجان ہو جائے تو اس کی بالز بنالیں۔

اب ایک پتیلی میں دودھ ابال لیں اور اس میں چینی بھی شامل کر دیں۔ دودھ کو دس سے پندرہ منٹ تک پکا کر قدرے گاڑھا کر لیں، اس کے بعد رس ملائی کی بالز دودھ میں شامل کر لیں اور مزید پانچ منٹ تک پکائیں۔

پیالے میں نکال کر ٹھنڈا کریں اور پستہ، بادام سے سجا کر کے پیش کریں۔

جلیبی

اجزا:

خمیر	ایک سو گرام
میدہ	دو سو گرام
سوڈا	ایک چٹکی
پانی	ایک سو گرام
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب:

شیرے کے لیے چینی اور پانی ملا کر پکائیں، یہاں تک کہ وہ ابل جائے۔ اب اسے چولہے سے اتار لیں

جلیبی کے لیے:

خمیر میدہ، سوڈا اور ایک سو گرام پانی ملا کر آمیزہ بنالیں۔

اب اس آمیزے کو ململ کے کپڑے میں ڈال کر گرم گھی میں جلیبی تل لیں اچھی طرح سے وہ دونوں طرف سے سنہری ہو جائیں۔ پھر انہیں تیار کیے ہوئے شیرے میں ڈال کر نوش فرمائیں۔

بالو شاہی

اجزا:

میدہ	آدھا کپ
گھی	آدھا کپ
دہی	دو کھانے کے چمچے
پانی	ایک کپ
کھانے کا سوڈا	ایک چائے کا چمچہ
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب:

ایک کھلے برتن میں پگھلا ہوا گھی اور دہی ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں جب گھی اور دہی یک جان ہو جائیں، پھر سوڈا ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ اب میدہ شامل کر کے پانی سے نرم سا آٹا گوندھ لیں۔ تقریباً دس منٹ تک گوندھنے کے بعد ڈھک دیں، پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر درمیان سے انگلی کی مدد سے سوراخ کر دیں۔ اب کڑاہی میں گھی گرم کریں اور بالکل ہلکی آنچ پر سنہرا ہونے تک تلیں۔ جب دیکھیں کہ ہلکا براؤن رنگ آگیا ہے تو نکال کر نیم گرم شیرے میں ڈال دیں، دس منٹ شیرے میں پڑا رہنے دیں تاکہ شیرا اچھی طرح رچ جائے۔ دس منٹ کے بعد شیرے سے نکال کر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کٹے ہوئے پستے اور چاندی کے ورق کے ساتھ سجا کر کھانے کے لیے پیش کریں۔



گلستان

نفسیاتی و ذہنی الجھنیں

سلمٰی فرید — کراچی

میں نے اپنے والدین سے لو جھگڑ کر اپنی مرضی سے اپنی پسند کی شادی کی تھی اور میرے سسرال والے بھی بہت مشکل سے اس شادی کے لیے دو سال کی جدوجہد، ضد اور کوششوں کے بعد راضی ہوئے تھے۔ میرے سسرال والے شرعی پردے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں، سو میں نے شادی سے پہلے ہی اپنے شوہر کے کہنے پر اپنے آپ کو ان چیزوں کا پابند کر لیا تھا۔ خیر جیسے تیسے کر کے وہ اس رشتے پر راضی تو ہو گئے اور شادی بھی ہو گئی، شروع شروع میں سب اکھڑے اکھڑے رہے لیکن بعد میں سب ٹھیک ہو گیا۔

بچوں کی پیدائش کے بعد ہم علیحدہ ہو گئے سسرال سے اور تب سے ہی میرے شوہر کا رویہ میرے ساتھ برا ہوتا گیا۔ پہلے تو میری ہر بات، ہر کام میں انہیں کیڑے نظر آنے لگے پھر مجھ سے بیزار بھی ہونے لگے۔ اب حال یہ ہے کہ مار دھاڑ پر اتر آئے ہیں۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے میں ڈپریشن کے باعث دو دفعہ خودکشی بھی کرنے کی کوشش کر چکی ہوں لیکن اللہ نے شاید بچوں کے لیے ابھی زندگی رکھی ہے۔ ہر دفعہ معافی تلافی کے بعد وہ پھر ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔

ہمارا گھرانہ خوشحال ہے۔ میرے تین بچے ہیں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ گھر کا ہر کام خود کرتی ہوں کہیں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ سسرال سے بھی بنا کر رکھی ہے لیکن اس کے باوجود یہ خوش نہیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، یہ ماں باپ کی نافرمانی کی سزا ہے یا میری بری قسمت۔ دل کرتا ہے مر جاؤں میں کہاں جاؤں؟"

ج: عموماً گھر میں جھگڑوں کی وجہ معاشی مسائل ہوتے ہیں۔ آپ معاشی طور پر خوش حال ہیں۔ روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔

مرد، ماں بہن کے بھڑکانے کی وجہ سے بھی بیویوں سے جھگڑتے ہیں۔ آپ کے سسرال والوں کے ساتھ تعلقات خوش گوار ہیں۔ اس لیے اس کا امکان بھی کم ہے۔

آپ کے شوہر نے اپنی پسند سے شادی کی ہے، اس لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آپ کو ناپسند کرتے ہیں اس لیے جھگڑتے ہیں۔

چونکہ انہوں نے والدین سے علیحدگی کے بعد جھگڑنا شروع کیا ہے۔ اس لیے اس کا امکان ہے کہ آپ کھانا اچھا نہ پکاتی ہوں، گھر میں صفائی کا خیال نہ رکھتی ہوں یا بچوں پر توجہ نہ دیتی ہوں۔

اگر ایسا ہے تو آپ ان کی پسند کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔ ان کی پسند ناپسند پر توجہ دیں۔ لیکن اس سے ہٹ کر ایک اور امکان بھی ہے کہ آپ کے شوہر لاشعوری طور پر کسی ذہنی الجھن کا شکار ہوں اور وہ خود بھی اپنی ذہنی کیفیت سمجھ نہ پا رہے ہوں۔ آپ اپنی ساس سسر کو اپنا مسئلہ بتائیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اس کیفیت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ ساس سسر نہیں ہیں تو کسی سمجھ دار جیٹھ، دیور یا نند سے بات کریں۔ اس سلسلے میں انہیں کسی سائیکاٹرسٹ کو بھی دکھایا جا سکتا ہے لیکن انہیں ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے آپ خود نہ کہیں۔ یہ بات ان کی بہن یا بھائی کہیں گے تو شاید وہ ان کی بات مان لیں۔ کبھی کبھی معمولی سے علاج سے ذہنی کیفیت میں حیرت انگیز تبدیلی آ جاتی ہے۔

خودکشی والی بات سن کر تکلیف ہوئی۔ ایک ماں اس طرح کیسے سوچ سکتی ہے۔ آپ اپنے بارے میں نہیں

اپنے بچوں کے بارے میں سوچیں۔ آپ کے بعد ان پر کیا گزرے گی۔ زندگی جتنی بھی دشوار اور مشکل ہو' ہر مسئلہ کا حل نکل آتا ہے۔ موت کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ خودکشی کا مطلب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی ہے۔ جو کہ کفر ہے اور کفر کے معنی ناشکری کے ہیں۔

نام نہیں لکھا

ایک بہن کا خط ملا ہے۔ انہوں نے اپنا نام نہیں لکھا۔ یہ بہن اللہ تعالیٰ سے شاکی ہیں اور زندگی سے منہ موڑ کر خودکشی کرنا چاہتی ہیں۔

اچھی بہن! انسان جلد باز اور بے صبرا ہے۔ غلطیاں خود کرتا ہے اور الزام قسمت پر رکھتا ہے۔ آپ خود بتائیں جو بو کر گندم کی توقع رکھنے والے کو آپ کیا کہیں گی؟

آپ کے والد نے غلطی کی کہ بغیر سوچے سمجھے آپ سے دگنی عمر کے شخص سے شادی کردی جبکہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا جبکہ آپ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ خوب صورت' تعلیم یافتہ' اچھا نیک خاندان لیکن آپ کے والد نے صرف پیسہ دیکھا۔ باقی کچھ نہیں دیکھا۔

اللہ تو آپ پر مہربان تھا۔ اس نے آپ کو اچھے گھر میں پیدا کیا' ذہانت دی' اچھی شکل دی۔ کوئی معذوری نہیں' بیماری نہیں' آنکھ' کان' ہاتھ' پیر' زبان سب کچھ عطا کیا۔ اس کی عطا میں کوئی کمی نہیں تھی پھر آپ کے والد نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟ لیکن آپ کے والد کی غلطی کے باوجود وہ جو ستر ماؤں سے زیادہ آپ پر مہربان ہے۔ اس نے آپ پر کرم کیا اور صرف ایک ماہ میں اس انسان سے آپ کا پیچھا چھوٹ گیا ورنہ خواتین کو طلاق حاصل کرنے کی کوشش میں سالوں لگ جاتے ہیں۔ دوسرا کرم آپ پر یہ ہوا کہ آپ نے تعلیم کا سلسلہ شروع کردیا۔ اعلا تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ جاب حاصل کی۔ یہ بھی اس کی عطا تھی' گورنمنٹ جاب خوش نصیب لوگوں کو ہی ملتی ہے۔

آپ نے پھر اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔ ایک میٹرک پاس لڑکے کے ہاتھوں بے وقوف بنتی رہیں۔ وہ آپ سے پیسے اینٹھتا رہا۔ آپ پڑھی لکھی تھیں' سمجھ دار تھیں اتنا نہ سوچا کہ عورت کی کمائی کھانے والے بے غیرت ہوتے ہیں پھر اس نے دھوکا دیا تو آپ کو اپنی عقل کو الزام دینا چاہیے۔

آپ لوگوں کی غلطیوں کا سلسلہ نہیں رکا۔ گھر والوں کے کہنے پر دوسرے مسلک میں شادی کرلی جبکہ ان کے عقائد آپ سے یکسر مختلف تھے۔ آپ کم عمر نہیں تھیں' جاہل نہیں تھیں' کسی کی محتاج نہیں تھیں اپنے پیروں پر کھڑی تھیں پھر ایسا فیصلہ کیوں کیا؟ دوسروں کی غلطیوں پر کیوں جائیں۔ آپ کے والدین' آپ کے بھائی سب نے تو غلط کیا ہی لیکن خود آپ نے بھی اپنے لیے کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا۔

آپ نے جو گستاخانہ کلمات لکھے ہیں وہ شائع نہیں کیے جاسکتے لیکن آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا' اس میں غلطی کس کی تھی؟

اب آپ خودکشی کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔۔۔ ایک اور غلط فیصلہ! تھوڑی سی ہمت کریں۔ اس آدمی سے پیچھا چھڑائیں۔ وہ طلاق نہ دے تو خلع حاصل کرلیں۔ بے شک اس سلسلے میں آپ کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن خودکشی سے کم۔ خودکشی کے بعد کیا ہوگا۔ یہ آپ کو علم ہونا چاہیے اگر علم نہیں ہے تو کسی عالم سے پوچھ لیں۔

آپ خوب صورت ہیں' تعلیم یافتہ ہیں۔ سب سے بڑھ کر آپ کے پاس گورنمنٹ جاب ہے۔ آپ کو اب بھی بہت اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔

بیوٹی بکس

امت الصبور

صغریٰ اقبال ۔۔۔ ملیسی

س : آپی! میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بہت زیادہ ٹوٹتے ہیں۔ بال بہت بے رونق اور روکھے بھی ہیں۔ ہر دوسرے مہینے بالوں کی ٹرمنگ بھی کرواتی ہوں لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اس کے علاوہ غذا بھی متوازن لیتی ہوں' پھلوں کا استعمال بھی باقاعدگی سے کرتی ہوں۔ مجھے کسی نے آملے ریٹھے لگانے کے لیے کہا تھا۔ لیکن اس کو استعمال کیسے کیا جاتا ہے یہ بتادیں اور کیا اس کے استعمال سے بال کالے بھی ہوتے ہیں؟

ج : بالوں کا روکھا پن غیر معیاری شیمپو کے استعمال کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تیل کم لگانے کی وجہ سے بال روکھے' بے رونق اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

آپ بالوں کا مساج باقاعدگی سے کریں۔ اس کے علاوہ نہانے سے پندرہ منٹ قبل بالوں میں تیل کا مساج کریں اور پھر نیم گرم پانی میں تولیہ نچوڑ کر بالوں پر باندھ لیں۔ اس سے بالوں میں نرمی بھی پیدا ہو گی اور تیل بھی بالوں میں اچھی طرح سے جذب ہو گا۔

آملے ریٹھے کا استعمال اور بنانے کا آسان سا طریقہ لکھ رہے ہیں۔

مٹھی بھر آملے' ریٹھے اور سیکاکائی کو ایک لیٹر پانی میں رات بھر کے لیے بھگو دیں۔ دوسرے دن اس پانی کو اتنا پکائیں کہ وہ آدھا رہ جائے۔ ٹھنڈا ہونے پر اب اس کو پیس لیں اور اس آمیزے کو بالوں میں لگالیں پھر بال دھولیں۔ اس کے مستقل استعمال سے نہ صرف بال کالے ہوتے ہیں بلکہ نرم اور ملائم بھی ہو جاتے ہیں اور بالوں کی قدرتی چمک بھی لوٹ آتی ہے۔

صدف کرن ۔۔۔ جہلم

س : آپی! میری عمر اکیس سال ہے جب کہ میرا وزن ساٹھ کلو ہے اور میرا قد پانچ فٹ دو انچ ہے۔ پہلے میرا وزن پچاس کلو کے قریب تھا لیکن پچھلے ایک سال سے مجھے قبض کی شکایت ہو گئی اور شاید اسی وجہ سے میرا وزن بھی بڑھ گیا ہے۔ میں کھانا بھی چبا چبا کے کھاتی ہوں اور اپنی غذا کا بھی خیال رکھتی ہوں۔ آپی! مجھے کوئی ایسا نسخہ بتا دیں جس سے میرا وزن بھی کم ہو اور قبض کی شکایت بھی دور ہو جائے؟

ج : قبض کی ایک وجہ ذہنی دباؤ یا کوئی پریشانی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت زیادہ مرغن غذائیں بھی قبض کی شکایت پیدا کرتی ہیں۔ آپ روزانہ رات کو دو انجیر پانی میں بھگو کر رکھ دیں اور صبح نہار منہ انجیر چبا کر کھالیں اور بچا ہوا پانی پی لیں۔

2۔ ایک چمچہ سنا کی پتی کا قہوہ بنا کر پی لیں۔

3۔ نہار منہ ایک چمچہ زیتون کا تیل پی کر ساتھ میں گرم دودھ پی لیں۔

تلی ہوئی اور بیکری کی اشیاء سے پرہیز کریں۔ رات کو کھانے کے بعد چہل قدمی ضرور کریں۔ اس سے آپ کا وزن بھی گھٹے گا اور آپ خود کو بھی ہلکا پھلکا محسوس کریں گی۔

عالیہ فرحین ۔۔۔ کراچی

س : میرے نقوش اچھے ہیں۔ رنگ بھی صاف ہے لیکن جلد بے رونق ہے' چہرے پر مہاسے بھی نکلتے ہیں جو بعد میں نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ جلد چکنی ہے۔ چہرے پر چھائیاں بھی ہیں جو سردیوں میں بہت نمایاں ہو جاتی ہیں۔

ج : ایک چمچہ لیموں کا رس' ایک چمچہ شہد' ایک گلاس نیم گرم پانی میں ملا کر نہار منہ پئیں۔ چند دنوں میں حیرت انگیز نتائج سامنے آئیں گے۔ جلد کی خوب صورتی کے لیے لیموں کے ان گنت فائدے ہیں۔ شہد فوری توانائی دیتا ہے اور قبض دور کرتا ہے۔

